Irshad
Mushkat
Mahmood

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

جون
2006

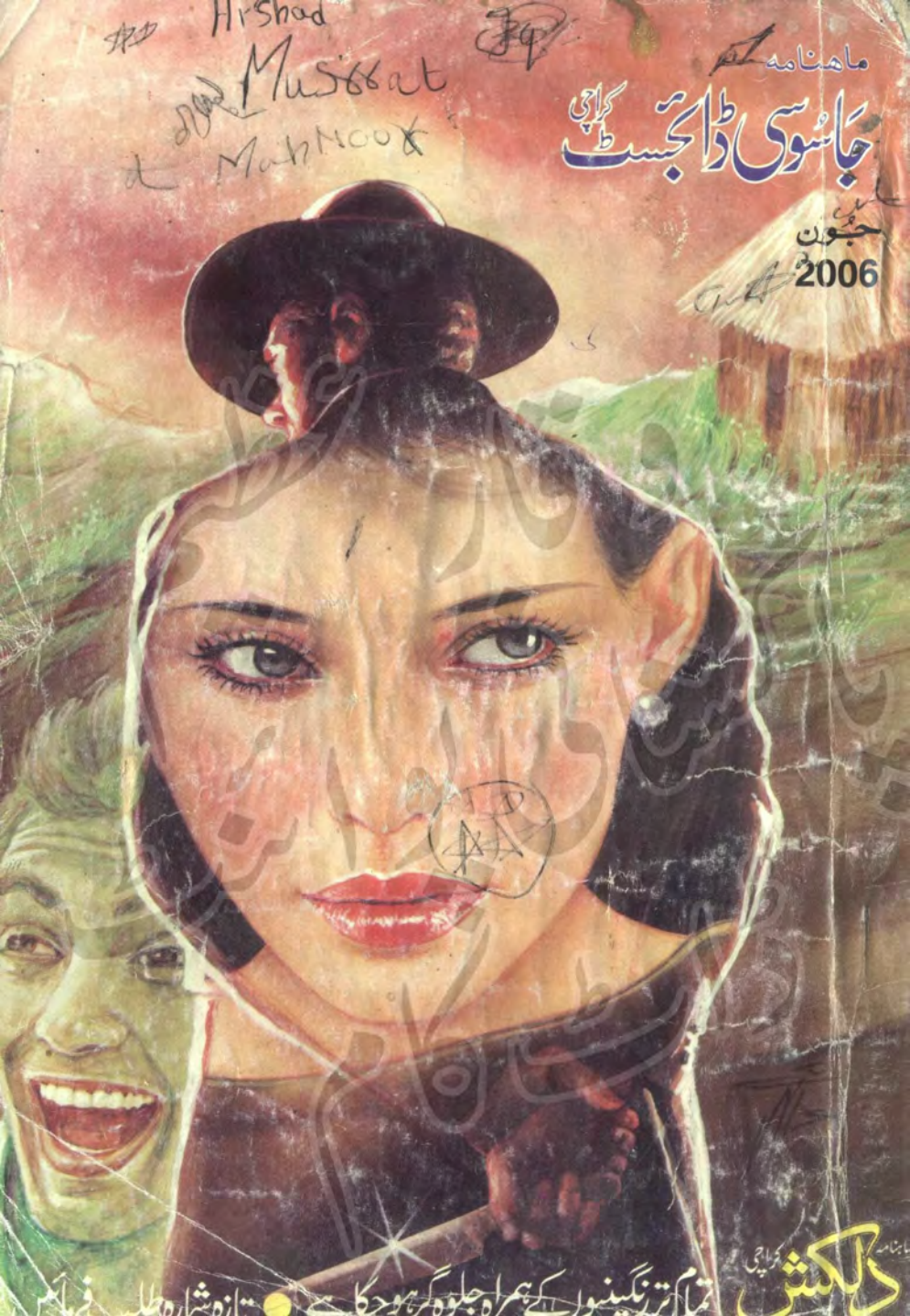

ماہنامہ دلکش کراچی

تمام تر رنگینیوں کے ہمراہ جلوہ گر ہو رہا ہے

تازہ شمارہ طلب فرمائیں

جاسوسی ڈائجسٹ

11 — چینی نکتہ چینی — مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتوں کے سلسلے، عنایتیں اور شکایتیں

18 — فیملی ڈراما — احمد اقبال
حرص و طمع کے سحر میں گرفتار خونی رشتوں کو کھو دینے والے مادیت پرستوں کا ماجرائے عبرت

77 — انٹرویو — سلیم انور
بلائے ناگہانی میں گرفتار شخص کا احوال جس کی مشکلات میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا

87 — آسان کام — رضوانہ منظر
ٹماٹر کے بیجوں کے اگنے سے شروع ہونے والی ایک پُرمزاح تحریر

93 — عجیب بلیک میلر — یعقوب جمیل
بقائے حیات کے لئے ایک انوکھا طریقہ اختیار کرنے والے شخص کی نہایت بندی اب انجام

98 — دیوی — طاہر جاوید مغل
ظلم و ستم اور جبر کی چکی میں کندن ہو جانے والی ایک معصوم دوشیزہ کا ماجرائے روح شکن

141 — سزائے موت — مدیحہ شاہ
ایک سراغرساں کی کوششوں کا احوال جو بہر صورت اپنی کامیابی چاہتا تھا

147 — اذیت — شگفتہ پروین
اچھائی اور برائی کے درمیان تفاوت کرنے والوں کا ماجرائے تحیر

154 — مستقبل شناس — ایچ اقبال
اسرارِ حقیقت کے تانے بانے میں الجھی ہوئی داستانِ ستارہ شناس راؤ پرویز کی گمشدگی

201 — بڑا اداکار — محمد ابراہیم جمالی
ایک ایسے فنکار کی عکاسی کرتی تحریر جس نے اپنے آپ کو ایک بڑا اداکار ثابت کر دیا تھا

211 — پائی کی چوری — مرزا ظفر بیگ
ایک پائی کی چوری کا قصہ دسترس میں ہونے کے باوجود اس کا حصول ناممکن تھا

223 — فرق — ثمر عباس
کچھ ایسے کرداروں پر مشتمل کہانی جن کی زندگی میں تاریکیوں کا راج تھا

228 — آتش رفتہ — غلام قادر
ان لمحوں کی روداد جو زندگی میں فیصلے کے کسی سنگِ میل کے دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں

252 — حفظِ ماتقدم — کاشف زبیر
کاشف زبیر کے مخصوص انداز میں لکھی گئی ایک تیز رفتار شوخ و شنگ شگفتہ تحریر

288 — سودا — شکیل صدیقی
شطرنج کی بساط پر پھیلی جانے والی بازی جیت دونوں فریقین کی بقا کا مسئلہ بن گئی تھی

317 — اسماء الحسنیٰ — ایس ایم قادری
دین اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل، سائلین کے سوال اور ایس ایم قادری کے جواب

MEMBER APNS CPNE

مدیرِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیر: نبی خیال
مصور: شاہد حسین

جلد 36 • شمارہ 06 • جون 2006 • زرِ سالانہ 450 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 35 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 5386783 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jasoosi@attglobal.net

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔ تار کا پتا "جاسوسی" کراچی

چینی نکتہ چینی

مدیرِ اعلیٰ

عزیزانِ من..... السلام علیکم!

قارئین، جون کا آگ برساتا مہینہ بجٹ کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آن پہنچا ہے۔ جس وقت آپ ان سطور کا مطالعہ کر رہے ہوں گے، اس دوران میں ہوشربا مہنگائی پر اپنا جی جلا رہے ہوں گے..... ہوسکتا ہے کہ اس وقت آپ کے گھر میں بجلی بھی لوڈ شیڈنگ کا نقاب اوڑھ کر غائب ہوچکی ہو۔ امسال بھی گرمیوں کے آغاز کے ساتھ ہی بڑھتی ہوئی آبی آلودگی سے لاحق ہونے والے گیسٹرو نامی وبائی مرض نے کئی لوگوں کو اسپتال پہنچا دیا ہے۔ ہر سال گرمیوں میں جب سر سے پاؤں تک پسینہ بہنا شروع ہوتا ہے تو ہم سب انہی مسائل سے الجھنے لگتے ہیں۔ ماہرینِ صحت کہتے ہیں کہ گرمیوں میں آلودہ پانی وبائی امراض کو پھیلانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ہر سال یہی ہوتا ہے لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ ہر سال گرمیوں میں یہ صورتِ حال زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

3 جون 1947ء کو جب پہلی بار تقسیم کا پلان سامنے آیا تو ہمارے قائد اور عوام کے ذہنوں میں ایک علیحدہ وطن کے قیام کا مطلب و مقصد ایک فلاحی ریاست کا قیام تھا۔ یہ بھی جون کا مہینہ ہے لیکن ''فلاحی ریاست'' کی اصطلاح ہمارے ذہنوں میں ہنوز ایک سوالیہ نشان کی طرح موجود ہے۔ حکومت نے شہریوں کو صاف پانی کی فراہمی کا وعدہ تو کیا ہے..... اگر اس وعدے پر برق رفتاری سے عمل کرلیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سارے لوگ موت کے منہ میں جانے سے بچ جائیں۔ صحیح وقت پر درست فیصلہ ہی ہماری فلاح و ترقی کی ضمانت ہے۔

☆☆☆

اس ماہ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی راولپنڈی سے پہلے انعام کے حقدار قرار پائے' لکھتے ہیں۔ ''مئی کا جاسوسی ملا۔ انتہائی جاذبِ نظر سرورق تھا اس میں سبز پگڑی پورے ٹائٹل پر چھائی تھی۔ سگریٹ سلگائے یہ نوجوان یقیناً اس جاذبِ نظر اور خوبصورت حسینہ کو اس ظالم کوڑے مارنے والے دہشت گرد سے نجات دلا دے گا۔ چینی نکتہ چینی میں یقیناً چینی کی گرانی یاد آئی مگر آپ نے مزدور کے لہو کے لیے ادب میں جاندار شاعری کا فقدان کا ذکر کر کے غور و فکر کے کئی در وا کر دیے۔ گلدستے میں تین کہانیاں زائد شامل ہوئیں۔ وقار شیخ کا انعامی تبصرہ اچھا تھا۔ باقی تبصروں میں اس دفعہ شہناز ریاست نمبر لے گئی ہیں۔ ایچ اقبال کی اسرار و رموز، تجسس و تحیر سے بھرپور اور علم الاعداد کی بھول بھلیوں میں گم مستقبل شناس نے قارئین کو پہلی قسط سے لے کر دوسری قسط تک مکمل طور پر اپنی گرفت میں رکھا ہے۔ نجیب کی موت کی پیش گوئی سے لے کر احمر اور فرخندہ کے اغوا تک ہر موڑ بے حد سسپنس فل ہے۔ ایک تجویز ہے کہ ایسی لمبی کہانیوں کو اختتام پر ایک ناولٹ کے طور پر شائع کر دیا کریں۔ یہ ناولٹ..... ریکارڈ رہیں گے۔ (کتابی شکل میں یہ کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔) خاص تحفہ گھر کا نہ گھاٹ کا میں کاشف زبیر نے ہنستے مسکراتے فقروں سے ایک نہایت ہی سنجیدہ مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ حسبِ معمول کاشف زبیر کی یہ تحریر بھی بلاشبہ بہترین کاوش ہے۔ واقعی معاشرتی منافقت کی جڑیں ہمارے معاشرے میں دور تک جا چکی ہیں۔ ابراہیم جمالی کی معمولی جرم بس کوارا تھی۔ مغرب کی بے باکیاں اور کھلم کھلا معاشرہ بچوں کو ایسے ہی انجام سے دوچار کریں گی۔ مرزا ظفر کی قیدی مزہ دے گئی۔ ایک نفسیاتی جنون کی کہانی واقعی عشق سدا سے حسن کا قیدی ہی بن کر رہنے میں تسکین پاتا ہے۔ جان کی پروا کیے بغیر۔ دیوی نے تو بھئی پہلی قسط سے ہی ہمیں اپنا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ سب سے پہلے زیرِ مطالعہ یہی آئی ہے۔ ہر قسط بھرپور اور جاندار ہوتی ہے اور اگلے ماہ کا انتظار اور شدت سے شروع ہو جاتا ہے۔ طاہر جاوید مغل مبارکباد کے مستحق ہیں۔ رد مال میں جان نے جب یہ جانا کہ وہ اس کھیل کا آخری راؤنڈ کھیل رہا ہے اصل میں تو یہ اس کھیل کی شروعات ہونے جا رہی تھی۔ سید احتشام کی اچھی کوشش تھی۔ اس دفعہ دوسرے نمبر پر مریم کے خان کی کہانی خاندانی حریف رہی واقعی انسان جب انسانیت کی تمام حدیں پار کرلے اور شیطانیت کو اپنے اعمال سے شرمانا شروع کر دے تو پھر انجام پروفیسر انتونیو سے مختلف ہرگز نہیں ہوا کرتا۔ مریم نے بڑی خوبصورت کہانی جاسوسی کو دی ہے۔ ہاں ڈاکٹر کیمر مزے میں رہا۔ بڑے عرصے کے بعد چونکا دینے والے انجام کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ آمنہ حسین نے بٹ میں کنجوس لوگوں کی ذرا سی غلطی کے لیے زیادہ ہی سخت سزا تجویز نہیں کر دی؟ خوبصورت کہانی جو مومن نے سلجھائی' مزہ آیا پڑھ کر' دوسری طرف میں بڈ کی غلط فہمی ہی تھی۔ انسان کبھی کبھی اس لیے بھی مار کھا جاتا ہے جب کہ مقابلہ بلیک میلنگ کے ایسے گینگ سے ہو۔ ہمیشہ کی طرح محمود احمد مودی کی قابلِ تعریف کاوش تھی۔ کاش بڈ جس کے جبر میں جان تک دے بیٹھا آخری چند الفاظ دنیا کے سن سکتا!!! سیر بنا راض اس دفعہ تصویر کے روپ میں خالصتاً جاسوسی کہانی لے کر آئی ہیں۔ اس پس منظر میں یہ ایک بہترین کاوش ہے۔ دو دوستوں کی کتھا ہے غرض اتنا اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی ایس ایم شجاع رضوی کی ممیزہ تجسس اور پُراسراریت سے مزین کہانی قاری کو آخر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں پہلے نمبر پر آلہ قتل رہی۔ ثمر عباس کی ایک خوبصورت کہانی اور ذہانت سے بھرپور پلاٹ انجانے میں سرزد ہونے والا جرم پھلتی ہوئی برف کی طرح ہر ثبوت کو مانع ثبوت میں تبدیل کرتی جا رہی تھی۔ لیجئے یہ ہیں سرورق کے رنگ جاسوسی کے جو مان ہیں اور قارئین کے لیے تحفۂ خاص' یہ تین رنگ بلاشبہ قوسِ قزح کے رنگ ہیں۔ سب سے پہلے پہلا رنگ بے آشیاں رضوانہ منظر کا رنگ۔ واقعی ماں باپ کے جانے کے بعد کوئی ان کا درجہ نہیں لے

سکتا صرف اللہ ہی ہوتا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لمحہ بہ لمحہ دکھ درد بکھیرتے ہوئے شگفتہ باجوہ کی کہانی دل کے اندر اترتی چلی گئی ہے۔ آئینہ مادر بھی نشور ہادی کی ماں باپ کے پیار و محبت، بچوں کی نفسیات اور ارد گرد کے ماحول کا اثر قبول کرنے والی ایک خوبصورت اور بے حد معاشرتی الجھن کو سلجھن بنا کر خاموش پانیوں کی طرح تہ میں تلاطم سمیٹے ہوئے یہ بہترین تحریر ہے۔ واقعی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ بدکردار اور مطلب پرست ہی انسان ہوں وقتی طور پر پھسل جانے والوں کے ساتھ اللہ نے اچھے لوگ ودیعت کیے ہوتے ہیں۔ روشنک کا صبر بالآخر فریدوں جوہر کو راہ راست پر لے آیا اور مہرو ز کا سونیا سے خوبصورت وعدہ نبھانا بڑا اثر انگیز اختتام رہا۔ آخری رنگ ہر لحاظ سے سب پر بھاری رہا۔ چالیس چوروں کا جو انجام بالآخر منظر امام نے دکھایا دل خوش ہو گیا۔ لمحہ لمحہ تجسس اور سسپنس سے بھرپور یہ کہانی منافقت کے مروج کو بیچ کر سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی جیت پھر سچائی ہی کی ہوئی۔ آخر میں ایک فرمائش کہ مدت سے اثر ثعمانی کو نہیں پڑھا کیا وجہ ہے؟ پلیز ایک درخواست ہے کہ ان کی کہانی کے آخر میں انگلش کے ناول کا انگریزی میں نام ضرور دے دیا کریں۔ تو یہ فرمائش کب پوری ہو رہی ہے؟ (یقیناً جلد ہی)

سرمد مشتاق کوٹلی آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں "ناٹل اس بار انتہائی خوبصورت اور جاندار تھا۔ ہماری صنف کے دو بندوں نے اس بار ناٹل کا میدان مار لیا جس کی وجہ سے ناٹل گرل ناراض ہو کر دوسری طرف منہ پھیر کے بیٹھی تھی۔ ہمیں بھی اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اسی لیے اسے ناراض چھوڑ کر ہم دسترخوان یعنی فہرست پر آ گئے۔ قسم قسم کی لذیذ ڈشیں اور پکوان دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا لیکن ہم نے صبر کا دامن ذرا کس کے پکڑا اور اپنی خاص الخاص محفل چینی یعنی تکہ چینی میں قدم رنجہ فرمایا جو کہ ہمیں بہت زیادہ رنگین نظر آئی چلیے آپ کو بھی اس رنگینی کی وجہ بتا دیتے ہیں۔ ارے بھئی ایک بار پھر جیت ہماری ہوئی مسندِ خلافت پر وقار احمد شیخ آف کوٹ غلام محمد معزز انداز میں بیٹھے اپنی دل نشین گفتگو سے دل موہ رہے تھے اور محفل کی بھیگی بلیاں مزید بھیگی بن کر محفل کے کونوں کھدروں میں بیٹھی نظر آئیں۔ وقار احمد شیخ کو بہت شاندار تبصرے پر مبارکباد قبول ہو۔ ثمینہ حیات صاحبہ ایک بات تو بتائیں کیا آپ کے ہاں انعام بے عقل کو دیا جاتا ہے حالانکہ اصول تو یہ ہے کہ جو زیادہ عقلمندی سے کھیلتا ہے وہی انعام کا حقدار بھی ہوتا ہے ویسے بلبل کریم صاحب نے کیا سچ فرمایا ہے کہ خواتین کو ہر چیز میں کیڑے نکالنے کی عادت ہوتی ہے۔ نور الہدیٰ صاحبہ کا خط پڑھ کر جو خبر معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ہمارا واسطہ چوروں سے پڑا ہے اس لیے ان سے بچنے کی ضرورت ہے جو اپنی دوست کے گھر سے ڈائجسٹ پار کر سکتی ہیں وہ پتا نہیں کیا کیا پار کرتی ہوں گی بہر حال اللہ مالک ہے۔ اسماشیریں آپ کی خوش فہمی جلد ہی تبدیل ہو کر غلط فہمی سے بدل جائے گی، ہمارا واسطہ آپ جیسی بلیوں سے پڑتا رہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی کچھ عرصے میں میدان چھوڑ کر اپنی ہار مان لیں گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف اس بار آتش فشاں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی جو ہوتی رہے گی۔ آپ سے ایک گزارش کرنی تھی کہ جلدی سے ایکشن سے بھرپور کہانی شروع کی جائے۔ سب سے پہلے ہم نے دیوی کا رخ کیا انکل طاہر کی صحیح تعریف کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ ان کے تیز الفاظ کا نشتر خوب چلتا ہے دیوی جاسوسی سے زیادہ تاثراتی کہانی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم دیر تک اس کے سحر کے زیر اثر رہتے ہیں۔ دیوی کے بعد مستقبل شاس کا نمبر آیا۔ اس پر ہم کیا تبصرہ کر سکتے ہیں اس لیے چپ ہی بھلے۔ اگر بات ہو رنگوں کی تو بے آشیاں رضوانہ منظر کا ایک پھیکا سا رنگ تھا جو بس ایویں سا لگا۔ آئینۂ مادر ہمارے خیال میں تھوڑا بہتر تھا۔ جس میں تھوڑے صفحات میں نشور ہادی نے بہت سے مسائل کو فوکس کیا تھا جو واقعی ہمارے معاشرے کا درد آئے ہیں لیکن کہانی پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ مرکزی خیال وہی تھا کہ کہانی ذہن کے دریچوں میں تازہ ہو گئی جو ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے سرپٹ ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ رنگ ٹھیک تھا۔ علی بابا چالیس چور کا نام پڑھ کر وہی کہانی ذہن کے دریچوں میں تازہ ہو گئی جو ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے لگا۔ آئینۂ مادر ہمارے خیال میں تھوڑا بہتر تھا۔ جس میں تھوڑے صفحات میں نشور ہادی نے بہت سے مسائل کو فوکس کیا تھا جو واقعی ہمارے معاشرے کا درد رہا تھا جس امتِ مسلمہ کے ایک اہم مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مکالموں کی برجستگی اور خوبصورت الفاظ نے کہانی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ بہر حال تیسرا رنگ پہلے دوسرا دوسرے پر ہی اور پہلا رنگ تیسرے نمبر پر لگا یہ صرف ہماری رائے ہے باقی جیسے آپ کی مرضی۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے پیٹ میں بل ڈالنے کے لیے "گھر کا نہ گھاٹ کا" کا مطالعہ کیا جس میں جلیل اور راجا کی خرمستیوں پر ہنسی آئی۔ اس کے بعد ابراہیم جمالی صاحب کی معمولی جرم پر حاضری دی۔ مغربی معاشرے میں ایسی برائیاں بہت عام ہیں۔ قیدی میں نوشابہ واقعی خطرناک کردار کی مالک تھی جو نہ جانے کتنے جوانوں کو پھانس کر کتنے قتل کروا چکی تھی۔ رومال میں جان ڈفلس بے گناہ بھی تھا لیکن اس کے ساتھ برا ہوا "دکھتی ہوئی رگ بار بار دکھتی ہے۔" والی ضرب المثل جان پر بالکل صادق آتی ہے۔ مریم کے خان کے قلم سے خاندانی حریف ایک اچھی اور بالکل منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی۔ ٹپ میں این کی کنجوسی نے اس کے شوہر جیری کو قتل کروا دیا بہر حال مون نے سمجھ داری اور معاملہ فہمی کے ساتھ قتل کی الجھی ہوئی گرہ کو سلجھا دیا۔ ہم نے بھی مون کی سمجھداری کو شاباش دی۔ دوسری طرف اور بے غرض کو ہم نے سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تو ہمارے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ خمیازہ ایک جاسوسی تحریر تھی جو کہ ذرا بہتر تھی۔"

عمران ملک میانوالی سے لکھتے ہیں "اس ماہ کا شمارہ حسبِ معمول دو تاریخ کو ملا۔ سرورق کی چڑیل نما حسینہ اور اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے چینی تکہ چینی کا رخ کیا۔ وقار احمد شیخ صاحب کو کرسی پر براجمان پایا۔ کرسیِ خاص مبارک ہو شیخ صاحب۔ اس کے علاوہ محفل میں نئے چہروں کے علاوہ پرانے چہرے نظر نہ آئے۔ بابا سمندر خان کا تبصرہ اچھا تھا خاصے زندہ دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ارے یہ کیا بی بی شیریں بھی یہاں پہنچ گئیں یعنی اسماشیریں، ذاکر انکل سے تھیں کرتی ہوئی نظر آئیں کہ انکل ہم بھی حسین کم نہیں کبھی آزمایئے اور ساتھ ہی ذرا داڑھی سہی نظر آئیں کہ صنفِ کرخت کو وارننگ دے رہی ہیں کہ پٹھان بہادر ہیں ہمیں زیادہ تنگ مت کیجئے گا تو بی بی شیریں۔ اسی دی تے پنجاب دے لاڑے آں کیسے ساڈے دی مشہور نے۔ اس کے بعد مستقبل شاس پڑھی ہاتھ کی لکیروں کے تانے بانے سمجھے۔ سائیڈ ہیرو راجو کا کردار پسند آیا' خیر کہانی اچھی ہے۔ امکان ہے آگے بھی اچھی ہی رہے گی۔ کاشف زبیر اچھے رائٹر ہیں۔ جلیل میاں کی کہانی میں پہلے جیسا مزاح نہیں جمی تو واقعی بچارہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ مرزا صاحب کی قیدی اچھی تحریر تھی۔ عموماً صنفِ نازک صنف کرخت کو ایسے ہی اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے جیسے نوشابہ نے ماسٹر جلیل اور بعد میں قادر خان کو۔ اس کے بعد دیوی پڑھی حسبِ معمول اچھی رہی اس بار بھی شانی مچھلی کی طرح رستم سیال کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہ گیا۔"

مظہر رؤف کی پریشانیاں فیصل آباد سے "دو ماہ کی مسلسل غیر حاضری کے بعد دوبارہ کاغذ قلم سنبھالا تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس دوران ہمارے گھریلو حالات نے یکایک ایسا پلٹا کھایا کہ دو ماہ مسلسل پریشانیوں کی نذر ہو گئے۔ پہلے تو کمر اور ٹانگوں کے جان لیوا درد نے ایک اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا رفتہ رفتہ بیماری اس قدر بڑھ گئی کہ چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا ابھی ایک مشکل سے چھٹکارا ملا نہیں تھا کہ 27 مارچ کو میرے والد صاحب جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور ابھی اس دکھ سے نکلے بھی نہیں تھے کہ 13 اپریل کو بڑے بھائی اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ابھی تک سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا میرے بستے بستے گھر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ اب تو چاروں طرف دکھ ہی دکھ دکھائی دیتے ہیں۔ تمام قارئین سے میں اپنی صحت یابی کے لیے دعاؤں کی اپیل کرتا ہوں اور ادارہ و قارئین سے گزارش ہی کہ میرے والد صاحب اور بھائی جان کے لیے بھی دعائے مغفرت فرمادیں اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ (ہم آپ کے لیے دعا کو ہیں کہ اللہ آپ کے والد اور بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کے دکھوں میں جلد از جلد کمی کر دے آمین)

وقار احمد شیخ کی کوٹ غلام محمد سے شمولیت۔ "مئی کا شمارہ ہاتھ میں آیا اور نگاہ سرورق پر جم کر رہ گئی۔ نازک نقوش والی ایک خوبصورت دوشیزہ ہمارے پسندیدہ فیروزی رنگ کے لبادے میں ملبوس رخِ زیبا کو تر چھائے رخ پھیرے کھڑی تھی، ابھی قاریٔ عالم کو اس کے حسنِ جہاں سوز کی داد بھی نہ دے پائے تھے کہ نگاہ ذرا سا لڑکھڑائی اور سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ نچلے کارنر میں ایک دلن ٹائپ کرخت چہرے والا مرد ہاتھوں میں بیلٹ لئے ہمیں گھور رہا تھا جیسے چیلنج کر رہا ہو..... ہمت ہے تو اب دیکھو، اور اوپری کارنر پر ایک اوباش سا نوجوان سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دلن کی دھمکیوں کی پروا کیے بنا ترچھی نگاہوں سے دیدارِ حسن کر رہا ہے۔ مردوں کے اس روپ کی تصاویر پر ہمارے بھائی حضرات بہت جز بز ہو کر ذاکر انکل سے شکوہ کناں رہتے ہیں لیکن اس میں ان کا کیا قصور.....؟؟؟ آرٹسٹ حضرات نہایت حساس ہوتے ہیں اور معاشرے کے ہر پہلو کو گہری نگاہ سے پرکھتے ہیں اشتہارات پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے فہرست کو پذیرائی بخشی۔ کوئی رسالہ محض اپنی کہانیوں ہی کے باعث قارئین میں سندِ مقبولیت حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ فہرست کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے نہایت شرافت سے محفلِ یاراں میں قدم رکھا ہی تھا کہ بے اختیار صوفے سے اچھل پڑے اور ہماری حالت دیکھ کر کام میں مشغول باجی بوکھلا گئیں کہ کہیں وہ اپنی دستکاری کی سوئی صوفے پر تو نہیں بھول گئیں لیکن حقیقت جان کر ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بھئی آخر کو اس ماہ کا تاج ہمارے سر کی زینت بنا ہے اس لئے ہماری خوشی کا اندازہ آپ لگا ہی سکتے ہیں۔ انعام یافتہ قرار دینے پر آپ کا شکریہ اور ان تمام انکل آنٹیوں، بہن بھائیوں اور بھانجے بھتیجیوں کا بھی پیشگی شکریہ جنہیں ہمارا تبصرہ پسند آیا۔ تمام ساتھیوں کے خطوط اچھے تھے لیکن ریاض شاہد صاحب ہم آپ کی رائے سے بالکل متفق نہیں کہ معاشرے کو بگاڑنے میں عورت پیش پیش ہے، حقیقت تو یہی ہے کہ مرد بھی برابر کے قصوروار ہیں، یہ تو آپ کی تنگ نظری کہلائے گی اگر اپنی صنف کی خامیاں تسلیم نہ کریں۔ اسماشیریں آپ نے پٹھانوں کی تعریف بیان کی ہے، بھئی ماشاء اللہ! لیکن ایک خاصیت آپ بتانا بھول گئیں.....؟ وہی جس کی وجہ سے سکھ بھی بہت مشہور ہیں۔ مستقبل شناس کی دوسری قسط پسند آئی لیکن کہانی کا ٹمپو پہلی قسط کے مقابلے میں ذرا سست تھا۔ کاشف زبیر کی ہنستی مسکراتی تحریر گھر کا نہ گھاٹ کا نے موڈ کافی خوشگوار کر دیا۔ ابراہیم جمالی کی تحریر معمولی جرم ایک اچھوتا خیال ہے۔ مرزا ظفر بیگ کی قیدی ایک بہترین کہانی تھی، نوشابہ کا کردار نفسیات کے طلبا کے لئے یقیناً دلچسپی کا حامل ہوگا۔ سید احتشام رومال کے ساتھ موجود تھے۔ دو کم عمر لڑکوں نے جان کو کھلونا بنا کر رکھ لیا اور بے چارہ کچھ نہ کر سکا۔ مریم کے خان خاندانی حریف میں آدم خور پودوں کے ساتھ موجود تھیں، ذرا مختلف خیال تھا اس لئے پسند آیا۔ مودی صاحب کی دوسری طرف اور سیریا راض کی تصویر متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔ شگفتہ پروین کی بے غرض بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ سرورق کا پہلا رنگ رضوانہ منظر نے اجاگر کیا، ایک عامیانہ تحریر تھی۔ کہانی میں مختلف موضوعات اور الگ جہتیں سموکر کافی الجھا دیا گیا جس سے کہانی کا حسن متاثر ہوا۔ نشور ہادی کی آئینۂ مادر ایک بہترین کہانی تھی بہروز کے کردار نے متاثر کیا۔ شمارے میں موجود کارٹونوں نے منہ کا ذائقہ بدلنے میں مدد دی اور کارٹونوں پر کئے گئے ریمارکس نہایت پُرلطف تھے۔"

ملک ریاض آصف کا تبصرہ جسلانی خورد سے "مئی کا جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ ناٹل مناسب تھا تبصرے سے گزر کر رہا ہوں اس لیے کہ لوگوں کو میرا ناٹل پر تبصرہ پسند نہیں آتا۔ پیاری راج دلاری محفل میں وارد ہوا۔ سب سے پہلے خطوط کی فہرست ملاحظہ کی اپنا نام نہ دیکھ کر دکھ ہوا لیکن رسید میں نام دیکھا تو تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ اس دفعہ ٹاپ آف دی پوزیشن جناب وقار احمد شیخ صاحب کا تبصرہ انتہائی جاندار اور اچھا تھا اور واقعی انعام کے لائق تھا۔ وقار صاحب نے کسی بھی صنف کو نہ چھیڑ کر میانہ روی کی مثال قائم کی۔ میری طرف سے جناب وقار صاحب کو بھرپور مبارکباد قبول ہو۔ باقی تبصروں میں ثمینہ حیات کا امن پسند تبصرہ پسند آیا، محترمہ بڑی امن پسند ہیں یہ ہمیں ان کا تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہے۔ محترمہ کو امن کا نوبل انعام ملنا چاہیے۔ فیصل اقبال اور شہناز ریاست کے تبصرے بھی اچھے تھے بلال کریم اور بابا سمندر موج کافی دیر بعد آئے۔ محترمہ نور الہدیٰ صاحبہ نے صنفِ وجاہت کو خوب لتاڑا بہر حال تبصرہ اچھا تھا۔ محترمہ اگر تھوڑی سی کول مائنڈ ہوتیں تو بہت اچھا ہوتا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوی کو پڑھا۔ اس قسط میں شانی صاحبہ نے بالکل صاحباں والا رول پلے کیا ہے۔ جیسے صاحباں نے مرزا جٹ کے کمان کے تیر توڑ دیئے تھے صاحباں کے بھائیوں نے مرزا جٹ کو مار ڈالا اسی طرح چوہدریوں کی حمایت میں شانی نے رستم سیال کے پستول سے گولیاں نکال کر اس کو مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی حالانکہ اگر پستول میں گولیاں ہوتیں تو چوہدری رستم کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتے تھے۔ کہانی کے آخر میں شانی کو چوہدری بشیر کے تمام کرتوتوں کا پتا بھی لگ گیا ہے اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ دوسری کہانی مستقبل شناس پڑھی۔ مستقبل شناس کا مستقبل میں ہی پتا چلے گا کہ کہانی کس سمت جاتی ہے ابھی تک تو کہانی عام سی ڈگر پر چل رہی ہے۔ کاشف زبیر کا گھر کا نہ گھاٹ کا میں پہلی دفعہ جلیل نے بغیر کسی لالچ کے کام کیا لیکن جمی کی قسمت خراب تھی کہ اس سکندر بخش نامی خانسامے نے دو لاکھ کا چونا لگا دیا۔ محمد ابراہیم جمالی کا معمولی جرم دراصل معمولی جرم نہیں تھا بلکہ ایک بڑے جرم کو چھپانے کے لیے گھڑا گیا افسانہ تھا لیکن پولیس کی تفتیش نے معمولی جرم کے پیچھے بڑے جرم کا سراغ لگا لیا۔ مرزا ظفر بیگ کی قیدی میں نوشابہ نے اپنی اداؤں میں قادر خاں کو ایسے جکڑا کہ وہ جیب کترے کا قاتل بن گیا اور سرکار کے قیدی کے بجائے ایک عورت کا

قیدی بن کر رہ گیا۔ سید احتشام کے رومال میں جان کو ڈولفن اپنی بزدلی کی وجہ سے بھکاریوں کے جال میں پھنس گیا۔ مریم کے خان کا خاندانی حریف میں اپنی ہی آگ میں خود جل کر مرنا کے مترادف انڈینوا اپنی ہی لگائی ہوئی آدم خور جھاڑیوں میں الجھ کر موت کے منہ میں چلا گیا۔ آمنہ حسین کی ٹپ عورت کی پہلی فطری کنجوسی پر مبنی کہانی تھی۔ اس نے صرف پانچ ڈالر کی خاطر اپنے شوہر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ دوسری طرف محمود احمد مودی نے عورت کی دوسری فطری (عادت) بے وفائی کو موضوع بنایا۔ خاص کر شوبز کی دنیا میں بے وفائی کی برائی عام ہے۔ سریناراض کی تصویر عورت کی تیسری فطری کمزوری لالچ پر لکھی گئی تھی پہلے انجمار اپنے باس کو بلیک میل کرتی ہے اس کے بعد مزید لالچ میں اس نے کلائز کو قتل کر دیا۔"

فرید اللہ ہمدم کا مختصر تبصرہ نامعلوم مقام سے۔ "اس دفعہ مٹی کا شمارہ 4 تاریخ سخت گرمی میں ہمارے ہاتھ لگا بڑے خوبصورت سرورق کے ساتھ خوبصورت حسینہ کرخت آدمی کے ہاتھ میں پکڑے خطرناک "بیلٹ" کو دیکھ رہی تھی پیچھے ایک آدمی سر پر سبز پٹی باندھے حسینہ کی حفاظت کے لیے تیار نظر آ رہا تھا لیکن حسینہ اسے رد کر رہی تھی کیونکہ وہ سگریٹ نوشی کرتا ہے اور یہ چیز حسینہ کو پسند نہیں تھی۔ کہانیوں میں دیوی سب سے پہلے پڑھ لی۔ زبردست جا رہی ہے۔ خاص کر شانی کا کردار بیدل کو بھانے والا ہے۔ مستقبل شناس پڑھی ناپ پر جا رہی ہے۔ احمر پرویز کے لیے معمائی ہوئی ہے اور خود میرے لیے بھی ادھر ایک دوسری بات یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ جب بھی پرویز کے لیے کوئی مصیبت کی گھڑی ہوتی ہے عندلیب عین اسی وقت کسی خاص مشن پر یا تو گئی ہوتی ہے یا پھر جانے والی ہوتی ہے یا آنے کا کہہ کر بعد میں پہنچ جاتی ہے۔ عین معمے کے وقت پرویز اس کا انتظار ہی کرتا رہتا ہے۔ یہ کیا چکر ہے۔"

محمد طیب حیاتی تونسہ شریف سے لکھتے ہیں۔ "اس بار جاسوسی پانچ تاریخ کو ملا ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی نظریں وہاں جم گئیں۔ حسینہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی آمیزش دیکھ کر ہمارے آنسو نکلنا بھی فطری بات تھی۔ حسینہ کے سامنے کھڑے دہشت گرد سے ہم خود بھی ڈر گئے جو کہ ہاتھوں میں پٹا اٹھائے شاید حسینہ سے کچھ کہہ رہا ہے اوپر موصوف بھی ماتھے پر پٹی باندھے سگریٹ سلگائے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ویسے ایسی حسینہ کو اس کے حال پر چھوڑنا ٹھیک نہیں ہوگا..... لیجیے چینی نکتہ چینی میں پہنچے اس بار ہم نے لشکر کی کمان وقار احمد شیخ کے ہاتھوں میں دیکھی پھر وقار احمد شیخ صاحب ہماری طرف سے مبارک باد۔ بچا جان آپ نے ڈاکٹر سجاد حیدر بھٹی کے تبصرے کو تنقید کا نشانہ کیوں بنایا؟ اس کے بعد ہم فہرست پر پہنچ گئے۔ اپنی پسندیدہ کہانی آتش فشاں نہ پڑھ کر اور نہ دیکھ کر دل کو بڑا دھچکا لگا..... اس بار مستقبل شناس میں زنگولا اور راجو کی دوستی کسی حد تک اچھی لگی لیکن یہ خبر پرویز اور عندلیب کے لیے سخت صدمے والی ہے۔ اس کے بعد دیوی پڑھی۔ دیوی پڑھتے ہی ہمیں بھی بھابو کے جانے اور رستم کے زخمی ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ اب تو شانی اور بھی مشکل میں ہے لیکن مشکل خدا ہی تو دیتا ہے اور پھر آسانی ہو ہی جاتی ہے۔"

مہر احمد اقبال کی رائے خلع سرگودھا سے۔ "جاسوسی نے حسب معمول 3 تاریخ کو دیدار کرایا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی ایسا لگا جیسے مفت میں سوئٹزر لینڈ کی سیر کر لی ہو۔ اوپر ایک لفظ "رام جانے" بنتے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور ایک حسین دوشیزہ کھوئی کھوئی سی ایسے دیکھ رہی تھی جیسے مرغا روٹ دیکھ کر کھانے کو جی چاہے مگر جیب میں پیسے نہ ہوں۔ نیچے ایک بیلٹ بردار شخص بے رحم تاثرات کے ساتھ ناپاکیکر کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس کے بعد آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے دیوی پڑھی جس میں کہانی نے ٹرن لیا بیچارہ رستم دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا جو شانی کی کارستانی تھی شانی کو اتنی اکڑ دکھانی ہے تو چوہدری بشیر کو دکھائے بیچارے رستم کے پستول سے گولیاں نکال کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اس کے بعد مستقبل شناس پڑھی جو ناقابل فراموش تحریر ہے پچھلے مہینے ہم احمر کے دیوانے تھے تو اب فرشتہ کے ہیں۔ زنگولا کی کہانی بھی عجیب تھی اس کے بعد چھوٹی تحریریں پڑھی جو 2006ء کی اب تک کی بہترین چھوٹی تحریریں تھیں۔ گھر کا نہ گھاٹ کا ایک مسکراتی تحریر تھی لیکن آخر میں تھوڑی ڈل ہوئی۔ معمولی جرم خوبصورت تحریر تھی۔ قیدی ایک زبردست تحفہ تھی۔ رومال بھی پیاری تحریر تھی۔ خاندانی حریف چھوٹی تحریروں میں ناپ پر تھی۔ ٹپ کنجوس بیوی کی غلطی پر مشتمل اچھوتی تحریر تھی۔ دوسری طرف میں بڈ کے ساتھ قسمت نے برا کھیل کھیلا۔ تصویر بھی دل لبھاتی تحریر تھی۔ بے غرض ایک اچھی تحریر تھی جس میں بٹ کے اندر جینے کی ایک نئی امنگ پیدا ہوئی۔ خمیازہ بھی ٹھیک تھی۔ آلہ قتل شرعباس کے مخصوص اسٹائل میں ایک سسپنس کہانی تھی۔ اب آتے ہیں رنگوں کی طرف پہلا رنگ بے آشیاں عورت کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو بے نقاب کر رہا تھا۔ دوسرا رنگ۔ نشور ہادی کا آئینہ مادر وقت ماضی اور مجبوریوں میں رنگا ایک خاص تحفہ تھا۔ منظر امام کی تحریر چالیس چوران کے خصوصی انداز میں تحریر کردہ ایک اچھی کاوش تھی جو سیاست دانوں اور سیاست دنوں کا احاطہ کیے ہوئی تھی۔"

عدیل چوہدری فرام 38/D.N.B لکھتے ہیں۔ "جاسوسی 4 تاریخ کو ملا سرورق پر ذاکر انکل نے نارزن کو چرس کے سوٹے لگاتے ہوئے دکھایا نیچے شاید بابر علی اپنی ہی پینٹ کی بیلٹ ہاتھ میں پکڑ کر شاید کسی فلم ساز کو ڈرا رہے ہیں اور سرورق کی حسینہ خیالوں میں گم اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی ہے کہ وہ گھوڑے پر آئے اور اسے دلہن بنا کر لے جائے مگر مجھے گھوڑا ملا نہیں اور وہ بے چاری انتظار ہی کرتی رہی۔ اشتہارات کو دیکھتے ہوئے اپنی محفل باؤ ہو میں قدم رنجہ فرمایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بونگے سے ..... صاحب کرسی صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ ہم نے پوچھا بھئی آپ یہاں کیسے تو وہ بولے معراج صاحب کی مہربانی ہے ہم نے کہا چلو کوئی بات نہیں اور وقار صاحب کو میری طرف سے مبارکباد قبول ہو۔ بلبل صاحب کافی عرصے کے بعد پروازی طبیعت تو ٹھیک تھی نا۔ نور صاحب بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں آپ دیے تبصرہ اچھا تھا۔ آنٹی شہناز بھی خوب چہک رہی تھیں۔ خیال سے یہ جنگل نہیں ہے۔ فیصل صاحب آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کالج پڑھنے جاتے ہیں یا پڑھانے وضاحت کے ساتھ بات لکھنی چاہیے۔ ثمینہ بی بی بڑھاپے میں انسان دوبارہ بچوں کی طرح حرکتیں کرنے لگتا ہے کوئی بات نہیں۔ سب سے جیسلے دیوی پڑھی بھئی کیا بات ہے انکل طاہر کی کیا ٹھہراؤ' کیا انداز' کیا تیزی' کتنی شوخی' ویل ڈن انکل، شانی بی بی اب تو کچھ رحم کھاؤ بے چارے رستم پر۔ مستقبل شناس میں راؤ صاحب کے حالات زندگی اچھے لگے مگر میرا ایک مشورہ ہے کہ اس کہانی کو قسط وار مت بنائیے گا یہ آپ بھی بہتر ہی جانتے ہوں گے کہ کیوں۔ چالیس چور علی بابا یہ کردار ہماری ہر بگلی اور ہر کوچے میں مل جائیں گے۔ اچھی تحریر تھی۔ اینڈ اچھا لگا نشور ہادی کی تحریر کردہ کہانی بھی کافی دلکش تھی مگر موضوع پرانا تھا۔ بے آشیاں ایک زبردست تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا جلیل صاحب کا ایک اور کارنامہ پڑھا

ہنس ہنس کر پیٹ میں درد ہونے لگا جی کے ساتھ بہت زیادتی ہوگئی جی کو اللہ صبر عطا کرے آلو ٹفل اس دفعہ چھوٹی کہانیوں میں پہلے نمبر پر آئی کہ آلو ٹفل پچھل بھی سکتا ہے نہ ہی آلو ٹفل ملا اور نہ ہی قاتل۔ ٹپ میں چیری کو اس کی کنجوس فطرت بیوی نے مردا دیا سچ کہتے ہیں میاں روی اختیار کرو۔ رومال ایک اچھی اور منفرد تحریر تھی جان کا رومال اسی کے گلے کا پھندا ثابت ہوا۔"

فرید احمد خان کی حاضری سکھر سے۔ "مٹی کا شمارہ حسب معمول مٹی کو موصول ہوا۔ ٹائٹل گرل مغموم سی نظر آئی۔ اوپر ایک کنارے پر پوری قسم کا نوجوان سر پر رومال اور منہ میں سگریٹ لیے دکھائی دیا۔ اس کے نیچے دانت بھینچے ہاتھ میں چمڑے کا بیلٹ لیے بڑے بالوں والا نوجوان نظر آ رہا ہے۔ سرورق برا تاثر ہے ٹھیک ہی لگا۔ چینی نکتہ چینی میں آئے، سب سے پہلے بلیک لسٹ کو چیک کیا وہاں ہم نہیں تھے تو چھوڑ عارس بندھی کہ شاید ہم محفل میں ہوں گے، دھڑکتے دل کے ساتھ محفل میں پہنچے وقار احمد شیخ صاحب جی ماشاء اللہ، کرسی صدارت کیسی سج رہی ہے آپ کو۔ صدق دل سے مبارکاں۔ محترمہ ثمینہ حیات، یہ آپ نے کن وغیرہ وغیرہ کو فراموش کر دیا بھئی، ذرا کھل کر سمجھایئے نا۔ ہم یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ آپ جیسی چڑیلیں ہیں جن کی وجہ سے مرد بیچارہ جہنم میں جائے گا۔ فیصل اقبال صاحب، اتفاق میں برکت ہے اگر آپ کی گولا باری اسی طرح اپنی ہی صنف پر جاری رہی تو ہم گئے ہتھکڑیاں توڑنے۔ ارے ررررے ے ے۔ تائی شہناز ریاست آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کے سوا پوری دنیا بخوبی جانتی ہے کہ اپنی عمر مرد چھپاتا ہے یا عورت۔ نعمان ارشد صاحب آپ کو حسینہ کی آنکھوں میں بے وفائی کہاں سے نظر آ گئی؟ ذیشان اسلم صاحب دیوی کے بارے میں آپ کے خیال بھی میرے خیالوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بلبل کریم 'سعدیہ ہما کے بارے میں آپ کے خیال صد فیصد درست ہیں۔ نور الہدیٰ جی لگتا ہے آپ کے پاس پینتیس روپے بھی نہیں جو اپنا ڈائجسٹ خرید سکیں۔ بابا سمندر موج خان دیکم۔ محفل میں کسی بزرگ کا ہونا لازمی ہے ورنہ تو بے چاری تائی شہناز ریاست اکیلے ہی یہ فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب، بھئی واہ سب کے نام لے کر تبصروں کو پسند کر کے گویا ایک ہی اسٹروک میں سینچری مار دی۔ کیا بات ہے بھئی۔ عبدالستار زخمی صاحب، آپ کا نکیہ' نکیہ ہے یا کوئی جدید فیکس مشین کہ نیا شمارہ آپ کے تکیے سے برآمد ہوا۔ اساشیریں ہم تو پہلے سے ہی ہوشیار ہیں۔ آپ پہلی بلی نہیں ہیں جو دودھ پی جائے گی۔ اپنی جان دیوی کے درشن کیے۔ بھابو کی وفات کے بعد تو شانی اور بھی اکیلی ہوگئی۔ رستم جیل پہنچ گیا اور اطلاعات ہیں کہ ان کے ساتھی انہیں چھڑا کر بھاگ لے گئے ہیں۔ کاش ایسا ہی ہوا ہو۔ دکھوں کے باوجود شانی حویلی سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتی جس پر ہم کو غصہ آتا ہے۔ ہمیں تو شانی کا بڑھاپا بھی حویلی میں نظر آتا ہے۔ قسط حسب سابق تجسس پر ختم ہوئی کاشف زبیر کی گھر کا نہ گھاٹ کا میں راجا کی ایک غلط فہمی کی وجہ سے جمی کا سب کچھ چوپٹ ہوگیا اور لڑکی کو مبلنگ اڑا کر لے گیا۔ مرزا ظفر بیگ کی قیدی پر تاثر تحریر تھی۔ جمالی صاحب کی معمولی جرم' احتشام صاحب کی رومال' مریم کے خان کی خاندانی حریف آمنہ حسین کی ٹپ' محمود احمد مودی کی دوسری طرف' میرینا راض کی تصویر' نگفتہ پروین کی بے غرض' شجاع رضوی کی خمیازہ اور شرعباس کی آلہ قتل بہت اچھی رہیں۔ ایچ اقبال کی مستقبل شناس اس قسط نے کچھ مزہ دیا کچھ بور کیا۔ زنگولا قابل رحم شخصیت بن کر سامنے آیا۔ فرشتہ جب شوخ اور چنچل ادا اختیار کرنے کے ساتھ جب ہندی الفاظ احمر کو تپانے کے لیے استعمال کرتی ہے تو بڑی مست لگتی ہے۔ راجو کا کردار اپنی جگہ شاندار ہے۔ یہ بھی خوش آئندہ بات ہے کہ راجو اور عندلیب میں صلح ہوگئی۔ پرویز اور عندلیب ایک دوسرے کو موبائل کرتے نظر آئے۔ رنگوں کی دنیا میں دوسرا رنگ آئینہ مادر پر ہٹ رہی۔ روشنک نام ہی پیارا اور منفرد ہے۔ شادی کے بارے میں مہر وزکا نکتہ نظر غیرت، معاشرے اور مذہب کے خلاف تھا پر جو بھولا شام کو گھر لوٹ آئے اسے بھولا نہیں کہتے۔ دوسرے نمبر پر پہلا رنگ بے آشیاں تھا۔ نگفتہ نے دکھوں اور تکلیفوں کو برداشت کر کے اگر منزل مقصود حاصل کر لی۔ پیار سچا ہو تو دل کا رشتہ پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ تیسرا رنگ چالیس چور بھی ٹھیک ہی رہی۔ علی بابا کے تو مزے ہو گئے۔ بدنیتوں کا پردہ فاش ہوا۔ منظر امام نے اچھے اور برے کی تمیز سے روشناس کرایا۔"

غلام عباس ناچ ضلع گھوٹکی سندھ سے لکھتے ہیں۔ "تقریباً چھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد آپ کی محفل میں قدم رکھ رہا ہوں۔ وہاں ممبئی میں جو ہم نے چار ماہ گزارے وہ بڑے کٹھن تھے کیوں کہ ہم جاسوسی سے بہت دور تھے۔ پاکستان پہنچتے ہی ماہ مئی کا شمارہ خریدا۔ سب سے پہلے بدر اعلیٰ کا تبصرہ پڑھا بے ہماری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ ارے یہ کیا! صنف مخالف کی جانب سے غمزوں، غوں غاں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہائے میرے خدا آپ لوگوں نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔ ویسے غصہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہاں ہر کام میرٹ پر ہوتا ہے۔ شہناز ریاست صاحبہ آپ اپنی ریاست کی حدود میں رہیں اس عمر میں اللہ اللہ کرنا ہی آپ کو اچھا لگتا ہے۔ ذیشان اسلم اور بلبل کریم کے تبصرے چمن کی خوشبو بنے ہوئے تھے۔ نور الہدیٰ صاحبہ! ویسے ایک بات تو بتائیں یہ آپ نے خالہ لاڈو اسپیکر کی روش کیوں اختیار کی ہوئی ہے۔ خوبصورت اور اسمارٹ نوجوانوں کو بوڑھے اور کاہل کہہ رہی ہیں۔ میرا آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ نور آ اپنے نظر والے چشمے کا نمبر تبدیل کروالیں ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ اوہو! مونا لیزا آپ کہاں ہیں جی؟ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی مستقبل شناس پڑھی یہ کہانی کچھ الجھے ہوئے انداز میں لکھی گئی ہے۔ دیکھتے ہیں پرویز صاحب اپنی پامسٹری سی اور کیا کیا کرتے ہیں۔ کاشف زبیر کی گھر کا نہ گھاٹ کا بوجھل لمحوں میں ہنسی بکھیرنے کے لیے کافی تھی جمی ایک ڈائن کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گیا۔ محمد ابراہیم جمالی کی معمولی جرم بھی اچھی تھی۔ مرزا ظفر بیگ کا قیدی بڑا ہی خطرناک نکلا۔ قادر خان بلاشبہ ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔ طاہر جاوید مغل کی دیوی ہمیں بہت پسند ہے۔ شانی روز بروز مشکلات میں گھری جا رہی ہے۔ سید احتشام کا رومال ہمارے پاس ہے۔ جان بیچارہ بھلا کر کے بری طرح پھنس گیا تھا۔ یہ ہے بھلائی کرنے کا نتیجہ! مریم کے خان کی خاندانی حریف ایک اچھی اسٹوری تھی۔ پروفیسر اینو ٹیو کو اپنے کیے کی سزا مل گئی تھی اب اس کی جگہ ایک اور آدم خور لے رہا تھا یعنی ڈاکٹر کیمر۔"

ثمینہ حیات کی شوخیاں فرام لالیاں۔ "اس مرتبہ جاسوسی قدرے تاخیر سے دستیاب ہوا مگر سرورق پر نظر ڈالتے ہی آدمی ناراضی غائب ہوگئی جیسے

بابا سمندر موج کے سر سے سینگ باقی آدھی ناراضی اپنا خط دیکھ کر غائب ہوگئی۔ وغیرہ وغیرہ کو بھلاتی ہوئے ''محفلِ جنگ'' میں پہنچے اس مرتبہ جناب شیخ صاحب نے میدان مارلیا مبارک ہو شیخ صاحب کو آپ کا چھوٹا سا تبصرہ ناکافی تھا۔ فیصل اقبال آپ ابھی تک کالج جاتے ہیں کچھ عمر کا لحاظ کریں آپ کے ساتھی تو کب کے ریٹائرڈ ہو کر مساجد آباد کررہے ہیں اور آپ ابھی تک کالج ہی جاتے ہیں۔ خیر جلدی سے بتائیں ریٹائرڈ کب ہورہے ہیں۔ نعمان ارشد عدی صاحب آپ آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں جو آپ کو آنکھوں میں بے حیائی نظر آئی۔ اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں ورنہ کسی دن گھر سے جوتے کھائیں گے۔ کاشف ندیم صاحب آپ کو محفل میں خوش آمدید بقول انکل جانی اب آپ بار بار آئیں گے (انشاء اللہ) ہم کبھی کسی سے لڑائی نہیں کرتے اس لیے اگر آپ ''امن پسند'' گروپ میں آنا چاہیں تو ہم حاضر ہیں ورنہ اس محفل میں کبھی لوگ لڑائیاں ہی لڑتے ہیں۔ باجی نورالہدیٰ آپ نے سب ''احمقوں'' کے کس بل نکال دیئے اب پورا مہینہ اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔ اس عظیم کارنامے پر دل چاہا آپ کو مٹھائی سے لاددوں مگر آپ کی صحت کے خیال سے باز رہنا پڑا مجھے یقین ہے اگر آپ اسی طرح ''تبصرے'' لکھتی رہیں تو سب ''بونگے'' اس محفل سے نو دو گیارہ، بارہ شاید کچھ تیرہ بھی ہوجائیں۔ عبدالستار زخمی صاحب پہلے زخم کیا بھول گئے ہیں پھر سے پٹنے کا پروگرام ہے اگر حسینوں کے حسن میں اسی طرح ''کھوتے'' (کھوتے؟) رہے تو آپ کا انجام بد قریب ہے۔ سوچا تھا شان احمد گھشکوری سے دو دو ہاتھ ہوں گے مگر وہ تو ''بلیک لسٹ'' ہیں اس کے بعد محفل سے نکل کر ہم مستقبل شناس میں پہنچے جہاں پروین جی ابھی تک الجھنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ پہلا رنگ بے آشیاں انتہائی بور، بے ربط اور ایویں سا تھا۔ جانے کیوں شاملِ اشاعت کیا گیا۔ دوسرا رنگ بھی جاسوسی کے معیار کا تو نہیں تھا تاہم گزارے لائق ضرور تھا۔ تیسرے رنگ میں جناب علی بابا چالیس چوروں کا خاتمہ کرتے نظر آئے مگر آپ دیکھئے گا یہ چالیس چور پھر جنم لے لیں گے اور وطنِ عزیز کا خون چوستے ہوئے زندہ رہیں گے۔ آخر میں اپنے ہردل عزیز قلمکار محترم کاشف زبیر کی بات کرتے ہیں۔ اس مرتبہ چلیل نے جن خانے کو یتیم خانے میں تبدیل کرنے کی مذموم حرکت کی اور جی جسے بخوبیں کو دو لاکھ روپے کا نیکا لگوادیا مگر حیرانی یہ ہوئی کہ سکندر بخش سے کچھ بھی وصول نہیں کیا۔ شاید اگلے ماہ یا اس سے اگلے ماہ اپنا حصہ وصول کرے گا کیونکہ چلیل ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی ہے۔''

ملک حسنین دانش چک 188 شمالی سے لکھتے ہیں۔ ''منی کا جاسوسی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ حسین دوشیزہ زلفیں بکھرائے اپنی نازک گردن کو خوبصورت سا بل دے کر بیلٹ بردار وحشی کو دیکھ رہی تھی۔ کارنر پر ایک وجیہہ مرد دانتوں میں مسکراہٹ دبائے رنگین رومال باندھے حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ محفلِ ترنگ میں پہنچے تو مدیر اعلیٰ کو یادِ رفتگاں سے الجھتے پایا انکل اس نفسا نفسی کے دور میں کون سوچتا ہے کسی کے لیے۔ اس ماہ کا سارا ملخص وقار احمد شیخ صاحب نے لوٹ لیا۔ مبارک ہو وقار صاحب تبصرہ یقیناً اچھا تھا۔ ثمینہ جی اندھے کو اندھا نہ کہیں تو کیا کہیں۔ ڈھنڈورا پیٹنے سے تو آپ اپنی رہی سہی بصارت بھی کھو دیں گی۔ شہناز ریاست دل کے پھولے پھوٹی نظر آئیں ارشد عدی صاحب آپ نے تو حسینہ کی آنکھوں میں بے حیائی بھی دیکھ لی بڑے چھپے رستم نکلے بھئی آپ۔ ملکہ بہار رہم گشکوری صاحب کی طرف سے معذرت چاہتے ہیں شاید انہیں نہیں معلوم کہ لیڈیز عمر کے معاملے میں تھی سنسنو ہوتی ہیں انجانے میں انہوں نے آپ کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا بابا سمندر خاں دلی چنگاریوں کو ہوا مت دیں ورنہ شعلہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ بلبل کریم صاحب کیا بات ہے آپ کی آپ نے تو نمک بطور مرہم استعمال کیا۔ فرید احمد خان آپ تو حسینہ کے دانتوں سے ہی کلین بولڈ ہونے لگے۔ بھئی ان میں سے کچھ خون آشام بھی ہوتی ہیں اسماجی بوائے کٹ ہیئر اور آنکھوں میں نیلے لینس کا رواج اتنا عام ہے کہ مشرقی حسن کافی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ دیوی جی اپنی تمام تر معصومیت اور نرم دلی کے باوجود عورت کی ازلی بے عقلی کا مظاہرہ کرہی گئیں بھلا محاذ پر جانے والے کسی سپاہی کو ہتھیار سے محروم کردینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ ویسے دیوی اپنی تمام تر سادگی کے باوجود مغل صاحب کے پوزیسیو سینسو اور رومینٹک قلم کا شاہکار ہے۔ مستقبل شناس اچھا اقبال کی ایک منفرد موضوع پر طبع آزمائی ہے رنگ باتیں کریں تو سنا تھا یہ لیکروں کی زبان بھی ہوتی ہے پہلی مرتبہ سنا بہرحال جاسوسی کے شایانِ شان اتنا ایک شاندار اضافہ اب کچھ بات ہوجائے ہمدردی بھی گلے کا پھندا ثابت ہوتی ہے ایک عبرت آموز تحریر آلۂ قتل مغربی ازدواجیات کا شاخسانہ عبرت جسے پڑھ کر محسوس ہوا کہ مغرب واقعی مغرب ہے جہاں لمحہ لمحہ شرم و حیا کے ساتھ انسانیت بھی غروب ہورہی ہے۔ معمولی جرم بھی اسی ڈگر کی کہانی تھی۔ نمیازہ ذہانت سے حل کیا گیا ایک معما۔ سرینا راض کی تصویر ایک گمنام آرٹسٹ کی کہانی جس نے شہرت کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ مودی صاحب کی دوسری طرف شوبز کے لوگوں کی مصروفیت کا شاخسانہ کہ انہیں اپنے جیون ساتھی بھی یاد نہیں رہتے۔ اب سرورق کے رنگوں کی طرف چلتے ہیں۔ منظر امام کی چالیس چور ایمان کو بیچ کر کھانے والے ضمیر فروشوں کی داستانِ عبرت علی بابا، اور زمر دکا کردار بہت منفرد تھا۔ آئینۂ مادر نشور ہادی کی اچھی کاوش تھی شوبز کی جگمگاہٹ لڑکیوں کو کس طرح اٹریکٹ کرتی ہے۔ بے آشیاں اکیلی لڑکیوں کو کس طرح معاشرتی ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی عکاس تحریر تھی۔''

حلیمہ لطیف کی باتیں نامعلوم جگہ سے۔ ''رسالہ ہاتھ لگا تو ہر باذوق و بدذوق بندے کی طرح پہلے سرورق دیکھا مئی کے مہینے میں بے چارے بے روزگار نوجوانوں کی جو حالت اور حلیہ ہوسکتا ہے ویسے ہی دو نوجوان دکھائی دیئے اور ایک عدد حسینہ محترمہ بھی نظر آئیں ویسے دیکھ لیں چاہے سردی ہو یا گرمی عورت ذات میک اپ اور نیل پش کرنے سے باز آ ہی نہیں سکتی۔ آگے صفحہ پلٹا تو ''چینی نمکہ چینی'' کی خوبصورت محفل بھی نظر آئی۔ انعام یافتہ تبصرہ اچھا تھا

فیملی ڈراما

احمد اقبال

کبھی کبھی زندگی میں وہ مقام بھی آتا ھے ..... جب نظروں میں کوئی نظارہ نہیں رھتا ..... آنکھوں میں کسی خواب کی تمنا نہیں رھتی ..... چہار سو بے یقینی کی کیفیت رھتی ھے۔ کچھ ایسے ھی کرداروں کے گرد گھومتی کہانی کے پیچ و خم ..... جو اپنے دگرگوں ماضی سے نکل کر حال کو نہایت شاندار بنانا چاھتے تھے ..... شارٹ کٹ کے ذریعے ترقی کی منازل عبور کرلینا چاھتے تھے ..... چاھے اس راہ میں کسی کا بھی آشیانہ بکھر جائے ..... انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔ ان کی نظریں صرف اور صرف اپنے ہدف پر تھیں۔

حرص و طمع کے سحر میں گرفتار خونی رشتوں کو کھو دینے والے مادیت پرستوں کا ماجرائے روح شکن

آفس میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے وجود میں کسی زخمی کبوتر کی روح تڑپ رہی تھی۔ وہ کرسی پر ایک منٹ میں دس بار پہلو بدل رہا تھا جیسے سیٹ میں کوئی پن ہے جو اسے پنکچر کررہی ہے۔ وہ پستہ قد، گول مٹول اور پچاس سال سے زائد عمر کا بے حد مظلوم صورت شخص تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا..... مگر وہ دیکھا ہوا بھی لگتا تھا کیونکہ اس میں اور آنجہانی الفریڈ ہچکاک میں جڑواں بھائیوں جیسی مشابہت تھی۔ اس کا بے بال اور تیل میں ڈوبا ہوا سر اوپر لگی ہوئی لائٹ کے منعکس ہونے سے کسی گلوب کی طرح روشن تھا۔

وہ اپنا تعارف کرا چکا تھا۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ کمپنی کا نام بی بی آئی سی (بہت بڑی انشورنس کمپنی) فرض کیا جاسکتا ہے۔ پریشانی اس کی صورت اور انداز و اطوار سے اتنی عیاں تھی کہ میں بھی پریشانی میں مبتلا ہورہا تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ میں نے فوری طور پر اس کی پریشانی کا سبب نہ پوچھا تو ناک سڑ کتے سڑ کتے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے گا۔

میں نے کہا ''امجد فاروقی صاحب، آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟''

اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں آگے جھک کر کہا۔ ''لو جی! آپ کو بھلا کون نہیں جانتا، خیر سے آپ صحافی ہو۔ وہ لکھ دیتے ہو جو سچ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو نگلنا مشکل ہوجاتا ہے..... اور وہ دشمن بن جاتے ہیں آپ کے۔''

اس سے پہلے کہ وہ میری حق گوئی کے نتیجے میں پیش آنے والے دردناک واقعات یعنی خطرناک نتائج کی

دھمکیوں اور گوشمالی سے قاتلانہ حملوں تک کے واقعات کی تفصیل میں جاتا' میں نے کہا ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''وکالت بھی ایسے ہی کرتے ہو آپ۔ اپنی مرضی سے مقدمہ لیتے ہو' صرف حق اور انصاف کا بول بالا کرنے کے لیے چنانچہ اس میں بھی وہی ہوتا ہے..... جھوٹ کی بنیاد پر نظام عدل چلانے والے سب آپ کے دشمن ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی ''کیا اب آپ اپنی آمد کا مقصد بیان کریں گے۔ ظاہر ہے یہاں آپ مجھے میرے بارے میں بتانے تو نہیں آئے؟''

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا ''پہلے یہ بتاؤ کہ آج کل آپ کیا کر رہے ہو۔ میرے لیے ٹائم ہے آپ کے پاس؟''

میں نے بڑی مدبرانہ فراست سے غیر واضح الفاظ میں اپنی مصروفیت کا یوں تذکرہ کیا جیسے کشمیر اور فلسطین سے بھی زیادہ اہم مسائل میں الجھا ہونے کے باعث میرے پاس سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ''ٹائم تو واقعی بالکل کہیں ہے میرے پاس۔''

وہ کچھ مایوس ہوا ''میں بہت امیدیں لے کر آیا تھا آپ کے پاس..... لیکن ایسا لگتا ہے کہ میری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ برے وقت میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے' میں چلتا ہوں۔''

میں نے جلدی سے کہا ''دیکھیے..... میں وقت نکال لوں گا جیسے بھی ممکن ہوا۔ آپ مجھے بتائیں تو سہی کہ پرابلم کیا ہے؟ ٹھہریے' میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔''

ایک الیکٹرانک کیٹل اور چائے بنانے کے لوازمات میرے آفس میں موجود ہیں۔ سیلف سروس کے اصول پر اپنی پسند کی چائے میں خود ایجاد کرتا ہوں۔ اپنی کالیں خود ریسیو کرتا ہوں اور میرے پاس نہ کوئی سیکریٹری ہے نہ معاون۔

چائے پیتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں کہا ''یہ معاملہ ہے ایک کروڑ کا۔''

میں نے بھی اپنی بے نیازی برقرار رکھی ''ایک کروڑ کی اب کیا ویلیو رہ گئی ہے۔''

وہ فریادی لہجے میں بولا ''لیکن میرے لیے ہے۔ صرف ایک سال پہلے ہی مجھے اچھی کارکردگی کی بنیاد پر ترقی ملی تھی۔ پچیس سال کی سروس کے بعد میں ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچا تھا اور شاید ریٹائرمنٹ تک جنرل منیجر بھی ہو جاتا۔ مگر اب تو میری نوکری ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ایک سال پہلے میری تنخواہ ستر ہزار تھی۔ اب ایک لاکھ ہے۔ مجھے کمپنی نے گاڑی دے رکھی ہے اور رہائش۔ بونس اور دیگر مراعات کے ساتھ یہ نوکری یقیناً بہت شاندار تھی۔ اگر اس عمر میں مجھے برطرف کر دیا گیا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ ایسی نوکری کون دے گا مجھے اور میں کروں گا بھی کیا۔ یہی غنیمت ہے کہ ابھی تک کیس پولیس کے پاس نہیں گیا۔''

میں نے کہا ''فاروقی صاحب! ایک کروڑ کا غبن کرنے کے بعد آپ کو نوکری کی ضرورت بھی کیا ہے؟''

وہ اچھل پڑا ''غبن..... کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی۔ میں نے فراڈ کے سارے سنہرے مواقع گنوا دیے حالانکہ میں غبن کرتا تو اتنی مہارت سے کہ اس الو کے پٹھے کے فرشتوں کو پتا نہ چلتا۔''

میں نے کہا ''یہ تعریفی کلمات کس کے لیے فرمائے ہیں آپ نے؟''

''اپنے باس..... کمپنی کے چیئرمین کے لیے۔ وہ کہتا ہے تمہاری نااہلی سے ہوا یہ نقصان۔ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے..... میں نے تو نہیں کہا تھا کہ وہ الو کا پٹھا مر گیا ہے۔''

میں نے پھر اسے ٹوکا ''یک نہ شد دو شد۔ یہ چیئرمین جیسا دوسرا کون تھا' آپ ذرا سکون سے مجھے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟ میں خود فیصلہ کر لوں گا کہ کون کس خطاب کا مستحق ہے۔''

''آپ نے وحید مراد کا نام سنا ہے؟''

''کمال کرتے ہیں آپ..... پاکستان میں تو ہر پیدائشی بہرے نے سنا ہوگا یہ نام۔ ہر اندھے نے بھی فلمیں دیکھی ہوں گی اس کی۔''

''پی بی ایس!'' اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا ''آپ ریورس گیئر میں بہت پیچھے چلے گئے۔ وہ ایک بلڈر تھا..... آٹھ سال پہلے خودکشی کر لی تھی اس نے۔''

''مجھے کچھ یاد آنے لگا ہے۔ کسی ستم ظریف نے مجھ سے کہا تھا کہ وحید مراد نے پھر خودکشی کر لی۔ حالانکہ یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ پہلی بار بھی اس چاکلیٹی ہیرو نے خودکشی ہی کی تھی پھر بھی کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں..... خیر!''

وہ بولا ''میں بتاتا ہوں پوری بات۔ اس نے بہت پہلے بنائے تھے شاد آباد گھر۔ وہ بہت کامیاب اسکیم تھی۔ تمام گھر فوراً بک ہو گئے تھے اور اس نے وقت پر قبضہ بھی دے دیا تھا۔ اسی سلسلے کی دوسری اسکیم تھی شاد آباد گھر فیز ٹو۔ اس کی

تکمیل سے پہلے وحید نے دو منصوبے اور اناؤنس کر دیے۔ پانچ دس مرلے کے پلاٹ اور ایک سے چار کنال کے بنگلے۔ فیز ٹو میں ترقیاتی کام پہلے ہی مکمل ہے۔ تعمیر کے مرحلے بھی اتنی تیزی سے مکمل ہوتے نظر آئے کہ لوگ تیسرے اور چوتھے منصوبے پر ٹوٹ پڑے۔''

''اور وہ سب پیسہ لے کر بھاگ گیا؟''

''رائٹ۔ اس نے اپنی ساکھ پہلے بنائی پھر ساکھ کو ایک جال کے طور پر استعمال کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سب فراڈ تھا۔ نہ زمین اس کی تھی' نہ اس کے پاس کوئی این او سی تھا۔ بکنگ کرانے والے برسوں دھکے کھاتے پھرے۔ وحید اور اس کے ایک پارٹنر نوازش علی کو تقریباً ایک کروڑ روپے ملے۔ نوازش کی بدقسمتی کہ ائرپورٹ پر کسی قرض خواہ نے اسے ایک سال بعد دیکھ لیا۔ وہ فرضی نام سے حاصل کردہ پاسپورٹ پر دبئی جا رہا تھا۔ اسے ائرپورٹ سیکیورٹی فورس والوں نے پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بعد میں سارے دعوے دار ایک فریق بن گئے۔ وحید تو غائب تھا۔ نوازش پر دھوکا دہی اور جعلسازی' فراڈ اور غبن وغیرہ کے الزام میں مقدمہ چلا۔ ضمانت تو اس کی ہو گئی تھی۔ عدالت نے اسے دیوالیا قرار دے دیا کیونکہ نہ اس کا کسی بینک اکاؤنٹ میں کوئی پیسہ تھا' نہ اس کی کوئی جائداد تھی۔ یہی حال وحید کا تھا۔ اس کے بیوی بچے جس مکان میں تھے' وہ بھی بینک کے پاس گروی تھا۔ انہوں نے کاروبار کے لیے لاکھوں کے قرضے بھی حاصل کر رکھے تھے۔ چونکہ دونوں کی پارٹنرشپ تھی اس لیے ایک کو دوسرے کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ دعوے داروں کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ نوازش کو سات سال کی جیل ہو گئی جو اس نے دو ڈھائی سال میں پوری کی۔ سات کا مطلب ویسے ہی ساڑھے تین ہوتا ہے۔ نیک چلنی کی اور مختلف مواقع پر ملنے والی ہر رعایت سے فائدہ اٹھا کے وہ بہت جلد باہر آ گیا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہے؟''

''اور وحید مراد؟''

''ہاں..... اس کی بیوی نے پولیس کو بتایا کہ روپوشی اختیار کرنے سے پہلے وہ بہت پریشان تھا اور اکثر کہتا رہتا تھا کہ حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ہر طرف سے قرض خواہوں میں گھر گیا ہے۔''

میں نے کہا ''کیوں.....؟ وہ ایک کروڑ کہاں گئے جو اس نے پلاٹوں اور بنگلوں کی بکنگ کرانے والوں سے اینٹھے تھے؟''

کالج کے لڑکے گرمیوں کی چھٹیاں اپنے گھروں پر گزارنے کے بعد ہوسٹل میں واپس پہنچے تو ایک لڑکے نے دوسرے سے پوچھا ''تم نے چھٹیاں کس طرح گزاریں؟''

''ڈیڈی جس کمپنی کے مالک ہیں..... میں نے اس کے دفتر جانا شروع کر دیا تھا.....'' دوسرے لڑکے نے بتایا پھر پوچھا ''اور تم سناؤ..... تم چھٹیوں میں کیا کرتے رہے؟''

''میں بھی بس عیش ہی کرتا رہا۔'' پہلے طالب علم نے جواب دیا۔

بیٹا، باپ کی کار مانگ کر لے گیا تھا اور رات گئے واپس آیا تھا۔ دوسری صبح باپ نے پوچھا ''کل تم کار لے کر کہاں گھومتے رہے تھے؟''

''دوستوں کے ساتھ ذرا سی دیو پر گیا تھا۔'' بیٹے نے بے پروائی سے کہا۔

''اپنے دوستوں سے کہنا، آئندہ اپنی چوڑیاں اور بندے وغیرہ گاڑی میں نہ بھول جایا کریں۔'' باپ نے تاکید کی۔

''پی بی ایس'' فاروقی نے زور سے ناک صاف کی ''یار' میرا خیال تھا کہ آپ سیانے بندے ہو۔''

''میری بھی آپ کے بارے میں یہی رائے تھی..... مگر.....؟''

''مگر کیا.....؟'' اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''آپ کی رائے درست تھی۔ میری غلط ہو گئی'' میں نے آہ بھر کے کہا۔

وہ بادل ناخواستہ مسکرایا ''اس قسم کے فراڈ تو ہر بڑے شہر میں ہو چکے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ جب ایک اسکیم فیل ہوتی ہے تو دوسری کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ دوسری اسکیم میں پیسہ لگاتے ہیں اس سے پہلی اسکیم کے قرض خواہوں کو مطمئن کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ بات نہ بڑھے۔ جب دوسری اسکیم والے پریشان کرنے پر اتر آئیں تو تیسری اسکیم شروع کر دی جاتی ہے۔ یعنی جو پیسہ آتا ہے وہ سب اپنے ہاتھ میں

نہیں رہتا۔ اس میں سے کچھ پرانے قرض خواہوں کا منہ بند رکھنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ کچھ پولیس اور تعمیراتی منصوبوں کو کنٹرول کرنے والے اداروں کے افسروں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس چکر میں نقصان اگر ہوتا ہے تو صرف ان مجبور اور بے بس لوگوں کا جو کچھ بھی نہیں کر سکتے' سوائے صبر کے۔ وحید مراد اور نوازش نے عیاشی بھی ضرور کی ہوگی۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ ایک وقت آیا جب وہ ہر طرف سے محصور ہونے لگے۔ وحید تو بھاگ گیا۔ نوازش جیل چلا گیا۔ دونوں کے بیوی بچے مصیبت میں پڑ گئے۔ ان کی عیاشی کی زندگی ختم ہوگئی۔ رہنے کا ٹھکانا تک نہ رہا۔ وحید کی بیوی نے بتایا کہ اس کا شوہر نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ خواب آور اور سکون آور گولیاں کھاتا رہتا تھا اور پھر بھی راتوں کو جاگتا تھا۔ دن میں باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس کا کھانا پینا تک چھٹ گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے بھی ریحانہ کے بیان کی تصدیق کی۔''

''یہ ریحانہ کون ہے؟''

''وحید مراد کی بیوی..... جو بیوہ ہوگئی تھی .....اور اب پھر بیوی ہے اسی مرحوم شوہر کی۔''

''کیا مطلب؟''

''روپوشی کے کچھ عرصے بعد پولیس کو کسی مخبر کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ وحید مراد کراچی میں ہے اور کیماڑی کے علاقے میں مقیم ہے۔ ایک پولیس پارٹی بھیجی گئی جس نے پتا چلالیا کہ وحید نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا ہے۔ وہ پورٹ کے علاقے میں کام کرنے والے کسی مزدور کا گھر تھا۔ اس غریب بستی میں سارے گھر ایسے ہی تھے۔ پولیس نے کمرے کی تلاشی لی تو وہاں وحید مراد کی موجودگی ثابت ہوگئی۔ اس کا اصل شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ سب ایک بریف کیس میں موجود تھے مگر اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کسی بینک اکاؤنٹ کی چیک بک' نہ کوئی اور دستاویز۔ معلوم نہیں وحید مراد کو پولیس کے چھاپے کی اطلاع مل گئی تھی یا کوئی اور بات تھی کہ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ پولیس نے سادہ کپڑوں میں نگرانی کی مگر تین دن گزر گئے اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ پولیس نے مزید تفتیش کی تو پتا چلا کہ اس نام اور حلیے کا ایک شخص موٹر بوٹ لے کر سمندر کی طرف گیا تھا۔ وہ موٹر بوٹ چوتھے روز سمندر میں لاوارث کھڑی ملی۔ پولیس کے ہاتھ ایک ڈائری لگی جس میں بے ترتیب اندراج تھے اور تقریباً وہی سب کچھ تھا جو پولیس پہلے سے جانتی تھی یا ریحانہ نے بتایا تھا۔ مزید تلاش کرنے پر پولیس کو ایک بند لفافہ ملا جس میں وحید مراد نے بیوی کو لکھا تھا کہ ''اب اس کے لیے خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا اور وہ سمندر میں کود کے اپنی جان دے رہا ہے۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ ایک اچھا شوہر اور بچوں کے لیے ایک اچھا باپ ثابت ہو اور ان کو اچھی زندگی دے۔ حالات نے اسے ایک ایسے موڑ پر پہنچا دیا ہے جہاں اس پر واپسی کے راستے بند ہوگئے ہیں۔ ناکامی نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ کامیاب اور خوشحال زندگی کے خواب بھی اس کی دسترس میں نہیں رہے تاہم وہ اتنا دوراندیش ضرور تھا کہ اپنے خاندان کو برے وقت سے بچانے کے لیے اس نے اپنی زندگی کا بیمہ ایک کروڑ میں کرالیا تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ رقم انہیں مل جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے لائف انشورنس پالیسی کے بارے میں تمام تفصیلات لکھی تھیں۔ یہ بتایا تھا کہ رقم کا کلیم کہاں اور کیسے داخل کیا جائے۔ اور اس خبیث نے میرا نام لکھا تھا کہ پالیسی میں نے امجد فاروقی سے لے لی تھی۔ کمیشن اسی کو ملتا تھا۔ کلیم منظور کرانے میں بھی وہی مدد کرے گا۔ پیسے کے بغیر تو آج کل کوئی اپنے باپ کا بھی کام نہیں کرتا۔ فاروقی کو لاکھ دو لاکھ دے دینا۔''

اس کی گفتگو میں ایک وقفہ آیا تو میں نے کہا ''فاروقی صاحب! ایک کروڑ کی بیمہ پالیسی اتنی آسانی سے مل جاتی ہے؟''

''پی بی' انشورنس کمپنی کو تو پریمیم سے غرض ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بیمہ کرانے والے کی سماجی اور مالی حیثیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک معروف بلڈر تھا اور لاکھوں کا انکم ٹیکس دیتا تھا۔''

میں نے کہا ''لیکن خودکشی کی صورت میں تو غالباً کچھ بھی نہیں ملتا۔''

اس نے دکھی لہجے میں کہا ''ہاں' بشرطیکہ خودکشی ثابت ہو جائے۔''

''وحید مراد کی خودکشی تو ثابت ہوگئی تھی۔''

''اخباری خبر کے مطابق۔ ہاں..... لیکن ایک تو اس کی لاش نہیں ملی۔ ماہی گیروں نے اور غوطہ خوروں نے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا تھا۔ اگرچہ انشورنس کمپنی نے خط اور ڈائری دونوں کو جعلی قرار دے دیا تھا مگر بیوی نے کہا کہ یہ میرے شوہر کی رائٹنگ ہی ہے اور یہ بات ثابت بھی ہوگئی۔ کمپنی نے اس کے باوجود ایک کروڑ ادا کرنے سے انکار کیا تو اس نے کورٹ میں کیس کر دیا۔ انشورنس کی رقم کی ادائیگی کے لیے موت کی شرط تھی۔ وحید مراد کی موت اگر خودکشی نہیں تھی تو ریحانہ یہ بھی ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ موت بیماری' طبعی اسباب یا کسی حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس کے لیے ایک ڈیتھ

سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ ریحانہ کا دعویٰ خارج ہوگیا۔ ریحانہ مایوس ہو کے بیٹھ گئی۔ ریحانہ شادی سے پہلے کسی کالج میں پڑھاتی تھی۔ وہ ایک غریب گھر کی مگر خوبصورت عورت تھی۔ جب وحید غائب ہوا تو اس کے دو بچے تھے۔ سلمان وحید بارہ سال کا اور سلطان وحید سات سال کا تھا۔ دیوالیا قرار دینے کی عدالتی کارروائی کے بعد ان کے پاس جو کچھ تھا بحقِ سرکار ضبط ہوگیا۔ اس میں گھر' گاڑی اور گھر کا ساز و سامان بھی تھا۔ ان کے پاس صرف تن کے کپڑے رہ گئے تو وہ دونوں بچوں کے ساتھ والدین کے گھر منتقل ہوگئی۔ سابقہ تجربے اور کوالیفکیشن کی بنیاد پر اس کو ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اس کے دونوں بچوں کو وہیں تعلیم کی مفت سہولت حاصل ہوگئی۔ بات پرانی ہوگئی۔ لوگ سب کچھ بھول گئے۔ پی بی آئی سی بھی بے فکر ہوگئی اور سات سال گزر گئے۔ سات سال بعد ریحانہ نے پولیس رپورٹ کی بنیاد پر عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ اس کے شوہر کو لاپتا ہوئے سات برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ عدالت اس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرے تاکہ وہ دوسری شادی کر سکے۔ اس نے ایک کروڑ کی لائف انشورنس پالیسی کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس کا باپ پہلے ہی مر گیا تھا۔ ماں دو سال بعد چل بسی۔ دو بھائی بیرونِ ملک آباد ہوگئے تھے چنانچہ کسی مرد کی عدم موجودگی میں خود کو معاشرتی طور پر غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ حالانکہ اس کے بچے جوان ہوگئے تھے۔ سلمان وحید انیس سال کا تھا اور سلطان چودہ سال کا۔ مگر ریحانہ نے شوہر کی گمشدگی کی جو رپورٹ لکھوائی تھی' اس میں بچوں کا کوئی ذکر نہ تھا اور نہ عدالت کو اس سے سروکار تھا۔ قانونی کارروائی مکمل ہونے میں ایک سال لگ گیا لیکن بالآخر ریحانہ کو ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا۔ اس نے ایک کروڑ کا انشورنس کلیم پھر داخل کیا۔ معاملہ پھر عدالت تک پہنچا۔ پی بی آئی سی کے وکیل نے ماتحت عدالت سے ریحانہ کے خلاف حکم حاصل کرلیا۔ معلوم نہیں کیسے' وہ ہائی کورٹ میں چلی گئی اور اس کی اپیل منظور ہوگئی۔ اس کا وکیل بھی اچھا تھا۔ کمپنی کو ایک کروڑ روپے ادا کرنے پڑے۔ اس بات کو بھی ایک سال ہوگیا۔ میری اس میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ پالیسی قواعد و ضوابط کے مطابق منظور ہوئی تھی۔ اگر وہ میرے پاس آیا تھا تو کیا یہ میرا قصور تھا؟ وہ کسی اور کے پاس بھی جا سکتا تھا۔ پالیسی کو میں نے نہیں' پی بی آئی سی نے منظور کیا تھا۔ مگر وہ الو کا پٹھا میرے پیچھے پڑ گیا ہے پی بی!''

''الو کا پٹھا یعنی چیئرمین..... مگر کیوں؟''

"زہے نصیب"

جو لوگ پیار، وفا، خلوص، محبت، چاہت، اپنائیت اور عزت بانٹتے ہیں اور بالواسطہ یا بلاواسطہ معاشرے کی ذہنی، اخلاقی فکری، روحانی تربیت کرتے ہیں..... تو ان کے چاہنے والے قدردان ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔

جی ہاں! اسی لئے آپ کی خدمت میں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے روحِ رواں

جناب معراج رسول صاحب و بیگم عذرا رسول صاحبہ

کا تفصیلی فیملی انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی.....

ماہ نامہ "دلکش"

ماہ جون 2006ء کے شمارے میں.....

آج ہی اپنے ہاکر سے ماہ جون 2006ء کا

ماہنامہ دلکش کراچی

بُک کروانا نہ بھولیے۔

خوابوں کی طرح ہے نہ خیالوں کی طرح ہے
وہ علم ریاضی کے سوالوں کی طرح ہے
الجھا ہوا ایسا کہ سلجھتا ہی نہیں ہے
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح ہے

پڑھیے

جناب معراج رسول صاحب کے دلچسپ جوابات

عذرا رسول صاحبہ کی سادگی بھری باتیں

اور ذیشان رسول کے پُرعزم خیالات.....

صرف اور صرف ماہ نامہ "دلکش" میں

فاروقی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''وحید کی موت مشکوک حالات میں ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا والی صورتِ حال ہے۔ اسے مردہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ قانونی طور پر اسے مردہ قرار دے دیا گیا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''بی بی آئی سی کے ایک اور ڈپٹی جنرل منیجر نے اسے کراچی میں دیکھا تھا۔ اس نے چیئرمین کے سامنے آ کے حلفیہ کہا کہ وہ وحید مراد کے سوا دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ چیئرمین نے مجھے بلالیا اور چڑھائی کردی مجھ پر۔ پہلے میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نے انشورنس پالیسی دی تھی۔ اب میرا جرم یہ بھی بن گیا ہے کہ اس فراڈ میں وحید مراد کا ساتھ میں نے دیا تھا۔ ریحانہ کی مدد کرنے والا میں ہوں..... کیونکہ.....''

میں نے کچھ دیر انتظار کیا ''کیونکہ کیا.....؟''

اس نے رومال سے ناک صاف کی ''وہ کہتا ہے تم ریحانہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس پر مرتے تھے' تمہارے اس کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔''

''کیا یہ سچ ہے؟..... اس لیے کڑوا لگتا ہے تمہیں؟''

''یہ جھوٹ ہے پی بی ایس' اس الو کے پٹھے کا کیا ہے' وہ یہ کہنا بھی شروع کردے کہ میں نے ہی وحید کو سمندر میں غرق کیا تھا۔ میں نے وہ ڈائری اور وہ خط کسی سے لکھوائے تھے۔ میں اسے دھوکے سے اپنے ساتھ لے گیا اور پانی میں دھکیل دیا'' اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

میں نے کہا ''تم کیا سمجھتے ہو' میاں بیوی نے مل کے یہ فراڈ کیا ہوگا؟''

''پہلے یہ تو ثابت ہوجائے کہ وحید مراد زندہ ہے۔''

''پولیس معلوم کرسکتی ہے۔ کراچی میں اسے کہاں دیکھا گیا تھا؟ جس نے دیکھا تھا وہ بتائے۔''

''وہ کیا بتائے گا' ایک تو اس نے وحید مراد کو دیکھا تھا تقریباً آٹھ سال کے بعد۔ وہ کراچی کے کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے گیا تھا کہ وحید مراد اسے دوسری ٹیبل پر سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اس کا تو کہنا ہے کہ وہ ایک نظر میں اسے پہچان گیا تھا۔ وہ کھانا چھوڑ کے اس کی طرف لپکا مگر اتنی دیر میں وہ بل ادا کرکے دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اسے اپنا بل ادا کرنے میں چند منٹ لگے۔ بقول اس کے صرف دو منٹ۔ وہ پانچ سو کا نوٹ کاؤنٹر پر پھینک کے بھاگا اور اس نے وحید مراد کو فٹ پاتھ پر جاتا دیکھ لیا۔ تقریباً پچاس قدم دور۔ وہ اسے نام سے پکارتا ہوا دوڑا لیکن وحید مراد نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو اس نے پھر آواز دی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وحید مراد چونکا تک نہیں۔ اس نے ٹیکسی کے روانہ ہونے سے پہلے کھڑکی میں سر ڈال کے کہا ''تم وحید مراد ہو نا؟'' تو ٹیکسی والا ہنسنے لگا کیونکہ وحید مراد نے کہا۔ ''معاف کیجیے گا آپ کو غلط فہمی ہوئی' میرا نام ندیم ہے'' صورت اس کی مصطفیٰ قریشی سے ملتی تھی۔ پھر ٹیکسی چلی گئی۔ بس یہ ہے سارا واقعہ۔ اب بتاؤ' ایک کروڑ آبادی کے شہر میں پولیس اسے کیسے تلاش کرسکتی ہے؟ لیکن وہ الو..... چیئرمین میرے پیچھے پڑ گیا ہے کہ جاؤ اسے تلاش کرو۔ اگر وہ مل جاتا ہے تو کمپنی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو چیلنج کردے گی اور اس کی بیوی کو ایک کروڑ روپیہ واپس کرنا پڑے گا۔''

''ایک منٹ کے لیے فرض کرلو کہ اس سے کچھ نہ ملا..... پھر.....؟''

اس کی شکل رونے والی ہوگئی ''پھر کیا..... میری نوکری بھی گئی..... اور پچیس فیصد بھی۔''

''کون سے پچیس فیصد.....؟''

''چیئرمین کہتا ہے کہ وصول ہونے والی رقم میں سے پچیس فیصد میرے۔ میں اسے چالیس فیصد پر بھی راضی کرلوں گا۔'' اس نے پُرامید انداز میں آگے جھک کر کہا ''وہ الو کا پٹھا دے گا پی بی!''

میں نے صورتِ حال پر غور کیا ''اگر میرے پاس آنے کے بجائے آپ بقلم خود کراچی جاتے اور وحید مراد کو تلاش کرتے۔''

اس نے ایک دردناک آہ بھری ''ایک تو میں نوکری کررہا ہوں۔ نوکری کیا غلامی ہے۔ دفتر میں اس الو کے پٹھے کی اور گھر میں بیوی کی..... میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ کچھ مسائل عمر کے ہیں' میرا بلڈ پریشر میری خودی سے بھی بلند ہے۔ جوڑوں کے بال بیرنگ گھس گئے ہیں۔ بھاگ دوڑ میرے بس کی بات نہیں رہی۔ اس کے علاوہ یہ تمہارا کام ہے' تم میں ہمت ہے۔ تمہارے تعلقات ہیں۔ تم کبھی وکیل تو کبھی صحافی بن کے ہر جگہ پہنچ جاتے ہو۔''

''لیکن وہ مسئلہ تو میرے لیے بھی ہے' بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنے کا' کراچی تو انسانوں کا سمندر ہے۔''

اس نے کہا ''دیکھو..... ایک کروڑ کے چالیس فیصد ہوتے ہیں چالیس لاکھ۔ آدھے میرے آدھے تمہارے۔ اگر ایک کروڑ کے آدھے بھی وصول ہوگئے تو دس لاکھ تمہارے دس میرے۔ سارے مل گئے تو رقم دگنی..... کیا خیال

ہے پی بی ایس؟''

''ہوں'' میں نے غور کرنے کے بعد کہا ''گویا یہ جوا ہے..... او کے مسٹر فاروقی' میں یہ جوا کھیلوں گا۔''

☆☆☆

پاکستان میں ابھی تک پرائیویٹ سراغ رساں کا کوئی تصور نہیں۔ شاید کبھی ہوگا بھی نہیں۔ یہاں اگر کوئی اس خوش فہمی کا شکار ہوجائے کہ وہ محض ذہانت سے شرلاک ہومز کی طرح جرم کا سراغ لگالے گا۔ تو اس کوشش سے پہلے ہی اسے پولیس ''ڈک'' دے گی کہ چاچا خواہ مخواہ دے پتر' کا سرکار میں دخل دیتا ہے؟ ذہانت کیا چھترول سے زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں جاکے پتا چل جائے گا۔

میرے والدین بہت خوش حال مگر ان پڑھ تھے چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ میں پی ایچ ڈی کرکے عالم فاضل بنوں مگر میں نے جوان ہوتے ہی یہ اعلان کردیا کہ میں صحافت کے میدان میں جھنڈے گاڑوں گا۔ تو والدین نے کہا کہ اچھا تمہاری مرضی' میں افریقہ کی سیاہ فام ہتھنی جیسی حسینہ کو ان کی بہو بنانے کا اعلان کرتا تب بھی وہ یہی کہتے۔

جھنڈے میں کہاں گاڑتا۔ میں جان کی بازی لگا کے کسی مافیا کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کی رپورٹ بناتا تھا تو اخباری مالکان اسے ردی میں ڈال کے مجھے باہر کا راستہ دکھادیتے تھے۔ انہیں کاروباری مفاد عزیز تھا اور وہ خود بھی ایک مافیا تھے۔

اس کے بعد میں نے حق و انصاف کی جنگ میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا' قدرت نے خدمت خلق کے جذبات مجھ میں یوں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے جیسے اچھے وقتوں کے استاد ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر کند ذہن طالب علم میں قابلیت بھرتے تھے۔ صحافی کے بعد میں وکیل بن گیا۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف یہ جہاد بھی آسان نہ تھا۔ حق گوئی و بے باکی آئین جواں مرداں۔ علامہ اقبال کے فرمان پر عمل کرنے کے چکر میں پولیس ہی نہیں' عدالتی نظام سے بھی میری ٹھن گئی۔ موکل مجھ سے جان چھڑا لیتے تھے۔ گواہ بھاگ جاتے تھے' سچ کا بول بالا کہیں نہ تھا' میرا منہ ہر جگہ کالا ہوتا تھا۔

تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے فون پر دھمکیاں ملتی تھیں۔ کئی بار میرا دماغ درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ عام طور پر مرہم پٹی کرا کے میں پھر پیشی پر حاضر ہوجاتا تھا مگر ایک بار مجھے دو ہفتے ہڈیوں کے وارڈ میں لیٹ کر بھی گزارنے پڑے۔ ناقابلِ تلافی نقصان صرف ایک بار ہوا جب قاتلانہ حملہ کرنے والوں نے میرے گھر پر فائرنگ کی اور دستی بم پھینکا جس سے میرے والدین جاں بحق ہوگئے۔ اس کے بعد میرے لیے کیا تھا کہ میں ڈرتا۔ آہستہ آہستہ میرے نام کی ساکھ بنتی چلی گئی۔ میں اخبار والوں کی دنیا میں ایک مجاہد کی حیثیت سے مشہور تھا تو انصاف مانگنے والوں کی جنگ کا سپہ سالار۔ مگر عام خیال یہ تھا کہ میں پنگا لینے کا شوقین ہوں۔ پتنگ باز بجاں والا گانا مشہور ہوا تو کچھ لوگ مجھے پنگے باز بجاں کہنے لگے۔ میری عرفیت پی بی بجناں ہوگئی' مختصراً پی بی ایس۔

دراصل اس کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔

گزشتہ سال جنوری میں یعنی اب سے کوئی بیس بائیس ماہ قبل ایک واقعہ میری شہرت کا سبب بن گیا تھا۔ کچھ ڈاکو ایک بہت بڑے پولیس افسر کے گھر میں گھس گئے جہاں انہیں رشوت کی کمائی سے جمع ہونے والا قارون کا خزانہ ملنے کی امید تھی لیکن بدقسمتی آڑے آئی اور وہ محصور ہوگئے۔ پولیس کی بھاری نفری نے انہیں گھیر لیا تو انہوں نے گھر والوں کو یرغمال بنالیا اور دھمکی دی کہ پولیس نے کمانڈو ایکشن کیا تو وہ مرنے سے پہلے سب کو مار ڈالیں گے' ان میں عورتیں' بچے اور افسر کی ضعیف ماں بھی شامل تھی۔

پولیس کے وعدے پر انہیں اعتبار نہ تھا۔ ڈاکوؤں نے نہ جانے کیا سوچ کے میرا نام لیا کہ پی بی بجناں کو بلاؤ تو ہم اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔ آدھی رات کو پولیس مجھے لے گئی اور یوں ان ڈاکوؤں کی جان بچ گئی جن کا پولیس مقابلے میں ہلاک کیا جانا بالکل یقینی تھا۔ میرے انکار کے باوجود ڈاکوؤں نے مجھے ہی اپنا وکیل مقرر کیا اور مجھے فیس کی رقم بھی ایڈوانس ادا کردی۔ بڑے سے بڑا وکیل بھی نہ انہیں بے گناہ ثابت کرکے سزا سے بچا سکتا تھا اور نہ ان کو ضمانت پر رہا کرا سکتا تھا۔ میری ہر کوشش ناکام رہی اور انہیں تین سے سات سال تک کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

میں ان سے بعد میں کوئی رابطہ رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر کچھ عرصے بعد جیل کے ایک اہلکار نے مجھے یہ پیغام پہنچایا کہ شاہ جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاہ جی ڈاکوؤں کے گروہ کا سرغنہ تھا اور اس کی حیثیت جیل کے اندر وی آئی پی جیسی تھی۔ میں نے مصروفیت کا عذر پیش کیا تین دن بعد کچھ لوگ بڑی شرافت سے مجھے اٹھا کے لے گئے۔

جیلر کے کمرے میں شاہ جی نے میرے اعزاز میں بڑی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اسٹیج کی دو نامور ڈانسرز کا رقص ہوا۔ کم لباسی ان کی وجہِ شہرت تھی۔ وہاں مکمل آزادی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ جیلر صاحب

کی شادی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ شاہ جی نے خود مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے بارے میں ایک لفظ نہ لکھوں نہ کہوں۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میری کیا مجال تھی کہ میں وعدہ کر کے مکر جاتا۔ مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ شاہ جی نے ہر جگہ میری تعریف کی کہ یہ بندہ بھروسے کے قابل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس سال مجھے تین مختلف ڈاکوؤں نے اپنا وکیل نامزد کیا۔ میں کسی کو بھی سزا سے نہ بچا سکا لیکن مجھے فیس پوری ملی۔ کسی نے میری نااہلی کی شکایت نہیں کی۔

پھر ایسا ہی دوسرا واقعہ چند ماہ قبل پیش آیا۔ ایک صنعت کار نے مجھ سے رابطہ کیا کہ اس کا بیٹا اغوا ہو گیا ہے اور تاوان مانگنے والوں سے پچاس لاکھ کا سودا ہو گیا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ پی بی بجھاں خود رقم لے کر آئے اور مغوی کو لے جائے۔ پولیس کو بیچ میں کوئی فریق ڈالنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجبوراً مجھے آدھی رات کے وقت پچاس لاکھ کا بوجھ اٹھا کے ایک سنسان جنگل میں جانا پڑا۔ میری بڑی آؤ بھگت ہوئی اور صنعت کار کا بیٹا میرے حوالے کر دیا گیا۔ ڈاکو مجھے پانچ لاکھ دینے پر مصر تھے مگر میں نے انکار کر دیا کہ یہ معاملہ صحافتی یا قانونی ذمے داری کا نہیں' اخلاقی ذمے داری کا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکو ہی نہیں' صنعت کار بھی احسان مند ہوا۔ ان کی طرف سے بعد میں جو تحائف ملے' وہ مجھے قبول کرنے پڑے۔

اس کے بعد تو جیسے میری دھاک بیٹھ گئی۔ آمدنی پہلے بھی کوئی مسئلہ نہ تھی۔ پولیس نے مشہور کر دیا کہ میں چوروں ڈاکوؤں کا ایجنٹ اور وکیل ہوں۔ قانونی مشیر اور دوست ہوں۔ اس شہرت نے کسی حد تک میرے نام کی دہشت قائم کر دی۔ کوئی مجھ سے پنگا اس لیے نہیں لیتا تھا کہ میرے ایک اشارے پر میرے موکل کسی کا بھی بینڈ بجا سکتے ہیں۔ ایک طرف صحافی اور وکیل میرے ساتھ تھے تو دوسری طرف خطرناک مجرم۔

امجد فاروقی نے اسی لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا کہ اس معاملے میں پولیس اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی اور میں قابلِ اعتبار بھی تھا۔ کراچی جاتے ہوئے میرے پاس تمام بنیادی معلومات تھیں۔ میں نے سات سال پرانے اخبارات کی فائلیں چھان ماری تھیں اور بہت کچھ پولیس کے ریکارڈ سے بھی حاصل کر لیا تھا مگر اس کے باوجود میں بے یقینی کا شکار تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ مرحوم وحید مراد کی تلاش کا نقطۂ آغاز کیا ہوگا۔ آٹھ سال پرانی تصویر کی مدد سے میں اسے ایک کروڑ انسانوں میں کیسے تلاش کروں گا۔ مشکل یہ بھی ہوگی کہ روپوشی میں نام کے ساتھ اس نے اپنا حلیہ بھی بالکل تبدیل کر لیا ہوگا۔ شاید ایک سے زیادہ مرتبہ۔ پھر بھی میں نے اپنے ذہن میں ایک پلان بنا لیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق مرحوم وحید مراد جب زندہ نظر آیا تو ایک ہوٹل میں کسی عورت کے ساتھ تھا اور اس نام سے پکارے جانے پر وہ چونکا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ اپنے اصل نام کو بھول چکا تھا یا اس نے خود کو آٹھ سال کے طویل عرصے میں اس بات کا عادی بنا لیا تھا کہ بے خیالی میں کوئی وحید مراد کا نام لے یا کوئی میرا شناسا مل جائے تو وہ کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرے اور اجنبی بنا رہے۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا نام تو ندیم ہے۔ کیا یہی اس کا موجودہ نام ہے؟ یا وحید مراد کی جگہ اس نے ٹالنے کے لیے ندیم کا نام بتا دیا۔ وہ ندیم کی جگہ محمد علی بھی کہہ سکتا تھا۔ یہ سارے مشہور فلمی نام تھے۔

میرے پاس کراچی کے تمام ہوٹلوں کی ایک فہرست تھی۔ ان میں فائیو اسٹار سے ون اسٹار تک ہر معیار کے ہوٹل اور ان کے پتے لکھے ہوئے تھے۔ پلان کے مطابق ہوٹل میں قدم رنجہ فرماتے ہی میں نے پہلے کمرا حاصل کیا۔ رات کے کھانے کے لیے میں نیچے لابی میں آیا تو کاؤنٹر پر اسٹاف کی ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ جہاں ایک اینگلو انڈین ٹائپ نوجوان ملا تھا وہاں اب ایک شوخ نظر خوش ادا اور پُرکشش جسم والی لڑکی بڑے رنگین لباس اور میک اپ میں نظر آ رہی تھی۔

میں نے اس کے سامنے جا کے اور کاؤنٹر پر جھک کے کہا ''دیکھیے' میں کمرا ایک سوا ایک میں ہوں' آج ہی آیا ہوں۔''

وہ جھک کے اتنا آگے بڑھ آئی کہ مجھے پسپا ہونا پڑا ورنہ دیکھنے والوں کو یہ قربت قابلِ اعتراض لگتی ''فرمایئے' میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' اس نے ایک مدعو کرنے والی مسکراہٹ بکھیری۔

میں نے کہا ''کر تو بہت کچھ سکتی ہیں آپ۔ مگر فی الحال صرف اتنا بتا دیجیے کہ کیا ندیم نام کے کوئی صاحب یہاں مقیم ہیں؟''

اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں چلائیں ''ندیم..... نو سر!''

میں نے اپنی جیب سے تصویر نکالی ''نام کا کچھ کنفیوزن ہے' آپ یہ تصویر ملاحظہ کریں۔''

اس کی آنکھوں میں شکوک ابھرے مگر اس نے تصویر پر نظر ڈال کے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے تصویر جیب میں رکھ لی اور لڑکی کو بھول گیا۔ حالانکہ اس کی نظر کا پیغام بہت واضح تھا۔ لباس اور اطوار سے اس نے مجھے اگر کوئی شوقین رئیس زادہ

سمجھا تھا تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ میں نے خود کو ایسا ہی ظاہر کیا تھا۔ مگر وہ تصویر کو دیکھ کے مثبت انداز میں سر ہلاتی تو میں یہ ثابت بھی کر دیتا۔

اگلے دن میں دوسرے ہوٹل میں تھا اور وہاں تقریباً وہی ہوا جو پہلے ہوٹل میں پیش آیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں میں نے کاؤنٹر کے علاوہ تصویر ان ویٹرز کو بھی دکھائی جو روم سروس پر مامور تھے یا جنہوں نے مجھے ڈائننگ روم میں سرو کیا تھا۔ تصویر کس کی ہے اور میں اسے کیوں تلاش کر رہا ہوں۔ اس سوال کا معقول اور مطمئن کر دینے والا جواب میرے پاس پہلے سے تیار تھا۔ یہ دھوکے باز شخص میرا ملازم تھا اور مجھے لاکھوں کا نقصان پہنچا کے فرار ہوا ہے۔ ہر جگہ میرے سوال کا جواب نفی میں ملا۔

میں ایک منصوبے کے مطابق ہوٹل بدلتا گیا۔ فائیو اسٹار ہوٹل گنتی کے چار پانچ تھے۔ زیادہ امید مجھے دوسرے اور تیسرے درجے کے ہوٹلوں سے تھی جن کی تعداد کئی گنا تھی۔ اس کے بعد مسافر خانہ ٹائپ ہوٹل آتے تھے جو عموماً ریلوے اسٹیشن کے گرد و نواح میں ہوتے تھے۔ اگر میں اسی رفتار سے چلتا تو ہر ہوٹل میں قیام فرمانے پر میرے دو ڈھائی سال تو ضرور صرف ہو جاتے لیکن جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں جوینده یابنده۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ انسان کو اس کی کوشش کے مطابق ملتا ہے۔ شاید ہر زبان میں ایسا کوئی مقولہ ضرور ہوگا۔

دو ہفتے بعد کامیابی نے میرے قدم چومے جب میں ساحلِ سمندر پر واقع ایک ہوٹل میں تھا۔ اب میرا معمول یہ ہو گیا تھا کہ دن کا کھانا کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھاتا تھا تو تصویر وہاں بھی دکھا دیتا تھا۔ میں نے بہت سے معروف پرائیویٹ اسپتالوں سے بھی رجوع کیا اور مایوس نہیں ہوا۔ اسی ہوٹل میں میرے قیام کو چوتھا دن تھا۔ مجھے یہ جگہ اچھی لگی تھی۔ کمرے کی ایک کھڑکی سے سمندر اور طلوعِ آفتاب کا نظارہ بہت خوبصورت تھا اور ہوٹل کے عقبی حصے میں نشیب کی جانب جانے والا راستہ ایک پرائیویٹ قسم کے ساحل پر ختم ہوتا تھا۔ عام لوگوں کو ادھر آنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں وہ یورپ یا امریکی بیچ کے مناظر تو نظر نہیں آتے تھے مگر تسلی یا سکون اور آرام کے لیے یہ جگہ لاجواب تھی۔

ناشتے کے بعد میں نے اخبارات کا پلندا بغل میں دبایا اور ساحل پر چلا گیا۔ وہاں ایک گھنٹے تک میں آرام کرسی پر نیم دراز موسم اور منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اخبارات پر سرسری نگاہ ڈال کے میں سمندر میں تیرنے چلا جاتا تھا مگر اس روز جیسے ہی میں نے ریت پر رکھے ہوئے ایک اخبار کو اٹھایا' میری نظر نے وحید مراد کو دیکھ لیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ فریبِ خیال ہے یا فریبِ نظر۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میری آنکھیں اس شخص پر جم کے رہ گئی تھیں جو مجھ سے سو فٹ کے فاصلے پر ایک عورت کے ساتھ موجود تھا۔ میری طرح وہ بھی الگ الگ کرسیوں پر کاہلی سے نیم دراز تھے۔ ساحل پر اس وقت سب سے زیادہ لوگ ہوتے تھے۔ کچھ صبح طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھتے تھے۔ پھر جاگنگ یا واکنگ کرتے تھے یا نہاتے تھے اور پھر ناشتا کرنے چلے جاتے تھے۔ کچھ میری طرح ناشتا کر کے آتے تھے تو کچھ دیر بعد سمندر کا رخ کرتے تھے۔

وحید مراد نے جب سر گھما کے بائیں طرف عورت کو دیکھا تھا تو اس کا پورا چہرہ میرے سامنے آیا تھا کیونکہ میں بھی اس کے بائیں ہاتھ پر تھا مگر کچھ دور۔ اب میں اس کا سائیڈ پوز دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے پھر عورت کی طرف دیکھ کے کوئی بات کی تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہ چہرہ اس تصویر سے بہت ملتا تھا جو مجھے شناخت کے لیے دی گئی تھی۔

آٹھ سال کے عرصے میں کسی بھی چہرے میں تھوڑی بہت تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ وحید مراد کا چہرہ بھی کچھ بھاری ہو گیا تھا اور اس کی صورت پر تھکن کے آثار عیاں تھے مگر اس کے بنیادی خدوخال وہی تھے جو میرے لیے خاصی حیرانی کی بات تھی۔ دوسری زندگی ایک نئے نام اور نئی شخصیت کے ساتھ آغاز کرنے کے لیے اسے پلاسٹک سرجری سے چہرے کو یکسر بدل دینا چاہیے تھا۔ اور کچھ نہ سہی وہ اپنا ہیئر اسٹائل بدل سکتا تھا۔ وگ لگوا سکتا تھا۔ داڑھی مونچھ کا اضافہ تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ یہ اس کی بے پروائی نہیں بے وقوفی کی انتہا تھی کہ وہ اصل چہرہ لیے اسی ملک میں گھوم رہا تھا اور دن دیہاڑے کراچی جیسے شہر کے ایک ہوٹل میں موجود تھا۔

اس کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے ہی میرے اعتماد کو ڈانواں ڈول کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ وحید مراد کا کوئی ہم شکل ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوتی۔ دنیا میں ایسے ایسے ہم شکل پائے جاتے ہیں جن پر جڑواں بھائی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

اپنے چہرے کے سامنے اخبار رکھتے ہوئے میں نے کرسی کا رخ تھوڑا سا بدلا اور وحید مراد کا بغور جائزہ لیا۔ اس کی عمر پچاس سال سے یقیناً زیادہ تھی۔ ماتھے پر شکنوں میں اضافہ ہوا تھا۔ بال سامنے سے بھی غائب ہوئے تھے اور پیچھے

سے بھی۔ اس کے علاوہ وہ حسبِ سابق تھا۔ جو عورت اس کے ساتھ تھی وہ بھی شاید چالیس کی ہوگی مگر وہ عمر کے حساب میں دس سال کم رکھنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب تھی۔ اس کی بنیادی وجہ اس کا جسم تھا جو متناسب تھا۔ جہاں کم ہونا چاہیے' کم تھا اور جہاں اس کے پھیلاؤ سے نشیب و فراز اور قوس و قزح کا حسن پیدا ہوتا تھا وہاں زیادہ تھا۔ اس تناسب کی تشہیر وہ ہر پُرکشش عورت کی طرح فراخ دلی سے کرتی تھی۔ کھلے گلے کی ٹی شرٹ کا پچھلا حصہ بھی کمر کے خم تک سنہری جلد کی بھرپور نمائش کرتا تھا۔ اس کے بازو شانوں کی گولائی تک عریاں تھے اور ٹائٹ ٹراؤزر کی اوپری حد کم ہونے کے باعث ناف کے گرد نواح کا منظر بھی وقفے وقفے سے نظر آتا رہتا تھا۔ تراشیدہ ریشمی بال بار بار اس کے چہرے پر پھسل آتے تھے۔

ان دونوں پر اچھی طرح غور فرمانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ عورت وحید مراد کی بیوی نہیں ہوسکتی۔ وہ اس کی محبوبہ عرف داشتہ وغیرہ ہی ہوسکتی تھی۔ ایسی خوبصورت کوئی بھی عورت ڈھلتی عمر والے ایک عام سے مرد کے ساتھ اس ہوٹل میں دیکھنے والوں کو حسد اور رشک میں مبتلا کر رہی ہے تو آخر کیوں؟ اسے عشق اگر ہوسکتا تھا تو وحید مراد کی دولت سے۔

اس سے قدرتی طور پر یہ سوال ذہن میں آتا تھا کہ صرف قرض چھوڑ کے روپوش ہونے اور خودکشی کا ڈراما رچا کے قرض خواہوں سے نجات پانے والے کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ اس کا جواب بھی آسان تھا۔ وہ پہلے بھی فراڈ سے دولت مند بنا تھا۔ اب بھی یہی کر رہا ہوگا۔

میں اس کی تصویر اتارنا چاہتا تھا مگر نہ میرے پاس کیمرا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ میں دندناتا ہوا جاؤں اور اپنے کمرے سے کیمرا لے آؤں۔ اس کی تصویر صرف چھپ کر اتاری جاسکتی تھی اور یہاں سوائے سپاٹ ساحل کے ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں چھپ کر میں اس کے چہرے کو فوکس کرسکتا۔ دور سے بھی یہ کام ممکن نہیں تھا۔ میں اسے چوکنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے ذرا بھی شک ہوجاتا تو میری کامیابی کا خواب شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجاتا۔ میں نے سوچا کہ میں اس سے تعارف حاصل کروں۔ کسی بھی بہانے اس سے دوستی کرلوں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ شک میں مبتلا ہوجائے گا کہ اس دوستی کے بہانے میں اس کی حسین ساتھی پر ڈورے ڈال رہا ہوں۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ مرد مجھے ہینڈسم اور خواتین پُرکشش سمجھتی ہیں۔ پچپن سال کے وحید مراد کے مقابلے میں تو یقیناً میں شہزادہ گلفام تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ میں اس کی نظروں سے اوجھل رہ کے اپنی سراغ رسی کو جاری رکھوں۔

مجھے ایک بے نام سا ڈر تھا کہ وہ اچانک غائب نہ ہوجائے مگر پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ اس کا امکان اگر ہے تو بہت کم۔ وہ یہاں بڑے سکون سے بیٹھا ہے اور اسے ذرا بھی شک نہیں کہ وہ کسی کی نظر میں ہے یا اس کے لیے خطرے کی کوئی بات ہے۔ میں اطمینان سے پتا لگا سکتا ہوں کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ ہوٹل کے کس کمرے میں مقیم ہے۔

پانی میں جانے کا ارادہ ترک کرکے میں نے اخبارات کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ یا کم سے کم اس کی اداکاری کی۔ پھر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ میرے کانوں میں ایک مترنم آواز آئی ''کیا میں یہ اخبارات دیکھ سکتی ہوں؟'' اور میں تقریباً اچھل پڑا۔ اچانک میں نے اس سنسنی خیز حسینہ کو اپنے بہت قریب دیکھا۔

میں نے فوراً اخبارات سمیٹ کر اسے پیش کیے ''کیوں نہیں' میں تو سب پڑھ چکا۔ آپ یہ بھی لے جائیں۔''

''شکریہ'' اس نے مسکراتے ہوئے ایک ادائے ناز سے بالوں کو جھٹکا تو جھٹکا میرے دل کو لگا۔ پھر وہ چلی گئی اور میں دل مسوس کے رہ گیا۔ حالات اجازت نہیں دیتے تھے ورنہ میں بلاتاخیر اس پر فریفتہ ہوجاتا اور اپنے سابقہ ریکارڈ کے پیشِ نظر کامیابی کی امید بھی رکھتا۔ پھر وحید جیسے رقیب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا میرا مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ خود یہ نیک کام بڑے شوق سے کرتی۔

میں نے انہیں بڑے انہماک سے اخبارات کا مطالعہ کرتے دیکھا تو بہتر سمجھا کہ کرسی پر ساکت بیٹھ کر انہیں گھورنے کے بجائے عمل کرتے ہوئے ان پر نظر رکھوں۔ میں پانی میں کود ہی تھا کہ وہ ایک دم اٹھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے درمیان کوئی بحث چھڑ گئی ہے۔ عورت پہلے واپس ہوٹل کی طرف گئی۔ مرد نے اخبارات سمیٹ کر واپس اس کرسی پر رکھے جس پر کچھ دیر پہلے تشریف فرما تھے۔ لیکن ایک اخبار وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ میں ہوتا تو شاید اخلاقاً وہ مجھ سے پوچھتا مگر پرانے ہوجانے والے کسی اخبار کی وقعت ہی کیا۔ اس کے لیے میں پانی سے نکل کے دوڑ نہیں سکتا تھا کہ اے مسٹر' میرا اخبار واپس کرو۔

میں نے وہ پورا دن ایسے گزارا کہ ہوٹل سے باہر جانے کا راستہ میری نظر میں رہے۔ میں دوپہر کے کھانے سے ڈیڑھ گھنٹا قبل لاؤنج میں جا بیٹھا۔ پہلے میں نے کافی پی پھر

جوس منگوایا۔ کھانے کا آرڈر دینے میں آدھا گھنٹا لگا دیا کہ میرے مہمان آنے والے ہیں۔ کھانے کے بعد میں نے پھر کافی منگوالی۔ تین گھنٹے بیٹھ بیٹھ کے میں بیزار ہوگیا تو ہوٹل سے باہر جاکے مختصر سے شاپنگ ایریا میں فضول قسم کے نوادرات دیکھتا رہا۔ ہوٹل کے گیٹ کے مقابل کچھ فاصلے پر ایک غریب نواز قسم کا ہوٹل تھا جہاں مزدور اور قلی آتے تھے۔ وہاں میں نے ڈیزل جیسے سیاہ تیل میں تلی ہوئی ایسی مچھلی کھائی جو شاید دو ہفتے قبل گرفتار ہوئی تھی اور گزشتہ ہفتے میں کئی بار تل کے تازہ کی گئی تھی۔ اس سے رات کو میرے پیٹ میں خاصی گرج چمک کے ساتھ طوفان آیا۔

وحید اور اس حسینہ کی مجھے صورت نظر نہ آئی۔ انہوں نے کھانا بھی کمرے میں کھایا ہوگا۔ چائے بھی وہیں پی ہوگی اور باقی وقت بند کمرے میں کیا کرتے رہے ہوں گے؟ اس خیال سے مجھے دکھ ہوتا تھا کیونکہ میں محض خوار ہو رہا تھا۔ شام کی چائے کے لیے پھر ہال میں بیٹھ کے میں نے سوچا کہ آخر اس خبیث کا پتا چلانے کے لیے مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ میں براہِ راست کاؤنٹر پر جاکے اور تصویر دکھا کے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس شخص کا نام کیا ہے اور وہ کس کمرے میں روپوش ہے؟

دوسرا طریقہ مخبری کا تھا۔ میں کسی غریب اور لالچی ویٹر کی خدمات حاصل کروں جو مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرکے کچھ دولت مند ہوجائے۔ اس کے لیے ہزار کا ایک نیا خوبصورت نوٹ دکھانا بھی کافی ہوتا لیکن میں دو بھی خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔ کام ذرا بھی خطرناک نہیں تھا۔ مسئلہ صرف رازداری کا تھا۔ میں چائے پیے بغیر اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں چائے منگوالی۔

روم سروس میں چائے فراہم کرنے والا ویٹر مجھے صورت سے خاصا فاقہ کش اور بے وقوف لگا۔ وہ چائے لے کر آیا تو میں نے احتیاط کے ساتھ بات شروع کی۔ ''کیا نام ہے بھئی تمہارا؟''

اس نے رک کے کہا ''کاشم شاب..... آبول کاشم۔''

وہ بنگالی تھا چنانچہ میں نے اس کے تلفظ کو درگزر کیا ''ابوالقاسم..... کب سے ملازم ہو؟''

اس نے حساب لگا کے بتایا ''او بھی بوکرا کوٹنے والا عید پر شوڑھے شات شول ہوزائے گا شاب!''

''ساڑھے سات سال بعد کتنا کما لیتے ہو؟ گزارا ہوجاتا ہے؟''

اس نے ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراطِ زر اور ہوشربا مہنگائی کے اس دور میں سات بچوں' ایک بیوی' ماں باپ اور سات بہن بھائیوں کا کنبہ تو ستر ہزار میں بھی گزارا نہیں کرسکتا۔ یہاں سب ملا کے سات ہزار بھی نہیں ہوتے۔ آنے والے بھی کنجوس اور کمینے ہوگئے ہیں۔ ٹپ بیس سال پرانے ریٹ پر دیتے ہیں۔

میں نے کہا ''اگر تم میرا ایک چھوٹا سا کام کردو۔ تو میں تمہیں ایک ہزار دے سکتا ہوں۔'' میں نے نوٹ میز پر ڈال دیا۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور رال ٹپکنے لگی۔ ''کوردے گا شاب.....''

میں نے اسے کام بتانے کے لیے تصویر دکھائی ''اسے دیکھا ہوگا تم نے۔ یہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے' ایک عورت بھی اس کے ساتھ۔''

اس نے سر کو اوپر نیچے کیا ''ایک دم ہے شاب!''

میں نے کہا ''اس کا نام معلوم کرو۔ اور یہ بتاؤ وہ کس کمرے میں ہے مگر یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ کسی کو پتا نہ چلے۔''

''نہیں پوتا چولے گا شاب!'' اس نے جھپٹ کے نوٹ دبوچا اور سلام کرکے غائب ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ آدھے گھنٹے کا کام بھی نہیں تھا مگر اس کی صورت مجھے رات تک دکھائی نہ دی۔ میں کھانے کے لیے پھر نیچے گیا اور ایک ویٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ابوالقاسم تو دن کی شفٹ میں تھا۔ آٹھ بجے چھٹی کرگیا۔ اس وقت سوا آٹھ بجے تھے۔ مجھے سخت طیش آیا مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ رات نو بجے میں نے وحید کو اس عورت کے ساتھ باہر جاتے دیکھا۔ ان کی تیاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی تقریب میں نہیں تو پھر گھومنے پھرنے یا کھانے پینے کے لیے جارہے ہیں۔ اگر مجھے کمرے کا نمبر ہی معلوم ہوجاتا تو میں خود معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ خیر' ابوالقاسم صبح تو آئے گا۔

صبح میں نے روم سروس سے بیڈ ٹی منگوائی تو ایک بلوچ نمودار ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آج وہ میری خدمت پر مامور ہے اور ابوالقاسم کی ڈیوٹی دوسرے فلور پر لگادی گئی ہے۔ خود اس کی درخواست پر۔ مجھے پھر طیش آیا اور میں نے کچھ دیر بعد اسے تلاش کرلیا۔

''ابوالقاسم..... یہ کیا ہے' تم سے ایک کام کہا تھا کل۔''

اس نے رکھائی سے کہا ''ہوم کو اینگ کش نہیں آتا شاب۔ ہوم یہ کوم نہیں کورکوسکتا۔''

میں نے بگڑ کے کہا ''نہیں کرسکتے تھے تو ذمے داری

کیوں لی تھی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نام انگلش میں ہی لکھے جاتے ہیں۔ لاؤ پیسے واپس کرو۔''

''کورے گا شاب۔ ایک دم کورے گا۔ ابھی نہیں کور..... کوسکتا'' اس نے اپنی خالی جیبوں کی نمائش کی اور پھر ایک تقریر جس کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ روز بس سے گھر جاتے ہوئے اس کی جیب کٹ گئی اور ہزار روپے کا نوٹ نکل گیا۔ اب یہ قرض حسنہ ہے جو وہ ایک دن ضرور لوٹائے گا۔ پھر وہ راستہ کاٹ کے نکل گیا سب سے بے وقوف نظر آنے والا ویٹر مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔

اس کی چالاکی نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ جو شخص ناقابلِ اعتبار ہو وہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی وقت مجھ سے اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت مانگ بیٹھے ورنہ دھمکی دے کہ میں منیجر کو بتادوں گا کہ آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ یا وہ وحید کے پاس جائے اور کہے کہ آپ کا کوئی دشمن آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اسی ہوٹل میں موجود ہے۔ وحید تو بدک جائے گا اور معلوم کرنا چاہے گا کہ وہ کون ہے۔ ابوالقاسم اس سے بھی کچھ اینٹھ لے گا۔ خیر' اس ویٹر کی اولاد نے میرا کام خراب کیا تو میں بھی اس کا مستقبل خراب کردوں گا۔

ابھی میں غصے کی کیفیت میں بجھی ہوئی گیلی لکڑی کی طرح دھواں دے رہا تھا کہ تقدیر کو مجھ پر رحم آگیا۔ میرے سامنے کوریڈور میں ایک دروازہ کھلا اور وحید اس حسینہ کے ساتھ برآمد ہوا۔ آج وہ زیادہ منحوس شکل کا اور وہ کہیں زیادہ قیامت خیز لگ رہی تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ سیدھے لفٹ کی طرف گئے اور نیچے اتر گئے۔ یہ وقت ان کے ساحلِ سمندر پر انجوائے کرنے کا تھا۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا گیا اور ان کے کمرے کا نمبر نوٹ کرلیا۔ یہ کمرا میرے کمرے کے عین اوپر تھا۔ میں نے نیچے جانے کے لیے لفٹ کی واپسی کا انتظار نہیں کیا اور زینے کی طرف بڑھا۔ عین اسی وقت ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور صفائی کرنے والی عورت ایک ٹرالی کے ساتھ باہر آئی۔ ٹرالی پر میلی چادر اور تکیے کے غلاف تھے اور ہوٹل کے مونوگرام والا ڈسٹ بن تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ کمرا ابھی ابھی خالی ہوا تھا اور اس موقع سے یقیناً فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

منیجر کو اس میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے مسکرا کے کہا ''شیور سر!'' اور میرا کمرا بدل دیا۔ دس منٹ بعد ایک بیل بوائے نے میرا سوٹ کیس کمرا نمبر تین سو چھبیس میں پہنچادیا۔

یہ میرے نقطۂ نظر سے بڑی کامیابی ہی تھی۔ اب وحید مراد کے اور میرے درمیان صرف ایک دیوار رہ گئی تھی۔ کامیابی مجھے اپنی دسترس میں نظر آنے لگی تھی۔

اب معمول کے مطابق میں نے بھی سمندر کا رخ کیا۔ جلدی کی اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک اخبار مجھے ہوٹل کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا۔ باقی میں ہوٹل کے بک اسٹال سے خریدتا تھا۔ یہ ضرورت سے زیادہ ایک عادت تھی۔ لاہور میں مجھے اردو اور انگریزی کے تقریباً تمام اخبارات کی اعزازی کاپی بلا معاوضہ ملتی تھی۔

انہیں میں نے کچھ فاصلے پر بھیگے جسموں کے ساتھ ریت پر دراز دیکھا تو صدمے سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ پہلوئے حور میں لنگورِ خدا کی قدرت۔ تصویر اتارنے کا آج بھی کوئی موقع نہ تھا حالانکہ آج میرے گاؤن کی جیب میں کیمرا موجود تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کے ساحل کا اور اس بہانے ان کا نظارہ کرتا رہا۔ میرے آس پاس ہر قسم کے لوگ تھے۔ کچھ عمر رسیدہ لیکن بیشتر جوان جوڑے جو وہاں ہنی مون کے موڈ میں خرمستی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ میرے جیسے تنہا اداس الو بہت کم تھے۔

کچھ دیر بعد وہی ہوا جو گزشتہ روز ہوا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کے جوس پیتے رہے اور میں سرخیاں دیکھ کے اخبارات ایک طرف رکھتا گیا۔ پھر اچانک میرے کانوں نے وہی مترنم آواز سنی۔ ''جی' کیا میں یہ اخبارات لے سکتی ہوں؟'' اور میں نے اخبار سامنے سے ہٹایا تو اس کے بدن کی رعنائی کا نیا انداز دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ آج اس نے لباس کو مزید مختصر کردیا تھا جو بڑی ہمت کی بات تھی کیونکہ یہ یورپ نہیں' پاکستان تھا۔ جب وہ اخبارات کا پلندا لے کر گئی تو غالباً دونوں طرف سو سو فٹ کے فاصلے سے ہر نگاہ اسی پر مرکوز تھی۔ خواتین اسے حسد سے دیکھ رہی تھیں' حضرات حسرت سے۔

جب میں پانی کے اندر گیا تو اس حسرت نے مجھے بھی بے قرار کیا کہ کاش وہ بھی میرے ساتھ میری بانہوں میں ہوتی' جیسے کہ وحید کے ساتھ تھی مگر پھر میں نے دیکھا تو وہ کسی بات پر بحث کررہے تھے یا لڑ رہے تھے۔ عورت اسی طرح جھنجلاتی واپس گئی۔ مرد نے تمام اخبارات میری کرسی کی سیٹ پر رکھے۔ سوائے ایک اخبار کے۔ پھر وہ بھی لوٹ گیا۔

ان کے غائب ہونے کے کچھ دیر بعد میں پانی سے نکلا۔ آخر وہ ہر روز ایک اخبار کیوں لے جاتے تھے۔ یہ اخبار وہ خرید بھی تو سکتے تھے۔ اس ہوٹل میں غریب لوگ بہرحال نہیں ٹھہرتے۔ میں نے اخبارات کا بنڈل اٹھا کے دیکھا۔ آج

اس میں دوسرا اخبار کم تھا۔

واپس اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے غسل کیا اور لباس بدلا۔ میرے پڑوسی ابھی تک کمرے میں ہی تھے۔ ان کے کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ وہ خبریں سن رہے تھے۔ میں نے کرسی کا رخ دروازے کی طرف رکھا اور دروازے کو تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر میں بھی ایک ''ان ہاؤس'' مووی دیکھتا رہا۔ پھر ریموٹ سے ٹی وی کا منہ بند کیا اور امجد فاروقی کا نمبر ملایا۔

''میں قاضی قدوس قریشی تفتس قازقستانی بول رہا ہوں'' میں نے اس کے ہیلو کے جواب میں کہا۔

''کیا..... کون.....؟'' وہ گھبرا گیا۔

میں نے کہا ''پی بی ایس..... اب پہچانا؟''

''اوہ' یار! اتنا مشکل نام کیسے ایجاد کیا تم نے۔ سارے قاف میرے حلق میں پھنس جاتے تو میرا سانس بند ہو جاتا۔''

''یہی میرا اصل نام ہے۔ آخر میں تخلص ہے کیونکہ میں کبھی نہ کبھی شاعری بھی ضرور کروں گا۔ خیر' تمہیں مبارک ہو' تمہارا کام ہو گیا ہے تقریباً.....'' میں نے کہا۔

''واقعی.....!'' وہ خوشی سے چلایا ''مجھے پتا تھا تم اس حرام زادے فراڈیے کو پکڑ لو گے..... مگر یہ تقریباً کیا بات ہوئی؟''

میں نے کہا ''وہ مل گیا ہے۔ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔''

''تو پھر دیر کیسی..... بلاؤ پولیس کو اور گرفتار کرا دو یا پہلے ایک ہاتھ مار کے لمبا ڈال دو'' وہ جوش سے بولا۔

میں نے کہا ''فاروقی صاحب! جلدی کا کام شیطان کا۔ ذرا میں تصدیق کر لوں..... قد کاٹھ شکل صورت سب وہی ہے مگر مشابہت اتفاقیہ بھی ہو سکتی ہے۔ یقینی شناخت کا ذریعہ صرف فنگر پرنٹس ہو سکتے ہیں۔''

''ہوٹل میں کس نام سے ٹھہرا ہے وہ؟''

''یہ بھی پتا چل جائے گا۔ دراصل میں نہیں چاہتا کہ اسے ذرا بھی شک ہو ورنہ وہ غائب ہو جائے گا۔ آہوئے صیاد دیدہ کی طرح۔''

فاروقی نے بوکھلا کے کہا ''کس کی طرح۔''

''جیسے گدھے کے سر سے سینگ'' میں نے آسان مثال دی ''اس کے ساتھ وہ عورت بھی ہے' مجسم قیامت' وحید تو ہو گا عمر میں اس سے دگنا' بھدا اور گنجا مگر وہ عورت ہے کہ اس سے چمٹی ہوئی ہے.....''

''چمٹی ہوئی ہے' یعنی اس وقت بھی؟ دن دیہاڑے' سرعام..... ذرا تفصیل سے بیان کرو یہ منظر۔ تم کہاں ہو' وہ کہاں ہیں.....؟ اور ان کے کپڑے.....'' اس نے ہکلا کے کہا۔

☆☆☆

میرے کانوں نے ایک چوکنا کر دینے والی آواز سنی تھی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند کیا گیا تھا۔ پھر قفل میں چابی گھمانے کی آواز آئی اور میں نے انہیں اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتا دیکھا۔ میں نے تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے سے سر نکال کے باہر جھانکا تو وہ کوریڈور میں لفٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وحید نے سوٹ پہن رکھا تھا اور عورت نے مختصر ترین بلاؤز کے ساتھ ساڑی باندھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اہم ملاقات یا تقریب میں شرکت کے لیے نکلے ہیں یا پھر گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے کے موڈ میں ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ وہ کافی وقت باہر گزاریں گے اور یہ میرے لیے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

طویل کاریڈور میں سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کوئی ویٹر برتن یا استری والے کپڑے لاتا لے جاتا نمودار ہو جاتا تھا یا کوئی مہمان کمرے سے نکل کے لفٹ کی جانب رواں نظر آ جاتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو جوش سے مل کے پھونک ماری اور زیر لب کہا ''یا مولا تیرا ہی آسرا'' اور پھر اپنے سوٹ کیس میں سے مخصوص آلات نقب زنی کی مشکل کشا کٹ نکالی۔ یہ کٹ مجھے ایک خاندانی قسم کے پیشہ ور چور نے بطور تحفہ پیش کی تھی۔ بوجوہ وہ اس پیشے سے تائب ہو گیا تھا۔ ایک رات اس نے والد ماجد یا دادا جان کو خواب میں دیکھا جو اسے ملامت کر رہے تھے کہ شرم کرو' چوری کرتے ہو۔ ہمارا نام بدنام کرتے ہو بزدل۔ ارے مرد بنو اور ڈاکے ڈالو۔ اس نے ایسا ہی کیا' فی زمانہ وہ ایک کامیاب ڈاکو تھا۔

اس کٹ میں مختلف اقسام کے تالے کھولنے والے سائنسی آلات تھے۔ وہ ان کی مدد سے قصر سلطانی سے چندے والی آہنی صندوقچی' گھر کے قفل سے بینک کے لاکر اور سیٹھ کی تجوری سے حوالات تک کے تالے کھول چکا تھا۔ ایک شارٹ کورس کے ذریعے اس نے اپنی مہارت مجھ تک منتقل کر دی تھی اور تب سے میرے کام آ رہی تھی۔

ایک نکیلی خم دار سلائی اور دندانے والے پتلے لمبے اسکریو ڈرائیور نے ولایتی ہینڈل والے قفل کو پانچ سیکنڈ میں کھول دیا۔ ظاہر ہے یہ حیران کن عملی مظاہرہ کرتے مجھے کسی نے بھی نہیں دیکھا ورنہ اس وقت یہ کہانی پڑھنے کے بجائے آپ جیل میں میرے روز و شب کی آپ بیتی پڑھتے۔ اگلے

پانچ سیکنڈ میں ہینڈل گھما کے میں کمرا نمبر تین سو پچیس میں داخل ہو چکا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹینٹڈ سرمئی رنگ کے تھے اور ان کے سامنے دہرے پردے تھے۔ ایک ورٹیکل بلائنڈ اور دوسرے سیاہی مائل سبز شنیل کے جو اسٹیج کے پردوں کی طرح دونوں طرف بڑی خوبصورتی سے سمیٹ دیے جاتے تھے۔ ایک لائٹ جلا کے میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ چیزیں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر چھوڑ گئے تھے۔ وارڈروب میں ان کے کپڑے الگ الگ لٹکے ہوئے تھے۔ نیچے ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے بریف کیس کو چھپانے کی واجبی سی کوشش کی گئی تھی۔

میں نے پہلے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں بھی کپڑے تھے۔ کچھ ایسے میگزین جو اب صرف بزرگ پڑھتے ہیں۔ کچھ دوائیں جو یقیناً وحید استعمال کرتا ہو گا۔ مجھے ایک شعر یاد آیا۔ مہکیں تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ۔ اللہ کرے (میرا) زور شباب اور زیادہ۔ سوٹ کیس بند کر کے میں نے بریف کیس کھینچا۔ ایک منٹ میں اس کا نمبروں والا لاک بھی کھل گیا۔ اندر لاکھوں کی مالیت کے نوٹ تھے۔ ڈالر اور پاؤنڈز۔ ان کے نیچے مجھے دو پاسپورٹ ملے۔ ایک پر وحید مراد کی تصویر تھی مگر اس کا نام مرزا نظام الدین ولد مرزا اسلام الدین لکھا ہوا تھا۔ پاسپورٹ کراچی سے جاری ہوا تھا اور تین سال پرانا تھا۔ اس کی ورق گردانی سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک بار لندن گیا تھا۔ دبئی' کویت اور بحرین اکثر جاتا تھا۔ پھر مجھے دوسرا پاسپورٹ ایک پاکٹ سے ملا جو سات سال پرانا تھا اور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے تمام صفحات ویزا کی مہروں سے بھرے ہوئے تھے۔ روپوشی کے بعد اس کا زیادہ وقت باہر گزرا تھا۔ وہ ہانگ کانگ' سنگاپور اور بنکاک آتا جاتا رہا تھا۔

ویسے تو ان شہروں میں سیاحوں کے لیے بھی بڑی کشش تھی لیکن پاکستان سے جانے والوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو پہلے اسمگلر کہلاتے تھے' اب امپورٹر ایکسپورٹر ہو گئے تھے۔ معمولی سرمائے سے تھوڑا سا اسباب تجارت اپنے پرسنل بیگ میں لے جانے والے ان شہروں کا ایک چکر لگا کے آتے تھے تو وہاں سے ایسا سامان لے آتے تھے جس کی پاکستان میں مانگ تھی۔ پاکستانی مال سنگاپور' ہانگ کانگ' بنکاک یا دبئی میں بیچ کے اور ممنوعہ سمجھا جانے والا مال وہاں سے پاکستان لا کے بیچنے میں نہ صرف یہ کہ کرایہ اور دیگر اخراجات نکل آتے تھے بلکہ تھوڑا بہت منافع بھی ہزاروں میں ہوتا تھا چنانچہ بے روزگار اور شوقین نوجوان یہ کام خطرہ مول لے کر بھی کر رہے تھے۔

ایسے سیاح کھیپی مشہور ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک بہت بڑا بزنس بن گیا تھا جس میں لاکھوں کھیپی شریک تھے۔ پاکستانی تاجر انہیں اپنا مال دے کر بھیجتے تھے۔ باہر وہ ایک ہی جگہ یہ مال پہنچاتے تھے اور جو مال انہیں دیا جاتا تھا وہ پاکستان پہنچا کے فارغ ہو جاتے تھے۔ سیر اور عیاشی مفت میں۔ پکڑے وہ اس لیے نہیں جاتے تھے کہ انہیں مال فراہم کرنے اور ان سے مال لینے والے بہت بڑے بزنس مین تھے اور ان کی ہر ائرپورٹ پر کسٹم حکام سے ملی بھگت تھی۔

اکثر کھیپی کچھ عرصے بعد منافع سے خوشحال ہو جاتے تھے۔ تجربہ حاصل کر لیتے تھے اور اتنے ذاتی تعلقات استوار کر لیتے تھے کہ آزادانہ بزنس کر لیتے تھے۔ اپنا بزنس آفس بنا لیتے تھے اور امپورٹر ایکسپورٹر بن کے دوسروں سے مال بھیجنے اور منگوانے لگتے تھے۔ غالباً یہی وحید مراد نے کیا تھا۔

اس نے روپوشی کے بعد ایک شناختی کارڈ ناظم الدین ولد سلام الدین کے نام سے بنوایا اور کھیپ کا کام کرنے لگا۔ چار سال بعد شاید وہ کسی قانونی چکر میں پھنس گیا۔ ممکن ہے گرفتار ہو کے جیل بھی گیا ہو مگر تعلقات کی وجہ سے یا رشوت کے بل پر رہا ہو گیا۔ پھر اس نے دوسرا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نظام الدین ولد اسلام الدین کے نام سے حاصل کیا۔ یہ بڑی ذہانت کی بات تھی۔ یہاں تو لوگ اس فرق کو سمجھ سکتے تھے لیکن باہر جن لوگوں سے اس کے کاروباری مراسم تھے انہیں سننے میں ناظم الدین اور نظام الدین ایک سے محسوس ہوتے ہوں گے اور سلام الدین یا اسلام الدین بھی۔

بریف کیس میں شناختی کارڈ ایک بھی نہیں تھا۔ شاید اس نے پہلے والا شناختی کارڈ ضائع کر دیا ہو گا۔ اب وہ نظام الدین ولد اسلام الدین اور آٹھ سال میں یقیناً بہت دولت کما چکا تھا۔ چنانچہ اس ہوٹل میں ایک زرخرید حسینہ کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔ میں نے دونوں پاسپورٹس کے نمبر اور ضروری معلومات نوٹ کرنے کے لیے کاغذ قلم تلاش کیا تو بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے مجھے ایک نوٹ بک ڈائری مل گئی جس کے اندر ہی نازک سا بال پوائنٹ پین بھی موجود تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ڈائری کے سارے نام مع فون نمبروں کے کاپی کرتا۔ میں نے ایک سادہ صفحہ پھاڑ کے مطلوبہ معلومات کا اندراج کیا۔ اس کے ساتھ میں نے کچھ فون نمبر بھی اتار لیے۔

مزید تلاشی پر مجھے سوٹ کیس کی سائیڈ میں ایک خفیہ

پاکٹ سے اس عورت کا پاسپورٹ بھی مل گیا۔ اس کا نام سیما نظام اور اس کے شوہر کا نام نظام الدین درج تھا۔ میرے دل کو سخت جذباتی صدمہ ہوا۔ پتا نا ظم آباد کا تھا اور تاریخ پیدائش کے حساب سے اس کی عمر چھتیس سال ہو چکی تھی۔ دو چار سال کی ڈنڈی اس نے ضرور ماری ہوگی ورنہ اصل عمر چالیس بھی ہوتی' اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ سارا کمال اس کے حسن و شباب کی جلوہ سامانی اور اس تجربے کا تھا جو وہ مال دار مردوں پر اپنا جادو چلانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔

میں وقت کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ پون گھنٹے بعد میں اپنے مطلب کی ہر بات جان چکا تھا۔ میرے پاس ایسا کیمرا نہیں تھا کہ میں پاسپورٹ کے صفحات کی تصویریں بنا سکتا۔ ان کی فوٹو کاپی بنوانا بھی مشکل تھا۔ میرے اعصاب پر یہ خوف بھی سوار تھا کہ کہیں وحید مراد اور اس کی محبوبہ میری توقع کے خلاف اچانک نہ لوٹ آئیں اور مجھے اپنے کمرے میں موجود پا کے شور مچانے یا گرفتار کرانے کے بجائے گولی مارنے کے راست اقدام سے محروم کر دیں۔ قانونی طور پر انہیں اس کا حق حاصل تھا اور وہ قانون کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔ اس ڈر کے باوجود میرے ذہن میں اپنی جان بچانے کے لیے کوئی پلان نہیں تھا۔ فرار کا واحد راستہ وہی تھا جس سے میں اندر آیا تھا۔ نہ میں کہیں چھپ سکتا تھا اور نہ میرے پاس سلیمانی ٹوپی تھی جسے پہن کے میں غائب ہو جاؤں تو انہیں نظر نہ آؤں۔ بس اللہ کو میری زندگی اور عزت بچانی تھی کہ میرے فارغ ہونے تک دشمن نے مداخلت نہیں کی۔ میں نے ہر چیز کو بڑی احتیاط کے ساتھ اسی طرح رکھا جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے اور میرے خیال میں جب میں رخصت ہوا تو میں نے اپنی تشریف آوری کا شک پیدا کرنے والی کوئی علامت نہیں چھوڑی تھی۔

تاہم یہ میری خوش فہمی تھی جو بہت جلد دور ہوگئی۔ میں نے نظر نہ آنے والے فنگر پرنٹ تک مٹا دیے تھے مگر ایک بہت بڑی بات بھول گیا تھا۔ میں نے خودکار لٹو والے تالے کا بٹن اندر سے دبایا اور دروازے کو کھینچ کے بند کیا تو وہ لاک ہوگیا۔ واپس اپنے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے اپنی غلطی کا خیال آیا تو میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ جب میں چوروں کی طرح داخل ہوا تھا تو اس کمرے میں اندھیرا تھا اور میں نے لائٹ جلا دی تھی۔ واپسی پر میں لائٹ آف کرنا بھول گیا تھا۔

میں پھر اپنے کمرے سے نکلا مگر مجھے حالات ناسازگار نظر آئے۔ کوریڈور کی صفائی ہو رہی تھی دو افراد فرش کو صاف کرنے کے بعد پالش سے چمکا رہے تھے اور مخالف سمتوں میں ہونے کی وجہ سے پورے کوریڈور پر ان کی نظر تھی۔ وہ آدھے گھنٹے تک مصروف رہے اور میں آلات سے لیس بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ خدا خدا کر کے وہ دفع ہوئے تو ایک اور شخص نمودار ہوگیا۔ وہ دروازوں کو باہر سے صاف کرنے اور ہینڈل وغیرہ چمکانے پر مامور تھا۔ میرا خود کو دلاسا دینا لاحاصل رہا کہ وہ اتنی جلدی آنے والے نہیں ہیں۔ لاک چمکانے والا آخری حصے میں تھا کہ وہ نمودار ہوگئے۔

اس کے بعد میں یہی دعا کر سکتا تھا کہ خدا کرے وہ لائٹ جلتی دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ یہی سمجھیں کہ جاتے وقت وہ سوئچ آف کرنا بھول گئے تھے۔ دن کا باقی حصہ ہم نے اپنے اپنے کمروں میں مقیدرہ کے گزارا۔ نہ وہ باہر نکلے نہ میں اس خیال سے کہیں گیا کہ مجھے ان پر نظر رکھنی تھی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ آخر بند کمرے میں وہ کیا کر رہے ہوں گے اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ رات کو وہ بھی کھانے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں گئے تو میں بھی گیا مگر ان سے کچھ دور ایسے زاویے پر بیٹھا کہ رقیبِ روسیاہ مجھے نہ دیکھے لیکن اس کافر ادا کے رخِ روشن کا اجالا میرے دل میں اترتا رہے۔ میں نے تسلیم کیا کہ وہ بے انتہا کشش رکھنے والی عورت ہے جس کے حصول کی خواہش کسی بھی مرد کو اسی طرح مغلوب کر سکتی ہے۔

رات کو میں نے امجد فاروقی سے پھر فون پر بات کی اور اسے اپنی کامیابی سے مطلع کیا۔ ''اب وہ روپوش نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے نمبر حاصل کر لیے ہیں۔''

''پی بی..... وہ سب جعلی ہوں گے۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہوا تو وہ تیسرا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا کے نکل جائے گا اور کیا پتا اس کے پاس کہیں دو چار پاسپورٹ اور پڑے ہوں۔''

''ابھی تک اسے کوئی شک نہیں۔ بس ایک بات مجھے رہ رہ کے کھٹکتی ہے کہ آخر وہ اتنے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ حلیہ بدلے بغیر کیوں گھوم رہا ہے۔ جیسے اسے کسی کا ڈر ہی نہیں۔ وہ اتنا بے وقوف تو نہیں تھا۔ وہ کوئی اس جیسا نہ ہو' یہ تصدیق ہو جائے۔''

''تصدیق کو گولی مارو۔ یہ کام پولیس کر لے گی۔ تم ان دونوں کو اندر کرا دو۔''

''مگر کیسے..... کس جرم میں اور کس حیثیت سے۔ میں اس معاملے میں کوئی فریق نہیں ہوں۔ مدعی کیسے بن سکتا ہوں' میں رپورٹ کیسے لکھواؤں؟''

''یار! تم سب کچھ کر سکتے ہو اور پاکستان میں سب ہوتا ہے۔ بے گناہ روز پکڑے جاتے ہیں اور تفتیش کے بعد چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ وہ کون سا پولیس پر کیس کرتے ہیں کہ ان کی بلاوجہ چھترول ہوگی یا بے عزتی ہوگی۔''

میں نے کہا ''او کے۔ صبح میں کچھ کرتا ہوں کہ پولیس تمہارے آنے تک انہیں روکے رکھے' میرا کام ختم۔''

''میں آتا ہوں پہلی فلائٹ سے'' وہ جوش سے بولا۔

معمول کے مطابق صبح میں بیڈ ٹی نوش فرما کے ساحل پر جانے کے ارادے سے نکلا تو ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کے دیکھا تو میرے دل کو دھکا لگا۔ اندر ایک عورت صفائی میں مصروف تھی۔ اس نے بیڈ پر سے چادر ہٹائی۔ پھر تکیوں کے غلاف اتارے۔ اندر اور کوئی نہیں تھا۔

میں نے اندر جا کے کہا ''یہ لوگ کہاں گئے؟''

صفائی کرنے والی پلٹی ''کون لوگ.....؟''

''جو اس کمرے میں تھے..... وحید..... میرا مطلب ہے نظام الدین!''

اس نے لاعلمی ظاہر کرنے کے لیے سر ہلایا ''ہم کو کیا معلوم؟''

میں نے کہا ''رات کو تو وہ یہاں تھے۔''

''ہوں گے جناب!'' وہ صفائی میں مصروف رہی۔

میں نے الماری کھول کے دیکھی۔ پھر درازوں میں دیکھا۔ وہ کچھ بھی چھوڑ کے نہیں گئے تھے۔ مجھے ڈسٹ بن نظر آیا جو اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے الٹ دیا۔ صفائی کرنے والی عورت پریشان ہوگئی۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب!'' وہ بولی مگر میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ڈسٹ بن میں سے اخبار کے دو تراشے نکالے جو دو دن پرانے اخبار سے پھاڑ کر الگ کیے گئے تھے۔ اپنے کمرے میں آ کے میں نے شکن آلود پرزے کو سیدھا کیا تو مجھے ایک خبر نظر آئی۔ ''لانڈھی کی بچہ جیل سے چار نوعمر مجرم فرار!'' میں نے اس خبر کی تفصیل دیکھی اور پھر پھٹے ہوئے حصے کو پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کارپوریشن کی مچھر مار مہم کی ناکامی پر اداریے کا ایک حصہ تھا۔ پھر میں نے دوسرے تراشے کو دیکھا۔ اس پر سندھ اور پنجاب کی سرحد پر واقع صادق آباد کے حوالے سے ایک خبر تھی ''کراچی جیل سے فرار ہونے والا ایک نوعمر مجرم گرفتار۔ دوسرا شدید زخمی۔''

پہلی خبر کی تفصیل میں یہ تھا کہ سولہ سے اٹھارہ سال کی عمر کے چار نوعمر مجرم جو سنگین نوعیت کے جرائم میں مختلف معیاد کی سزائیں کاٹ رہے تھے' لانڈھی کی بچہ جیل سے رات کی تاریکی میں فرار ہوگئے۔ متعلقہ حکام نے اس واردات میں حفاظتی عملے کے ملوث ہونے کا شک ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ایک وارڈن اور چھ پہرے داروں کو معطل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر میں کسی بھی مجرم کا نام نہیں تھا۔

دوسری خبر میں بتایا گیا تھا کہ لانڈھی جیل سے فرار ہونے والے چار نوجوانوں نے پہلے کراچی سے دو موٹر سائیکلیں چھین کر نیشنل ہائی وے کا راستہ اختیار کیا۔ موٹر سائیکلیں انہوں نے حیدرآباد سے آگے چھوڑیں اور ایک چھینی ہوئی گاڑی میں خیرپور تک سفر کیا۔ پیٹرول ختم ہو جانے کے بعد انہوں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑ دیا اور غالباً باقی راستہ کسی ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لے کر طے کیا۔ صادق آباد میں انہوں نے ایک عورت کو روک کر کار چھیننے کی کوشش کی اور مزاحمت پر عورت کو گولی مار دی۔ کچھ آگے جا کے انہوں نے ناکا بندی کرنے والی پولیس پارٹی پر گولی چلائی مگر جوابی کارروائی میں دو مفرور قیدی ہلاک ہوگئے۔ تیسرا شدید زخمی بہاولپور اسپتال میں زیرِ علاج ہے اور پولیس کی تحویل میں ہے۔ تاہم چوتھا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا' پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ خبر میں ان سب مجرموں کے نام تھے۔ زندہ سلامت فرار ہو جانے والے مجرم کے نام نے مجھے چونکا دیا۔ اس کا نام سلطان وحید مراد بتایا گیا تھا۔ اس کی عمر چودہ سال تھی۔

یہ بڑا غیر معمولی نام تھا اور یہ ثابت کرتا تھا کہ یہ اسی وحید مراد کا بیٹا ہوگا جو دنیا کے لیے آٹھ سال قبل ہی خودکشی کر چکا تھا مگر درحقیقت مختلف ناموں سے زندہ تھا۔ یہ صورتِ حالات میں نیا موڑ تھا جس نے میرے ذہن میں بہت سے شبہات اور امکانات کو جنم دیا۔ شاید وحید مراد اپنی ساتھی عورت کے ساتھ راتوں رات اسی لیے فرار ہوا تھا کہ ایک طرف اسے کمرے میں لائٹ جلتی دیکھ کے شک ہوا ہوگا کہ کسی نے کمرے کی تلاشی لی ہے تو دوسری طرف اپنے بیٹے کے بارے میں ایک تشویش ناک خبر نے بھی اسے فرار پر مجبور کیا ہوگا۔

میں نے فوراً امجد فاروقی کو فون کیا۔ میری آواز سنتے ہی اس نے کہا ''پی بی ایس۔ امید ہے شام کی فلائٹ پر مجھے سیٹ مل جائے گی۔''

میں نے کہا ''اب کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''یار' وہ نکل گیا۔ رات کو کسی وقت غائب ہوگیا۔''

''مگر کیسے.....؟'' اس نے برہمی سے کہا۔

''کیسے کا کیا مطلب۔ ہوٹل سے کوئی کسی بھی وقت چیک آؤٹ کرسکتا ہے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تو اس کا کمرا خالی تھا۔''

''تمہاری اتنی نگرانی کے باوجود.....؟''

میں نے کہا ''فاروقی صاحب! میں کیا رات بھر ڈنڈا لیے دروازے پر بیٹھا تھا چوکیداری کے لیے؟''

''تم نے معلوم کیا وہ کہاں گیا؟''

''یار! بے وقوفی کی باتیں ضرور کرو مگر ایسی نہیں کہ تمہارے دماغ کی خرابی ظاہر ہو۔ وہ کیا بتا کے گیا ہوگا کہ اب میں فلاں جگہ جارہا ہوں۔ ڈاک اور ملاقاتی اس پتے پر آجائیں۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' فاروقی پر رقت طاری ہونے لگی ''اب وہ کہاں ہاتھ آئے گا۔''

''ایک امید کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ وحید مراد جب غائب ہوا تو اس کے کتنے بچے تھے اور کیا عمر تھی ان کی؟''

''میں نے بتایا تھا۔ بڑا بارہ سال کا تھا' چھوٹا سات سال کا۔''

میں نے کہا ''کیا چھوٹے والے کا نام سلطان وحید مراد تھا؟.....پورا نام؟''

''ہوگا.....یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''یہ میں تمہیں لاہور آکے بتاؤں گا'' اور فون بند کردیا۔

اس روز مجھے کسی بھی فلائٹ سے لاہور کی سیٹ نہ ملی۔ مجھے مزید ایک روز کراچی میں رکنا پڑا۔ کراچی میں کسی وکیل سے تو میری جان پہچان نہ تھی مگر صحافت کے حوالے سے میرا نام اب غیر معروف نہیں رہا تھا۔ میں نے آدھا دن پریس کلب میں گزارا اور شام کو سینٹرل جیل گیا۔ وہاں ایک نیا جیلر آیا تھا۔ اس نے مجھے جیل مینوئل کے حوالے اور قاعدے ضابطے کی تکرار سے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر جب میں نے اپنے ان دوستوں کا حوالہ دیا جن سے میں ملنا چاہتا تھا تو اس کے رویے میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ ان میں سے ایک ڈاکو تھا اور دوسرا اغوا برائے تاوان کا مجرم۔ دونوں سات سات سال کی سزا کاٹ رہے تھے مگر جیل میں معزز مہمان کا درجہ رکھتے تھے اور میرے لیے ان کے دل میں اچھے جذبات کبھی کم نہ ہوئے تھے۔

فتح جنگ کا بہادرا پہلے آگیا اور بڑی گرم جوشی سے ملا

''سر جی! ہماری یاد کیسے آگئی؟''

میں نے کہا ''میں کراچی آیا تھا' کسی کام سے۔ سوچا تم سے بھی مل لوں۔ کیا ہوا تمہاری اپیل کا؟''

''کیا ہوتا ہے جی! وکیل کو پیسے مل گئے ہیں۔ تاریخ پڑتی جارہی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آپ ہائی کورٹ میں بھی ہمارے وکیل ہوتے۔''

میں نے کہا ''اس کے لیے لائسنس لینا پڑتا ہے۔ اور میں نے وکالت کو کبھی اتنا سیریس نہیں لیا۔ میں کوئی بہت اچھا وکیل تو ثابت نہیں ہوا' تمہیں سزا سے نہ بچا سکا۔ یہاں بڑے بڑے قابل وکیل ہیں۔''

''او جی' بات قابلیت کی نہیں ہوتی۔ ذہانت کی ہوتی ہے یا بندے کی نیک نیتی کی۔ جس کے دل میں لالچ ہو وہ صرف پیسے کو دیکھتا ہے۔ نہ کسی کا ہمدرد ہوتا ہے نہ مددگار۔''

کچھ دیر بعد اغوا برائے تاوان والا چراغ علی بھی آگیا۔ اسے بھی مجھ سے بڑی خوش اعتقادی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ میں نے اس کی سیشن کورٹ میں پیروی اتنی لگن اور دلچسپی سے نہ کی ہوتی تو اسے ضرور سزائے موت سنادی جاتی۔ اب اس نے بھی اپیل دائر کررکھی تھی اور اسے بھی افسوس تھا کہ ہائی کورٹ میں وہ میری خدمات سے محروم ہے۔ چائے سے خاطر تواضع کے بعد میں نے مطلب کی بات کی۔

''یہ نئے جیلر صاحب تو قاعدے قانون کے سخت پابند ہیں' مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ سمجھتے ہیں میں تمہارا یا ان کا انٹرویو اور اندر کے حالات چھاپ دوں گا۔''

بہادرے نے سر ہلایا ''جناب عالی' یہ یاروں کا یار ہے۔''

میں نے کہا ''ابھی دو دن پہلے لانڈھی جیل سے کچھ مجرم فرار ہوئے تھے۔''

جیلر نے سر ہلایا ''ان میں سے دو مارے گئے۔ تیسرا اسپتال میں پولیس کی تحویل میں ہے۔''

''اور چوتھا فرار ہوگیا ہے۔''

''پکڑا جائے گا وہ بھی'' جیلر نے بڑے یقین سے کہا۔

''مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کا جرم کیا تھا؟''

''یہ ریکارڈ تو لانڈھی جیل حکام کے پاس ہوگا'' جیلر نے کہا۔

''اس وقت میں وہاں نہیں جاسکتا اور ایسا کوئی ہے بھی نہیں وہاں جو مجھے انفارمیشن دے سکے' آف دی ریکارڈ۔''

''لو جی!'' بہادرے نے کہا ''ادھر تو وہی بندہ ہے آج کل جو پہلے یہاں تھا۔ آپ کو جانتا ہوگا۔''

''اعتبار کا رسک کوئی نہیں لے سکتا۔ وکیل کے ساتھ آپ صحافی بھی ہیں'' جیلر نے کہا۔

''سر جی! آپ ہماری زبان پر بھی اعتبار نہیں کرتے'' بہادرے نے ایسے لہجے میں کہا جیسے جیلر کی بات سے اس کی توہین ہوئی ہے۔

''نہیں نہیں.....تم ذمے داری لیتے ہو تو.....'' جیلر نے بے تکلفی کے انداز میں اپنے خوف کو چھپالیا۔ دن رات خطرناک مجرموں سے رابطہ رکھنے والے اگر حقیقت پسندی سے کام نہ لیں تو مشکل میں پڑجائیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ڈاکوؤں کا پورا گروہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ پکڑے جائیں تو باقی باہر فعال رہتے ہیں۔ جو اندر ہوں وہ باہر جاکے زیادہ خطرناک ہوجاتے ہیں اور تمام ڈاکوؤں میں پیشہ ورانہ رقابت اپنی جگہ' مشکل وقت میں وہ اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ وہ کوئی جیلر ہو یا وزیر۔ خود کتنے بھی مسلح محافظوں کے ساتھ رہے۔ اس کا ایک خاندان بھی ہوتا ہے جس میں بچے' بوڑھے اور عورتیں سب شامل ہوتے ہیں جو اسکول بھی جاتے ہیں۔ بازار بھی اور اسپتال بھی۔ ہر جگہ وہ کتنے غیر محفوظ ہوتے ہیں۔

بہادرے کے شکایتی انداز میں چھپی ہوئی دھمکی کو جیلر صاحب نے فوراً نوٹ کرلیا ''اچھا بھئی' اگر تم کہتے ہو تو ہم مان لیتے ہیں'' اس نے کوئی فون نمبر ملایا اور ریسیور میری طرف بڑھادیا۔

دوسری طرف لانڈھی جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ تفصیلی تعارف پر اس نے مجھے پہچان لیا ''آپ کل آجاؤ۔ فون پر میں کچھ نہیں بتاسکتا۔''

میں نے کہا ''کل صبح کی فلائٹ سے مجھے واپس جانا ہے۔ بڑی مشکل سے سیٹ ملی ہے۔''

اس نے قدرے تامل کے بعد کہا ''اچھا جی۔ پھر آپ ابھی آجاؤ میرے آفس میں۔ میں اسی معاملے کی تفتیش کررہا ہوں۔ ساری فائلیں ہیں میرے پاس۔''

اگرچہ شام ہوگئی تھی مگر میں نے موقع گنوانا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے لیے ایک ٹیکسی آگئی اور جیلر صاحب نے ازراہِ عنایت ایک سادہ لباس والے پولیس اہلکار کو میری راہنمائی کے لیے ساتھ کردیا۔ جب میں لانڈھی بچہ جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس پہنچا تو رات ہوگئی تھی۔ مجھے کچھ دیر اس کے پی اے کے کمرے میں انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ مصروف تھا۔

اس کی مصروفیت دس پندرہ منٹ کے بعد برآمد ہوئی۔ وہ تقریباً تیس سال کی قبول صورت اور بھرے بھرے جسم والی عورت تھی جس کا لباس بھی عام سا تھا اور میک اپ بھی معمولی تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر دکھ' حزن و ملال اور مجبوری کے وہی تاثرات نظر آئے جو اسیروں سے جذباتی رشتوں میں بندھی ہوئی ہر عورت کے چہرے پر صاف پڑھے جاسکتے ہیں۔ پھر وہ نظر اور جسم چرا کے تیزی سے باہر نکل گئی۔ معلوم نہیں وہ کسی بیٹے کے لیے رعایت کا سودا کرنے آئی تھی یا بھائی کے لیے۔

ہم ایک دوسرے کے لیے مکمل اجنبی نہیں تھے۔ جیلر کا سارا سروس ریکارڈ میرے سامنے تھا اور وہ میری شہرت سے باخبر تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے مطلب کی بات کی ''ان چار لڑکوں کا آپس میں کیا تعلق تھا؟''

''کوئی رشتے داری تو تھی نہیں ان کی۔''

''پھر کیا جیل کے اندر انہوں نے کوئی گروہ بنالیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''لو جی۔ اب ایسی اندھیر نگری بھی نہیں ہے کہ یہ لونڈے جیل کے اندر کوئی گروہ بنالیں'' حسب عادت اس نے اپنے ہر جملے کو شاندار گالیوں سے مرصع کیا ''اور نہ تفتیش کے نتیجے میں ایسی کوئی بات سامنے آئی۔''

''پھر وہ چاروں ایک ساتھ کیسے فرار ہوئے.....اور کیوں؟''

وہ ہنسنے لگا ''جیل سے لوگ کیوں فرار ہوتے ہیں سر جی! کیا یہ بھی میں بتاؤں.....اب رہی کیسے کی بات' فلمیں دیکھتے ہو آپ؟''

میں نے کہا ''ہاں' زیادہ تر انگلش!''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ''ان فلموں میں جیل سے کیسے فرار ہوتے ہیں لوگ؟ کبھی سرنگ کھود کے نکل جاتے ہیں۔ کبھی پہرے داروں کو الو بنا کے۔ ایک انڈین فلم میں تو کمال کا سین تھا۔ کوئی ڈانسر ناچتی گاتی رہی اور جوانی کے جلوے دکھا کے اس نے سب کی نظروں کو خیرہ کردیا۔ وہ سب کو زہر آلود شراب پلاتی رہی اور سب مست ہوکے پیتے رہے۔ پھر وہ نکل گئی اپنے سچے عاشق کے ساتھ۔ ہے نا مزے کی بات؟''

میں نے کہا ''فلموں کی بات چھوڑو۔ اس میں تو لوگ چھلانگیں مار کے فصیل کے اوپر سے تیرتے ہوئے اور گولیوں کی برسات سے بچتے ہوئے بھی نکل جاتے ہیں۔ یہ نوعمر لڑکے کیسے نکل گئے؟''

وہ مجھے دیکھتا رہا ''آپ بتاؤ!''

میں نے سوچ کے کہا ''اس کی منصوبہ بندی باہر سے کی گئی۔ رائٹ! پھر اس پلان کی تمہارے ماہرین نے منظوری دی۔ جس میں مالیاتی امور سب سے اہم ہوں گے۔ جب سارے معاملات طے ہوگئے تو تم نے گرین سگنل دیا۔ اور جیسا کہ طریقۂ کار ہے۔ تم نے کچھ ذمے داروں کو معطل کردیا۔ اب تم ہی اس معاملے کی تفتیش بھی کررہے ہو۔ ذمے دار کچھ عرصے بعد بحال کردیے جائیں گے یا زیادہ سے زیادہ ٹرانسفر ہوجائیں گے۔''

اس نے انٹرکام پر پی اے کو چائے کا آرڈر دیا ''وہ کیا ہے اپنے پی بی ایس صاحب! ہر آفس' ہر ادارے' ہر محکمے کا ایک سسٹم بنا ہوا ہے۔ یہ تم سے بہتر کون جانتا ہوگا۔''

میں نے کہا ''مجھے ان لڑکوں کے بارے میں بتاؤ۔''

اس نے کہا ''یہ جو دو لڑکے مارے گئے' یہ لاوارث تھے۔ ماں باپ کا کچھ پتا ہی نہیں۔ ایک نے کچھ عرصہ یتیم خانے میں گزارا تھا۔ دوسرا ایسے ہی پل گیا' جیسے کتے بلیاں پل جاتے ہیں۔ وہ ایسے ہی حالات میں مارے بھی جاتے ہیں۔ ایک کی عمر اب سترہ سال ہوئی تھی۔ دوسرا سولہ کا بھی نہیں تھا۔ دونوں کے لیے تھانہ اور جیل نئی جگہ نہیں تھی۔ آتے جاتے رہتے تھے۔''

''اور یہ تیسرا..... جو زخمی ہے۔''

''تیسرا پہلی بار آیا تھا۔ اس کا باپ ہیروئچی تھا۔ ماں کیا کرتی؟ نہ جانے کب سے اسی طرح اپنا' شوہر کا اور بچے کا پیٹ پالتی رہی تھی۔ بچہ جب اتنا بڑا ہوگیا کہ چھری چلا سکے تو اس نے غیرت میں ماں کو قتل کردیا مگر تمہاری دلچسپی کس میں ہے پی بی ایس؟''

میں نے کہا ''چوتھے میں..... جو فرار ہوگیا ہے۔''

''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا..... کیا تم بھی اس کی وکالت کروگے؟''

میں نے کہا ''اگر اسے اور کوئی نہ ملا اور اس نے مجھ سے کہا تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔ ابھی اس کا وکیل کون ہے؟''

''یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اس کے خلاف پہلے چھوٹے موٹے مقدمات تھے۔ مار پیٹ' چوری' نشے میں ہنگامہ آرائی پھر اقدام قتل کا ایک کیس ہوگیا۔ یہ تو چکر ہی ایسا ہے' جو ایک بار اس عمر میں پولیس کے ہتھے چڑھ جائے' وہ زندگی بھر اس چکر سے نہیں نکل سکتا۔ پہلے حالات بہت اچھے تھے۔ باپ کوئی بلڈر تھا۔ لوگوں کے پیسے لے کر بھاگ گیا۔ کوئی کہتا ہے لاکھوں' کوئی کروڑوں۔ بعد میں اس نے خودکشی کرلی۔ ماں نے بڑی مشکل حالات میں دو بچوں کو پالا۔ وہ پولیس کو کہاں سے کھلاتی' اچھا وکیل کیسے کرتی؟ نتیجہ یہ کہ سیشن کورٹ سے سلطان کو کسی کیس میں چھ ماہ کی سزا ہوئی تو کسی میں تین سال کی۔ عمر کم تھی اس لیے یہاں بھیج دیا گیا۔ اب یہ نیا معاملہ سنگین ہوگیا ہے۔ جیل سے فرار' گاڑی چھیننا..... قتل۔''

''کیا اب یہ سارے جرائم اس کے سر تھوپ دیے جائیں گے؟''

''کیا مطلب؟ تم اسے بے گناہ سمجھتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کیا پتا پلان کس نے بنایا؟ گاڑی چھیننے والا کون تھا اور مزاحمت پر گاڑی کے مالک پر گولی کس نے چلائی؟''

''دیکھو' یہ سب عدالت دیکھے گی۔ وہ شریک جرم تو تھا۔ قسمت اچھی ہے اس کی۔ آج ہی اس کی سالگرہ تھی۔ وہ پندرہ سال کا ہوگیا ہے لیکن ارتکاب جرم کے وقت نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''جیلر صاحب! کیا آپ کو مجھ پر اعتماد ہے؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہو تم' تم پر تو چور ڈاکو بھی اعتماد کرتے ہیں۔ اعتماد نہ ہوتا تو تم کو یہ سب کیوں بتاتا؟''

میں نے کہا ''تم نے تسلیم کیا ہے کہ انہیں جیل کے ماتحت عملے نے رشوت لے کر فرار کرایا۔ میں یہ نہیں پوچھتا کہ تمہارا حصہ کیا تھا مگر یہ رقم تو اچھی خاصی ہوگی جوان نوعمر مجرموں نے محافظوں کو ادا کی۔ لاکھوں میں ہوگی۔''

اس نے سر ہلایا ''دس لاکھ بتائی گئی تھی مجھے۔ مگر بارہ لاکھ تھی۔ ماتحت عملے کے تین بندے تھے۔ ایک نے تین لاکھ رکھے' باقی کو دو دو لاکھ دیے۔''

''یہ رقم ان کے پاس کہاں سے آئی؟ تمہارے کہنے کے مطابق تو وہ سب ہی لاوارث اور کنگال تھے؟''

اس نے سوچ کے کہا ''میں نے پوچھا تھا۔ وارڈن کہنے لگا کہ سر جی' ان لڑکوں کے پیچھے بھی کچھ لوگ ہیں اور ہمیں آم کھانے سے غرض رکھنی چاہیے' پیڑ گننے سے نہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے بات کرنے والا وہ تھا جو اب اسپتال میں پڑا ہے۔ وہ ذرا تیز اور زیادہ ہمت والا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بھی یہی کہا کہ ہم سب مل کر کچھ کریں گے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا یہاں سے نکل کے کہاں جاؤ گے' کیا کرو گے؟ وہی کام جو پہلے کرتے تھے' کچھ دن بعد پھر آجاؤ گے یہاں۔ وہ تھا بڑا ڈرامے باز' بہت پکا ایکٹر تھا۔ باتوں کا ماہر تھا۔ اس نے مجھے یقین دلا دیا

Eman AD Communications
Sutlej Pharma

کہ ان چاروں نے برائی کا راستہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے ذمّے دار ایک مولوی صاحب ہیں جو کبھی کبھی ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کا ایک مدرسہ اور دارالعلوم ہے کہیں پنجاب میں۔ اس نے نام بتانے سے انکار کردیا کہ مولوی صاحب نے منع کیا ہے۔"

"وہ مولوی کس سے ملنے آتا تھا؟"

"اسی سے جو زخمی ہے۔ اس نے مولوی صاحب سے کہا کہ اس کے لیے دعا کریں۔ ایک بار وہ یہاں سے نکل جائے تو باقی زندگی دین کے لیے وقف کردے گا۔"

"کیا یہ بھی ڈراما کیا تھا اس نے مولوی صاحب کے سامنے؟"

"کیا ہوگا..... بہرحال وہ مولوی متاثر ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھ تین اور لڑکے بھی ہیں۔ وہ بھی نیکی کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں اور گناہ کی زندگی سے توبہ کرکے صرف تبلیغِ دین کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں وہ مولوی بھی سامنے آگیا۔ اس نے وارڈن سے اور پھر مجھ سے ملاقات کی مگر نہ اپنا نام بتایا اور نہ اپنے دارالعلوم کا۔ اس نے کہا کہ وہ چار بچوں کی دنیا و عاقبت سنوارنے کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہے۔"

"وہ مولوی جینوئن تھا؟"

"اب مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ بھی ڈراما تھا۔ وہ صرف مڈل مین تھا۔ سودا کرانے والا۔ رقم تو پہلی شرط ہوتی ہے۔ اس نے دلیل سے بھی ہمیں قائل کرلیا کہ یہ کارِ ثواب بھی ہے۔ اور بعد میں خطرہ کوئی نہیں۔ چاروں بچے یہاں سے نکل کے سیدھے مدرسے جائیں گے اور پھر وہیں رہیں گے۔ ان کا کسی سے بھی رابطہ نہیں ہوگا۔ دو چار سال دین کا علم حاصل کریں گے۔ قرآن حفظ کریں گے اور کچھ مخیّر لوگ اس کارِ خیر میں مالی معاونت فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں ان کے چکر میں آگیا۔ تم اندازہ کرو بی بی ایس۔ کل کے لونڈوں نے میرے جیسے تجربے کار جیلر کو قائل کرلیا۔ تاہم میں جذباتی نہیں ہوا۔ یہ نہیں کیا کہ اس کارِ خیر میں خود بھی شریک ہوجاتا اور کہتا کہ چار بھٹکے ہوئے فرزندانِ اسلام کو صراطِ مستقیم پر چلانے کے نیک مشن میں یہ ناچیز بھی آپ کے ساتھ ہے۔ شاید اس کے بدلے میں اللہ میری سابقہ زندگی کے گناہوں کو معاف کردے۔ نہیں، میں نے نقد سودے میں کوئی رعایت نہیں کی۔ بس ایک اطمینان ہوگیا ہے کہ اس میں رسک کوئی نہیں۔ جب ہم کسی کی رہائی کا سودا کرتے ہیں تو رسک ضرور لیتے ہیں لیکن یہ بھی واضح کردیتے ہیں کہ اب باہر جو بھی ہوگا اس کے ذمّے دار وہ خود ہوں گے۔ مفرور مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں۔ ان لڑکوں کے کیس میں مجھے کسی کے بھی پکڑے جانے کا امکان بالکل نظر نہیں آیا۔ دو چار سال تو بہت ہوتے ہیں، کسی مدرسے بھی انہیں تلاش کرنے کون جائے گا؟ اس کے بعد خطرہ کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن دیکھو، کیسا فراڈ کیا ان سب نے میرے ساتھ۔ کتنی زبردست اور اچھی اداکاری کے ساتھ جھوٹ بولا کہ میرے جیسا پاپی قائل ہوگیا اور یہاں سے نکلتے ہی انہوں نے اسلام کا کیسا نام روشن کیا۔"

اس تمام گفتگو کے دوران میں جیلر نے عادت اور ضرورت کے مطابق کسے، کتنی اور کیوں گالیوں سے نوازا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پولیس اور جیل کا عملہ دن رات یہی زبان اتنی فراوانی سے استعمال کرتا ہے کہ گالی ان کے نزدیک گالی نہیں رہتی، میں بھی اس طرزِ تکلم کا عادی ہوچکا تھا۔

میں نے کہا۔ "اب تمہارا کیا خیال ہے، وہ مولوی کس کا ایجنٹ تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی داڑھی بھی اگر نقلی نہیں تھی تو اس نے اب تک صاف کرادی ہوگی۔ اور وہ بھی انہی کے ساتھ ہوگا۔ پانچویں سواری، وہ سلطان کے ساتھ فرار ہوگیا۔ اب اس کا ہاتھ آنا تو مشکل ہے لیکن سلطان پکڑا جائے گا۔"

"کہاں سے اور کیسے؟"

"یہ پولیس کا کام ہے لیکن عام طور پر یہ لوگ انہی کے ذریعے پکڑے جاتے ہیں جن کے لیے وہ دکھی تھے یا جو ان کے لیے دکھی تھے۔ ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، قطب شمالی پر جاکے اکیلا تو کوئی زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ پولیس نے ضرور اس کی ماں سے پوچھا ہوگا اور اس کی نگرانی بھی کرے گی۔ اس کی فون کال بھی ٹیپ ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ نہیں سوچا تم نے کہ وہ مولوی اس کی ماں کا ہی ایجنٹ ہو۔ اسی نے دس لاکھ کا بندوبست کیا ہو؟"

"اب سوچ رہا ہوں۔ پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے شوہر کی لائف انشورنس کا ایک کروڑ روپیا اب ملا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ بہت سخت حالات کا شکار رہی۔ ایک اور بات بھی مجھے تفتیش کے دوران میں معلوم ہوئی کہ اس کی ماں نے خواجہ صاحب کو بیٹے کا وکیل مقرر کیا ہے۔"

"کون خواجہ صاحب، خواجہ مسعود اختر.....؟"

"جی..... سلطان نے ہر سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرائی تھی مگر اچھے اور بڑے وکیل کے بغیر کہیں بھی بات نہیں بنتی۔ خواجہ صاحب اگر نچلی عدالت میں بھی اس کی پیروی کرتے تو شاید سلطان کو بچا لیتے۔ ایک تو بڑے وکیل کی ذہانت ہوتی ہے لیکن اس کا کچھ دبدبہ بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے جج جلدی مرعوب ہوجاتے ہیں۔"

"ذاتی اثر رسوخ بھی ہوتا ہے ان کا۔"

"ہاں۔ میرا خیال ہے ہائی کورٹ سے یہ سزائیں تو ختم ہوجائیں گی جو وہ کاٹ رہا تھا۔ جو نئے مقدمات اب درج ہوئے ہیں ان کے بارے میں ابھی کیا کہہ سکتے ہیں۔ پھر بھی سزا ضرور کم ہوگی۔ آخر فیس کس بات کی لیتے ہیں یہ لوگ۔"

میں نے کہا "خواجہ صاحب نے دس لاکھ تو لیے ہوں گے۔"

"ضرور لیے ہوں گے۔ پانچ لاکھ ایڈوانس۔ پولیس اس معاملے کو تو چھیڑے گی ہی نہیں کہ سلطان کی ماں نے جیل سے فرار کرانے کے لیے دس لاکھ کسے دیے تھے اور کس کی معرفت۔ یہ تو میرے تمہارے درمیان ہے مگر میری سمجھ میں آتی ہے تمہاری بات۔ اس کی ماں کا ہاتھ ہوسکتا ہے، شک صرف اس لیے ہوتا ہے کہ سلطان کی ماں نے چار کی بات کیوں کی؟ وہ صرف اپنے بیٹے کے لیے بات کرتی تو کم سے کم پانچ لاکھ بچا لیتی۔"

"کیا پتا سلطان کے پلان کچھ اور ہوں۔ جیل میں تربیت تو ہوجاتی ہے۔ کچا مجرم پکا ہوجاتا ہے۔ انہوں نے کوئی گروہ بنالیا ہو اور سلطان نے ماں سے کہا ہو کہ میرا مرنا جینا تو دوستوں کے ساتھ ہے۔ ان کے بغیر میں باہر نہیں آؤں گا۔ یہ جذباتی عمر ہوتی ہے۔ دوستی اور دشمنی ایسے ہی چلتی ہے، ماں نے اس لیے بھی بات مان لی ہوگی کہ اس کے پاس پیسہ آگیا تھا۔"

میں نے نو بجانے والے وال کلاک کی طرف دیکھا "تمہاری معلومات میں ایک چونکا دینے والا اضافہ۔ شاید اس سے تمہاری تفتیش کا ریکارڈ متاثر کن ہوجائے۔ ایک مردہ آٹھ سال بعد زندہ ہوگیا ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔"

میں نے کہا "شیکسپیئر نے کیا زبردست آفاقی سچائی بیان کی تھی۔ سلطان کا باپ وحید مراد، جس کے بارے میں کسی کو شک نہیں رہا تھا کہ وہ خودکشی کرچکا ہے، وہ زندہ ہے اور اسی شہر میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ موجود ہے۔"

"اور تم نے اسے تلاش کرلیا۔"

"تلاش کرلیا تھا۔ میں اور وہ ایک ہی ہوٹل کے کمروں میں ساتھ ساتھ تھے مگر وہ پھر غائب ہوگیا۔ میرے یقین کے مطابق وہ وحید مراد تھا۔ اس کا نام اب نظام الدین ہے۔ ایک خوبصورت بیوی اس کے ساتھ ہے۔ اس کا نام سیما نظام ہے۔ شادی سے پہلے سیما خان تھی۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے انکساری سے کہا "اللہ نے جو تھوڑی بہت ذہانت دی ہے، وہ میرے کام آتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے شک ہے کہ وہ بیٹے کو رہا کرانے کے لیے ہی یہاں موجود تھا۔ جیسے ہی بیٹا جیل سے نکلا، وہ بھی غائب ہوگیا۔ وہ ہے ایک دھوکے باز، جعلساز اور ڈرامے باز وغیرہ۔"

"تم سمجھتے ہو یہ ایک فیملی ڈراما ہے؟"

"رائٹ! پہلے شوہر لوگوں کا پیسہ لے کر بھاگا۔ پیچھے کچھ بھی چھوڑ کے نہیں گیا۔ اس نے ڈرامائی انداز میں خودکشی کرلی۔ اس کا بزنس پارٹنر بے چارہ پھنس گیا۔ سب کا نقصان اکیلا کیسے پورا کرتا۔ اس نے جیل کاٹی۔ سات سال بعد بیوی نے عدالت سے شوہر کی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا کیونکہ اس کی موت کا ثبوت کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک تحریر کے جو اس نے خودکشی کے وقت لکھی تھی۔"

"اس کی لاش نہیں ملی تھی، مجھے یاد ہے۔"

"جب بیوی کو بھی ایک کروڑ مل گئے تو مرحوم شوہر پھر نمودار ہوگیا۔ اس نے بیٹے کو بھی جیل سے نکال لیا۔ اب فیملی آرام سے کہیں باہر جاکے سیٹل ہوجائے گی۔"

"اور بیوی نمبر دو.....؟"

"وہ بھی رہے گی ساتھ اگر چاہے گی۔ آٹھ سال وہ اکیلا تو نہیں رہ سکتا تھا اور جیسی بیوی اس نے حاصل کرلی تھی، وہ کسی رزقِ حلال کمانے والے کو لاٹری میں بھی نہیں ملتی۔ اس نے اوپن مارکیٹ سے لی ہوگی۔ ایسی زرخرید بیوی کے لیے وفاداری کی شرط کیسی۔ وہ اپنا راستہ الگ کرلے گی۔ بیوی نمبر ون، دونوں بچے اور وحید مراد پیپی فیملی، باقی زندگی کہیں ہنسی خوشی گزار سکتی ہے۔"

"تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ مگر بات ثبوت کی ہے۔"

"ثبوت بھی مل جائے گا اگر وحید مراد مل گیا۔ میں اسے تلاش کررہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ہمشکل نہیں تھا۔ کیا اس کے فنگر پرنٹس کہیں مل سکتے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اس کی خودکشی سے پہلے وحید مراد کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں تھا۔ ہاں اگر تم شناختی کارڈ کے آفس سے رجوع کرو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بہت کارآمد ٹپ دی ہے اس وقت تم نے۔ انشورنس کمپنی اب وحید مراد کی بیوی سے ایک کروڑ واپس وصول کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وحید مراد تو زندہ ہے۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''بالفرض محال تم نے ایسا ثابت کردیا' تب بھی ایک کروڑ اس کی بیوی سے کیسے وصول ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے' وہ شرافت سے واپس کردے گی کہ اب میں یہ رقم نہیں رکھ سکتی۔ سرتاج من سلامت باشد۔ ایک کروڑ حاضر ہیں میرے سہاگ کی قیمت۔ تم ہوتے تو کیا کرتے؟''

میں نے کہا۔ ''میں خالی جیب دکھا کے کہتا کہ وہ سب رقم تو خرچ ہوگئی۔ میں نے کہیں دفن کی تھی' جگہ بھول گئی ہوں۔''

اگلے روز میں نے ایک اور اخبار کے اندر والے صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر دیکھی۔ لاندھی بچہ جیل سے فرار ہونے والا جو مجرم بہاولپور میں زیرِ علاج تھا' وہ مر گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ شدید زخمی ہوا تھا چنانچہ اس کی موت کی خبر میں چونکانے والی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی مگر بہاولپور کے کسی گمنام رپورٹر نے ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا تھا۔

اس نے پولیس کی بات کو جھٹلایا تھا کہ قیدی کو جب اسپتال لایا گیا تو وہ شدید زخمی تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے اس کی تردید کی تھی اور صاف کہا تھا کہ اس کے زخم معمولی نوعیت کے تھے اور اس کی حالت ہرگز تشویش ناک نہیں تھی ورنہ اسے انتہائی نگہداشت کے یونٹ یا آئی سی یو میں ضرور رکھا جاتا۔ اسے مرہم پٹی کے بعد رخصت کردیا جاتا لیکن پولیس کے اصرار پر اسے عام وارڈ میں ایک بیڈ دے دیا گیا تھا۔ رپورٹر نے اس کی موت کے حالات کو پُراسرار قرار دیتے ہوئے عدالتی تفتیش کا مطالبہ کیا تھا۔

مجھے رپورٹر کے خیال سے سو فیصد اتفاق تھا مگر ایک چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے اخبار کے چھوٹے سے رپورٹر کی تشویش سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ عدالتی تحقیقات کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ ایسی ہی ایک تفتیش وہ جیلر کررہا تھا جو خود فرار کے ڈرامے کا پروڈیوسر تھا۔ عدالتی تفتیش کے لیے کوئی ایس ڈی ایم بیٹھ جائے گا۔ کوئی ڈاکٹر کچھ بھی کہے' رپورٹر کچھ بھی لکھے' تفتیشی افسر یہی لکھے گا کہ قصوروار کوئی نہیں' موت برحق ہے۔ جب یہ رپورٹ داخل دفتر ہوگی تو وقت بہت آگے چلا گیا ہوگا۔ ایسے ہی بہت سے قتل خبروں میں آچکے ہوں گے۔ بے اختیار مرتے رہیں گے۔ بااختیار مارتے رہیں گے' روزِ مکافات ہنوز دور ہے۔

لاہور واپس جانے سے پہلے مجھے دو کام اور نمٹانے تھے۔ مجھے نوازش علی کی بیوی سے ملنا تھا جس کا پرانا پتا مجھے مل گیا تھا۔ پھر مجھے سیما کے پرانے پتے کی تصدیق کرنا تھی۔ نوازش علی کے ایک پرانے پڑوسی دکاندار نے مجھے اس کی بیوی کا موجودہ پتا دے دیا۔ وہ اب بھی کبھی کبھی پرانے محلے کے چکر لگاتی تھی مگر دو سال سے غائب تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب میری تلاش رائگاں نہیں گئی۔ چالیس سال سے زائد عمر کی وہ عورت ایک شادی دفتر چلا رہی تھی۔

''کیا آپ کوئی فیچر بنا رہے ہیں؟'' اس نے مجھے اندر لے جانے کے بعد کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے تو علم بھی نہیں تھا کہ آپ کوئی شادی دفتر چلا رہی ہیں ورنہ بہت پہلے حاضر ہوتا۔''

''باہر آپ نے سائن بورڈ نہیں دیکھا۔'' وہ مسکرائی ''پچھلے چار پانچ سال سے میں یہ کام کررہی ہوں اور اللہ کا شکر ہے، پیسا تو اتنا نہیں کمایا لیکن نیک نامی ضرور کمالی ہے۔ حالانکہ زیادہ تر لوگ جو یہ کام کررہے ہیں..... خیر چھوڑیے' آپ کو تو مجھ سے زیادہ پتا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''مسز نوازش علی.....!''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ کسی ضرورت مند کا فون تھا۔ جتنی دیر وہ اس سے بات کرتی رہی' میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتا رہا۔ گھر کی کسی چیز سے بھی دولت مندی عیاں نہیں تھی۔ فرنیچر معمولی اور پرانا تھا۔ دیواروں پر رنگ ہوئے کئی سال گزر گئے تھے۔ قالین میلا ہورہا تھا۔ اس کے باوجود آرائش میں سلیقہ نظر آتا تھا۔ ایک کارنر ٹیبل پر چند فریم شدہ تصویریں رکھی تھیں۔ ایک میں وہ خود دو بچوں کے ساتھ تھی۔ یہ کم سے کم دس سال پرانی تصویر تھی جس میں وہ جوان اور بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ ان میں سے ایک آٹھ نو سال کا یا کچھ زیادہ تھا۔ اس کی صورت کے نقوش ماں سے ملتے تھے۔ دوسرا چھوٹا اور بالکل مختلف تھا۔ دوسری لڑکی تھی۔

''لوگ اب مجھے باجی ثریا کہتے ہیں۔ آپ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عمر میں تو مجھ سے بہت کم ہیں'' وہ پھر مسکرائی مگر اس کی مسکراہٹ میں کچھ عجیب سا دکھ اور حزن وملال تھا۔

کال بیل بجی تو اس نے اٹھ کے باہر جھانکا۔ پھر اندر والے دروازے تک جاکے آواز دی ''شاہد.....! ٹرک آگیا ہے'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور اپنی جگہ آ بیٹھی ''دراصل میرے بیٹے نے نیا مکان لیا ہے ادھر شادمان کی طرف۔ سامان کی شفٹنگ بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ مصروف ہیں تو میں پھر کسی وقت آجاؤں گا۔''

''نہیں نہیں' مجھے کیا کرنا ہے۔ بیٹا شفٹ کررہا ہے' میں تو یہیں رہوں گی۔''

''یہ بیٹا ہے آپ کا؟'' میں نے دوسری تصویر کی طرف دیکھا جس میں ایک نوجوان اور اس کی دلہن شادی کے جوڑے میں نظر آرہے تھے۔ یہ تصویر زیادہ پرانی نہیں لگتی تھی۔ تیسری تصویر میں اس کی بیٹی دلہن بنی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ مزید دکھی ہوگئی ''ایک سال پہلے شادی ہوئی تھی اس کی۔ پتا نہیں قصور کس کا تھا۔ میں نے تو اپنی طرف سے بہت کوشش کی مگر اس کی بیوی کسی قیمت پر میرے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تو میں کیا کرسکتی ہوں؟ وہ مجھے ساتھ لے جانے کے لیے بھی تیار نہیں۔ بیٹی کی شادی تین سال پہلے کردی تھی۔''

میں نے اس افسوس ناک معاشرتی مسئلے سے پہلوتہی کرنے کے لیے کہا ''میں دراصل آپ کے شوہر سے ملنے آیا تھا' مسز نوازش علی!''

اس کا چہرہ پُرشکن ہوگیا ''پھر تو آپ غلط جگہ آگئے مسٹر قدوس قریشی!''

میں نے کہا ''کیا اب وہ یہاں نہیں رہتے؟''

''جی نہیں..... اور نہ اب وہ میرے شوہر ہیں'' اس نے رکھائی سے کہا ''میں نے بہت پہلے اسے چھوڑ دیا تھا۔ عدالت کے ذریعے خلع حاصل کرلی تھی۔''

میں نے کہا ''دیکھیے..... یقیناً آپ کے پاس کوئی معقول وجہ بھی ہوگی۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔''

''آپ اخبار والے بہت کچھ فرض کرکے بھی چھاپ دیتے ہیں اس لیے میں وضاحت کروں۔ میں ساری زندگی کسی ایسے شخص کے ساتھ نہیں گزار سکتی تھی جو دھوکے فراڈ کے الزام میں جیل کاٹ چکا ہو۔ ہم عزت دار لوگ ہیں قریشی صاحب۔ میرے والد بہت بڑے عالم تھے' باعمل..... میرا بھائی ایک ایسے محکمے کا افسر تھا جہاں رشوت نہ لینا جرم سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی کھوپڑی الٹی تھی۔ یہ گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ اس نے رشوت دینے کی کوشش کرنے والے ایک ٹھیکے دار کو گرفتار کرادیا تھا۔ وہ بہت بڑا ٹھیکیدار تھا اور اس نے بدمعاش بھی پال رکھے تھے۔ اس نے میرے بھائی کا ٹرانسفر کرادیا۔ اوپر دوسری دنیا میں۔ میرا دماغ بھی ایسا ہی ہے۔''

میں نے کہا ''لیکن اصل فراڈ کرنے والا تو کوئی اور تھا۔''

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوازش بھی اپنے پارٹنر وحید مراد کے جرم میں برابر کا شریک نہ ہوتا تو بہت پہلے اس کاروبار سے الگ ہوجاتا۔ وہ سب جانتا تھا کہ وحید مراد کیا کررہا ہے۔ اس کی ہر اسکیم فراڈ تھی۔ وہ دھوکا دہی سے پیسے اینٹھ رہا تھا اور نوازش سے ہر بوگس دستاویز پر دستخط کرا رہا تھا۔ نوازش کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ بھی اتنا ہی لالچی تھا جتنا وحید مراد۔ آخر جائز طریقے سے بھی تو منافع کمایا تھا انہوں نے۔ شاد آباد اسکیم بہت کامیاب رہی تھی۔ مگر ان کے دماغ میں راتوں رات کروڑپتی بننے کا بھوت سوار تھا۔ کیا ہوا اس کا انجام؟ وحید مراد سب کچھ سمیٹ کر نکل گیا۔ نوازش کے لیے چھوڑ گیا صرف قرضے' لوگوں کی دشمنی' بدنامی اور ذلت۔ ہمارا سب کچھ چھن گیا۔ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی' دو کاریں تھیں' سب ضبط کرلیا گیا۔ پھر ایک نے خودکشی کرلی دوسرا جیل چلا گیا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایسے شخص کا سایہ بھی میرے بچوں پر پڑے'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ایک نوجوان اچانک اندر آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹکا ''امی! میں وہ کپڑوں کی الماری لے جاؤں؟''

عورت نے اپنی آنکھیں خشک کرکے گہری سانس لی ''تم ہر چیز لے جاسکتے ہو بیٹا! پوچھے بغیر..... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

نوجوان نے کچھ خفت سے مجھے دیکھا لیکن کوئی سوال کیے بغیر باہر نکل گیا۔ مجھے اس عورت کے لیے دل میں بڑا رحم محسوس ہوا جو اپنے شوہر کو گنوا چکی تھی اور اب بیٹا بھی اسے چھوڑ کے جارہا تھا۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''جیل سے رہائی کے بعد آپ کی اپنے سابق شوہر سے ملاقات نہیں ہوئی؟''

''ہوئی تھی۔ وہ یہاں آگیا تھا۔ یہ میرے والدین کا چھوڑا ہوا گھر ہے۔ میں نے اسے گھر میں نہیں گھسنے دیا۔ جب خلع ہوگئی تو کچھ عرصہ وہ بچوں سے ملتا رہا۔ شاہد کو اکثر فون کرلیتا تھا۔ پھر خود ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ ایک بیٹی لاہور میں ہے۔ اس کا رابطہ رہتا ہے باپ سے.....''

''اپنی بیٹی کا پتا بتا سکتی ہیں آپ؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''مجھے معلوم ہے آپ اپنے طور پر معلوم کرلیں گے لیکن کیا آپ اسے بخش نہیں سکتے؟''

میں نے کہا۔ ''باجی ثریا! آپ نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ میں ہرگز آپ کو تماشا بنانے نہیں آیا۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ میں تو صرف نوازش کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جو شاید آپ کی بیٹی بتا سکے۔''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے' وہ کسی لانچ پر رہتا ہے۔''

"کیا مطلب..... گھر نہیں ہے اس کا؟"

"قریشی صاحب! وہ بہت عیاش آدمی تھا۔ یہ بتاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے بہت عرصہ برداشت کیا مگر بعد میں اس نے جوا اور شراب بھی شروع کردی۔ جب وہ جیل گیا تو انتہا ہوگئی۔ عورت تو بچوں کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے۔ اس نے اپنا گھر پھر کیوں نہیں بسایا۔ کیوں رہتا ہے اس لانچ پر جو پہلے وحید مراد کا عشرت کدہ تھی۔"

"کیا وہ لانچ وحید مراد کی تھی؟"

"ہوگی۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہاں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔ میں تو صرف ایک بار گئی تھی اس پر۔ گہرے سمندر میں سارا دن گزارا تھا۔ بہت اچھی، خوبصورت اور سجی سجائی لانچ تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ لانچ پر کس قسم کی پارٹیاں ہوتی تھیں اور ان میں کیسی عورتیں آتی تھیں۔ تین چار سال پہلے تک نوازش اسی میں رہتا تھا، اب پتا نہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تھینک یو باجی ثریا! مجھے افسوس ہے کہ شاید میں بہت غلط وقت پر آیا۔ میرے کسی سوال سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے تو مجھے معاف کردیں۔"

اس نے ایک پُرمتانت مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "معافی تو مجھے مانگنی چاہیے، میں اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔ آپ سے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔"

میں نے کہا۔ "چائے پینے کے لیے میں پھر کبھی آجاؤں گا۔ فی الحال اس بارے میں سوچا تو نہیں مگر ہوسکتا ہے کسی روز گھر بسانے کا خیال آئے تو آپ سے ہی رجوع کرنا پڑے۔"

وہ مسکرائی۔ "تم جیسے آدمی کو لڑکیوں کی کیا کمی؟"

"لڑکیاں تو واقعی بہت ہیں لیکن آپ کو اپنے جیسی کوئی نظر آئے تو..... صورت اور سیرت میں، تو مجھے فون کردیں۔ میں سر کے بل دوڑتا ہوا آؤں گا۔"

تعریفی الفاظ نے اس کے چہرے پر تھوڑی سی بشاشت پیدا کی۔ شاید شادی دفتر میں کوئی جنت کی حور یا کوہ قاف کی پری تلاش کرنے والوں میں سے کسی نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہوگی کہ ایسی بات کریں۔ وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ دروازے کے سامنے کھڑا ہوا ٹرک سامان سے بھر گیا تھا۔ اندر سے کسی تیز مزاج عورت کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔ "شاہد! بھئی یہ کیوں چھوڑ رہے ہو یہاں۔ اب تمہاری ماں کو اس کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ تمہیں تو ہر بات سمجھانی پڑتی ہے۔ چلو اسے بھی رکھواؤ۔ افوہ، یہ بھی لے جاؤ۔"

اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

میں نے کہا "باجی ثریا! ایک آخری بات، میری طرف سے بالکل اطمینان رکھیے۔ آپ سے جو بھی بات ہوئی، آف دی ریکارڈ تھی۔ اس کا ایک بھی لفظ نہ میری زبان سے نکلے گا نہ قلم سے۔"

اس نے مسکرا کے کہا "تھینک یو!" اور دروازہ بند کرلیا۔ آگے ٹرک نے راستہ روک رکھا تھا۔ میں اپنی گاڑی کو ریورس گیئر میں پیچھے لے گیا۔ خلاف توقع یہاں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی..... میں نے گاڑی کا رخ ناظم آباد کی طرف موڑ دیا۔ سیما خان یا سیما نظام الدین کے پاسپورٹ پر درج پتا میرے ذہن میں تھا۔ آدھے گھنٹے کی جستجو کے بعد میں نے وہ گھر تلاش کرلیا لیکن مجھے سامنے کی طرف آویزاں ایک چھوٹے سے سائن بورڈ کو دیکھ کر مایوسی ہوئی جس پر "برائے فروخت" لکھا ہوا تھا اور ایک فون نمبر۔ ایک پی سی او سے میں نے یہ نمبر ملایا تو دوسری طرف سے اشرف نام کے کسی بردکر نے کہا "پرائم پراپرٹی!"

میں نے مکان کا نمبر بتا کے کہا "اگر اس کی خرید کے سلسلے میں بات کرنی ہو تو.....؟"

اس نے کہا "میں آپ کو پتا سمجھا دیتا ہوں۔ آپ کہیں قریب ہی ہیں؟"

میں نے کہا "میں اس گھر کے دروازے پر کھڑا ہوں۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مین روڈ پر آجائیں۔ آغا جوس سینٹر کے سامنے میری ایجنسی ہے۔"

دس منٹ بعد میں نے اس دکان میں قدم رکھا جو اس نے اپنے ہی گھر میں نکالی تھی۔ وہ عمر رسیدہ آدمی تھا۔ صرف اس لیے کہ اسے شک نہ ہو، میں نے اس کے ساتھ جا کے مکان کو اندر سے دیکھنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ وہ گلی کے کونے والا اور دو سو تینتیس گز کا خاصا پرانا مکان تھا جس کی مناسب دیکھ بھال بھی نہیں کی گئی تھی۔ شاید فروخت کا فیصلہ کرنے کے بعد اس پر رنگ کرا دیا گیا تھا۔ میں نے اندر گھوم پھر کے اچھی طرح دیکھا لیکن گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی الماری میں کاغذ کا ایک پرزہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ کسی دروازے پر یا دیوار پر کوئی نام یا فون نمبر نہیں لکھا ہوا تھا۔ شاید اب کسی لاک یا ہینڈل پر سیما کے فنگر پرنٹ تک باقی نہ تھے۔

قیمت کی بات ہوگئی تو میں نے کہا "مالک کون ہے گھر کا؟"

"مالک پہلے تو نظام الدین صاحب تھے، ان کا انتقال

ہوگیا۔"

میں نے سرسری دلچسپی ظاہر کی "پھر اب.....؟"

"ان کی بیوہ ہیں۔ میں نے ہی اس کی ملکیت ان کے نام کرانے کی قانونی کارروائی پوری کی تھی۔ پرانے کرائے داروں کو بڑی مشکل سے نکالا تھا۔"

میں نے کہا "نظام الدین صاحب کا انتقال کب ہوا؟"

اس نے سوچ کے بتایا "گیارہ سال ہوگئے۔ ان کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا۔ پی آئی اے میں تھے۔ نائٹ شفٹ سے لوٹ رہے تھے کہ کسی ٹرک نے ان کی کار کو ٹکر ماردی۔ بہت اچھے آدمی تھے۔"

میں نے کہا "آپ کے اچھے مراسم تھے فیملی سے؟"

"بہت پرانے۔ جب ناظم آباد کی اسکیم شروع ہوئی تو ہم نے پلاٹ لیے تھے۔ میرا مکان پہلے بنا۔ جس دن ایوب خان کا مارشل لاء لگا اسی دن میں اس گھر میں آیا تھا جس میں ایجنسی ہے۔ دو مہینے بعد وہ آگئے۔ میری شادی ہوچکی تھی، ان کی بعد میں ہوئی۔"

میں نے کہا "اچھا تو اب اگر ان کی بیوہ سے ملنا ہو تو..... کہاں ہیں وہ؟"

اس نے کہا "جنرل پاور آف اٹارنی ہے میرے پاس۔"

میں نے تھوڑے تذبذب کا مظاہرہ کیا "پھر بھی..... کہاں رہتی ہیں آخر وہ؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ پہلے کراچی سے لاہور چلی گئی تھی۔ پھر شادی کرلی، بیرونِ ملک تھی..... مجھے فون کرتی رہتی تھی۔"

میں نے کہا "کب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟"

"ملاقات ابھی ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ سات سال بعد کرائے داروں نے جان چھوڑی تو وہ آئی تھی۔ منتقلی کے کاغذات پر دستخط کیے۔ میرے ساتھ رجسٹرار کے دفتر بھی گئی اور کے ڈی اے آفس بھی۔ میرے ہی گھر میں ٹھہری تھی۔ کہنے لگی کہ چچا، بس اب اس گھر کو بیچ ڈالو۔ کرائے داری کا روگ نہیں پالنا مجھے۔ چھ سات سال سے کرایہ وصول کرکے میں اسی کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس سے گھر کو کچھ مرمت اور رنگ روغن کرا دینا۔ پاور آف اٹارنی دے کر چلی گئی۔ بات یہ ہے کہ اب اسے پیسے کی ضرورت تو ہے نہیں۔"

"کوئی لاٹری نکل آئی ہے کیا؟ یا کسی کروڑ پتی کو پھانس لیا ہے؟ شوہر کیا کرتا ہے؟"

میری بات غالباً اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ "میں اس سے ملا تو نہیں لیکن وہ ہے کوئی بہت بڑا بزنس مین۔ امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہے۔ میں نے زیادہ پوچھا بھی نہیں لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا.....؟"

"کچھ نہیں۔ بس آدمی کا وقت بدل جاتا ہے۔ وہ خود اتنی بدل گئی ہے۔ میرے سامنے اسکول جاتی تھی۔ گورنمنٹ اسکول میں پڑھتی تھی۔ اب تو پہچانی نہیں جاتی۔ طور طریقے، لباس، زبان..... وہ اب یہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شاید یہ علاقہ اسے غریب بستی لگتا ہوگا..... خیر، یہ سب اس لیے بتایا ہے میں نے کہ آپ کا ارادہ ہو تو سودا کم میں بھی ہوجائے گا۔ وہ جان چھڑانے کی فکر میں ہے، اچھی قیمت ملے نہ ملے، آپ آفر دیں۔"

میں نے کہا "آپ ابھی لیں پوری قیمت۔ مگر آپ کا کہنا ہے کہ وہ سال بھر پہلے آئی تھی۔ اس کے بعد سے فون پر بات کررہی ہے۔ اب یہ معاملہ ہے قانونی اور لاکھوں کا۔ اس بات کا اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ مل سکتی ہے۔ آسکتی ہے ضرورت پڑنے پر۔ اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے۔ پاور آف اٹارنی تو خود بخود غیر قانونی اور ختم ہوجاتی ہے اگر پاور دینے والا نہ رہے۔"

اس نے سر ہلایا "بس یہی ایک پرابلم ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں درجنوں گاہک آکے چلے گئے۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کوئی صورت دیکھ کے میرا اعتبار کیوں کرے؟"

"آپ کے پاس کوئی فون نمبر نہیں ہے؟ اس کا یا اس کے شوہر کا، گھر کا یا دفتر کا.....؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "ضرور ہوگا مگر وہ دیتی نہیں۔ خود فون کرلیتی ہے۔ اب تو چھ مہینے ہوگئے۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔ آپ مجھے اپنا فون نمبر دے جائیں، میں سب کے فون نمبر لے کر رکھ لیتا ہوں۔ کیا کروں، اس بار کہہ دوں گا کہ ایسے تو کبھی سودا نہیں ہوگا۔"

"وہ آپ سے بھی چھپاتی ہے" میں نے افسوس سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ٹال دیتی ہے کہ ہم ایک جگہ نہیں رہتے۔ کوئی گھر نہیں ہے۔ یہاں آتے ہیں تو ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ مستقل ٹھکانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اس کے شوہر کا نام کیا ہے؟"

"مرزا اکبر بیگ بتایا تھا اس نے۔"

میں نے پوچھا "خاتون کے سابق شوہر سے بچے وغیرہ

نہیں ہیں؟ ان کے بھائی بہن یار شتے دار..... آپ کے اتنے پرانے مراسم تھے۔ آپ بھی کسی کو نہیں جانتے؟''

''سیما خود اکلوتی تھی۔ اس کے بچے نہیں ہوئے۔ ماں باپ مر گئے' پہلے شوہر کے عزیز و اقارب ضرور تھے مگر اب پتا نہیں کہاں ہیں۔ اچھا' میں رابطہ کرلوں گا آپ سے۔ اگر اس کا فون آیا'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میری ساری سراغ رسی رائگاں گئی۔ تاہم ایک بات کی تصدیق ہوگئی۔ وحید مراد اس کا شوہر نہیں تھا۔ نظام الدین اس کے پہلے شوہر کا نام تھا اور وحید مراد اس کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ پر نظام الدین بن گیا تھا۔ سیما اس کی دھوکے بازی اور جعلسازی میں پارٹنر تھی اور وہ دونوں بڑی ڈھٹائی سے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میاں بیوی کی حیثیت سے دنیا بھر میں گھوم رہے تھے۔ سیما نے ایک پرانے جاننے والے کو شوہر کا نام غلط بتا دیا تھا تاکہ کوئی اسے نام سے بھی تلاش نہ کرپائے۔ اگر میں کراچی کی ٹیلی فون ڈائریکٹری لے کر مرزا اکبر بیگ نام کے ہر شخص کو فون کرتا تو ان سب کا جواب ایک ہی ہوتا کہ وہ کسی سیما کو نہیں جانتے۔

☆☆☆

امجد فاروقی یہ جاننے کے لیے بہت بے تاب تھا کہ کراچی میں میری جستجو کا حاصل کیا رہا۔ ابھی میں کسی کامیابی کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ ابھی تک میں وحید مراد کے پارٹنر نوازش علی کو تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ میری پیش رفت صحیح سمت میں ہورہی ہے۔ لاہور پہنچتے ہی مجھے امجد فاروقی کا فون موصول ہوا۔ وہ اگلے دن مجھ سے لنچ پر ملنا چاہتا تھا۔

جب میں ہوٹل پہنچا تو اس نے مجھے دروازے سے داخل ہوتے ہی دیکھ لیا اور اپنی جگہ کھڑا ہوکے ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ ایک کونے والی میز پر قابض تھا جو الگ تھی اور وہاں شیشوں کی دیوار سے دو طرف کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے رسمی طور پر تاخیر کی معذرت کی۔ اس نے فوراً آرڈر دے دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' اس نے بلاتوقف کہنا شروع کیا۔ ''معاملات آج بھی وہیں ہیں جہاں روزِ اول تھے۔ اس کا کوئی پتا نہیں۔''

میں نے کہا ''ایسا نہیں ہے۔ پہلے صرف شک تھا کہ وہ مرحوم وحید مراد نہ ہو۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔ میں بھی اس سے مل چکا ہوں اور تصدیق ہوگئی ہے کہ تمہاری انشورنس کمپنی کے ساتھ فراڈ کیا گیا تھا۔''

''لیکن وہ ہاتھ تو نہیں آیا؟''

''جو سراغ ملے ہیں' وہ نظر نہ آنے والے تیروں کے نشانات کی طرح ہیں اور ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ٹیلی ڈراما تھا جو اپنے طے شدہ کلائمیکس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ابھی ابھی مجھے ایک اہم لیکن جزوی کامیابی حاصل ہوئی ہے'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

میں نے کہا ''یہ جو وحید مراد ہے..... یہ ڈبل مرحوم ہے۔ مجازی طور پر تو مرا ہی تھا' خودکشی فرما کے..... حقیقی طور پر بھی مر چکا ہے گیارہ سال پہلے۔''

اس نے سر کھجایا ''دیکھو یار! میں پہلے ہی کنفیوز ہوں.....''

میں نے کہا ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جو اس کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس عورت نے وحید مراد کو مرحوم شوہر بنالیا ہے۔ نظام الدین اس کا پہلا شوہر تھا جو گیارہ سال پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ عورت سیما اسے نظام الدین بنا کے ساتھ لیے پھر رہی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نکاح کرلیا ہو مگر ہے یہ زبردست ٹیلی ڈراما جس کا ڈراپ سین ہونے ہی والا ہے۔''

''اس وقت میرا پیٹ ہی نہیں' دماغ بھی خالی ہے۔ تمہاری باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔'' اس نے بھوکی نظروں سے ان ڈشوں کو دیکھا جو ویٹر نے ٹیبل پر لگادی تھیں۔ ''پہلے ہم کھانا کھالیں؟''

میں نے کہا ''بالکل ٹھیک۔ اول طعام بعد کلام۔''

کھانے کے بعد وہ کچھ پُرسکون ہوا ''ہاں۔ اب سمجھاؤ مجھے کہ تم اسے ٹیلی ڈراما کیوں سمجھ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''کیا تم نے سلطان وحید مراد کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں دیکھی ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ خیر سے وہ بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگا تھا ہوش سنبھالتے ہی۔ سرکاری مہمان تھا۔''

میں نے کہا ''کراچی کی خبریں تمہیں اس لیے یہاں نہیں لگیں۔ وہ جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ تین ساتھیوں کے ہمراہ۔ انہوں نے سیدھا لاہور کی طرف رخ کیا۔ ایک گاڑی چھینی' پھر دوسری..... اسی چکر میں ایک قتل بھی کردیا۔ پولیس کے ہاتھوں دو تو مارے گئے ہیں۔ تیسرا اسپتال جاکے مرا یا شاید ماردیا گیا۔ صرف سلطان مفرور ہے۔''

''انہی کارناموں سے اس کے شاندار مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دن پھانسی چڑھے گا عین عالمِ شباب میں..... انشاء اللہ۔''

میں نے کہا ''اس کو جیل سے فرار کرانے کے لیے دس لاکھ رشوت دی گئی تھی۔''

''یہ تم کو کس نے بتایا؟''

''خود رشوت لینے والے..... جیلر نے۔ مگر مجھے شک ہے کہ اس نے پورا سچ نہیں بتایا۔ رقم میں ڈنڈی مار گیا۔ دس لاکھ ایک قیدی کو فرار کرانے کے لیے تو ہوسکتے ہیں مگر چار قیدیوں کے لیے یہ بہت کم ہیں۔ خیر پتا چل جائے گا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ..... یہ رقم ریحانہ نے ادا کی ہو۔ اپنے لختِ جگر کو چھڑانے کے لیے؟''

''زیادہ شک مجھے اس کے باپ پر ہے۔ وہ اسی لیے کراچی میں تھا۔ جس دن بیٹا جیل سے فرار ہوا' وہ بھی غائب ہوگیا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کے ساتھ ایک بہت خوبصورت عورت تھی جو ہرگز شریف عورت نہیں ہے اور ایسی عورت یا تو زرخرید ہوتی ہے یا پھر کرائے پر ملتی ہے۔ ظاہر ہے اس کا کرایہ بھی کم نہیں ہوتا۔ وحید مراد نے پچھلے سات آٹھ سال میں کافی دولت اکٹھی کی ہے۔ وہ اسی جعلی پاسپورٹ پر باہر جاتا رہا ہے۔ اور یہ عورت اس کی بزنس پارٹنر ہی ہوگی۔ ایسی عورتیں منشیات فروشوں کے لیے ڈھال کا کام کرتی ہیں۔ بند راستے کھولنے میں بھی کام آتی ہیں اور کاروبار کو ترقی دینے میں بھی۔ خیر مجھے اس کے کام یا نام اور دام سے کیا۔ میرا خیال تھا کہ باپ بیٹا اب لاہور کا رخ کریں گے۔''

''یار' وہ کیوں آئے گا یہاں؟''

میں نے کہا ''دیکھو۔ اس سارے معاملے کو میری نظر سے دیکھو۔ آج سے آٹھ سال پہلے وحید مراد نے کروڑوں کا فراڈ کیا اور اپنے بزنس پارٹنر کو پھنسا کے بھاگ گیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے ساتھ کتنی رقم لے گیا تھا۔ یہاں وہ کچھ نہیں چھوڑ کے گیا تھا جو ضبط کیا جاسکے۔ جانے سے پہلے وہ اپنا سارا پلان بیوی کو سمجھا گیا تھا اور بیوی نے سمجھ لیا تھا۔ سات سال بعد جب اس نے خودکشی کا ناٹک کیا تو اس کی موت کا ثبوت کوئی نہیں ملا تھا۔ صرف بیوہ نے واویلا کیا کہ خط اسی کا ہے۔ ڈائری اسی کی ہے اور ذہنی طور پر اس کی حالت ایسی ہی تھی مگر یہ بات مانی نہیں گئی اور انشورنس کمپنی سے ایک کروڑ وصول کرنے کی کوشش ناکام رہی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ پھر وہ سات سال ایک مظلوم' بے کس اور مالی مشکلات کا شکار بیوہ کا رول نبھاتی رہی۔ یہ دنیا کو یقین دلانے کے لیے ضروری تھا۔ ایک اچھے اور خوشحالی مستقبل کے لیے بھی۔ شوہر سے اس کا رابطہ ہوگا مگر وہ پیسے بھیجتا رہتا یا بیوہ ٹھاٹ سے رہتی تو شکوک پیدا ہوتے۔ بلکہ شکوک کی تصدیق ہوجاتی۔ وہ صبر سے سختی کے دن گزارتی رہی۔ اس کا نقصان صرف ایک ہوا۔ اس کا چھوٹا بیٹا غلط راستے پر چل پڑا۔ مال حرام کا کچھ نقصان تو ہونا ہی تھا۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ باپ کی نگرانی نہ تھی۔ ماں اسے کنٹرول نہیں کرسکی اور اس نے غلط صحبت اختیار کرلی۔ پھر جرائم کی راہ پر چل پڑا۔

''بیوہ کو سات سال بعد صبر کا پھل ملا۔ اس نے تمہاری کمپنی سے ایک کروڑ وصول کرلیے۔ شوہر بھی بڑی جانفشانی سے محنت کررہا تھا۔ اس نے رسک بھی بہت لیے۔ سیما جیسی عورت کی خدمات حاصل کرکے اس نے خوب دولت اکٹھی کی۔ اسے معلوم ہوگا کہ دولت کا رنگ کوئی نہیں ہوتا۔ نہ سیاہ نہ سفید۔ وہ صرف ایک طاقت ہوتی ہے جس کی راہ میں نہ قانون حائل ہوسکتا ہے اور نہ کوئی بین الاقوامی جغرافیائی سرحد۔ ترقی یافتہ ممالک بھی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں کہ تشریف لائیے۔ سرمایہ کاری فرمائیے اور شہریت لیجیے۔ آدمی پرانے ماضی کو دفنا سکتا ہے اور نیا مستقبل کسی نام و نسب رشتے یا عقیدے کے بغیر شروع کرسکتا ہے۔ یہ تو ہوئی میاں بیوی کی کارگزاری۔ میں اس امکان کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہوں کہ نورِ چشم سلطان وحید مراد نے بھی خاندانی بہبود کے اس کام میں حصہ نہ لیا ہو۔ چوریاں اس نے پریکٹس کے لیے کی ہوں گی۔ بعد میں اس نے ایک ڈاکا ڈالا۔ ڈاکے تو شاید بہت ڈالے ہوں گے' ایک کا ریکارڈ ہے جس میں وہ پکڑا گیا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ڈکیتی کی رقم یا سارا مالِ غنیمت کہیں محفوظ ہو اور جیل سے نکل کے وہ سیدھا وہیں جائے۔ مال سمیٹے اور ابا کی خدمت میں پیش کردے کہ یہ ہے میری کمائی۔ تاہم یہ مفروضہ ہے اور غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ماں باپ کو بچوں کے مستقبل کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی اور سلطان مراد نے یہاں اپنا مستقبل تاریک کرلیا تھا۔ دوسرا بڑا لڑکا بگڑا تو نہیں تھا مگر شادی کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

''شادی بھی اس نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف کی تھی۔ اور اب الگ ہی رہتا ہے۔ ماں کے ساتھ کوئی نہیں تھا'' فاروقی نے کہا۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''چلو' اب ابا مرحوم سب ٹھیک کرلیں گے۔ وہ خود جس شخص کے پاسپورٹ پر زندہ ہے

اسی کو دنیا سے رخصت ہوئے گیارہ برس ہو گئے۔ اس نے بیوی بچوں کے لیے بھی نئے ناموں سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کر لیے ہوں گے۔ کسی دن وہ سب ماضی سے مستقبل کی جانب فلائی کر جائیں گے۔ کسی بھی جہاز میں جو کینیڈا' آسٹریلیا جیسی منزل کی جانب پرواز کر رہا ہوگا۔ اس کے بعد وہ اپنی تاریخ نئے سرے سے رقم کریں گے۔''

امجد فاروقی نے سر ہلایا ''لیکن ابھی تک وہ بیوہ بیوی ریحانہ تو بڑی خاموشی سے اپنی تنہا زندگی جی رہی ہے۔ اور جب وحید مراد یا نظام الدین کے پاس ایک نئی مرسیڈیز ہے تو وہ پرانی کورولا کی خاطر یہ سارا تردد کیوں کرے گا؟''

میں نے کہا ''یہ ایک حیوانی جبلت کا مسئلہ ہے۔ جب بچے جوان ہو جائیں تو صرف پیسے کی خاطر کوئی ان سے دستبردار نہیں ہوتا۔ خون کے رشتے اتنی آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے۔ بیٹوں کے لیے باپ سے زیادہ ماں اہم ہوگی۔ وحید مراد کی عمر پچاس سے اوپر ہے۔ اگلے دس بیس برسوں میں وہ بوڑھا ہونے لگے گا۔ پھر کوئی سیما ساتھ نہیں دے گی۔ یہی بیوی اور بچے سہارا ہوں گے۔ وحید مراد بھی یہ بات جانتا ہوگا۔''

''کیا تم اس عورت سے ملے ہو' ریحانہ سے؟''

''ابھی تک اس کی نگرانی ہو رہی تھی۔''

''کیا..... تم نے پولیس کو بھی شامل کر لیا تفتیش میں؟''

میں نے کہا ''نہیں۔ کچھ مخبر یہ کام کر رہے تھے۔ باقی میرے تعلقات کام آئے۔ فون ٹیپ ہوتا رہا لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا۔''

''ہوگا بھی نہیں۔ ماں نے ایک بیٹے کو جیل سے نکالنے پر دس بیس لاکھ اڑا دیے باقی دوسرے کو دے دے گی۔''

میں نے کہا ''نہیں۔ میری معلومات کے مطابق جیل سے چار نوعمر مجرموں کو نکالنے میں کسی دینی مدرسے کا ہاتھ تھا۔ واللہ اعلم یہ جھوٹ تھا یا سچ مگر سلطان نے کہا تھا کہ ان کی رہائی کے لیے رقم کسی مولوی نے فراہم کی تھی۔ اس نے یہ گارنٹی بھی دی تھی کہ چاروں لڑکے مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کریں گے اور کبھی لوٹ کر برائی کے راستے پر نہیں جائیں گے۔ اس کہانی کی تصدیق نہیں ہوئی۔ یہ سچ بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹ بھی۔ افغان جہاد کی وجہ سے یہاں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ بیرونی عناصر مدرسوں کے نام پر مجاہد بھرتی کر رہے ہیں۔ نوعمر لڑکوں کو برین واش کر کے اور جہادی تربیت دے کر افغانستان میں لڑنے بھیج رہے ہیں۔ یہ خود سلطان ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ سچ کیا ہے۔ انہوں نے فرار کے لیے کتنی رشوت دی اور رقم کس نے فراہم کی۔''

''تم سلطان کو مارو گولی۔ یہ بتاؤ' ریحانہ سے ایک کروڑ واپس کیسے وصول ہوں گے؟''

میں نے کہا ''دیکھو..... سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وحید مراد مل گیا۔ یعنی اس کا زندہ ہونا ثابت ہو گیا۔''

''مگر وہ ہے کہاں؟''

''اس کے بہت سے سراغ مل گئے ہیں۔ کہیں نہ کہیں وہ پھر زیر دام آئے گا۔ وہ بیٹے سے ملے گا یا بیوی سے رابطہ کرے گا۔ یہ نہ ہوا تو سیما کا پتا چل جائے گا۔ سیما مل گئی تو وحید بھی ملے گا۔''

''سوال یہ ہے کہ کب..... جیسے جیسے وقت گزرے گا' ایک کروڑ کی واپسی کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ وہ باہر نکل گیا' سب کے ساتھ تو پھر کوئی امید نہیں رہے گی۔''

میں نے کہا ''مسٹر امجد فاروقی۔ میں جھوٹا دلاسا نہیں دے سکتا۔ تمہاری کمپنی کے ایک کروڑ واپس ملنے کی امید بہت کم ہے۔''

''اگر وحید مراد پکڑا جائے تو ہم ریحانہ کو بھی گرفتار کرا سکتے ہیں۔''

''کس جرم میں؟''

''دھوکا دہی..... فراڈ!''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''فاروقی صاحب! عدالت سے جاری ہونے والا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جعلی نہیں تھا۔ نہ اس میں دھوکا تھا اور نہ فراڈ۔ تمہاری کمپنی نے قانونی مجبوری میں رقم ادا کی تھی۔''

''مگر وہ بات تو غلط ہو گئی۔''

''اس میں ریحانہ کا کیا قصور ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس نے شوہر کے ساتھ مل کے فراڈ کیا۔''

میں نے کہا ''فراڈ شوہر نے کیا۔ یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ریحانہ اس میں شریک تھی؟''

''شوہر پکڑا گیا تو سب ثابت ہو جائے گا۔''

میں نے کہا ''شوہر کو کس جرم میں گرفتار کریں گے آپ؟''

وہ چونکا ''کیا مطلب.....؟''

میں نے کہا ''کیا وحید مراد کے خلاف کوئی ایف آئی آر کاٹی گئی تھی..... نہیں' اس نے نوازش علی کو سامنے رکھا تھا اور بروقت آنے سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس پر کوئی کیس نہیں تھا۔ ایک بھی رپورٹ وحید مراد کے خلاف نہیں لکھوائی گئی تھی۔ جو ایف آئی آر بعد میں درج

ہوئیں' ان میں کمپنی کے دونوں ڈائریکٹرز کو فریق بنایا گیا تھا۔ وصول کچھ نہیں ہوا۔ کمپنی دیوالیا قرار دی گئی اور جو پکڑا گیا تھا اس نے سزا کاٹ لی۔ کیس فائل کلوز۔"

فاروقی کا رنگ اڑ گیا "یار! ایسی باتیں مت کرو۔ وحید مراد نے فراڈ نہیں کیا تھا؟ خودکشی کا ناٹک رچا کے؟"

میں نے ہنس کے کہا "امجد فاروقی صاحب! خودکشی تو یقیناً جرم ہے مگر خودکشی کا ناٹک کیسے جرم ہے۔ کس قانون کے تحت؟"

"اس نے جو تحریر چھوڑی تھی' کیا وہ دستاویزی ثبوت نہیں ہے' اس کی دھوکا دہی ثابت کرنے کے لیے؟"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ تحریر؟ آٹھ سال بعد پولیس کے مال خانے میں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ فائل تک نہیں ملے گی اور فرض کرو' مل جائے تو وہ کہے گا کہ یہ میری تحریر ہی نہیں۔"

"اس کی بیوی گواہی دے چکی ہے کہ تحریر اسی کی ہے؟"

میں نے کہا "اس کی بیوی کوئی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ نہیں تھی۔ تم کیسے ثابت کرو گے کہ میاں بیوی آپس میں ملے ہوئے تھے اور یہ انشورنس کمپنی سے رقم اینٹھنے کی سازش تھی؟"

اس کا چہرہ مایوسی سے لٹک گیا "تمہاری باتوں سے تو یوں لگتا ہے جیسے تم ان کے وکیل ہو؟"

میں نے کہا "فاروقی صاحب! جنگ ہو تو ہمیشہ دشمن کے دماغ سے سوچنا چاہیے اگر تم وحید مراد یا ریحانہ کے وکیل ہوتے تو عدالت میں انہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کیا دلائل دیتے؟ مجھے تو تمہاری رقم وصول ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تم کیوں جھک مار رہے ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ وحید مراد کو تلاش کرنے کی ذمے داری میں نے قبول کی تھی۔ اسے میں نے تلاش کرلیا ہے اور کسی دن تمہارے سامنے لا کے بھی کھڑا کردوں گا۔ اس سے یا اس کی بیوی سے تم کتنا وصول کرسکتے ہو؟ یہ تمہارا کام ہے۔ ایگریمنٹ کے مطابق مجھے بھی میرا حصہ دے دینا۔ کچھ نہ ملے تو کوئی بات نہیں' میں سمجھ لوں گا کہ میں نے جوا کھیلا تھا۔ پانسا میرے حق میں نہیں پلٹا۔"

"وہ الو کا پٹھا ایسا نہیں سمجھے گا۔"

میں نے کہا "کون..... تمہارا چیئرمین؟ نہیں فاروقی صاحب' وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا۔ وہ ایسے ہی تو بہت بڑی انشورنس کمپنی کا چیئرمین نہیں بن گیا۔ اس نے قانونی ماہرین سے رائے ضرور لی ہوگی۔"

"کیا اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا؟"

میں نے کہا "کیس تو بہت سے بنتے ہیں۔ اس نے بیوی کے ساتھ مل کر ایک مجرمانہ سازش کی اور تمہاری کمپنی کو ٹھگ لیا۔ تم ریحانہ کو ملوث ضرور کرسکتے ہو۔ اس کی بدنیتی حالات کی گواہی سے ثابت بھی کیا جاسکتا ہے لیکن میاں بیوی خالی جیب دکھادیں گے اور معلوم ہو کہ ان کے اثاثے صرف ہیں تو وہ بھی کچھ عرصہ جیل میں گزار لیں گے۔"

"اس سے مجھے کیا فائدہ؟"

میں نے رازداری سے کہا "ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اس سے سودا کرلو۔"

"کیسا سودا؟"

"اس کے خلاف ایک جرم تو ثابت ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کے پاسپورٹ پر ملک سے باہر جاتا رہا ہے جس کو مرے ہوئے بھی گیارہ سال ہوگئے۔ اس کیس میں اسے سات سال کی جیل بھی ہوسکتی ہے۔ سیما اس کے جرم میں شریک ہے۔ ایف آئی اے اور امیگریشن والے اسے بھی پکڑ لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نکاح کیے بغیر ساتھ رہتے ہیں۔ یہ حدود آرڈیننس کا کیس ہے جس میں دونوں برابر طرح پھنس جائیں گے۔ اب آگے اگر ایف آئی اے والے ہیروئن کی اسمگلنگ کا چکر چلادیں تو وہ دونوں مارے گئے۔ اگر وحید مراد کا بیوی بچوں کے ساتھ خیر و عافیت کے ساتھ باہر نکل جانے کا کوئی پلان ہے تو وہ ختم۔"

"پھر وہی بات۔ انہیں جیل ہو یا پھانسی..... مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا "فائدہ اٹھا سکتے ہو تم۔ اگر قانونی چکر میں نہ پڑو اور اس جیسے عیار مکار شخص کے ساتھ قانون کا سہارا لے کر کیا نمٹنا۔ اگر کچھ فائدہ اٹھایا تو پولیس اور ایف آئی اے والے اٹھائیں گے۔ جن کے لیے یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے۔ تگڑی اسامی ہے۔ اگر تم میں ہمت اور ذہانت ہے تو ایک شارٹ کٹ ہے۔"

وہ کنفیوز نظر آنے لگا "کیسا شارٹ کٹ.....؟"

میں نے کہا "قانون کے لمبے راستے کو چھوڑو۔ پولیس سے پہلے اسے پکڑ لو اور اس سے دوٹوک بات کرو کہ بیٹے' اب تم مال سمیٹ کے بیوی بچوں کے ساتھ اس صورت میں باہر جاسکتے ہو جب ہمارا حصہ دے جاؤ۔ پولیس پکڑے گی تو بہت خوار کرے گی۔ بہت دبائے گی اور نچوڑے گی۔ وہ دو کروڑ تو نکلوالیں گے تمہارے۔ مال بچاؤ گے تو مار بہت کھاؤ گے۔ دھڑی کے بدلے چمڑی اتار لیں گے۔ خیر سے پورا خاندان

ولایت کے بجائے حوالات اور جیل میں نظر آئے گا۔ آسان راستہ تمہارے لیے شارٹ کٹ ہے کہ یہاں مجھے ایک کروڑ دو اور عزت آبرو کے ساتھ باہر سدھارو۔ جیسے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ تم خودکشی فرمانے اور نظام الدین کے مرحوم ہونے کے باوجود اس دنیا میں پھر رہے ہو۔ ایسے ہی آیندہ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ ابھی آپس کے اعتماد کی بات ہے۔ خاموشی سے نکل جاؤ لیکن ہماری خاموشی کی قیمت دے جاؤ۔"

فاروقی کی آنکھیں چمکنے لگیں "کیا ایسا ہوسکتا ہے؟"

میں نے مسکرا کے کہا "ایسا کیوں نہیں ہوسکتا آخر۔ سوال یہ ہے کہ کیا تم یہ سب کرسکو گے۔ فرض کرو' میں اس کو پارسل بنا کے تمہارے حوالے کردوں؟"

فاروقی نے میز پر مکا مارا "اس کی تو ایسی تیسی۔"

ویٹر دوڑتا ہوا نمودار ہوا "یس سر۔ کیا چاہیے؟"

"ایک کروڑ..... میرا مطلب ہے بل لاؤ" فاروقی نے کہا۔

☆☆☆

تھوڑی سی تلاش کے بعد میں نے مزنگ چونگی کے علاقے میں وہ مکان تلاش کرلیا۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ وہ بہت عام سا چار یا پانچ مرلے پر بنا ہوا مکان تھا جو میرے ذہن میں پہلے سے موجود نقشے سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک کنال کے نہ سہی کم سے کم دس مرلے کے گھر میں ضرور رہتی ہوگی اور یہ گھر بھی کسی اچھی اور نئی آبادی میں ہوگا۔ عدم توجہی اس کے در و دیوار سے اور رنگ و روغن سے عیاں تھی۔ وہ چھوٹے بڑے گھروں پر مشتمل متوسط طبقے کے لوگوں کی آبادی تھی۔ نمبر ترتیب سے ہونے کے علاوہ نمایاں طور پر لکھے ہوئے بھی تھے چنانچہ میں بھٹکے یا کسی سے پوچھے بغیر صحیح دروازے پر پہنچ گیا۔

کال بیل کام نہیں کررہی تھی۔ دوبارہ بٹن دبا کے اور انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازے کو بجایا۔ دروازہ کھول کے سامنے آنے والی عورت بھی چالیس سال کی ہوگی مگر اپنی عمر سے زیادہ کی نظر آتی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ وہ ذاتی رکھ رکھاؤ سے بے نیاز تھی۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی لیکن اس نے ہیئر کلر سے اسے چھپایا نہیں تھا۔ میں ساٹھ سال اور اس سے زائد عمر کی بہت سی خواتین کو جانتا تھا جو بالوں کے رنگ کو سیاہ نہ کرتیں تو ان کا سر سفید نظر آتا۔ اس کے چہرے سے تھکن' مایوسی اور افسردگی عیاں تھی اور رہی سہی کسر اس نے ڈھیلا ڈھالا بدوضع لباس پہن کے اور سیاہ فریم والا چشمہ لگا کے پوری کردی تھی۔

میں نے کہا "مجھے ریحانہ سے ملنا تھا۔ جو وحید مراد کی بیوی تھیں۔"

وہ چونکی نہیں مگر اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمودار ہوئے "جی میں ہی ریحانہ ہوں۔ اس کی بیوی نہیں' بیوہ۔ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

میں نے اس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا "دیکھیے..... کچھ ایسے معاملات ہیں جن پر میں یہاں گلی میں کھڑا رہ کے بات نہیں کرسکتا۔ ان کا تعلق آپ کے بیٹے سلطان سے بھی ہے۔"

اب اس کی آنکھوں میں شک اور خوف نظر آنے لگا "آپ..... کون ہیں؟"

میں نے کہا "ویسے تو میں ایک صحافی ہوں..... اور وکیل....."

اس نے ناگواری سے نفی میں سر ہلایا "میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ اب کیا چاہتے ہو تم.....؟"

اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی' میں نے کہا "پلیز..... میری بات سن لیں۔ میں آپ کے لیے اچھی خبر لایا ہوں اور میرا ارادہ ہرگز وہ نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ اگر آپ اخبار پڑھتی ہیں تو میرا نام جانتی ہوں گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی..... "کیا ہے تمہارا نام؟"

"قاضی قدوس قریشی قفنس قازقستانی..... جی میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ زیادہ تر لوگ قدوس قریشی کہتے ہیں' کچھ پی بی ایس!"

اس کے تاثرات بدل گئے "تو آپ ہیں وہ ذاتِ شریف؟"

میں نے کہا "محترمہ! میں واقعی ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ کے کام آسکتا ہوں' آپ کا کام خراب نہیں کرسکتا۔"

اس نے مجھے راستہ دے دیا "اچھا..... اندر آجاؤ۔"

ایک معمولی سے کمرے میں جسے ڈرائنگ روم کے بجائے بیٹھک کہنا زیادہ مناسب تھا' میں نے سکون کا سانس لیا "تو یہاں رہتی ہیں آپ..... یقین نہیں آتا۔"

"کیوں..... آپ کے خیال میں مجھے کہاں رہنا چاہیے؟"

میں نے کہا "آپ کے شوہر اتنے بڑے بلڈر تھے۔ پھر ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی آپ کو ان کی لائف انشورنس کی اچھی خاصی رقم ملی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ بہت ٹھاٹ باٹ

سے کسی کوٹھی میں رہتی ہوں گی۔"

اس نے تلخی سے کہا "پرانے زخموں کو مت چھیڑو۔ دکھ بھی بہت اٹھائے ہیں میں نے۔ اس وقت نہ کوئی صحافی آیا نہ وکیل' جب میرے حالات سخت تھے۔ دنیا نے میری زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ میں جہاں جاتی تھی' میرے پیچھے قرض خواہ لگے رہتے تھے۔ سنسنی خیزی ڈھونڈنے والے صحافی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "یقین کیجئے' مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آپ واقعی مالی مسائل سے بھی دوچار تھیں۔"

"واقعی کا کیا مطلب..... مرنے والا کیا چھوڑ کر گیا تھا میرے لیے اور بچوں کے لیے۔ صرف قرض' قانونی مسائل' بدنامی' پریشانیاں اور خطرات۔ ساری دنیا میں ایک بھی ہمدرد نہیں تھا میرا۔ جو اپنے تھے وہ بھی غیر ہو گئے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ شوہر نے خودکشی سے پہلے بیوی بچوں کے لیے لاکھوں چھوڑے ہوں گے۔ جو تھوڑا بہت تھا وہ بھی چھن گیا تھا۔ یہاں تو ایسے بھیڑیے اور شیطان تھے جو قرض کے بدلے میں مجھے کمائی کے لیے کوٹھے پر پہنچا دیتے۔ میرے بچوں کو خرکاروں کے ہاتھ بیچ دیتے۔ خیر' ان باتوں سے اب کیا حاصل۔ تم بتاؤ کیا اچھی خبر لائے تھے؟"

میں نے کہا "خاتون! کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ آپ کے شوہر نے خودکشی کر لی تھی؟"

وہ بھڑک اٹھی "یہ کیا فضول سوال ہے..... دنیا جانتی ہے۔"

میں نے کہا "ناراض نہ ہوں۔ میں دنیا کی نہیں' آپ کے یقین کی بات کر رہا تھا۔"

"آٹھ سال سے بیوہ ہوں میں..... اور تم پوچھ رہے ہو مجھے اپنے بیوہ ہونے کا یقین بھی ہے یا نہیں؟" اس نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا "دیکھیے..... کیا آپ کو ایک فیصد امید بھی نہیں..... کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ زندہ ہو سکتا ہے' اور شاید کبھی آ جائے۔ آپ نے اس کی لاش تو نہیں دیکھی تھی نا..... نہ کسی اور نے۔ جو لوگ نظروں کے سامنے دفن کر دیے جائیں ان کے لیے صبر آ جاتا ہے مگر گم ہو جانے والوں کا انتظار تو لوگ ساری عمر کرتے ہیں۔ زندگی کی آخری سانس تک۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بات کی اچانک اتنی اہمیت کیوں ہو گئی ہے۔ مجھے بہت پہلے یقین آ گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ آج ایک فیصد بھی شک کا امکان نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مسز وحید مراد! ایک فیصد تو بہت زیادہ ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں میں ایک چانس پر زندگی میں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لاکھوں کی آبادی میں ایک شخص کے پاس فرشتۂ اجل کا قرعہ نکل آتا ہے تو وہ حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے کے نام تقدیر بدل دینے والی لاٹری نکل آتی ہے۔ آپ بیوہ نہیں ہیں' وحید مراد زندہ ہے۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی اور میں یہ دیکھتا رہا کہ اس کے ردِعمل میں اداکاری کا کتنا کمال ہے۔ تھوڑی بہت ایکٹنگ ایک بچہ بھی کر لیتا ہے۔ ریحانہ اگر سات آٹھ سال سے ایک بیوہ کا رول کر رہی تھی تو یہ ہو سکتا تھا کہ اس کردار میں اس کی اداکاری بھی حقیقی لگے۔ لیکن اس کا ردِعمل مجھے انتہائی فطری لگا۔ کوئی ایوارڈ یافتہ اداکارہ بھی کسی تیاری کے بغیر نہ ایسے ڈائیلاگ بول سکتی تھی اور نہ جذبات کی ایسی عکاسی کر سکتی تھی۔

بالآخر اس نے خودکلامی کے انداز میں تردید کی "یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے خاتون۔ کیا واقعی اس نے آپ سے رابطہ نہیں کیا؟"

"مجھ سے..... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ وہ بھلا مجھ سے کیوں رابطہ کرے گا آٹھ سال بعد' اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں کہ وہ زندہ ہے۔"

"آخر وہ شوہر ہے آپ کا۔"

وہ چلا کے بولی "وہ شوہر تھا۔ جب زندہ تھا۔ آٹھ سال ہو گئے اسے خودکشی کیے ہوئے۔ وہ سمندر میں ڈوب کے مر گیا تھا۔ میرے پاس اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے۔"

"وہ تو سات سال سے لاپتا ہر شخص کے لیے جاری ہو جاتا ہے۔ آپ کو لائف انشورنس کی رقم لینی تھی اس لیے آپ نے قانون کا سہارا لیا۔ ورنہ کون لیتا ہے؟"

اس نے اٹھ کے ایک گلاس پانی کا پیا اور پھر دوپٹے سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا "دیکھو..... یہ تم کیسے جانتے ہو' کس نے کہا ہے تم سے..... اور کیوں یقین کر لیا ہے تم نے ایسی بے بنیاد بات کا۔"

میں نے تھوڑا سا وقفہ دے کر کہا "اگر میں سنی سنائی پر یقین کر کے آ جاتا تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوتا لیکن میں نے خود دیکھا ہے اسے..... میں مل چکا ہوں اس سے۔"

وہ نروس ہونے لگی "تم نے دیکھا ہے اسے..... کب..... اور کہاں؟"

میں نے کہا "ایک ہوٹل میں۔ مجھ سے پہلے بھی کسی نے

اسے دیکھا تھا' انشورنس کمپنی والوں نے۔"

"اوہ....." وہ گہرا سانس لے کر بولی "اب سمجھی میں۔ انہوں نے چلایا ہے یہ سارا چکر' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ لائف انشورنس کی رقم غلطی سے دے دی گئی۔ وہ آدمی تو زندہ ہے' ہے نا یہی بات.....؟"

میں نے کہا "بالکل ہے۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی "انہیں بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ ایک کروڑ دینے پڑے۔ مگر کیا کسی کو اندازہ ہے کہ سات سال میں نے کتنی تکلیف اٹھائی تھی۔ میرے بچوں نے کتنی تکلیف اٹھائی تھی۔ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ چھپتے پھرتے تھے لوگوں سے۔ کوئی نہ کوئی ہمیں پھر تلاش کر لیتا تھا۔ اب میں مرنے والے کو کیا کہوں۔ کتنے گھر اجاڑے تھے اس نے' کتنے لوگوں کی زندگی بھر کی کمائی چھین لی تھی' کتنے خواب دکھا کے تعبیر چھین لی تھی۔ ہمیں نہ جانے کس کس کی کیسی بددعا لگی۔ وہ خود تو مر گیا شرم سے ڈوب کے' ہمارے لیے بے شرمی سے جینے کا عذاب چھوڑ گیا۔ میں نے بچوں کو کیسے پالا یہ میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن باپ کے کیے کی سزا انہوں نے ہمیشہ بھگتی۔ چھوٹا والا زیادہ حساس تھا۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ کہتا تھا بچے مجھے ذلیل کرتے ہیں کہ اس کا باپ فراڈیا تھا' کیسی کیسی گالیاں کھائی ہیں ہم نے سب کی" وہ بات کرتے کرتے رونے لگی تھی۔

اس ڈر سے کہ کہیں وہ ہسٹریا میں مبتلا نہ ہو جائے' میں نے خود اٹھ کے اسے پانی دیا "ٹیک اٹ ایزی مسز وحید مراد!"

اس نے گلاس پھینک دیا "مت لو میرا یہ نام۔ کوئی وحید مراد میرا شوہر نہیں۔ اگر تم ایجنٹ ہو انشورنس کمپنی کے تو چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "اوکے' آئی ایم سوری..... میں چلا جاتا ہوں..... لیکن اس سے آپ کے مسائل بڑھ جائیں گے۔ میں تو آپ کو آگاہ کرنے آیا تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کر گئے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا بیٹا سلطان بھی جیل سے فرار ہو گیا ہے۔"

وہ بُری طرح چونکی "کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے محسوس کیا کہ اس خبر کے جھٹکے نے ریحانہ کے ہسٹریا کو روک دیا ہے "آپ کو کیا معلوم خاتون..... یہ کراچی کے اخبارات کی خبر ہے جو یہاں آپ کی نظر سے نہیں گزری۔ آپ کا ایسا کوئی ہمدرد نہیں جو یہ خبر آپ تک پہنچاتا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ آپ کے فون پر آبزرویشن تھی تاکہ آپ کا شوہر یا بیٹا ادھر کا رخ کریں یا آپ سے بات کریں تو معلوم ہو جائے۔ جس دن آپ کا بیٹا جیل سے فرار ہوا تھا' اسی دن وحید مراد پھر غائب ہو گیا تھا۔ یہ بھی شک کیا جا رہا ہے کہ بیٹے کو فرار کرانے میں باپ کا ہاتھ تھا۔"

اس نے اپنا سر ایسے تھام لیا جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ پھر اس نے کہا "ایک منٹ..... مجھے ذرا سنبھلنے دو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا میں نے۔ میں چائے بنا کے لاتی ہوں تمہارے لیے۔ مجھے ساری بات بتاؤ' شروع سے..... یہ سب جھوٹ تو نہیں ہو سکتا..... مگر میں کیسے مان لوں' ضرور کوئی چکر ہے۔"

وہ مجھ سے زیادہ خود سے بات کر رہی تھی۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ایک وقفہ آ جائے جس میں وہ خود کو سنبھال لے۔ میں نے چائے سے انکار نہیں کیا۔ چند منٹ بعد وہ ہاتھ منہ دھو کے اور چائے لے کر لوٹی تو اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان سے اس کو اول تا آخر تمام واقعات بتائے۔ صرف ایک بات میں نے اس سے چھپائی کہ اس کا شوہر کس عورت کے ساتھ کس نام سے رہتا ہے۔ اسے صدمہ ہوتا۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا "کیا تم یہی سمجھتے ہو کہ وہ ادھر آئے گا۔ آخر کیوں.....؟ سلطان کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی ماں ہوں میں..... مگر میرا شوہر جو آٹھ سال پہلے مجھے چھوڑ گیا تھا' اسے کیا ضرورت ہے کہ پھر مجھ سے رابطہ کرے..... اور سلطان کو اس نے جیل سے فرار کیوں کرایا؟ نکالنا تھا تو باعزت طریقے سے نکالتا۔ بے گناہ ثابت کر کے۔ اس کے جرم کو اتنا سنگین بنا کے کون سا فرض ادا کیا اس نے؟ مزید دشمنی کی ہے اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "حقیقت کیا ہے' اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا لیکن خاتون! پولیس کا اور انشورنس کمپنی کا ایک نظریہ ہے کہ یہ سارا ایک فیملی ڈراما تھا۔ اس میں آپ بھی شامل تھیں..... اور ہیں۔"

"وہ کیسے؟" وہ مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھنے لگی۔

میں نے اسے بتا دیا۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے بھی اس نظریے سے اتفاق تھا لیکن اب میرے خیالات بدل چکے تھے۔

"میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا" وہ برہمی سے بولی۔

''انشورنس کمپنی والے ایسا سمجھتے ہیں۔''

''وہ سمجھتے رہیں۔ میں نے قانونی طور پر اپنا حق حاصل کیا تھا۔ وہ رقم کیسے واپس مانگ سکتے ہیں.....اور رقم اب ہے بھی کہاں؟''

''اگر آپ کو بتانا پڑے کہ رقم کہاں گئی؟''

وہ بولی ''ہاں.....میں بتا سکتی ہوں' پچاس لاکھ تو جو بڑے بیٹے کے لیے تھے' وہ میں نے اسے دے دیے۔ اس نے اپنے لیے کراچی میں ایک مکان خرید لیا ہے۔''

''اور آپ کو اکیلا چھوڑ گیا ہے اس گھر میں؟''

''میں خود نہیں گئی اس کے ساتھ'' وہ نظر چرا کے بولی ''اس کا تو بزنس ہے وہاں' باقی آدھے میں نے سلطان کے لیے رکھے تھے۔ اس میں سے دس لاکھ میں بہت بڑا وکیل کیا ہے میں نے۔ پھر یہ کیا بے وقوفی کی اس نے؟ وہ جیل سے فرار کیوں ہوا آخر؟ خواجہ صاحب جیسے وکیل بھی اب کیا کر سکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''آپ کی اس سے ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''ابھی دو ہفتے پہلے۔ سولہ دن پہلے۔ میں اسے یہی بتانے گئی تھی کہ میں نے خواجہ صاحب کی خدمات حاصل کر لی ہیں اور اس وقت سلطان نے اپنے باپ کی تو کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ اسے جیل سے نکالنے کے لیے فرار کرانا چاہتا ہے۔ سلطان بے وقوف نہیں ہے کہ اس باپ کے کہنے میں آ کے ایسی حماقت کرتا جس سے وہ پہلے ہی شدید نفرت کرتا ہے۔ وحید کو بھی کیا پڑی ہے کہ سلطان کے لیے کچھ کرے' جب آٹھ سال کچھ نہیں کیا۔''

وہ بہت دیر بولتی رہی۔ یہ اس کی زندگی کے گزرے ہوئے آٹھ سالوں کا ماجرا تھا جس میں ایک عورت کے سارے دکھ شامل تھے۔ وہ جو اس کو شریکِ حیات سے ملے تھے' وہ جو دنیا نے دیے تھے اور وہ جو اب بیٹے دے رہے تھے۔ وہی بیٹے جن کے لیے جینا اس کی مجبوری بنا ہوا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ بڑے بیٹے نے اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اسے کبھی خوش نہیں رکھ سکے گی۔ وہ ان کے ساتھ جاتی تو حالات مزید خراب ہوتے۔

میں نے ایک وقفے کے دوران میں کہا ''خاتون! آپ کی قربانیوں نے مجھے متاثر کیا۔ بیٹوں کو بڑا کرنے کے لیے آپ کی جدوجہد واقعی بہت سخت تھی۔ شوہر نے آپ کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ مگر جو اس کی وجہ سے آپ کو ملا وہ بھی آپ نے بیٹوں کو دے دیا۔ اپنے لیے کچھ نہیں رکھا؟''

''مجھے کیا کرنا تھا؟''

میں نے کہا ''کیوں.....؟ زندگی کے سکھ آرام پر آپ کا کوئی حق نہیں؟ یہ تو ذمے داری تھی جوان بیٹوں کی۔ اب ان کی باری تھی کہ وہ دکھ اٹھائیں اور آپ کی زندگی کو آسان بنائیں۔ ایک بیوی کو ساتھ لے کر نکل گیا دوسرا تباہی کے راستے پر چل پڑا ہے۔ آپ اب بھی دکھی ہیں' ان کے لیے.....ایک کروڑ پتی سمجھی جانے والی عورت کے پاس کچھ نہیں؟''

''تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں اور ایسا ہی کرتی ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ جو سلطان کے حصے کے نصف کروڑ تھے اس میں سے دس لاکھ تو آپ نے وکیل کو دے دیے.....باقی کہاں ہیں؟''

اس نے شک کی نظر سے مجھے دیکھا ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ تاکہ انشورنس کمپنی کو بتا دو۔ میں بتا رہی ہوں تمہیں کہ کوئی مجھ سے ایک پیسہ وصول نہیں کر سکے گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''آپ کو مجھ پر بھروسا ہونا چاہیے۔ انشورنس کمپنی نے مجھے وحید مراد کی تلاش پر مامور ضرور کیا تھا لیکن ایک تو میں نے ان سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا تھا۔ میں کسی طرح بھی پابند نہیں ہوں کہ انہیں کچھ بتاؤں۔ حالات کی جو تصویر اب میرے سامنے آئی ہے وہ بہت مختلف ہے۔ میں نے انشورنس کمپنی پر پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ شاید وحید مراد کے ملنے کے بعد بھی رقم انہیں نہ ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف انشورنس کمپنی ہی نہیں' وحید مراد کے بہت سے پرانے قرض خواہ بھی وحید مراد کے گرفتار ہوتے ہی پھر اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اس کے وارثوں کے اثاثے بھی منجمد کرانے کی پوری کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے آپ نے اس خطرے کا سدِباب کر لیا ہوگا۔''

وہ مسکرائی ''حالات نے مجھے بھی چالاک بنا دیا ہے۔ تم فکر مت کرو' میرے یا بچوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ہے تو کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ ہم سب ہی دیوالیے نظر آئیں گے۔''

میں نے کہا ''دیری گڈ! اب ایک آخری سوال.....اس کا صحیح جواب یا تو آپ دے سکتی ہیں یا آپ کا شوہر۔ میری معلومات کے مطابق کسی نے سلطان کو فرار کرانے کے لیے جیل حکام کو رشوت دی تھی' دس لاکھ روپے۔ یہ رقم مجھے اس کام کی نوعیت کے اعتبار سے بہت کم لگتی ہے۔ اتنی بڑی رقم باپ تو باپ ادا کر سکتا تھا یا پھر ماں نے دی ہوگی۔''

''میں نے ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کی۔ میں دشمن نہیں ہوں اپنے بیٹے کی۔ اس کا باپ ہے جرائم پیشہ' یہ خیال اس کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ سلطان کو نکال کر باہر لے جائے مگر سلطان اس کی مدد ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ وہ خود کیا کہتا ہے؟''

''وہ تو کچھ اور ہی کہانی سناتا ہے'' میں نے کہا ''کہ اسے کسی دینی مدرسے والوں نے اپنی کوشش اور اپنی ضمانت پر رہائی دلوائی تھی۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں.....لیکن جو بھی ہوا غلط ہوا۔ اس کے جرائم کی فہرست میں کتنا اضافہ ہو گیا' کتنے سنگین جرائم کا۔''

میں نے کہا ''اگر وہ آپ سے رابطہ کرے' کسی بھی طرح.....تو کیا آپ اس سے یہ بات پوچھیں گی.....اور پھر مجھے بتائیں گی؟''

''میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔''

''اگر میں آپ کے شوہر کو پھر تلاش کرنے میں کامیاب رہا تو میں بھی اس سے معلوم کروں گا۔''

''یہ کیا شوہر شوہر لگا رکھی ہے تم نے۔ کیا پتا تم نے جسے دیکھا وہ کون تھا؟ وہ ملتی جلتی صورت والا کوئی شخص بھی تو ہو سکتا ہے؟ تمہاری اس سے بات تو نہیں ہوئی تھی ناں.....آخر تمہارے پاس شناخت کا کیا ذریعہ تھا؟''

''اس کی تصویر'' میں نے پولیس ریکارڈ کی پرانی تصویر نکالی ''یہی ہے نا وحید مراد؟''

''ہاں.....مگر آٹھ سال بعد وہ ایسا تو نہیں ہوگا؟''

''ظاہر ہے.....جب میں نے اسے دیکھا تو وہ.....ایسا تھا'' میں نے اپنے بریف کیس میں سے دوسری تصویر نکال کے اس کے سامنے رکھی۔

اس نے تصویر کو غور سے دیکھا ''اس میں مشابہت تو ہے مگر یہ وحید مراد نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''دیکھیے.....اس تصویر کو پولیس کے آرٹسٹ نے بنایا ہے جیسے میں نے کہا۔''

''مجھے اندازہ ہے.....لیکن تم اس سے مطمئن ہو کہ یہ اس کا چہرہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو تم غلطی پر ہو.....میں تم سے شرط لگا سکتی ہوں۔''

میں نے تصویر واپس رکھ لی ''آپ ہار جائیں گی۔''

''ایک بیوی.....میرا مطلب ہے اس شخص سے زیادہ وحید مراد کو اور کون پہچانے گا' جو پندرہ سال اس کے ساتھ رہی تھی۔ جو اس کے بچوں کی ماں تھی'' وہ تلخی سے بولی۔

''شاید وہ سامنے آئے تو آپ کا خیال بدل جائے۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ' اتنا بڑا فراڈ کرنے والا اپنے اصلی چہرے اور حلیے کے ساتھ اتنی بے خوفی سے کیوں پھر رہا ہے؟ وہ بھی ایک بوگس پاسپورٹ پر۔ ایک ایسے شخص کے پاسپورٹ پر جس کو مرے ہوئے گیارہ سال ہو گئے مگر کیا یہ ناممکن ہے کہ اس کا کوئی جاننے والا آج بھی زندہ ہو۔''

میں نے کہا ''نظام الدین تو بہت ہوں گے پاکستان میں' اس کا چہرہ بہرحال وحید مراد کا ہے۔''

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ نام کے ساتھ چہرہ کیوں نہیں بدلا اس نے؟ میک اپ سے کیا ممکن نہیں۔ وہ داڑھی مونچھ رکھ سکتا تھا۔ ہیئر اسٹائل بدل سکتا تھا۔ کنٹیکٹ لینسز لگا کے آنکھوں کا رنگ تبدیل کر سکتا تھا۔ پیسہ ہو تو پلاسٹک سرجری کرا کے وحید مراد خود کو ندیم یا محمد علی بنوا سکتا تھا۔''

''یہ بات واقعی میرے لیے بھی ناقابلِ فہم ہے۔''

وہ پُرمسخر انداز میں بولی ''اب ملے تو پوچھ لینا۔''

''مجھے وہ پھر کہاں ملے گا.....لیکن ہو سکتا ہے آپ سے ملنے آئے اور میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ آئے گا۔''

''ہاں.....گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ اگر مجھے پریشان کیا اس نے تو میں اسے قتل کر دوں گی۔''

''آپ کو وہ کیسے پریشان کر سکتا ہے؟''

''بالفرض محال وہ زندہ ہوا' تو پھر شوہر بن جائے گا۔ دعویٰ کرے گا حقوقِ زوجیت کا۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس کی بیوہ ہی ٹھیک ہوں۔ میں واقعی اسے گولی مار دوں گی۔''

بات صرف کہنے کی تھی مگر اس کے الفاظ میں نفرت کا جو زہریلا سمندر موجزن تھا وہ اس کے عزائم کی عکاسی کرتا تھا۔

''یہ تو پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے.....؟''

وہ بگڑ گئی ''کیا بات ہے؟ تمہیں بہت ہمدردی محسوس ہوتی ہے اس سے۔ میری طرف دیکھو' میرے بچوں کو دیکھو' ان سیکڑوں لوگوں کی طرف دیکھو' جن کے نزدیک وہ ایک بے ضمیر ڈاکو تھا۔ جو انہیں لوٹ کے بھاگ گیا تھا۔ آج بھی نہ جانے کتنے اس کے خون کے پیاسے ہوں گے۔ تم دیکھ لینا.....کسی روز وہ مارا جائے گا۔''

میں نے سر ہلا کے کہا ''یہ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔''

اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ''اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو تلاش کر لوں گی۔ آپ اتنے غیر معروف تو نہیں ہیں۔''

اس عورت نے میرے اعتماد کو متزلزل کر دیا تھا۔ میں

اب پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جسے میں فیملی ڈراما سمجھتا تھا وہ میری خام خیالی تھی..... حالات کی گواہی کچھ اور تھی۔ حقائق مختلف نظر آتے تھے۔ ابھی تک میں حتمی فیصلہ صادر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ وحید مراد' اس کی بیوی اور بیٹا سب شریکِ جرم تھے۔ نہ ان کے درمیان کوئی جذباتی رشتہ محسوس ہوتا تھا اور نہ مالی مفادات کا تعلق۔

اگر اس معاملے میں ایک غیر متوقع پیش رفت نہ ہوتی تو شاید میں اس کی پُراسرار اور ناقابلِ فہم بھول بھلیوں سے نکل آنے کو ترجیح دیتا مگر ایک دن اچانک مجھے کراچی سے اس پراپرٹی ڈیلر کا فون موصول ہوا جو سیما نظام کے ناظم آباد والے گھر کی فروخت کا ذمے دار تھا۔

میرے ہیلو کے جواب میں اس نے کہا ''قدوس قریشی صاحب! میں کراچی سے اشرف بول رہا ہوں' پرائم پراپرٹی!''

مجھے ایک امید کی روشنی محسوس ہوئی ''جی فرمائیے' کچھ بات بنی؟''

اس نے کہا ''سیما کا فون آیا تھا' ابھی کچھ دیر پہلے۔''

میں نے کہا ''اچھا..... کہاں سے؟''

''یہ تو اس نے نہیں بتایا کہ وہ خود کہاں ہے' میرے پوچھنے کے باوجود۔ میں نے کہہ دیا کہ بی بی' ایسے تو تمہارا مکان کبھی فروخت نہیں ہوگا۔ خریدار مطمئن نہیں ہوتے۔''

''پھر..... کیا وہ ملنے پر راضی ہے؟''

''نہیں جناب! وہ تو خفا ہوگئی کہ تم کیسے پراپرٹی ڈیلر ہو۔ پاکستان میں تو بروکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ قائداعظم کے مزار اور مینارِ پاکستان تک بیچ دیں۔ شاید تمہیں پاور آف اٹارنی دے کے غلطی کی میں نے۔ میں نے کہا کہ سیما اگر میں اس قسم کا بروکر ہوتا تو کب کا تمہارے مکان کو ٹھکانے لگا کے رقم بھی ہضم کر جاتا۔ اب تم خود کر دو کسی اور سے کراؤ یہ کام۔ میں اس معاملے میں نہیں پڑوں گا۔ ایک خریدار صرف ایک دن کے نوٹس پر لاہور سے کراچی آ کے ادائیگی کر سکتا ہے مگر وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ کم سے کم یہ اطمینان چاہتا ہے کہ تمہارا اپنا ٹھکانا معلوم ہو' تم زندہ بھی ہو یا نہیں؟''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... لیکن فرض کریں اس نے اپنی پاور آف اٹارنی کسی اور کو دے دی.....؟''

''اتنی بے وقوف نہیں ہے وہ..... اور پاور آف اٹارنی کسی اور کو غائبانہ طور پر تو نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لیے بھی سامنے تو آنا ہی پڑے گا اسے۔ اس کی خاموشی سے مجھے لگتا ہے کہ وہ آئے گی۔ کسی دن اچانک آ جائے گی۔''

''اگر وہ آ جائے تو آپ کچھ مت کریں۔ بس مجھے ایک فون کر دیں۔ گاہک تو یقیناً اور بھی ہوں گے مگر میں آپ کو منہ مانگی قیمت دوں گا اور ایک دن میں شرطیہ ادائیگی میری ذمے داری۔''

فون بند کرنے کے بعد میں نے اپنے رابطوں کی فہرست پر نظر دوڑائی اور ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے ایک جنرل منیجر سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار اپنی پروموشن کے معاملے میں ہونے والی دھاندلی کے خلاف اس نے مجھے اندر کی بہت سی سنسنی خیز معلومات فراہم کی تھیں۔ جب یہ اسٹوری شائع ہوئی تو اوپر تک خاصی ہلچل ہوئی اور بالآخر اس کی پروموشن بھی ہوگئی۔ اس کے لیے وہ میرا شکر گزار تھا۔

اس نے مجھے دیکھ کے بڑی مسرت کا اظہار کیا ''قاضی قدوس قریشی قفس قازقستانی' فرمائیے..... کیسے زحمت کی ہے مگر پہلے بتائیے کیا لیں گے' چائے..... کافی یا ٹھنڈا؟''

میں نے کافی کو ترجیح دی ''ایک کام ہے جو آپ کے لیے بالکل مشکل نہیں۔''

''آپ حکم کریں۔ مشکل کام بھی آسان ہو سکتے ہیں۔''

میں نے اسے اشرف کا فون نمبر دیا ''یہ کراچی کا ایک پراپرٹی ڈیلر ہے۔ ابھی ایک دو گھنٹے پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ دوست ہے میرا۔ کسی نے اسے فون پر دھمکی دی ہے۔''

''کیا اس نے کمپلیٹ کی.....؟''

''نہیں۔ وہ لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ آپ کراچی کے اس فون پر صبح سے ہونے والی ہر کال کا نمبر ٹریس کریں اور مجھے بتا دیں۔''

''نو پرابلم!'' اس نے فون اٹھا کے اپنے پی اے کو طلب کیا۔

میں نے کہا ''فون نمبر ہو تو ایڈریس بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''یس..... وہ تو ہر بل پر ہوتا ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے پی اے کو ضروری ہدایات دیں اور میرے کافی ختم کرنے سے پہلے میرے سامنے تین فون نمبروں کی ایک فہرست آ گئی۔ ان کے سامنے لکھے ہوئے سارے پتے کراچی کے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چالاک عورت کراچی میں ہی موجود تھی مگر سامنے آنے سے کترا رہی تھی۔'' اچانک میرے ہاتھ میں الجھی ہوئی ڈور کا وہ سرا آ گیا تھا جو سب سے اہم تھا۔ اگر میں نے سیما کو تلاش

کر لیا تو وحید مراد خود بخود مل جائے گا۔

میں نے یہ خوش خبری امجد فاروقی کو سنانے کے لیے اس کے گھر فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ میرے پاس اس کے آفس کا براہِ راست نمبر تو نہیں تھا مگر بی بی آئی سی کے ایکس چینج کا نمبر تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اگر وہ چیئرمین کے ساتھ کام کرتا تھا تو یقیناً ہیڈ آفس میں ہی ہوگا لیکن آپریٹر نے معذرت کی کہ اس نام کے کوئی ڈپٹی جنرل منیجر اس کمپنی میں نہیں ہیں۔

میں نے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں انہیں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ کئی بار مل چکا ہوں ان سے۔''

''ممکن ہے وہ دوسری انشورنس کمپنی ہو سر!''

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ بہت بڑی انشورنس کمپنی کوئی اور بھی ہے؟ ہاں' میں آفس جا کے بھی نہیں ملا..... اور فون پر بھی آفس میں بات نہیں ہوئی کبھی.....''

''آئی ایم سوری!''

میں نے کہا ''ایک منٹ..... کیا میں چیئرمین صاحب سے مل سکتا ہوں؟''

''وہ..... میٹنگ میں ہیں اس وقت۔ آپ کو اپائنٹمنٹ لینا ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ انہیں میرا نام بتا دیں۔ ٹائم وہ بتا دیں گے۔'' میں نے کہا اور چند منٹ انتظار کرتا رہا۔ حسبِ توقع مجھے دوپہر کے بعد بلا لیا گیا۔

میری حیرانی پہلے پریشانی میں اور پھر خود سے ناراضی میں بدل گئی تھی۔ آخر صورت دیکھ کر میں نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ امجد فاروقی ہے اور بی بی آئی سی کا ڈپٹی جنرل منیجر بھی ہے۔ وہ معزز اور ذمے دار نظر آتا تھا' کپڑے بھی اچھے پہنتا تھا اور باتیں بھی یقین کے ساتھ کرتا تھا۔ اس کی بدحواسی کو عمر اور پریشان حالی کو حالات سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس پر شک کرتا اور کہتا کہ شناختی دستاویزات سے خود کو ڈپٹی جنرل منیجر بی بی آئی سی ثابت کرو۔

شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اگر اس نے نام غلط بتایا تھا تو باقی باتیں بھی غلط بتائی ہوں گی۔ مجھے اس سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں بلاوجہ کس چکر میں پڑ گیا۔ اتنا بڑا جھوٹ آخر اس نے کس لیے بولا؟ خیر' پتا چل جائے گا۔ اس کے گھر کا فون نمبر میرے پاس ہے' پتا بھی مل جائے گا۔

بی بی سی آئی کا چیئرمین میری بات سن کے دنگ رہ گیا۔ وہ ایک انتہائی سنجیدہ مزاج اور بردبار آدمی تھا۔ ہر لحاظ سے بہت بڑی انشورنس کمپنی کا پلر کہلانے جانے کے لائق۔ اس کے سامنے میں نے خود کو قطعی احمق محسوس کیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم نے وحید مراد کی بیوہ کو گزشتہ سال عدالت کی تصدیق کے بعد ایک کروڑ ادا کیے تھے۔ وحید مراد کے بارے میں باقی اسٹوری بھی درست ہے۔ وہ کروڑوں کا غبن کر کے بھاگ گیا تھا اور اس کے پارٹنر نوازش علی کو جیل کاٹنی پڑی تھی۔ لیکن وہ زندہ ہے' اس بارے میں ابھی تک ہمارے پاس کوئی رپورٹ نہیں۔ نہ ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''اگر اب آپ کو پتا چلے کہ وہ زندہ ہے..... پھر.....؟''

''پھر ہم پولیس کے ذریعے تلاش کرائیں گے۔ اخبارات میں اس کی تصویر دیں گے۔ پوسٹرز بھی لگوا سکتے ہیں مگر اس کے لیے پوری کارروائی قانون کے مطابق ہوگی۔ عدالت کی اجازت سے۔ اور بالفرض محال وہ پکڑا گیا تو ایک مرحلہ ہوگا تصدیق کا۔ صورت کا کیا ہے مسٹر قریشی! دنیا میں ایسے ایسے ہم شکل ہیں کہ کبھی اتفاق سے سامنے ہو گئے تو لوگوں نے جڑواں سمجھا۔ اس کی صحیح شناخت ضروری ہوگی۔''

مجھے مزید شرمندگی ہوئی۔ ''اچھا..... اس کے بعد.....؟''

''پھر دیکھیں گے رقم کی واپسی کے لیے کیا قانونی طریقۂ کار ہے۔ کتنا واپس وصول کیا جا سکتا ہے اور کیسے؟ اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا اور کتنی توانائی۔ کتنا پیسہ عدالتی نظام میں لگے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی بہت منافع بخش کام ہوگا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے ہمیں کچھ نہ ملے۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ''کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ گزشتہ آٹھ برسوں میں امجد فاروقی نام کا کوئی شخص اس کمپنی میں تھا؟ کسی نچلے عہدے پر..... یا کوئی انشورنس ایجنٹ؟''

اس نے گھڑی دیکھی ''ایڈمن سیکشن کے پاس پرسنل ریکارڈ یقیناً ہوگا۔ لیکن اس میں سے ایک نام نکالنا شاید مشکل ہو۔ آپ کل آ جائیں' میں کوشش کرتا ہوں۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔ ایک سوال اب مستقل میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ آخر وہ کون تھا اور اس نے مجھے کیوں استعمال کیا؟ امجد فاروقی تک پہنچنے کا شارٹ کٹ اس کا فون نمبر تھا جس پر میں اس سے بات کرتا رہتا تھا۔ میں نے فون سے پتا تلاش کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ وہ صدر بازار کی پچھلی گلیوں میں ایک چھوٹا سا مکان تھا لیکن وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اردگرد کے لوگوں سے معلوم کیا

تو ایک بات کی تصدیق ہوگئی۔ میرے بیان کردہ حلیے کا ایک شخص وہاں رہتا تھا مگر اس نے یہ مکان حال ہی میں کرائے پر لیا تھا۔ اس کا نام امجد فاروقی نہیں قدیر الدین تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کیا کام کرتا تھا۔ اسے محلے میں بھی بہت کم دیکھا جاتا تھا۔ وہ کب باہر جاتا تھا اور کب لوٹتا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر اسی محلے میں مجھے قدیر الدین کا مالک مکان مل گیا۔ اس نے بتایا کہ قدیر نے یہ مکان ایک ماہ قبل کرائے پر لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ریلوے کے محکمے میں ہے اور اس کی تبدیلی کراچی سے لاہور کردی گئی تھی۔ مکان مل جانے کے بعد وہ کسی روز چھٹی لے کر جائے گا اور اپنے بیوی بچوں کو لے آئے گا۔ مالک مکان کے خیال میں وہ شریف لیکن کچھ پریشان حال اور مخبوط الحواس آدمی تھا۔

ایسی صورت حالات کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے امجد فاروقی یا قدیر الدین کے آفس اور گھر پہنچ کے میں نے اسے ہمیشہ کے لیے گنوا دیا ہے۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوگا کہ میں اس کی تلاش میں آفس اور گھر پہنچ گیا تھا' وہ غائب ہوجائے گا۔ بے وقوفی کی ابتدا اس نے کی تھی۔ اس نے کیسے فرض کرلیا تھا کہ میں کبھی بھی اس کے آفس نہیں جاؤں گا اور اس سے میرا رابطہ ہمیشہ گھر کے فون پر رہے گا۔ بے وقوفی کی انتہا میں نے کی تھی اور اب یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرگیا تھا کہ آخر وہ کون تھا؟

رات تک میں تقریباً فیصلہ کرچکا تھا کہ خود کو اس معاملے سے الگ کرلوں گا۔ ایک تجسس مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں تہ تک پہنچ کے حقیقت معلوم کروں ورنہ میرے لیے یہ ایک لاحاصل دردِ سر بن گیا تھا۔ میں سونے کے ارادے سے لیٹا' ایک کتاب پر اپنا ذہن مرکوز کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ایک اجنبی آواز سنائی دی ''میں سلطان ہوں سر!''

میں نے بے خیالی میں کہا ''کون سلطان؟''

''سلطان وحید مراد!''

میں ایک دم اٹھ بیٹھا ''تم..... کہاں سے بات کررہے ہو؟''

اس نے کہا ''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں بتانا تو پڑے گا کہ تم کہاں ہو؟ کیا تم اپنی ماں کے گھر میں ہو..... یا باپ کے ساتھ ہو؟''

''جی نہیں..... میں ان دونوں کے ساتھ نہیں ہوں۔ ابھی کچھ دیر میں میرا ایک ساتھی آئے گا' آپ اس کے ساتھ آجائیں۔''

میں نے کہا ''اچھا..... میں آجاؤں گا..... لیکن تم کیوں ملنا چاہتے ہو مجھ سے۔''

''کیا آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے تھے؟'' اس نے کہا اور فون کی لائن کاٹ دی۔

اس کی ماں کا نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے فوراً اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ گھنٹی بہت دیر بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ آخر اتنی رات کو وہ اکیلی عورت کہاں جاسکتی ہے؟ میں نے سوچا۔ کیا پتا وہ سب ایک ہی جگہ ہوں۔ ماں' باپ اور بیٹا۔ سلطان کو ماں نے ہی بتایا ہوگا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں ورنہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوتی۔ ممکن ہے یہ فیملی ڈراما اسی طرح ختم ہو جیسے میں نے سوچا تھا۔ وہ کسی خفیہ مقام پر مجھ سے الوداعی ملاقات کریں اور نکل جائیں۔

جب کال بیل بجی تو میں نے احتیاطاً اپنا ریوالور میز کی دراز سے نکال لیا۔ ڈور آئی سے جھانک کر دیکھنے پر مجھے ایک ڈبل کیبن پک اپ دکھائی دی جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ گھنٹی بجانے والا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے زنجیر ہٹا کے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور باہر جھانکا۔ ''کون ہے..... سامنے آؤ'' میں نے کہا۔

وہ سامنے آگیا۔ اس کا حلیہ سو فیصد شرعی تھا۔ سیاہ گھنی داڑھی۔ شلوار جس کے پائنچے اونچے تھے۔ کھدر کا کرتہ۔ سر پر رومال..... وہ بہت مسکین صورت والا دبلا پتلا نوجوان تھا۔

''مجھے سلطان نے کہا تھا کہ آپ کو لے آؤں۔''

میں باہر آگیا ''مجھے کہاں جانا ہوگا؟''

''زیادہ دور نہیں۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ہم بھروسے پر آئے ہیں سر! آپ بھی ہم پر بھروسا کرسکتے ہیں'' وہ بولا۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا ''بھروسے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سوچے سمجھے بغیر جان کو خطرے میں ڈال دیا جائے' میں تمہیں نہیں جانتا۔''

اس نے کہا ''آپ دارا کو جانتے ہیں' اس کا بھائی تھا رشید۔ آپ کی وجہ سے ان کی جان بچ گئی تھی۔''

''ہاں۔ مگر وہ تو جیل میں ہیں۔''

''میں دارا کا بھتیجا ہوں۔ سب سے بڑے بھائی رفیق کا بیٹا۔ آپ چچا رشید کے گھر آئے تھے' شیخوپورہ میں۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا

ہوں۔ کیا تم بھی انہی کے ساتھی ہو؟ خاندانی پیشے میں ہو؟''

''نہیں جناب! اللہ نے مجھے ہدایت دی۔ اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں'' وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ڈبل کیبن پک اپ کے شیشے سیاہ تھے۔ ان سے باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم اپنے سامنے مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ گاڑی نئی تھی اور مولوی ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ ہم سو کلومیٹر سے زیادہ کی رفتار پر اوکاڑہ کی جانب جارہے تھے۔ شہری آبادی کی حدود ختم ہوتے ہی گاڑی سڑک سے ذرا ہٹ کے کسی احاطے کی کچی دیوار کی اوٹ میں ٹھہر گئی۔

''آپ کو زحمت ہوگی لیکن ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔'' ڈرائیور نے شائستگی سے کہا ''یہاں ہم گاڑی بدلیں گے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' دونوں طرف کے دروازے کھول دیے گئے۔ مجھے دو افراد نظر آئے جن کے چہرے نقاب میں تھے۔ ان کے کاندھوں پر کلاشنکوف بھی نظر آرہی تھی۔ انکار اب لاحاصل تھا۔ مجھے یہاں زبردستی نہیں لایا گیا تھا۔ میں نیچے اترا تو مجھے دوسری گاڑی دکھائی دی۔ یہ ایک سوزوکی ہائی روف تھی۔ اس میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ڈبل کیبن پک اپ کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ میں پیچھے گیا تو دونوں مسلح افراد نے دروازے کو کھینچ کر بند کیا۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہائی روف کے اگلے اور پچھلے حصوں کے درمیان موٹے کینوس کا پردہ حائل ہے۔ ہائی روف کے تمام شیشوں پر بھی پردے تھے اور ظاہر ہے یہ اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ میں باہر کا منظر نہ دیکھ سکوں۔ میں نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس سے پہلے میں کہیں زیادہ خطرناک حالات میں ڈاکوؤں کی کمیں گاہوں تک بھی جاچکا تھا۔

گاڑی نہ جانے کتنی بار دائیں بائیں گھومتی رہی اور ایک گھنٹے بعد کسی گیراج میں داخل ہوگئی۔ گیراج کا شٹر بند ہوگیا تو مجھے اترنے کی اجازت ملی۔ پچھلے حصے میں نظر آنے والے دروازے سے مجھے اندر لے جایا گیا اور ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا گیا جہاں دال ٹو دال کارپٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یہاں لانے والے نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ چند منٹ کے بعد ایک مولوی ٹائپ نوجوان چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کے میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بہت ہلکی سی داڑھی تھی۔

''میں سلطان وحید مراد ہوں جناب!'' اس نے چائے بناتے ہوئے کہا ''آپ کا بہت شکریہ کہ آپ آگئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ انتہائی قابلِ اعتماد ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے اعتماد کو دھوکا نہیں دو گے۔ وہی بتاؤ گے جو درست ہے'' میں نے کہا ''کیا تم اپنی ماں سے ملے ہو؟''

اس نے ایک چائے کا کپ اٹھالیا ''میں نے ماں کو فون کیا تھا۔ اس نے مجھے وہ ساری باتیں بتادی ہیں جو اس کے اور آپ کے درمیان ہوئی تھیں۔''

میں نے کہا ''سوال میں کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا باپ زندہ ہے؟''

''ہاں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی صورت دیکھنے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اس لیے یہ بات اپنے دماغ سے نکال دیں کہ مجھے جیل سے نکالنے کے لیے رشوت اس نے دی تھی۔''

''پھر کیا تمہاری ماں نے.....؟''

اس نے بات کاٹ دی ''نہیں۔ ماں نے تو مجھے قانونی طور پر نکالنا چاہا تھا۔ ایک بہت بڑے وکیل کی خدمت حاصل کی تھیں۔ اس کے پیسے ضائع ہوئے۔ اگر وہ مجھ سے پوچھ لیتی تو میں اسے منع کردیتا۔ میرے معاملات تو پہلے ہی طے ہوگئے تھے۔''

''کس طرح؟ کیا جو بات تم نے جیلر کو بتائی تھی' وہی سچ تھی؟''

''ہاں..... مجھے اور میرے ساتھ تین لڑکوں کو نکالنے والے یہ لوگ تھے جو آپ کو یہاں لائے ہیں۔''

''انہوں نے کتنا معاوضہ ادا کیا تھا؟ جیلر کہتا ہے کہ دس لاکھ میں سودا ہوا تھا۔ مجھے یہ رقم بہت حقیر لگتی ہے۔''

''اسے دس لاکھ ہی دیے گئے تھے اور ایک دھمکی..... ورنہ شاید وہ اس سے دس گنا مانگتا۔''

''کیسی دھمکی.....؟''

''ایسی کہ وہ ڈر گیا۔ میرے ساتھی بہت طاقتور ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ کون لوگ ہیں؟''

''وہی جو کمیونسٹ کافروں کے خلاف جہاد کررہے ہیں۔ روس کو افغانستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہاں اسلامی نظام قائم ہو اور پاکستان محفوظ رہے۔''

میں نے کہا ''کیا یہ پاکستانی ہیں؟''

''نہیں..... لیکن یہ اسلام کے مجاہد ہیں۔ ان کا تعلق مختلف ممالک سے ہے مگر مقصد ایک ہے۔''

میں نے کہا ''دیکھو۔ میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر میرے نقطۂ نظر سے یہ جہاد نہیں ہے۔ یہ لوگ تمہارا سیاسی

استحصال کررہے ہیں۔ تم جیسے نوجوانوں کو برین واش کرکے ایک ایسی جنگ میں جھونک رہے ہیں جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں۔''

''یہ راہِ حق پر چلنے والے لوگ ہیں۔''

میں نے کہا ''کیسے؟ کیا اسلامی تعلیمات یہ کہتی ہیں یا تاریخ میں کوئی ایسی مثال ہے کہ رشوت دے کر نوعمر مجرموں کو جیل سے فرار کرایا جائے۔ کیا رشوت کے بارے میں واضح حکم نہیں ہے کہ لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ پھر جیل سے مجرم کو نکالنا کیا نظامِ عدل کا خون کرنے کے برابر نہیں ہے۔ اور یہ لوگ نابالغ بچوں کے ہاتھ میں اسلحہ دے کر انہیں والدین کی مرضی کے خلاف' خلافِ قانون طریقے پر مرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ یہ جہاد کا کون سا تصور ہے؟''

اس کے پاس کسی بھی دلیل کا جواب ایک جذباتی فیصلہ تھا جو وہ تبدیل نہیں کرسکتا تھا۔ ''دیکھیے جناب! ان تمام معاملات کو سمجھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں' جو بات میں نے بروقت سمجھ لی تھی کہ میری گمراہی میرے اعمال کا نتیجہ بھی کہتے ہیں ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد کو بھی ملتی ہے۔ میرے باپ نے جو کچھ کیا اس کا خمیازہ خود اس نے بھگتا۔ اب میں اپنی گزری ہوئی زندگی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری دنیاوی زندگی جہنم تھی۔ میں اس سے نکلنا چاہتا ہوں۔ صرف شہادت میں میری نجات ہے اور حیاتِ ابدی میری آرزو ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا ''کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ تمہاری ماں پر کیا گزرے گی؟''

''اگر میں ساری زندگی مجرموں کے درمیان جیل میں گزارتا تو اس پر کیا گزرتی؟ اور بالآخر میرا انجام تختۂ دار پر ہوتا تو اس پر کیا گزرتی۔ وہ کتنی عدالتوں میں جاتی' کہاں کہاں اپیلیں کرتی پھرتی۔ کتنے وکیل کرتی' یہ سوچا ہے آپ نے؟''

میں نے کہا ''پہلے شوہر اسے چھوڑ گیا۔ اب تم بھی واپس نہ آنے کی نیت سے جارہے ہو؟''

''وہ صدمہ بھی جھیل لیا تھا اس نے۔ یہ بھی برداشت کرلے گی۔ ایک بیٹا تو ہے اس کے پاس۔ اب پیسہ بھی ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو کسی دن واپس آجاؤں گا لیکن میری نجات کا راستہ شہادت کی منزل پر ہی ختم ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''چلو چھوڑو یہ باتیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اتنے عرصے بعد تمہارے باپ کو تمہاری یاد کیوں آگئی؟ کیوں لے جانا چاہتا تھا وہ تمہیں۔''

''وہ پچھتاوے کا شکار تھا۔ وہ مجھے اور میری ماں کو..... اور میرے بھائی کو' سب کو باہر لے جانا چاہتا تھا..... لیکن پہلے میں نے صاف انکار کیا' میری ماں تو اس سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں۔ اس کا بس چلے تو وہ اس کو قتل کردے۔ وہ اسی کا مستحق ہے۔''

''یعنی اسے قتل کردیا جائے۔'' میں نے تلخی سے کہا ''پھر یہ نیک کام تم نے کیوں نہیں کیا؟ آزاد ہونے کے بعد ایک بے گناہ عورت کے خون سے اپنے ہاتھ ضرور رنگے تم نے۔ اس کی گاڑی چھیننے کے لیے۔''

اس نے نظر ملائے بغیر کہا ''وہ ناگزیر تھا۔''

''کیوں ناگزیر تھا.....'' میں نے برہمی سے کہا ''شاید تم دلیل دو گے کہ معاملہ زندگی بچانے کا ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ تم ایسا نہ کرتے تو مارے جاتے۔ مجبوری میں ہر گناہ اور جرم کرنے کا نظریہ ضرورت سامنے لانے والا صرف شیطان ہوتا ہے۔ رشوت دے کر جیل سے بھاگنا' بھاگنے کے لیے گاڑی چھیننا' جان بچانے کے لیے قتل کردینا۔ سب اس لیے ضروری تھا کہ تم جہاد کے لیے نکلے تھے۔ شہادت کی حیاتِ ابدی چاہتے تھے۔ مائی فٹ..... یہ سب تمہارے بیمار ذہن کی گناہ گار سوچ ہے۔''

وہ خاموش بیٹھا رہا لیکن اس کی صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہورہا ہے۔ اس کا دماغ ایک ہی طرح سے سوچ سکتا تھا۔ اس کے سامنے عقل کی بات کرنا بے عقلی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی ''کیا تمہارے ساتھ فرار ہونے والے دوسرے لڑکے بھی تمہاری طرح سوچتے تھے؟''

اس نے کہا ''ہاں' کم سے کم انہوں نے ایسا ہی ظاہر کیا تھا میرے سامنے..... لیکن باہر آنے کے بعد ان کی نیت بدل گئی تھی۔''

''وہ کیا چاہتے تھے؟''

''وہ اپنے اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔ پرانی زندگی کی طرف۔''

''کیا تم نے انہیں روکا تھا؟''

''ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیے لیکن ان کی نیت میں فتور آگیا تھا۔''

''کیا واقعی وہ پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''پولیس تو بعد میں لاشیں اٹھا کے لے گئی تھی۔ ان کو میں نے مارا تھا۔''

میں دم بخود رہ گیا ''تم نے..... کیوں؟''

وہ بولا ''ہم بہت خوف زدہ تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ ہمیں جیل سے نکالنے والوں نے پولیس کو پیچھے نہ لگا دیا ہو۔ جلد از جلد نکل جانے کے لیے ہم نے بس یا ٹرین کے بجائے کسی سے لفٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس عورت کو ہم نے گاڑی چھیننے کے لیے نہیں روکا تھا۔ اس سے پہلے ہم کئی کاروالوں کو روکنے کی کوشش کر چکے تھے مگر وہ نہیں رکے تھے۔ پھر میرا ایک ساتھی سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور ایک کار کو رکنا پڑا۔ اس میں ایک ہی عورت تھی۔ وہ چلانے لگی۔ ہم نے اسے خاموش کرانے کی بہت کوشش کی۔ بڑی شرافت سے یقین دلانا چاہا کہ ہم اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔''

''مگر جب اتنی شرافت کے باوجود وہ نہیں مانی تو تم نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''نہیں..... وہ چلتی گاڑی سے کود گئی' دروازہ کھول کے۔ دراصل ہم سب نوجوان تھے۔ وہ سمجھی کہ ہم اس کے ساتھ.....'' اس نے ایک آہ بھری۔

''پولیس کا موقف کچھ اور ہے۔''

''وہ غلط ہے۔ باہر گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ ہم نے اسے سڑک سے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا۔ اس وقت وہاں سے کئی گاڑیاں گزریں۔ پتا نہیں کس نے آگے جا کے پولیس کو بتا دیا۔ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی۔ گاڑی کی تلاشی لینے پر میرے ایک ساتھی کو گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ریوالور ملا۔ وہ بھرا ہوا تھا اور شاید اس عورت نے اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھا تھا۔''

''پھر اس نے استعمال کیوں نہیں کیا تھا؟''

''یا تو اسے موقع نہیں ملا تھا' وہ گھبرا گئی تھی یا اسے ریوالور چلانا نہیں آتا ہوگا۔ ریوالور کسی اور کا ہوگا۔ آگے ایک لڑکا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں پیچھے تھا اور میرے ساتھ اس عورت کی لاش تھی۔ میں نے ایک بار پھر ان لڑکوں سے کہا کہ وہ وہیں چلیں جہاں ہمیں جانا ہے لیکن وہ نہیں مانے۔ میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے ریوالور چھین لیا۔ وہ میرا مذاق اڑانے لگے اور مجھے گالیاں دینے لگے۔ اتنی دیر میں پولیس کی گاڑی نظر آ گئی۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے ان دونوں کو گولی ماری اور ریوالور لے کر بھاگ گیا۔ کھیتوں میں ہوتا ہوا نکل گیا۔''

''کیا ان کو قتل کرنا اتنا ہی ضروری تھا؟''

''اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ پولیس کو سب بتا دیتے۔ پولیس سے کچھ چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔ ہم سب پکڑے جاتے۔ میرا مطلب ہے پولیس یہاں چھاپا مارتی اور ان لوگوں کو گرفتار کر لیتی۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ تیسرا لڑکا زخمی تھا' اسے بھی تم نے ہی قتل کیا ہوگا؟''

''نہیں' جب میں نے دو پر گولی چلائی تو وہ بھاگ گیا تھا۔ وہ بچ گیا تھا۔ میں سڑک سے اتر کے دائیں طرف بھاگا تھا۔ وہ بائیں طرف گیا تھا۔ لیکن ادھر سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ وہ نیچے تو نہیں آیا مگر اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ یہ سب مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا تھا۔''

''اسپتال میں اسے کس نے مارا؟''

''مجھے پتا نہیں مگر وہ بھی سب کا راز فاش کر دیتا۔ اسے زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔''

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا ''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو' مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''میری ماں نے کہا تھا۔ وہ آپ کی تعریف کر رہی تھی اور جب میں نے اس سے ملنے سے انکار کیا تو اس نے آپ کا نام لیا۔ یہ کہا کہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ آپ کو میں نے صرف یہ بتانے کے لیے بلایا تھا کہ آپ واپس جا کے میری ماں کو سمجھائیں۔ اس طرح کہ وہ سمجھ جائے۔ اس سے کہیں کہ میرے حق میں دعا کرے۔''

''کیا میں اسے بتا دوں کہ تم بھی باپ کی طرح خودکشی کر رہے ہو؟''

وہ مشتعل ہو گیا ''خودکشی حرام موت ہے۔''

''ڈراما اس نے بھی کیا تھا' تم بھی کر رہے ہو۔ دکھ تو وہ ایک عورت ہی اٹھا رہی ہے۔''

''آپ بھی سمجھائیں اسے کہ شہادت کا رتبہ حاصل کیے بغیر میری مغفرت ممکن نہیں۔ یہی ہم سب کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اسی میں نجات ہے۔ آخرت کی ابدی زندگی میں ہم ساتھ ہوں گے۔''

اس سے بحث لاحاصل تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا ''مجھے اب چلنا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں آ کے میں نے اپنا وقت ضائع کیا۔''

''مجھے یقین ہے کہ آپ پر بھروسا غلط ثابت نہیں ہوگا۔ آپ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ سوائے میری ماں کے۔ آپ راز کو راز رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں آپ کی گڈول بہت اچھی ہے۔''

صبح اب زیادہ دور نہیں تھی۔ میری واپسی کے لیے دوسری ہائی روف منتظر تھی۔ اس پر کوئی نمبر نہ ہوتا تو مجھے حیرانی

نہ ہوتی مگر اس پر پشاور کی نمبر پلیٹ تھی۔ میں نے نمبر نوٹ کر لیا حالانکہ اس کا فائدہ کوئی نہ تھا۔ وہ نمبر غلط ہوگا یا اس گاڑی کا مالک کوئی ایسا شخص نکل آئے گا جس کا اس معاملے سے کسی قسم کا تعلق ثابت کرنا ناممکن ہوگا یا خطرناک۔ مجھے واپس لانے والے لوگ بھی مختلف تھے کہ انہوں نے گھر پر اتارنے کے بجائے مجھے مال روڈ پر یونیورسٹی کے سامنے اتار دیا۔ سڑک اس وقت خالی تھی۔ چند منٹ میں گاڑی کی ٹیل لائٹ بھی غائب ہو گئی۔

واپسی کے سفر میں بھی یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ میری نظریں باہر کچھ نہ دیکھ پائیں۔ یقین سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا مگر میرا خیال ہے کہ ہم نے ملتان روڈ پر ہی سفر کیا تھا۔ میں صبح صادق کے دھندلکے میں پیدل چلتا رہا۔ وہاں سے مزنگ تک فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ایک ریسٹورنٹ میں چائے تازہ تازہ بن کے تیار ہوئی تھی۔ میرا ذہن آہستہ آہستہ پُرسکون ہو رہا تھا۔

سلطان مراد کی ماں ریحانہ کے گھر تک کا فاصلہ طے کرنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگا۔ اس وقت تک صبح ہو گئی تھی۔ گلیوں میں اخبار والے اور دودھ والے موٹر سائیکلوں پر دوڑتے پھر رہے تھے۔ جب میں نے اس گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا دیکھا تو مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ حیران ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ واقعات اپنی مرضی سے رخ بدل رہے تھے۔

میں نے نمازیوں کے ایک گروہ کو مسجد سے واپس آتے دیکھا۔ وہ چار عمر رسیدہ لوگ تھے جو آہستہ آہستہ باتیں کرتے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے اور اسی گلی کے باسی لگتے تھے۔ ان میں سے دو نے بڑے یقین کے ساتھ مجھے مطلع کیا کہ اس گھر میں رہنے والی عورت گھر چھوڑ کے چلی گئی ہے۔ کہاں چلی گئی ہے؟ پتا تو وہ کسی کو دے کر نہیں گئی۔ اس کے پڑوسی کو بھی اچانک معلوم ہوا۔ نہیں جی' مکان اس کا نہیں تھا۔ یہاں تو وہ کرائے پر رہتی تھی۔ ابھی چھ سات مہینے پہلے ہی تو آئی تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ۔ ہاں جی' بیوہ تھی۔ ایک بیٹا جیل میں تھا' بڑی دکھی عورت تھی۔

☆☆☆

لاہور کے مقابلے میں کراچی کا موسم سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا نے بے حد خوشگوار بنا دیا تھا۔ یہ علاقہ ویسے بھی سمندر کے بے حد قریب تھا اور میں سمندر کی مخصوص نم آلود بو کو ہوا میں محسوس کر سکتا تھا۔

سیما نے اشرف پراپرٹی ڈیلر کو جس فون نمبر سے کال کیا تھا وہ اسی علاقے کا تھا۔ فون نمبر سے میں نے بہ آسانی معلوم کر لیا تھا' یہ پہلے ماہی گیروں کے گوٹھ تھے۔ جب آبادی بڑھی تو یہ علاقہ بھی ترقیاتی اسکیم کا حصہ بن گیا۔ اب یہاں متوسط طبقے کے لوگوں کی اکثریت تھی جنہوں نے اپنی بچت سے یا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے گھر بنائے تھے' زیادہ تر مکانات اسّی اور ایک سو بیس گز کے تھے۔ آخری حصے میں تھوڑے سے مکانات دو سو گز پر بنے ہوئے تھے۔

مکانوں کے نمبر ترتیب میں تھے چنانچہ میں ٹیکسی سے اترنے کے بعد خود ہی نیم اور نمبر پلیٹ دیکھتا ہوا آگے چلتا گیا۔ وہ مکان ایک دم ہی میرے سامنے آ گیا۔ ابھی میں مکان کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور سیما باہر آ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ اجنبیت اور لاتعلقی کا انداز برقرار رکھوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ میں عین اس کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی کہ وہ مجھے نہ پہچانے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ آہستہ آہستہ آگے آئی ''آپ..... آپ کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔''

میں نے خوش اخلاقی سے مسکرا کے کہا ''کراچی کے ایک ہوٹل میں ساحل پر میں اکیلا تھا۔ آپ کے ساتھ ایک اور صاحب تھے..... غالباً.....''

اس نے سر ہلایا ''وہ میرے شوہر ہیں۔ کون ہیں آپ؟ کیا چاہتے ہیں اور کیوں پیچھا کر رہے ہیں ہمارا؟''

میں نے کہا ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''میں اسے اتفاق تو نہیں سمجھ سکتی۔ آپ میرے گھر کے سامنے کھڑے کیا کر رہے تھے آخر؟''

میں نے کہا ''خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔ گھنٹی بجانے ہی والا تھا کہ آپ آ گئیں۔''

''کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟''

میں نے کہا ''میں آپ سے نہیں' وحید مراد سے ملنے آیا تھا۔''

وہ چونکی ''کون وحید مراد؟''

میں نے کہا ''جو آج کل نظام الدین ہیں۔ آپ کے مرحوم شوہر کے قالب میں۔''

''وہ..... وہ یہاں نہیں رہتے'' وہ ہکلانے لگی۔

''کیوں.....؟ کیا وہ پھر مرحوم ہو گئے ہیں..... دیکھیے' اتنا گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ میں کسی سنسنی خیز اسٹوری کی اشاعت کے چکر میں ہوں اور نہ آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں.....

اور آپ کی گفتگو کا ہر لفظ صیغۂ راز میں رہے گا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ آپ تعاون کریں۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا "کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟"

میں نے کہا "پولیس سے کسی کا تعلق نہیں ہوتا۔"

"میرا مطلب تھا' کیا تم کرائم رپورٹر ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ میں ایک وکیل بھی ہوں لیکن اس وقت ذاتی حیثیت میں بات کر رہا ہوں۔ جو باتیں میرے علم میں ہیں ابھی تک کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے لاہور میں ریحانہ سے بھی ملاقات کی تھی۔ پھر وحید مراد کے بیٹے سلطان مراد سے بھی ملا تھا جو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ میں اشرف کے پاس بھی گیا تھا۔"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا "اوکے۔ اوکے..... اندر آجائیں۔"

پورچ کے اندر ایک نئی کار کھڑی تھی جو چھوٹی فیملی کار کی حیثیت سے بے حد مقبول تھی۔

☆☆☆

وہ مجھے لاؤنج سے گزار کے اس ڈرائنگ روم میں لے گئی جو بڑے اہتمام سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سیما خود نسوانی حسن کا شہکار تھی اور احساسِ حسن کا شعور بھی رکھتی تھی۔ اس کا لباس اس احساس کو اجاگر کرتا تھا۔ اس کے گھر کو دیکھ کر بھی ذوقِ جمال کو تسکین ملتی تھی۔

:.... وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئی "اس گھر کا پتا تمہیں کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "کسی نے بھی نہیں۔ تم نے اشرف کو فون کیا تھا۔ اپنا مکان بیچنے کے لیے؟"

اس نے سر ہلایا "حالانکہ کوئی ضرورت نہیں تھی اس کی۔"

میں نے کہا "آخر کب تک گزاروگی تم یہ مسلسل روپوشی اور گمنامی کی زندگی..... اور ایسی کیا مجبوری ہے تمہیں؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "اس مجبوری کو محبت کہتے ہیں قریشی صاحب! اگر آپ نے محبت کی ہے تو سمجھیں گے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "آپ اس سے محبت کرتی ہیں.....؟ وحید مراد یا نظام الدین سے؟"

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے میری اس کے ساتھ خوار پھرنے کی اور دربدر ہونے کی..... لیکن اب میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔"

"کیا مطلب..... آپ اسے چھوڑ دیں گی؟"

"اسے ہی کیا..... سب چھوڑ دوں گی۔" وہ خلا میں دیکھتی رہی "میں نے سات سال گزار دیے اسی آس میں۔ بہت کوشش کی لیکن میں سب کچھ گنوا کے بھی اسے نہ پا سکی۔"

"وہ آپ سے محبت نہیں کرتا؟"

"وہ کسی سے بھی محبت نہیں کرسکتا' اپنے سوا۔ عورت یہ سمجھتی ہے کہ مرد کے پیروں میں شادی کی زنجیر ڈال کے اسے اپنا بنا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ریحانہ کو نہ چھوڑتا۔ اس نے تو شوہر پر اپنا حقِ ملکیت مضبوط کرنے کے لیے اسے دو بیٹے بھی جن دیے تھے۔ کیا وہ اسے روک سکی؟ اگر میں اس کے بچوں کی ماں بن بھی جاتی تو فرق نہ پڑتا۔ مزید بچوں کی اسے اتنی اشد ضرورت بھی نہیں پھر وہ ساری زندگی میرے ساتھ کیسے گزار سکتا تھا؟"

میں نے کہا "زیادہ تر لوگ ایک ہی بیوی سے وفادار رہتے ہیں۔"

"شاید وہ ان کی مجبوری ہوتی ہے جسے وہ وفاداری کا نام دے کر مطمئن رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم مجبوری کسے کہتی ہو؟"

"مالی..... معاشرتی یا نفسیاتی ورنہ بیوی گھر کی مالکن بن کے خوش رہتی ہے۔ وہ باہر خوش رہنے کے راستے تلاش کرلیتے ہیں۔ سیکریٹری کہو اسے یا داشتہ..... یا میرے جیسی دوسری بیوی۔ بالآخر صرف ایک عورت رہ جاتی ہے جسے بچوں کی ماں شکست دے دیتی ہے۔"

"کیا اس نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"وہ تو کب کا مجھے چھوڑ چکا ہے۔ یہ تو میں ہوں جو کمبل بن کے اس سے چمٹی ہوئی ہوں۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ میرا حسن بہت بڑی طاقت ہے۔ کیا تمہیں ایسا لگتا ہے؟"

میں چونک پڑا کیونکہ میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا "شاید..... بلکہ یقیناً ہے۔"

"اس کے باوجود اب وہ مجھ میں وہ کشش محسوس نہیں کرتا..... دو سال سے اس پر احساسِ جرم وندامت اتنا غالب تھا کہ وہ واپس آنا چاہتا تھا۔ ضمیر صاحب اسے دن رات ملامت کرنے لگے تھے۔ بیٹوں کی محبت جوش مار رہی تھی۔ کسی طوائف جیسی بے شرمی کے ساتھ میں اسے روکتی رہی۔ شاید یہ عمر کا اثر ہی تھا۔ وہ بوڑھا نہیں ہوا مگر رومانس اور ایڈونچر کے جذبات پر عقل غالب آگئی ہے۔ تم سوچو کہ اس آدمی کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ میں نے اس کی ہر بات مانی۔ ہر معاملے میں اس کا ساتھ دیا۔"

میں نے کہا "کب سے جانتی ہو تم اسے؟"

"وہ میرے شوہر کا دوست تھا۔ شادی کے بعد وہ گھر آیا تو آہستہ آہستہ میں اس کی طرف کھنچتی چلی گئی' کسی وجہ کے بغیر۔ میرا مطلب ہے وحید مراد نے مجھ پر ڈورے نہیں ڈالے۔ نہ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ اسے اور مجھے کوئی خلوتی موقع ملتا۔ حادثاتی طور پر کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "کیا تمہارا شوہر.....؟"

"نہیں' وہ ہر لحاظ سے مثالی شوہر تھا۔ تعلیم یافتہ' خوش حال۔ خوبرو' مجھ سے بے حد محبت کرنے والا۔ شاید اس کے مقابلے میں وحید مراد بہت کمتر سمجھا جاسکتا ہے مگر میں کیا کرتی۔ جو کچھ ہوا اس میں میرا اختیار نہ تھا۔ اور میں دیوانگی میں مبتلا ہوگئی..... اور بس..... میرے جیسی عورت کی طرف سے پہل ہو تو کوئی بھی مرد فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں لگاتا۔"

"شادی تمہاری مرضی سے ہوئی تھی؟"

ہاں.... میری خوشی اور رضامندی اس میں شامل تھی۔ اس لیے کہ میرا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔ نہ ہی کسی سے عہد وپیمان تھے۔ میں کوئی فلرٹ ٹائپ لڑکی نہیں تھی۔ بہت جان دینے والے تھے مجھ پر۔ مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ جوانی میں ایک دو سیریس نظر آنے والے اور کچھ محض دل لگی کے عشق تو ہر لڑکی کرلیتی ہے۔ وہ عشق جو برباد کرتا ہے' جان لیوا ہوتا ہے' وہ شادی کے بعد ہوا۔"

"جو چھپائے نہیں چھپتا" میں نے کہا۔

"ہاں..... مگر میرے شوہر کو پتا نہیں چلا کیونکہ وہ پی آئی اے میں تھا جہاں اس کی ڈیوٹی ہر دو دن بعد بدل جاتی تھی۔ دو دن دوپہر' پھر رات' پھر صبح۔ شادی کے چار سال بعد وہ مرگیا۔"

"کیسے.....؟" میں نے کہا "طبعی موت..... یا.....؟"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہی ہو "میرا خیال ہے کہ اب جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ویسے تو اس کی موت حادثاتی تھی۔ وہ رات کی ڈیوٹی کے بعد گھر آرہا تھا کہ کسی نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہوگیا لیکن..... وہ گاڑی وحید مراد چلا رہا تھا۔"

"پھر کتنے عرصے بعد تم نے اس سے شادی کی؟"

"تین سال بعد۔"

میں نے کہا "اس وقت بھی وہ ایک بلڈر تھا۔ بہت پیسہ تھا اس کے پاس..... اور اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔"

"ہاں۔ مگر ہم یہاں نہیں رہتے تھے۔ میں کراچی میں تھی۔ وہ کاروبار کے بہانے ہر ہفتے آجاتا تھا۔ ہم اس کی لانچ پر چلے جاتے تھے۔ گہرے سمندر میں جہاں ہمیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لانچ تھی۔ اس نے مجھے تحفے میں دی تھی اور اس کا نام بھی میرے نام پر رکھا تھا' سیما اس پر صرف دو افراد کا عملہ تھا۔ ایک جو اسے چلاتا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ ایک بوڑھا ملاح تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رہتا بھی لانچ پر تھا۔ دوسرا بے چارہ تیسری جنس کا تھا' نہ مرد نہ عورت۔ وہ کھانے پکانے اور صفائی کے کام بڑے شوق سے کرتا تھا۔ زنانہ کپڑے پہن کر رہتا تھا اور بہت ہی خدمت گزار تھا۔ اب وہ لانچ نوازش علی کے قبضے میں ہے۔"

"وحید مراد نے واپس کیوں نہیں لی؟"

"کیسے لیتا' وہ تو مر چکا ہے۔ قانونی طور پر کاغذات میں اسی کا نام لکھا ہوا ہے۔ اس کی ملکیت میرے نام ہوجاتی تو نوازش علی کیسے اس پر رہ سکتا تھا۔ وحید مراد قانونی چارہ جوئی نہیں کرسکتا۔"

"وحید مراد نے اسی لانچ سے سمندر میں کود کے خودکشی کی تھی۔ کیا اس وقت بھی تم اس کے ساتھ تھیں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "لانچ کو وہ خود چلا کے گہرے سمندر میں لے گیا تھا۔ ساحل سے کئی میل دور۔"

"اور پھر وہاں سے تم دونوں کیا تیر کر واپس آئے تھے؟"

اس نے کہا "نہیں۔ میں تو بس سوئمنگ پول میں تیر لیتی ہوں۔ وہ اچھا پیراک تھا مگر چار پانچ میل سمندر میں تیرنا اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی ہوا بھرنے والی ائر بوٹ میں ساحل تک لوٹے تھے۔ یہ ربر بوٹ وہ باہر سے لایا تھا۔ ایمرجنسی کے لیے ایک بوٹ ہمیشہ لانچ پر موجود رہتی تھی۔ بوٹ میں دو افراد بیٹھ کے جاسکتے تھے۔"

"اس روز لانچ کا عملہ کہاں تھا؟"

"وحید نے انہیں چھٹی دے دی تھی۔ وہ عام طور پر ہفتے کو گھومنے پھرنے شہر چلے جاتے تھے اور اتوار کی رات کو لوٹ کر آجاتے تھے۔ میں نے بتایا ہے نا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وحید نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان کے درمیان میاں بیوی جیسے تعلقات ہیں اور یہ بات سب ہی کو معلوم تھی۔"

میں نے کہا "کیا ان سے پوچھ گچھ نہیں کی گئی تھی؟"

"انہوں نے وہی کہا جو وحید نے سمجھا دیا تھا۔ انہوں نے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ کہا کہ وحید

صاحب کچھ عرصے سے لانچ پر ہی رہنے لگے تھے۔ انہوں نے سب سے ملنا جلنا چھوڑ رکھا تھا اور یہ کہا تھا کہ کوئی انہیں پوچھتا ہوا آئے تو اسے کچھ نہ بتایا جائے لیکن لانچ کے بارے میں کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ وحید کے بیوی بچوں کو بھی نہیں۔ انہوں نے یہی کہا کہ مالک روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بہت شراب پینے لگے تھے اور ان کی صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ وہ رات بھر جاگتے تھے اور اکثر روتے بھی تھے۔''

''وحید نے انہیں معقول معاوضہ دیا ہوگا..... یہ کہنے کا؟''

''اگر دیا تھا تو مجھے معلوم نہیں۔ وحید کے پارٹنر نے بعد میں پولیس کو میرے بارے میں بتادیا تھا۔ اسے میرا نام بھی معلوم تھا لیکن اور کچھ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ہم شادی کر چکے ہیں۔ وہ خود بھی عیاش آدمی تھا۔ کوئی نہ کوئی عورت اس کے ساتھ بھی ہوتی تھی۔ دونوں ان معاملات میں ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہیں پوچھتے تھے۔''

''کیا وہ دونوں میاں بیوی جو عملے میں شامل تھے' اب بھی نوازش علی کے ساتھ ہیں؟''

''ہاں۔ ان سے زیادہ وفادار اور خدمت گزار ملازم اسے کہاں مل سکتے تھے۔''

میں نے کہا ''مشہور یہی ہے کہ جب وہ غائب ہوا تو لاکھوں کا مقروض تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا' کیا یہ سچ ہے؟''

''نہیں' یہ سچ نہیں ہے۔ یہ پیسہ ہی تھا جو اس کے کام آیا۔ بعد میں تو دولت اس کے لیے ہاتھ کا میل ہوگئی تھی۔ وہ مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا بنالیتا تھا۔ ہم ساری دنیا میں پھرتے رہے' میں اس کی مددگار تھی۔''

''ایسا کیا بزنس تھا اس کا؟''

اس نے کہا ''وہی جس میں لاکھوں کے کروڑوں بن جاتے ہیں۔ ڈرگ..... وہ ایک گروہ میں شامل تھا۔ سال بھر پہلے اسے شرافت کا دورہ پڑا۔ تم اسے نروس بریک ڈاؤن بھی کہہ سکتے ہو۔ اسے بیوی بچوں کی یاد آنے لگی۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس پریشان کرنے لگا حالانکہ اس کی بیوی کو ایک کروڑ مل چکے ہیں۔ لیکن اسے دکھ تھا کہ بیوی بچوں نے بہت سخت حالات دیکھے۔ بہت برا وقت گزارا۔ وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ بیوی کی وفاداری میری محبت پر غالب آگئی۔ بچے اہم ہوگئے۔ میری حیثیت کسی داشتہ جیسی ہوگئی۔ وہ اسی لیے واپس آیا تھا کہ انہیں ساتھ لے جائے۔ وہ پچھتاوے کے عذاب میں اس حد تک بڑھ گیا کہ خود کو قانون کے حوالے کرنے کی سوچنے لگا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس کی روپوشی کی وجہ سے اس کے دوست اور بزنس پارٹنر نے جیل کاٹی۔ وہ تو تمام قرض خواہوں کی ساری رقوم بھی واپس کرنے کے لیے تیار تھا۔''

''پھر..... کیا اس کا ارادہ کیوں بدل گیا؟''

''اس کے بیوی بچوں نے اسے ٹھکرادیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب ہمیں نہ تمہاری ضرورت ہے نہ تمہاری دولت کی۔ بیوی نے صاف کہا کہ میں اب تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ قانونی طور پر یہ نکاح فسخ ہوگیا ہے اور تم میرے سامنے آئے تو میں تمہیں گولی ماردوں گی۔ تمہاری صورت بھی نظر آئی تو پولیس کو بتادوں گی۔ ایسا ہی جواب سلطان نے دیا' اس کے چھوٹے بیٹے نے۔ بڑا بیٹا البتہ اس کا ہمدرد تھا۔ اس کی بیوی بہت ہوشیار ہے۔ اس نے شوہر کو سمجھایا ہوگا کہ جذباتی ہو کے ایک دولت مند باپ کو گنوانے کی کیا ضرورت ہے' جس سے ہمیں بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔''

خاموشی کا ایک اور مختصر وقفہ آیا جس میں وہ نظریں خلا میں جمائے اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کترتی رہی اور میں اس کے نظارۂ حسن میں محو رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ زندگی اب اسے کہاں لے جائے گی؟ ماضی سے حال اور مستقبل تک اس کے لیے آسودگی اور سکون کی منزل کب آئے گی؟ سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہونے کا عذاب اس کے ساتھ کیوں ہے؟

بالآخر اس نے کہا ''اتنی دیر ہوگئی۔ میں نے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا ''تھینک یو۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ اب وہ کہاں ہوگا؟''

''میں ہمیشہ اندازے قائم کرتی رہی ہوں۔ یقین کے ساتھ کبھی نہیں کہہ سکتی..... کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ کب کیا کرسکتا ہے' وہ کہیں بھی ایک یوٹرن لے سکتا ہے اور ایک دائرے میں گھوم کے پھر وہیں آسکتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے ٹھکرائے جانے کے بعد وہ بہت مایوس تھا۔ مگر وہ ہار ہار ان کی طرف جاسکتا ہے۔ اس نے نوازش علی سے ملنے کی بات بھی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے نقصانات کی تلافی کردے۔ اس نے جتنا عرصہ جیل میں کاٹا' اس کی معافی مانگے۔''

''مجھے وہ لانچ کہاں ملے گی؟''

''وہیں بندرگاہ کے علاقے میں۔ میرا خیال ہے دوسری لانچوں والے اس کا پتا بتادیں گے۔'' اس نے سوچتے ہوئے

کہا ''اس کے علاوہ..... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کے گھر میں مل جائے۔''

''کیا تمہیں اس کا پتا معلوم ہے؟''

''ہاں۔ میں تمہیں لکھ دیتی ہوں'' اس نے کہا اور اندر گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا جو اس نے مجھے تھمادیا۔

میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا ''قریشی صاحب! آپ کا وحید کے معاملات سے کیا تعلق ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کا انٹرسٹ کیا ہے؟''

میں نے کہا ''انٹرسٹ میرا نہیں تھا۔ ایک اور شخص کا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں وحید کا پتا چلاؤں کہ کیا وہ واقعی زندہ ہے۔ وہ ایک قرض خواہ بن کے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ وحید کی بیوی نے اس کی بیمہ کمپنی سے ایک کروڑ وصول کرلیے ہیں اور یہ ثابت ہوجائے کہ وحید کی خودکشی ایک فیملی ڈراما تھی تو کمپنی ایک کروڑ واپس لے گی۔ جو رقم وصول ہوگی اس کا ایک حصہ مجھے بھی ملے گا۔ کمیشن' انعام یا حقِ محنت۔ لیکن وہ سب جھوٹ تھا۔''

''کیا جھوٹ تھا؟''

''امجد فاروقی نام کا کوئی شخص انشورنس کمپنی میں ڈپٹی جنرل منیجر نہیں اور نہ کمپنی دھوکے بازی سے لی جانے والی ایک کروڑ کی رقم کی وصولی کے لیے قانونی چارہ جوئی کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ مشکل کام ہے۔ شاید ناممکن۔ وحید کی بیوی رقم واپس نہیں کرے گی۔ پتا نہیں اس شخص نے اتنا بڑا اور احمقانہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا تم کسی امجد فاروقی سے واقف ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''وحید نے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''حقیقت تو میرے سامنے آگئی ہے لیکن مجھے کسی قسم کا مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ میرا وقت بھی ضائع ہوا اور پیسہ بھی۔''

''اگر وہ تمہیں ملا... تو کیا تم اسے پولیس کے حوالے کردو گے؟''

''پتا نہیں' اصولاً تو مجھے ایسا کرنا چاہیے لیکن یہ بڑا لمبا چکر ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے کسی کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔''

وہ میرے ساتھ بیرونی گیٹ تک آئی۔ ''اگر وہ تمہیں نہ ملے تو کل ساحلِ سمندر پر ولیج ریسٹورنٹ میں آجانا۔ اس نے وہاں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا ہے' کل فیصلہ ہوجائے گا۔''

میں نے پلٹ کے پوچھا ''فیصلہ؟ کس بات کا فیصلہ؟''

''یہی کہ..... وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ کہاں رہنا چاہتا ہے اور کس کے ساتھ؟ تاکہ میں بھی اپنی مرضی سے جی سکوں..... یا مرسکوں..... یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہوں..... خوار ہوتی رہوں..... اور وہ اپنی پیچھے رہ جانے والی زندگی کے پیچھے رہے۔ دنیا کے لیے وہ مرگیا۔ میرے ساتھ اس نے دوسری دنیا بسالی۔ اب وہ پھر اسی دنیا میں لوٹ کر کیسے جاسکتا ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کے۔ میں کہاں جاؤں' میرے لیے تو کوئی پرانی دنیا نہیں رہی۔''

میں نے کہا ''میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔''

وہ اداسی سے مسکرائی ''یہ ہمدردی ہے یا دلچسپی یا تمہارے لیے تو یہ ایک فیملی ڈراما ہے۔ فل آف ایکشن..... ایڈونچر' کرائم' رومانس..... اور سسپنس سے بھرپور۔ تم صرف تماشائی ہو۔''

میں نے اس کی تردید نہیں کی کیونکہ سچ بہرحال یہی تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں مچھلی بندر یا فش ہاربر کے علاقے میں تھا۔ مجھے امید تھی کہ دن رات سمندر میں کشتیاں اور لانچیں لے کر جانے والے ماہی گیروں سے مجھے ایک پرائیویٹ لانچ کا سراغ لگانے میں مدد ضرور ملے گی لیکن وہاں سیکڑوں چھوٹی بڑی کشتیوں' موٹر بوٹس' لانچوں' فشنگ ٹرالر اور بحری جہازوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔

میں نے عمر رسیدہ بلوچ اور مکرانی ماہی گیروں کو ترجیح دی۔ وہ سمندر کے پرانے باسی تھے اور اس دنیا کے تاریخ جغرافیے کو نوجوانوں سے زیادہ جانتے تھے۔ میرا پہلا گھنٹا لاحاصل رہا۔ ملاح مجھ سے لانچ کے سائز' رنگ اور عملے کے بارے میں سوالات کرتے تھے۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نوازش علی کا نام جانتا تھا لیکن اس کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھا۔

بالآخر ایک چھوٹی سی چائے کی دکان کے مالک نے ہاتھ روک کے قہقہہ مارا ''اڑے یہ تو لیلیٰ مجنوں کو پوچھتا ہے ڑے۔''

سفید جھاڑ جھنکاڑ بالوں' میلے چیکٹ کپڑوں اور بے نور آنکھوں والے ایک شخص نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا ''کریم اور شابو کو پوچھتا ہے؟''

میں نے کہا ''ان کا نام تو مجھے معلوم نہیں..... مگر وہ لانچ پر ہی رہتے ہیں' میاں بیوی کی طرح۔''

پہلا شخص پھر ہنسا ''اڑے وہی بابا! گریب کا جوڑو تو سب کا جوڑو۔ اپنا بھی جوڑو۔'' پھر اس نے ایک نوجوان کو میرے ساتھ کردیا جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی مگر وہ مسلسل سگریٹیں پھونکتا تھا۔ اس کی صحت' افسوس ناک حد تک

خراب تھی۔ اس کی چال غیر متوازن تھی اور کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے گر جائے گا مگر میں اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کشتی میں اتر کے مجھے بھی آنے کا اشارہ کیا تو مجھے مزید پریشانی لاحق ہوئی مگر یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس نے کشتی کھولی اور چپو چلانے لگا۔ کشتی سیکڑوں بڑی کشتیوں اور لانچوں کے درمیان سے راستہ بناتی آگے بڑھتی گئی۔ فاصلے کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہوا۔ ہر جگہ وہی سمندر کا سیاہ تیل ملا ہوا پانی تھا اور مچھلیوں کی بو تھی۔ لہروں کی آواز تھی اور ماہی گیروں کی چیخ پکار تھی۔ تقریباً چالیس منٹ بعد میں نے اچانک اس لانچ کو اپنے سامنے دیکھا۔ اس کے گہرے رنگ پر جو لال یا براؤن تھا سفید حروف مدھم پڑ گئے تھے مگر سیما کا نام اندھیرے میں بھی واضح تھا۔

پانی میں ایک چھوٹی سی فولادی سیڑھی اتر رہی تھی۔ اس پر چڑھنے سے پہلے میں نے کشتی کے ملاح اور اپنے گائیڈ کو سو روپے کا نوٹ نذر کیا۔ وہ ایسی پُر امید نظروں سے مجھے تک رہا تھا کہ میں صرف شکریہ ادا کرتا تو وہ میرا دامن پکڑ لیتا کہ اڑے بابا گولی مارو نی شکریہ کو، پیسہ نکالو۔ وہ خوش نہیں ہوا۔

لانچ میرے اندازے کے مطابق ساٹھ ستر فٹ لمبی تھی۔ میں زنگ آلود زینے پر احتیاط سے اوپر چڑھا تو فولادی جنگلے والی ایک گیلری آ گئی۔ دائیں جانب ایک دروازہ سا نظر آ رہا تھا۔ ایک گول کھڑکی کے شیشے سے لائٹ بھی جھلک رہی تھی۔ میں نے دروازے میں جھانک کر پہلے کریم کو اور پھر شابو کو آواز دی تو باہر کی لائٹ جل گئی۔ پھر چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے سفید پھولوں والی کالی قمیص کے ساتھ کالی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے بال بھی کالے کیے تھے اور آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ اس کا اپنا رنگ خاصا اجلا تھا اور جسم بھی دبلا پتلا تھا اور چہرے کے نقوش بھی جاذبِ نظر تھے۔ مجھے پہلے سے اصلیت معلوم نہ ہوتی تو میں اسے عورت ہی سمجھتا۔

اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں، میں نے کہا ''آپ شابو لگتی ہیں۔''

اس نے ہاتھ چلا کے اور نظریں گھما کے کہا ''اجی شابو ہوں تو شابو ہی لگوں گی نا۔ آپ بتاؤ، آپ کون ہو۔ ایسے منہ اٹھا کے آ گئے ہو جیسے آپ کی سسرال ہو۔ کیا کام ہے آپ کو شابو سے؟''

میں نے کہا ''مجھے نوازش علی صاحب سے ملنا ہے۔''

اندر سے کسی نے غرا کے پوچھا ''کون ہے شابو؟''

شابو نے اپنی نیم مردانہ آواز میں جواب دیا ''اجی کوئی صاحب کے ملنے والے ہیں۔''

سیاہ فام اور پچپن ساٹھ سال کا ایک مضبوط جسم والا بوڑھا اندر سے نکل آیا۔ اس کے سر کے گھنے بال اتنے سفید تھے کہ لگتا تھا اس نے کوئی اونی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ ''کیا کام ہے جی آپ کو صاحب سے..... انہوں نے تو نہیں بتایا تھا کہ کوئی آنے والا ہے اور میں نے بھی آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا ''میرا نام قریشی ہے اور میں ایک بہت پرانے قانونی معاملے کی تفتیش کر رہا ہوں، جس کا تعلق وحید مراد کے قتل سے ہے۔''

قتل کے نام پر وہ دونوں بری طرح چونکے۔ شابو نے کریم کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کسی فرمانبردار بیوی کی طرح شابو نے خاموشی اختیار کر لی۔ کریم نے کچھ دیر سوچ کے کہا ''میں انہیں بتا دیتا ہوں'' وہ اندر چلا گیا۔

شابو نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا ''آپ پولیس میں ہو جی!''

میں نے متانت سے کہا ''نہیں، پولیس ہماری ماتحت ہے۔ ہماری رپورٹ پر تمہیں بھی گرفتار کر سکتی ہے۔ تفتیش کے لیے تھانے لے جا سکتی ہے۔''

''لو جی! میں نے کیا جرم کیا ہے؟'' شابو نے گھبرا کے کہا۔

کریم پھر نمودار ہوا ''آ جائیں جناب! میرے ساتھ۔''

وہ مجھے دس فٹ لمبے چوڑے اور آٹھ فٹ اونچے کمرے یا کیبن میں لے گیا جو بڑی نفاست سے آراستہ تھا۔ پرانا ہونے کے باوجود قالین، پردے اور صوفے صاف اور خوبصورت تھے۔ وحید مراد کے ہم عمر مگر صورت سے شائستہ اور تعلیم یافتہ نظر آنے والے نوازش علی پر ماہ و سال زیادہ اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ بال تو اس نے ہیئر کلر سے بلیک براؤن کیے ہوں گے مگر وہ اسمارٹ بھی تھا اور اس نے نوجوانوں کی طرح گہرے سرخ رنگ کی اسپورٹ شرٹ کے ساتھ جینز کی پتلون پہن رکھی تھی۔

مصافحہ کرنے اور بیٹھنے کے بعد میں نے کہا ''نوازش علی صاحب! سب سے پہلے تو معذرت کہ مجھے ان دونوں کے فضول سوالات سے بچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ میں کوئی تفتیش نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں۔ پورا نام مشکل ہے مگر بتا دیتا ہوں۔ قاضی قدوس قریشی تقفس قازقستانی عرفِ عام میں پی بی ایس۔''

وہ خوش دلی سے مسکرایا ''میں سمجھ گیا۔ پولیس کی طرح نہ سہی، تفتیش تو آپ بھی کرتے ہیں۔ اتنے عرصے بعد وحید مراد کیس کا حوالہ کیسے آ گیا؟''

میں نے کہا ''میں مختصراً سب بتاتا ہوں۔''

وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ درمیان میں اس نے مجھ سے پوچھ کے شابو کو کافی لانے کے لیے بھی کہا۔ آہستہ آہستہ اس کے ظاہری اندازِ بے پروائی میں تشویش اور فکرمندی شامل ہوتی گئی۔

میری بات سننے اور کافی ختم کرنے کے بعد اس نے کہا ''سب کچھ آپ جانتے ہیں۔ بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

میں نے کہا ''کیا آپ اس سے ملے ہیں؟''

''ہاں۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ یہ بریف کیس یہاں چھوڑ گیا۔''

میں نے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے سیاہ رنگ کے بیش قیمت بریف کیس کو دیکھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

نوازش علی اٹھا اور بریف کیس کھول کے میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں پانچ سو اور ہزار کی مالیت کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ''یہ ایک کروڑ روپے ہیں۔''

میں نے سر ہلایا ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے تلافی کر دی ہے؟ یہ رقم کافی ہے۔ اس ذلت اور پریشانی کے بدلے جو تم نے قرض خواہوں کی وجہ سے اور پھر جیل جا کے اٹھائی؟''

''میں نے اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ زندگی آرام سے گزارنے کے لیے میرے پاس کافی تھا۔ جو بے ایمانی کے کاروبار میں شریک ہوں وہ آپس میں بہت ایماندار رہتے ہیں۔ افسوس یہ تھا کہ اس نے میرے ساتھ بھی بے ایمانی کی۔ اب اتنے عرصے بعد اس نے میرے سامنے آ کے معافی مانگی۔ وہ میرے سامنے روتا رہا۔ میں نے کہا کہ چلو جانے دو یار! رات گئی بات گئی۔ عذاب میں نے جھیلا اور تم نے بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرا عذاب میری سزا کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ تم ابھی تک بھگت رہے ہو۔ میرا پہلے بھی دنیا میں کون تھا؟ نقصان میں تم رہے کہ سارے رشتے بھی گنوا دیے۔ وہ کہنے لگا کہ یہی پچھتاوا میرے ضمیر کا بوجھ بن گیا ہے۔ میرے بیوی بچے بھی مجھے معاف کرنے پر تیار نہیں۔ جاتے وقت وہ بہت اصرار کے ساتھ یہ رقم چھوڑ گیا۔ کہنے لگا کہ میری خاطر رکھ لو۔''

میں نے کہا ''آپ فراخ دل آدمی ہیں۔''

''میں نے اس کی بیوی سے بھی بات کی تھی۔ مگر وہ اب شوہر کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔ کہتی رہی کہ وہ میرے سامنے آیا تو میں اسے قتل کر دوں گی۔ سچ مچ بیوہ ہو جاؤں گی۔ قانونی طور پر پہلے ہی ہوں۔ مجھ پر کسی ایسے شخص کے قتل کا الزام کیسے آ سکتا ہے جو آٹھ سال پہلے ڈوب کے مر گیا تھا۔ میں نے یہ بات وحید کو بتا دی اور وہ ڈر گیا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ۔ اس کے گھر میں۔ وہ ان سب کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ بیٹے، بہو اور پوتے کو۔ وہ سب کینیڈا میں رہیں گے۔ اس کی بیوی کو یقین ہے کہ وہ چھوٹے بیٹے کو رہا کرا لے گی۔ اس نے ایک بہت قابل وکیل کیا ہے۔''

''مگر اس کا بیٹا تو مفرور ہے اور واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا'' میں نے کہا۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کل کیا ہوگا؟'' اس نے کندھے اچکائے۔

میرا اب امجد فاروقی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں اس سے رابطہ رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر اس رات ہوٹل کے کمرے میں میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھا کے کہا ''ہیلو!''

دوسری طرف سے امجد فاروقی کی آواز سنائی دی۔ ''اجی آپ کہاں ہیں جناب!''

میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا کے کہا ''تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟''

''پی بی ایس۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم، تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔''

میں نے کہا ''امجد فاروقی... یہ سب کیوں کیا تم نے آخر؟''

''کس بات پر خفا ہو تم یار.....!''

میں نے کہا ''حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔ اتنا بڑا جھوٹ بولا تم نے مجھ سے۔ احمقانہ اور گھٹیا جھوٹ۔ تم کیا سمجھتے تھے میں اتنا بے وقوف ہوں.....؟''

''ارے نہیں پی بی ایس۔ دیکھو، میری بات سنو..... کبھی انسان مجبور بھی ہو جاتا ہے جھوٹ بولنے پر۔ مگر تم کو بے وقوف بنا سکتا ہوں میں؟ بے وقوف تو میں خود ہوں ورنہ تم سے مدد کیوں مانگتا۔''

میں نے کہا ''دیکھو۔ تم اگر واقعی وحید مراد سے ملنا چاہتے تھے... تو اس کا پتا چلا لیا ہے میں نے۔''

''کیا واقعی.....؟'' وہ چلایا ''یار! میں کراچی میں ہوں۔''

میں نے کہا ''اس کا پتا نوٹ کرلو۔ اور ملنا ہے تو خود جا کے مل لو۔ میں تم جیسے دھوکے باز سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتا۔ اور نہ مجھے تمہاری کوئی وضاحت درکار ہے۔''

میں نے اسے وہ پتا بتا دیا جو مجھے سیما نے ایک پرزے پر لکھ کے دیا تھا اور فون بند کر کے سو گیا۔

☆☆☆

صبح میں دیر سے اٹھا۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کے میں نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بجے تھے۔ اب میں واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ امجد فاروقی یا جو بھی وہ تھا' وحید مراد سے ملے نہ ملے' مجھے ان دونوں سے ملنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ پی آئی اے کا بکنگ آفس ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا چند منٹ میں وہاں پہنچا لیکن یہ جان کے مجھے کوفت اور مایوسی ہوئی کہ سارا دن جانے والی کسی فلائٹ میں یہاں تک کہ نائٹ کوچ پر بھی کوئی سیٹ دستیاب نہیں تھی۔ مجھے اگلے روز کے لیے بھی شام کی فلائٹ پر جگہ ملی۔

سڑک پر شام کے اخبارات فروخت کرنے والے لڑکے دوڑ دوڑ کے اور چلا چلا کے اخبار بیچ رہے تھے۔ یہ شام کے کہلائے جانے والے سب ہی اخبارات دوپہر سے پہلے خریدار تک پہنچ جاتے تھے اور ایک طرح سے رات بھر کی خبروں کا ضمیمہ بن جاتے تھے۔ میرا ارادہ کوئی اخبار خریدنے کا نہیں تھا مگر ایک ہاکر کے اعلان نے مجھے متوجہ کر لیا ''پڑھیے صرف ایک روپے میں۔ آٹھ سال پرانے مردے کا قتل۔''

کچھ شام کے اخبارات ایسی ہی بے سروپا مگر سنسنی خیز سرخیاں جماتے تھے اور لوگ بھی یہ بات سمجھتے تھے مگر پھر بھی ہاکر کا اعلان عام دلچسپی کا سبب بن گیا تھا اور یقین نہ کرنے کے باوجود لوگ ایک روپے کی قربانی دے رہے تھے۔

یہ قربانی میں نے بھی دی مگر اس کی وجہ میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح چمکنے والا ایک خیال تھا۔ خبر ایک باکس میں تھی اور اس کے ساتھ ہی لاش کا خون آلودہ چہرہ نظر آ رہا تھا۔ شک وشبے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ تصویر وحید مراد کی تھی۔ ذیلی سرخی میں لکھا تھا کہ مقتول نے آٹھ سال پہلے خودکشی کی تھی۔

فٹ پاتھ کے ایک کنارے پر رک کے میں نے خبر کی تفصیل پڑھی۔ اس میں وہ پتا موجود تھا جہاں مقتول اپنے بیٹے' بہو اور پوتے کے ساتھ رہتا تھا۔ گزشتہ رات کسی نے گھنٹی بجا کے مقتول وحید مراد کو باہر بلایا۔ باہر ان کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا اور بات اتنی بڑھی کہ انہوں نے ریوالور نکال لیے اور ایک دوسرے پر فائر کیا تاہم مقتول نے جو گولی چلائی وہ قاتل کے پیٹ میں لگی لیکن قاتل کی گولی مقتول کے دل میں اتر گئی اور اس کی وہیں موت واقع ہو گئی۔ قاتل کو جس کا نام امجد فاروقی بتایا جاتا ہے' شدید زخمی حالت میں گرفتار کر کے اسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں اس کو طبی امداد دی جا رہی ہے مگر ڈاکٹروں کے مطابق اس کی حالت تشویش ناک ہے۔

پولیس سے رپورٹر صرف اتنا معلوم کر سکا تھا کہ مقتول آٹھ سال قبل ایک بلڈر تھا اور لوگوں کے کروڑوں روپے لے کر غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے سمندر میں کود کے خودکشی کر لی تھی مگر اس واردات سے پتا چلتا ہے کہ وہ جھوٹ تھا۔ رپورٹر کا اندازہ تھا کہ قاتل بھی کوئی ایسا شخص ہی ہے جس کا پیسہ مقتول بلڈر نے کھا لیا تھا اور اس کے زندہ ہونے کی خبر پا کے وہ اپنا قرض مع سود وصول کرنے آیا تھا۔ قاتل نے ابھی تک کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

امجد فاروقی سے میری بات گزشتہ رات گیارہ بجے کے بعد ہوئی تھی۔ وحید مراد کا پتا حاصل ہوتے ہی وہ روانہ ہو گیا۔ روزِ اول سے ہی اس کا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ مجھے رپورٹر کا اندازہ خاصا درست لگا کہ وحید مراد نے امجد فاروقی کے ساتھ بہت بڑا فراڈ کیا تھا۔ شاید اس نے امجد فاروقی کی عمر بھر کی کمائی لوٹ لی تھی اور اسے کنگال کر دیا تھا۔ ممکن ہے اس نے اپنی بیوی کا یا ماں کا زیور بیچا ہو یا کسی سے قرض لے کر فائدے کی امید میں اس گھر کی ادائیگی کی ہو جو اسے کبھی نہیں ملا لیکن دشمنی کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی تھی۔

وجہ کچھ بھی ہو' امجد کے دل میں سلگنے والی نفرت کی آگ برسوں بعد بھی بجھی نہیں تھی۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ وحید زندہ ہے' اس نے ایک بہت بڑا جھوٹ بول کے مجھے اس کی تلاش پر مامور کر دیا۔ وہ جانتا ہوگا کہ میں انتقام کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ وہ مجھے پیشہ ورانہ خدمات کے عوض نقد اور پیشگی کوئی پُرکشش معاوضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا چنانچہ اس نے مجھے بے وقوف بنایا کہ جب انشورنس کمپنی کو ایک کروڑ واپس ملیں گے تو مجھے انعام میں دس بیس لاکھ ضرور دیے جائیں گے۔

یہ اتنا بوگس جھوٹ تھا کہ چل نہیں سکتا تھا مگر اب مجھے افسوس تھا کہ کتنی آسانی سے میں نے اسے سچ مان لیا اور اس جھوٹ کا راز کتنی دیر سے فاش ہوا۔ امجد فاروقی کے دل کی مراد بر آئی۔ اسے اپنے دشمن کا بتا مل گیا اور اس نے فوراً اسے ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اسے امید نہیں ہوگی کہ آدھی رات کے وقت اس کے بلانے پر وحید مراد باہر آئے گا تو وہ بھی مسلح ہوگا۔ اس نے پہل کی اور امجد فاروقی کو گولی مار دی مگر اس نے بھی مرتے مرتے جوابی فائر کر دیا۔ اب امجد فاروقی شدید زخمی اور پولیس کی تحویل میں تھا۔ وہ زندہ رہا تو برسوں جیل میں گزارے گا۔

تاہم ابھی وہ زندہ تھا اور پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہ مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا کہ میں اس سے مل کے اپنے اندازوں کی تصدیق کر لوں میرے ذہن میں ایسے بہت سے لوگوں کے نام آئے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ ایک ڈی ایس پی مجھے سب سے موزوں لگا۔ باقی تمام خوبیاں اس میں وہی تھیں جو بیس برس تک ہر نچلے عہدے اور ہر تھانے کا تجربہ حاصل کرنے یعنی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے ہر پولیس افسر میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس میں دوغلا پن نہیں تھا۔ اگر کوئی کام اس کے بس سے باہر ہو تو وہ صاف بتا دیتا تھا۔ یہ بتا دیتا تھا کہ کام کرانے میں کتنا پیسہ خرچ ہوگا اور اس کے لیے کس کی سفارش درکار ہوگی۔ جو کام اس کے اختیار میں ہوتا تھا' اس کے لیے وہ مجھے انکار نہیں کرتا تھا کیونکہ متعدد بار میں اس کی مدد کر چکا تھا۔

وہ مجھے آفس میں ہی مل گیا۔ رسمی تکلفات کے بعد اس نے گھڑی دیکھی ''یار' معاف کرنا میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تم کراچی میں کب تک ہو؟''

میں نے کہا ''کل شام تک..... مجھے تم سے ایک کام تھا۔''

''بولو..... اچھا یوں کرتے ہیں' تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو راستے میں بات کریں گے۔''

پہلے اس کا ارادہ پولیس دین میں جانے کا تھا۔ میری وجہ سے اس نے اپنی کار کو ترجیح دی جسے ایک یونیفارم والا پولیس کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ دین ہمارے آگے رہی جس میں ایک انسپکٹر کے ساتھ دو مسلح افراد سوار تھے۔

میری بات سن کے وہ ہنس پڑا ''یار' یہ تو کمال ہو گیا۔ ہم ادھر ہی تو جا رہے ہیں۔ وہ کیس میرے علاقے کے تھانے کا ہے۔ بہت پرانی فائل ملی ہے مجھے۔ یہ جو بندہ اب قتل ہوا ہے' پہلے خودکشی کر چکا تھا۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

میں نے کہا ''اخبار کی فائلوں میں اس کے سارے کارناموں کی روداد موجود ہے لیکن مجھے اس سے نہیں' امجد فاروقی سے ملنا ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا ''وہ تمہارا دوست ہے؟''

''ہرگز نہیں۔ ساری تفصیل بتانے کا یہ وقت نہیں۔ اس کی حالت کیسی ہے؟''

''خطرے سے باہر ہے۔ ابھی تک اس کا بیان نہیں ہوا ہے' تم کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔''

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ ابھی تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے کے بعد لاش وارثوں کے حوالے کرنی ہے۔ اس کا بیٹا ہے یہاں۔''

''اس کی بیوی.....؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''اسے اطلاع دی گئی تھی مگر اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہے میرے لیے وہ پہلے کب زندہ تھا کہ تم مجھے اس کی موت کی خبر دے رہے ہو۔''

دورانِ گفتگو اس نے ایک بار بھی وحید کی دوسری بیوی کا حوالہ نہیں دیا تو میں نے بھی سیما کا نام نہیں لیا۔ وحید کی صورت دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا چنانچہ میں مردہ خانے نہیں گیا۔ ڈی ایس پی نے مجھے میڈیکولیگل افسر کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا بڑا بیٹا رونی صورت بنائے نمودار ہوا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ باپ کی لاش وصول کرنے آیا ہے۔ اس کی صورت کے نقوش میں اپنے باپ کی جھلک بہت نمایاں تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد رسمی طور پر اظہارِ افسوس کیا اور پھر پوچھا ''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو' امجد فاروقی کو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''میرا خیال ہے کہ پاپا بھی اسے نہیں جانتے تھے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کل رات جب وہ آیا تو پونے بارہ بجے تھے۔ پاپا سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ جب اس نے کال بیل بجائی تو میں گیا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے وحید مراد صاحب سے ملنا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ میں نے پاپا کو بتایا تو وہ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔''

''اسی لیے وہ اپنے ساتھ ریوالور لے گئے تھے؟''

''اس نے آہستہ سے کہا ''ہاں' خطرہ تو وہ محسوس کرتے تھے۔ میں ان کے پیچھے گیا۔ پاپا نے کہا تھا..... کون ہو تم..... اور اس نے جواب دیا۔ تمہاری موت..... ان کے درمیان اس سے زیادہ گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اچانک

ریوالور نکال لیا اور گولی چلادی۔ جب میں چلایا تو وہ شخص بھاگا۔ پاپا گر گئے تھے۔ گولی ان کے دل میں لگی تھی۔''

میں نے کہا ''پھر تمہارے پاپا نے ریوالور نکال کے اس کا نشانہ کیسے لے لیا۔''

وہ نظر چرا کے بولا ''گرنے سے پہلے انہوں نے ریوالور نکال لیا تھا اور فائر بھی کر دیا تھا۔''

میں نے کہا ''بھاگنے والا دس بیس گز دور تو چلا گیا ہوگا۔''

''ہاں..... پولیس کا کہنا ہے کہ اس کی لاش تیس فٹ دور تھی۔''

میں نے خاموش رہنا بہتر جانا۔ ورنہ ایک شک والا سوال میرے ذہن میں بھی پیدا ہوا تھا کہ رات کے اندھیرے میں فرار ہونے والے کسی شخص کو گولی ماری جائے تو اس کی کمر کے کسی حصے پر لگنی چاہیے۔ امجد فاروقی کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اسے سامنے سے گولی ماری گئی تھی۔ وحید مراد دل میں گولی لگنے کے بعد یقیناً گرا ہوگا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ریوالور نکالے اور فرار ہوتے شخص پر گولی چلا سکے۔ غالباً یہ کام باپ نے نہیں بیٹے نے کیا تھا۔ وہ ریوالور اٹھا کے قاتل کے پیچھے دوڑا۔ صدمے اور غصے میں اسے اپنا ہوش اور یہ خیال نہیں ہوگا کہ قاتل اسے بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔ شاید امجد فاروقی نے اچانک رک کے اور پلٹ کے تعاقب کرنے والے کی طرف دیکھا اور اسی وقت خود گولی کا نشانہ بن گیا۔ اگر اس نے فائر کیا تو گولی کسی اور سمت نکل گئی یا ریوالور سے فائر ہی نہیں ہوا۔

میں نے اپنے مفروضات کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔ تفتیش پولیس کا کام تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب مانگنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اگر وحید مراد کا بیٹا اپنے باپ کی دولت کا ایک حصہ اپنی زندگی کی قیمت سمجھتے ہوئے پولیس کے حوالے کر دے تو پولیس اس کی کہانی کو درست قرار دیتے ہوئے اپنی رپورٹ میں ثابت کر سکتی ہے کہ قاتل پر گولی خود مقتول نے ہی چلائی تھی، اس کے بیٹے نے نہیں۔

مجھے یقین تھا کہ وحید مراد نے اپنے بیٹے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ جو اس نے اپنے پارٹنر نوازش علی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ بیٹے کے سوا اس کا تھا ہی کون۔ وہ اپنی ساری دولت اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا تھا کیونکہ وہ بینک اکاؤنٹ کے چکر میں نہیں پڑ سکتا تھا۔ جو آدمی آٹھ سال پہلے خودکشی کر چکا ہو اس کا بینک اکاؤنٹ کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر وہ فرضی نام سے بینک اکاؤنٹ رکھتا اور دوسری بار سچ مچ مر جاتا تو اس کے وارثوں کو مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگر وہ سات سال کی جلاوطنی ساتھ دینے والی بیوی کے ساتھ مشترکہ اکاؤنٹ رکھتا کے مرتے ہی سب اس کا ہو جاتا۔ اس کے حقیقی اور رشتوں کے وارثوں کو کچھ بھی نہ ملتا چنانچہ اب وہ خود موبائل بینک تھا اور جہاں جاتا تھا' اپنی طاقت کو ساتھ رکھتا تھا۔ یہ طاقت اس کی وہ دولت تھی جو اس نے زندگی پر لگا کے کمائی تھی۔ مگر اب اس کے لیے غیر اہم ہو گئی کہنے کو کہا جا سکتا تھا کہ حق بہ حق دار رسید ایک باپ کی دو موت اس کے بیٹے کے حق میں خوش نصیبی کی لاٹری ہو تھی۔

اگلا ایک گھنٹا وحید مراد کی لاش قانونی طور پر اس کے کے سپرد کرنے میں گزر گیا۔ اس خبر کی اشاعت کے ساتھ بہت سے اخباری نمائندے مستعد ہو گئے تھے اور اسپتال گئے تھے۔ انہوں نے پرانی فائلوں سے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں اور دوسری موت سے پہلے وحید مراد کی روپوشی آٹھ سالوں کے بارے میں انہیں ان گنت سوالوں جواب درکار تھے۔ تاہم میرا ڈی ایس پی دوست ان سے چھڑا کے مجھے اسپتال پہنچانے میں کامیاب رہا۔

اسپتال کے اس حصے تک رسائی نہ تھی جہاں امجد فاروقی کو ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ایک پولیس والا اس کو ریکوری کے آغاز میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا جس میں ہر کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ امجد فاروقی کا کمرا بالکل آخر میں تھا۔ دوسرا پولیس مین کمرے کے باہر موجود تھا۔ تیسرا کمرے کے اندر بیڈ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔

امجد فاروقی بستر پر کمبل اوڑھے بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا اس کے بازوؤں سے خون اور گلوکوز کی سوئیاں منسلک تھیں سرہانے کی طرف الیکٹرانک مانیٹر نصب تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور وہ بہت کمزور نظر آتا تھا مگر وہ ہوش میں تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

بیڈ کے دوسری طرف جا کے میں نے کہا ''کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں'' امجد فاروقی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ''پولیس تو تم سے سب پوچھ ہی لے گی۔ لیکن تم نے وحید مراد کو قتل کیا تو یقیناً تمہارے پاس ایسا کرنے کی کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔''

''قتل اس کی کم سے کم سزا تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے بہت اذیت کے ساتھ تڑپا تڑپا کے مارتا۔''

''اس نے تمہارے ساتھ بھی فراڈ کیا تھا؟''

''فراڈ.....!'' وہ نفرت سے بولا ''اس نے مجھے برباد کر دیا' میرا سب کچھ چھین لیا۔ وہ میرا دوست تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کا بزنس پارٹنر بن جاؤں۔ میں ایک انشورنس ایجنٹ تھا اور میری اچھی خاصی کمائی تھی۔ میرے پاس اچھا گھر تھا اور اچھی گاڑی تھی۔ یہ سب مجھے اپنے والد سے ترکے میں ملا تھا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تو نہیں تھا۔ میرا ایک بھائی بھی تھا مگر وہ آسٹریلیا چلا گیا تھا چنانچہ والدین نے جو کچھ چھوڑا' سب مجھے مل گیا۔ وحید کے بزنس میں کتنا فائدہ تھا۔ یہ بھی مجھے نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر آج میں اپنا سب کچھ بیچ کے کاروبار میں لگا دوں تو ہر سال میرے اثاثے دگنے ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک سال بعد میرے ایک نہیں دو مکان بن سکتے ہیں۔ دو سال بعد چار۔ آج ایک گاڑی ہے ایک سال بعد میں دو لے سکتا ہوں۔ رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ تم میرے فلیٹ میں بھی گزارا کر سکتے ہو۔ میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنا گھر' گاڑی اور بیوی کا زیور سب بیچ دیا۔ یہی نہیں' میں نے بہت بھاری شرح سود پر دس لاکھ کا قرض بھی لے لیا۔ کچھ عرصے بعد وحید نے مجھے بتایا کہ اس کا بزنس پارٹنر نوازش علی اس کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ اس کا حصہ تو کہیں زیادہ کا ہے لیکن اسے پچاس لاکھ مل جائیں تو وہ پارٹنر شپ ختم کر دے گا اور اس کی جگہ میں برابری کی بنیاد پر شریک ہو گیا تو لاکھ کے کروڑ بنتے دیر نہیں لگے گی۔ جانتے ہو اس کے بعد میں نے کیا' کیا؟''

میں نے کہا ''میں کیسے جان سکتا ہوں۔ میں تو شاید تمہارا اصل نام بھی نہیں جانتا۔ تم نے سب جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا ''نام غلط نہیں بتایا تھا میں نے۔ میری بیوی کا باپ بھی دولت مند تھا اور اس کی شادی کسی انشورنس ایجنٹ سے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے لو میرج کر لی تھی۔ اس کے بعد والدین نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ میری بیوی کا ایک بڑا بھائی تھا۔ وہ سیاست کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ایک سیاسی جماعت نے اسے دھوکا دیا تو وہ مخالفوں سے مل گیا اور ایک دن سیاسی دشمنی میں مارا گیا۔ اسی صدمے نے باپ کی جان لے لی۔ اس کا کاروبار پہلے ہی تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی عمر رسیدہ تھی۔ وہ جاہل عورت تھی۔ اسے شوگر زیادہ ہونے کی وجہ سے نظر بھی بہت کم آتا تھا۔ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ میری بیوی اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ میں نے دھوکے سے اس کا گھر بھی بیچ دیا۔ پچاس لاکھ میں اسے پہلے دے چکا تھا۔ مزید پچاس لاکھ دے کر میں نے نوازش علی کی جگہ اس کا بزنس پارٹنر بننے کا خواب پورا کر لیا مگر وہ دھوکے باز سب کے ساتھ میرا پیسہ بھی لے کر فرار ہو گیا۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ غصے اور صدمے سے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ میں ڈیپریشن میں مبتلا ہو گیا۔ ایسے میں کام کیا ہوتا' میری آمدنی ختم ہو گئی۔ میں نے محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا۔ میں اس کی نظر میں گر گیا تھا۔ مجبوری میں اس نے نوکری کی۔ اب اسی انشورنس کمپنی میں' جہاں میں کئی سال پہلے ایک سیلز مین تھا' وہ ٹیلی فون آپریٹر اور ریسپشنسٹ ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا ''وہ..... وہ بیوی ہے تمہاری؟''

''ہاں..... قانونی طور پر.....'' اس نے تلخی سے کہا ''مجھے تو وہاں اب کوئی جانتا ہی نہیں جہاں میں نے خود کو ڈپٹی جنرل منیجر ظاہر کیا تھا۔ جب تم مجھے فون کرتے تھے تو میری ٹیلی فون آپریٹر بیوی اس کال کو میرے گھر کے نمبر پر ٹرانسفر کر دیتی تھی اور میں تم سے بات کر لیتا تھا۔ ایسا وہ اس لیے کرتی تھی کہ اسے امید تھی کہ تم وحید مراد کو تلاش کر لو گے۔ میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ تمہاری مدد سے ہماری ڈوبی ہوئی رقم مل سکتی ہے۔ وحید مراد مل جائے تو اس سے کچھ نہ کچھ وصول کیا جا سکتا ہے اور وہ مان گئی تھی ورنہ اب اس سے میرا تعلق بھی نام کا رہ گیا ہے۔ اگر میں نے اسے دھوکا نہ دیا ہوتا تو شاید وہ غریبی میں بھی میرے ساتھ گزارا کر لیتی۔ اب وہ اچھا کما رہی ہے۔ آفس کے بعد وہ اپنے کسی باس کے ساتھ اچھا وقت گزارتی ہے۔ رات کو دیر سے آتی ہے اور بعض اوقات نہیں آتی۔ وہ مجھے بھی پال رہی تھی' ترس کھا کے یا شاید مجھے اذیت پہنچانے کے لیے۔ سزا دینے کے لیے۔'' وہ چپ ہو گیا کیونکہ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا ''کیا تم نے کبھی وحید مراد سے اپنی رقم کی واپسی کے لیے کہا تھا؟''

''کیسے کہتا..... وہ تو مر گیا تھا اور اس کا پتا تم نے کل ہی بتایا تھا مجھے۔ دس منٹ بعد میں اسے تلاش کرنے نکل گیا تھا۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''قتل کرنے سے پہلے تم نے اس سے بات تو کی ہوتی۔''

''اس سے کیا ہوتا۔ کیا وہ مان جاتا؟''

میں نے کہا ''وہ مان جاتا' تم نے اسے مارنے میں بہت جلدی کی۔ وہ تو واپس آیا ہی اس لیے تھا کہ اسے ضمیر کی خلش پریشان کر رہی تھی۔ وہ اپنے پرانے رشتے جوڑنے اور قرض لوٹانے آیا تھا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''کل ہی اس نے نوازش علی کو ایک کروڑ واپس کیے ہیں۔ اس کے نقصانات کی تلافی اور معافی کے لیے وہ خود اس کے پاس گیا تھا۔ یہ بات مجھے خود نوازش علی نے بتائی تھی۔ اگر تم تھوڑا سا انتظار کر لیتے تو وہ تمہارے پاس بھی آتا۔ وہ خود تمہیں تلاش کرتا اور تمہارے قرض کا پیسہ پیسہ لوٹا دیتا۔ تم نے تو اسے دیکھتے ہی گولی مار دی۔''

وہ مزید دکھی ہو گیا ''میرے سینے میں نفرت اور انتقام کا آتش فشاں آٹھ سال سے دہک رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔''

''اگر وہ تمہارا دوست تھا... تو اس نے کل رات تمہیں دیکھ کر یہ کیوں پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ وہ تمہیں پہچانا کیوں نہیں تھا؟''

''میں نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور باہر اندھیرا بھی تھا۔''

میں نے کہا ''میں اب چلتا ہوں۔ جانے سے پہلے ایک آخری سوال۔ تم پر گولی کس نے چلائی تھی؟ خود وحید مراد نے یا اس کے بیٹے نے؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''تم نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا... جس کے پیر نہیں تھے۔ مگر وہ چل گیا..... میری حد تک' یہ لاحاصل جھوٹ تھا۔ اب کیا لاحاصل سچ بولو گے؟''

وہ میری بات سمجھ کے معنی خیز انداز میں مسکرایا ''مجھ پر گولی خود وحید مراد نے چلائی تھی۔''

☆☆☆

سیما کے گھر کے باہر تالا لگا ہوا تھا لیکن پورچ میں اس کی کار موجود تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور گھر سے کچھ فاصلے پر اپنی کرائے کی کار میں دروازے پر نظر رکھے بیٹھا رہا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ پولیس وہاں کب آتی ہے اور اخبار والے اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں؟

یہ بات یقینی تھی کہ جب وحید مراد کی دوسری موت کے بعد تفتیش کا دفتر دوبارہ کھولا جائے گا تو سیما کا نام بھی سامنے آئے گا۔ پھر پولیس اس سے گزرے ہوئے وقت کے ہر لمحے کی کہانی سن لے گی۔ یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ ابھی تک اسے وحید کے قتل کی خبر نہ ملی ہو۔ ایسی صورت میں یہ عین ممکن تھا کہ وہ افراتفری میں نقد رقم اور ضروری اسباب سمیٹ کے فرار ہو چکی ہو۔ کسی فلائٹ پر لندن یا دبئی کی جانب پرواز ہو۔ فوری طور پر سیٹ نہ ملے تو وہ کسی دشواری کے بغیر روپوش بھی ہو سکتی تھی۔ گزرے ہوئے سات برسوں میں وحید کے ساتھ رہ کے اس نے سب سیکھ لیا تھا۔

تاہم تھوڑا بہت امکان یہ بھی تھا کہ اسے ابھی تک معلوم نہ ہو۔ گھر میں رہنے والی عورت صبح کا اخبار دیکھتی پھر ٹی وی کی خبریں۔ وحید مراد کے قتل کی خبر ایسی نہ تھی کہ ٹی وی پر نشر ہوتی۔ صبح کے بڑے اخباروں میں بھی فرنٹ پیج پر جگہ پانا محال تھا۔ شام کے اخبارات گھروں میں نہیں ڈالے جاتے تھے۔ وہ صرف دکانوں' ہوٹلوں کاروباری اداروں تک محدود تھے یا پھر بازاروں اور بسوں میں فروخت ہو جاتے تھے۔

ایک گھنٹے بعد میں مایوس ہو گیا۔ ابھی تک نہ پولیس ادھر کا رخ کیا تھا اور نہ اخبار والوں نے۔ غالباً سیما کا یہ ٹھکانا کسی کے علم میں نہ تھا۔ وہ خود حالات کی بو پا کے چھوڑ چکی تھی یا پھر اپنے محبوب کو آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر پہنچ گئی تھی مگر اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ جذبات کی رو بہہ کے اتنا بڑا خطرہ مول لے۔

میں واپس ہوٹل لوٹ آیا اور کھانا کھا کے سو گیا۔ شام چائے پیتے ہوئے مجھے پھر سیما کا خیال آیا۔ اس نے مجھ کہا تھا کہ وحید مراد اگر اپنے بیٹے کے گھر نہ ملے تو شام کو سا سمندر پر ویج ریسٹورنٹ میں آ جانا۔ وہاں وہ مجھ سے آئے گا اور وہ اس سے فیصلہ کن بات کرے گی۔

مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ کرائے کی گاڑی میرے پاس اور کلفٹن کا ساحل میرا دیکھا ہوا تھا۔ جب میں ویج ریسٹورنٹ پہنچا تو شام کے وقت تفریح کے لیے آنے والوں کا رش بڑھ تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سیکڑوں کاریں کھڑی تھیں۔ ریسٹورنٹ اس ساحل کے آخری حصے میں تھا۔ اپنی گاڑی ایک خالی جگہ میں لگا کے میں اندر گیا اور ساحل کی ریت پر ہوئی میزوں کے درمیان دیکھتا ہوا ایک میز پر بیٹھ گیا۔ لہریں بہت دور تھیں مگر ساحل کی ریت میں نمی تھی۔ مجھے محسوس تھا کہ جیسے جیسے رات گزرے گی' لہریں آگے بڑھیں گی پانی ان میزوں' کرسیوں کو بھی چھونے لگے گا۔

سیما ان لوگوں میں نہیں تھی جو وہاں لائف کو انجوائے کر رہے تھے۔ چائے' کافی اور کولڈ ڈرنکس پی رہے تھے افق تک محیط سمندر کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نوجوان آگے پانی تک چلے گئے تھے۔ بوڑھے وہیں بیٹھے تھے اور بچوں کو آگے جانے سے روک رہے تھے۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے کافی منگوالی۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ اچانک نمودار ہوئی۔ اس نے سمندر کی طرف اترنے والی سیڑھی پر رک کے تمام میزوں

ایک نظر ڈالی اور میں نے اسے غروب ہوتے سورج کی شفق رنگ کرنوں میں کسی آسمانی مخلوق کی طرح دیکھا۔ وہ سرسراتے بادلوں جیسے سفید لباس میں تھی جو ساحل کی تیز ہوا میں اس کے جسم سے چپک کر رعنائی شباب کے سارے نشیب و فراز کو نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی ریشمی ساڑی کا آنچل سنبھالنے کے باوجود اڑ رہا تھا۔ اس کے کھلے سیاہ بال بکھر رہے تھے اور اسی پوز میں وہ ہر نگاہ کا مرکز بن گئی تھی۔

میں نے اٹھ کے ہاتھ ہلایا تو وہ سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے حسین چہرے کی شگفتہ مسکراہٹ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے وحید مراد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق فیصلہ کرنے آئی تھی کہ وحید زندگی کے سفر میں صرف اس کے ساتھ قدم ملا کے چل سکتا ہے یا نہیں۔ یہ جانے بغیر کہ فیصلہ تو تقدیر کر چکی ہے۔

''اس کا مطلب ہے آپ کی وحید سے ملاقات نہیں ہوئی؟'' اس نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

میں نے کہا ''آپ کیا لیں گی؟''

''ابھی تو صرف کافی!'' اس نے کہا ''حالانکہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے آج دن میں کچھ نہیں کھایا۔ مگر میں ڈنر خراب کرنا نہیں چاہتی۔''

میں نے کہا ''جیسی آپ کی مرضی.....'' اور اس کے لیے بھی کافی منگوالی۔

''یہاں میں ہر روز آ جاتی ہوں۔ رات تک بیٹھی رہتی ہوں۔ مجھے یہاں بہت سکون ملتا ہے'' وہ بولی ''رات تک ساحل پر پھرتی رہتی ہوں۔''

''آپ اکیلی آتی ہیں؟''

''ہاں۔ اب تو اکیلی ہی ہوں۔ وحید پہلے آتا تھا'' وہ اداسی سے بولی ''معلوم نہیں دیکھنے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''آج آپ گھر میں نہیں تھیں؟''

وہ چونکی ''کیا آپ آئے تھے؟ میں تو کہیں بھی نہیں گئی؟''

میں نے کہا ''لیکن باہر تالا لگا ہوا تھا' گاڑی بھی نہیں تھی۔''

''گاڑی کرائے کی تھی۔ وحید نے منگوالی تھی۔'' وہ بولی ''تالا عام طور پر لگا ہوا نظر آتا ہے۔ میں خود اندر سے ہاتھ ڈال کے لگا دیتی ہوں۔ اس کی ایک چابی وحید کے پاس بھی ہے۔''

''میں ایک گھنٹا آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔''

''کوئی خاص بات تھی؟'' اس نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر سکون سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر لگا دیا۔

مجھے اس کا یہ انداز بہت دل نشیں لگا۔ ساڑی کا آنچل پھسل گیا تھا اور نم آلود ریت پر پھیل گیا تھا۔ سیلولیس بلاؤز میں اس کے مدور شانے اور گداز بازو' کشادہ گلے اور پیٹ کے اوپر والے حصے تک جسم سے چپکے ہوئے کپڑوں میں اس کے بدن کا مرمریں منظر کے لیے بڑی سنسنی خیز کشش رکھتا تھا۔

میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ ایک بری خبر سنا کے میں اس شام کی ساری خوبصورتی کا خون کر دوں۔ یہ خبر اس ایٹم بم کی طرح ہوتی جس نے پلک جھپکتے میں ایک ہنستے بستے شہر کو قبرستان میں بدل دیا تھا۔ کیوں نہ میں سب کچھ وقت پر چھوڑ دوں۔ کل تو مجھے جانا ہی ہے۔ وحید کو اب تک سپرد خاک کر دیا گیا ہوگا۔ اس کی پہلی بیوی نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری ابھی تک نہیں جانتی تھی کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔

اس نے اچانک کہا ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں چونک پڑا اور اپنی چوری پکڑے جانے پر خفت کو چھپانے میں ناکام رہا ''کچھ نہیں۔ یہاں تمہارے سوا کیا ہے دیکھنے کو۔ کیا تم نے نوٹ کیا تھا کہ جب تم آئی تھیں تو ہر نظر کس طرح تمہارے نظارے میں گم ہو گئی تھی۔ جو پہلے قدرت کے حسن کو دیکھ رہی تھی۔''

''بہت سنی ہیں میں نے ایسی باتیں۔ مگر باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ احساس حسن تو جذبات کا کرشمہ ہے۔ جذبات نہیں تو کچھ نہیں۔ وحید کو اب میری خوبصورتی نظر ہی نہیں آتی۔ پہلے اسے دولت جمع کرنے کا جنون تھا' وہ بے گھر' بے وطن اور تنہا ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے وحید پر قبضہ کر لیا اور یہ سمجھتی رہی کہ میری محبت نے اسے ہمیشہ کے لیے حاصل کر لیا ہے تو یہ غلط تھا۔ بالآخر وہ لوٹ گیا۔ اپنے گھر کی طرف' خون کے رشتوں کی طرف اور اپنی مٹی کی طرف۔ میرا یہ حسن' جس کی قوت تسخیر پر مجھے بہت غرور تھا' اسے روکنے میں ناکام رہا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ آج وہ نہیں آیا شاید اب کبھی نہیں آئے گا۔''

وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی محسوس ہوتی تھی۔ خلا میں دیکھ رہی تھی اور نہ جانے گزر جانے والے وقت کی کون سی یادوں میں گم تھی۔ سورج غروب ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ سمندر کے بیکراں وجود پر تاریکی پھیل گئی تھی۔ کناروں پر روشنیاں تھیں لیکن افق تک محیط اندھیرے میں سمندر کرب سے بل کھا رہا تھا' کراہ رہا تھا۔

وہ آنچل سنبھال کے اٹھی ''آؤ.....''

میں کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ چلنے لگا ''تم نے کیا سوچا ہے؟ اب تم کیا کرو گی' کہاں جاؤ گی؟''

اس نے جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑے اور نرم گیلی ریت پر چلنے لگی۔ اس کے جسم سے گزر کے آنے والی تیز سمندری ہوا میں اس کی خوشبو شامل ہوگئی تھی۔ میں سحر زدہ سا اس کے ساتھ چلتا رہا۔

''مجھے اب کچھ نہیں سوچنا۔ کچھ نہیں کرنا۔ کہیں نہیں جانا۔ زندگی پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ کیا دیا ہے آخر مجھے زندگی نے؟'' وہ اب پانی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میں نے کہا ''ایک منٹ..... ذرا میں جوتے اتار لوں۔''

میرا خیال تھا کہ وہ رک گئی ہوگی۔ میں ریت پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کے جوتے اتارنے لگا۔ ایک جوتے کے لیس کی گانٹھ کھولنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ میری انگلیاں گیلی ہوگئی تھیں اور میرے تازہ تراشے ہوئے ناخن سخت ہوجانے والی گانٹھ کو کھولنے میں مدد نہیں کر رہے تھے۔ جب میں جرابوں کو جوتے میں ڈال کے کھڑا ہوا تو وہ بہت آگے جا چکی تھی۔

میں نے چلا کے کہا ''سیما۔ رک جاؤ' آگے مت جاؤ۔''

اس نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور سیدھی چلتی گئی۔

میں نے اس کے پیچھے جاتے ہوئے پھر آواز دی ''سیما۔ دیکھو آگے پانی گہرا ہے۔ واپس آجاؤ..... سیما.....!''

وہ اندھیرے میں سمندر کی متلاطم سطح کے پس منظر میں ایک سفید ہیولا سا رہ گئی تھی۔ میں جوتے پھینک کے دوڑا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ پانی کی ایک بڑی لہر نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں گر کے اٹھا تو سیما کہیں نہ تھی۔ میں دیوانہ وار چلایا۔ ''سیما..... سیما.....'' مگر جواب میں مجھے سمندر کی غراہٹ جیسی گونج کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔

مجھے تیرنا نہیں آتا تھا مگر میں بھاگتا گیا۔ روشنیاں بہت دور تھیں۔ لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ میری مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں شدید احساس جرم میں مبتلا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے خودکشی کر لی تھی اور میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ چند منٹ پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور اب کہیں نہیں تھی۔

پانی کی ایک اور لہر آئی اور مجھے بہا لے گئی۔ میں نے بے کسی سے ہاتھ پاؤں مارے اور بہت سا کڑوا پانی نگلنے کے بعد ایک بار پھر ریت پر قدم جمانے میں کامیاب رہا۔ اسی وقت ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی دھندلائی نظر کے سامنے ایک سفید غبار سا دکھائی دیا۔

''سیما.....!'' میں نے چلا کے کہا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ بے سدھ تھی۔ میں نے اسے کھینچا اور اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ نہ جانے کہاں سے میرے جسم میں اتنی طاقت آگئی کہ میں ریت پر سیما کو اٹھا کے دوڑتا رہا۔ کسی کی طرف دیکھے بغیر اور کسی کی پروا کیے بغیر میں اپنی گاڑی تک پہنچا۔ میرے سارے کپڑے پانی میں تر تھے اور میرے جوتے سمندر میں بہہ گئے تھے۔

اسی حالت میں گاڑی چلا کے میں ایک اسپتال تک پہنچا تو میرے جسم کی ساری توانائی ختم ہوچکی تھی۔ گیٹ میں گاڑی موڑتے ہوئے میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ گاڑی گیٹ کو سپورٹ کرنے والے ستون سے ٹکرائی تو میرا سر سامنے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ پھر میں بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک کمرے میں بیڈ پر تھا۔ ایک ڈاکٹر کسی نرس کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مجھے اپنی جسمانی حالت میں کوئی خرابی محسوس نہ ہوتی تھی۔ سوائے ایک تھکن آمیز غنودگی کے۔

میں نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا تو وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آیا ''ہیلو' کیا حال ہے آپ کا؟''

میں نے کہا ''یہ تو آپ بتا سکتے ہیں۔ مجھے ٹھیک ہی لگتا ہے۔''

''یس۔ آپ کی کوئی انجری سیریس نہیں۔ معمولی خراشیں ہیں جو گاڑی کے ٹکرانے سے آئی ہیں۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹنے سے۔''

''اور وہ خاتون.....! جو میرے ساتھ تھیں؟''

''وہ آپ کی وائف نہیں ہیں'' وہ بولا ''ہم نے تو کاغذات میں یہی لکھ دیا ہے۔ دراصل کاغذات صرف آپ کے پاس سے برآمد ہوئے تھے۔''

''اٹ از اوکے۔ ان کی حالت کیسی ہے؟''

''اب وہ خطرے سے باہر ہیں..... لیکن آئی سی یو میں ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''

''میں انتظار کر سکتا ہوں'' میں نے کہا۔

انتظار تو شاید میں اب تک کر رہا تھا۔ میرا انتظار تو اب ختم ہوا ہے۔ بس مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس کا انتظار ہے لیکن اب پتا چل گیا ہے کہ وہ سیما تھی..... تو پھر کیا فکر..... میں باقی عمر انتظار کر سکتا ہوں۔

✻

انٹرویو

سلیم انور

ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مشہور ہو..... تمام دنیا نہیں تو..... کم از کم اس کے شہر کے لوگ تو اسے جانیں، پہچانیں۔ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے ہی شخص کی کتھا جسے ایک اخبار کو انٹرویو دینے کا موقع مل رہا تھا۔

بلائے ناگہانی میں گرفتار شخص کا احوال، جس کی مشکلات میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا

جمعے کی شب ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر میں نے بار کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

یہ میرا معمول تھا کہ جمعے کی شب ٹھیک نو بجکر دس منٹ پر میں ہمیشہ ''دی ڈاگ اینڈ ڈک'' نامی بار میں جایا کرتا تھا۔ وہاں کافی شناسا لوگوں سے ملاقات ہوجاتی تھی اور اپنے پیشے سے متعلق کوئی نہ کوئی کام ملنے کے امکانات خاصے روشن ہوتے تھے۔

بار کی خادمہ میری ہمیشہ کی طرح کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں بار کے دروازے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں سیدھا اسی کی جانب چل دیا۔

''ایوننگ میری!'' میں نے کاؤنٹر کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

''ایوننگ، جوزف.....'' اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ ''وہی مخصوص مشروب.....؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کاؤنٹر کے سامنے ایک خالی اسٹول پر بیٹھ گیا۔

میری نے کاؤنٹر سے ایک خالی گلاس اٹھایا اور پمپ

کی جانب پلٹ گئی۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے پمپ کا لیور دو مرتبہ کھینچا اور جھاگ گلاس کے منہ تک بھر آیا تو اس نے وہ گلاس میرے سامنے کاؤنٹر پر لا کر رکھ دیا۔

''تم کیا پینا پسند کرو گی، ڈیئر.....؟'' میں نے میری سے پوچھا۔

''کمپاری پلیز، جوزف.....''

ایک وقت تھا کہ وہ پورٹ اور لیمن پر قناعت کر لیتی تھی، لیکن ہر دور ہمیشہ تو ایک جیسا نہیں رہتا..... اور یہ سب کچھ اس نا ہنجار ٹیلی وژن کی وجہ سے ہوتا ہے جس میں نت نئی چیزیں دیکھ کر لوگ انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ ان کی دسترس میں ہوں یا نہ ہوں۔

میں نے ایک چسکی لینے کے بعد اپنے اطراف میں نظر دوڑائی۔ بار میں موجود لوگوں میں سے بیشتر یہاں کے مستقل گاہک تھے اور ان میں کئی ایک میرے شناسا تھے۔ میں اپنے شناساؤں سے نگاہ ملنے پر اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

.....اور تب میری نگاہ ٹیڈ پر پڑی۔

وہ نیم تاریک گوشے کی ایک میز پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بیئر کا گلاس تھا۔ مجھ سے نگاہ ملتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میری جانب چل دیا۔ اس نے اپنا گلاس میز ہی پر چھوڑ دیا تھا۔

اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر میں نے اپنی قسمت کو دل ہی دل میں کوسنا شروع کر دیا۔

''ہیلو، جوزف!.....'' اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ساتھ ہی سر کی جنبش سے اپنی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ''میرے ساتھ بیٹھنا پسند کرو گے؟''

میں ٹیڈ سے بخوبی واقف تھا۔ وہ انتہائی درجے کا عیار اور چالاک شخص تھا۔ بعض پیشہ ور تو اسے اپنا استاد مانتے تھے۔ البتہ میں نے اسے کبھی استاد تسلیم نہیں کیا تھا۔ تاہم میں ایک طریقے سے اس کے مقابل قدرے دبا دبا سا رہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میں اس کی کسی بات سے انکار کر سکوں۔ وہ ہمیشہ مجھ پر حاوی ثابت ہوتا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ میرے دل میں مختلف وسوسے جنم لے رہے تھے۔ اس کی میز پر پہنچ کر میں اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔

گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل ٹیڈ نے پُرشوق نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، البتہ اس نے بار کی ملازمہ میری کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ پھر اس کی نظریں دائیں بائیں حرکت کرنے لگیں۔ آخر میں اس نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

میں یہی سمجھا کہ شاید اسے کسی خاص شے کی تلاش ہے۔

پھر آخر میں اس کی نگاہیں میرے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ وہ چند لمحے یونہی نظریں جمائے رہا۔ پھر اپنے مخصوص کریہہ لہجے میں سرگوشی کے انداز میں گویا ہوا.....

''میں نے تمہارے لیے ایک عمدہ کام تلاش کیا ہے۔ جوزف!''

''پچھلی مرتبہ تم نے میرے لیے جو کام منتخب کیا تھا۔ اس کے سلسلے میں جہاں گیا وہاں میری مڈبھیڑ ایک حرام خور دیو قامت، السیشن کتے سے ہو گئی تھی۔'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا ''اس مڈبھیڑ کی بدولت مجھے دو ہفتوں تک منہ کے بل سونا پڑا تھا۔''

''اس مرتبہ میں نے تمہارے لیے آسان کام تلاش کیا ہے۔'' ٹیڈ نے حسبِ عادت تسلی آمیز لہجے میں کہا ''وہاں نہ تو کتے ہوں گے اور نہ ہی کوئی دوسری مشکل پیش آئے گی۔ وہ مکان ہمیس ٹیڈ کے علاقے میں ہے۔''

''یہ تو تم نے ابتدا ہی میں بری خبر سنا دی۔'' میں نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیس ٹیڈ کے علاقے میں تو اولڈ بل کے آدمیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔''

اولڈ بل سے ہماری مراد پولیس ہوتی ہے۔ ہم پیشہ ور لوگ عام جگہوں پر گفتگو کے دوران میں یہی کوڈ ورڈ استعمال کرتے ہیں۔

''لیکن تمہارے، پاس تو اپنی وین ہے..... اور ویسے بھی وہ مکان کونے پر واقع ہے۔ لہٰذا تم اپنی وین بغلی سڑک پر صنوبر کے درختوں کے جھنڈ کے نیچے پارک کر دینا۔ اس مکان کی پچھلی منزل کے باتھ روم کی کھڑکی کے اندر کی جانب ایک عام سی چٹخنی لگی ہوئی ہے۔ تم چاقو کی مدد سے شیشہ کاٹ کر چٹخنی کھول دینا۔ پھر کھڑکی کا پٹ اٹھا کر اندر داخل ہو جانا..... وہاں تمہیں سامنے ہی سیڑھیاں دکھائی دیں گی۔ وہ مکان خالی ہے۔ اس کے مکین کہیں گئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم بے دھڑک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ جانا۔ اوپر بائیں جانب کا پہلا دروازہ ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس کمرے میں کھڑکی کے پردے کے پیچھے چھجے پر کارڈ بورڈ کا ایک بکس موجود ہوگا۔ سب کچھ اس ڈبے میں ملے گا..... اور تمہارے دوستوں کو اس قسم کی نادر اور قدیم اشیا کی طلب ہے.....''

''ان دوستوں کا نام و پتا؟''

''تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ لوگ تمہیں اس کے عوض اچھا معاوضہ ادا کریں گے۔ تمہیں یہ سودا منظور ہے؟'' ٹیڈ نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

میری عقل اور تجربہ تو یہی کہہ رہے تھے کہ میں فوراً انکار کر دوں، لیکن پھر یاد آیا کہ نہ صرف میرے بک میکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے بلکہ میری گرل فرینڈ بھی خاصی شاہ خرچ واقع ہوئی ہے۔ مجبوراً مجھے ہامی بھرنی پڑی۔

''آل رائٹ.....'' میں نے کہا ''مجھے یہ سودا منظور ہے۔''

ٹیڈ نے یہ سن کر اپنی جیب سے کاغذ کا ایک میلا کچیلا ٹکڑا نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں تو اس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اتنا بھونڈا اور بدنما نقشہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اسٹنگٹن ایونیو اور رینی روڈ کے سنگم پر واقع اس مکان کا نقشہ تھا جس میں واردات کے لیے چند لمحوں قبل میں نے ہامی بھری تھی۔ مکان کا داخلی دروازہ اسٹنگٹن ایونیو کی جانب تھا۔

''اس مکان کا نام 'دی سیڈ ارس' ہے۔'' ٹیڈ نے اپنے مخصوص کرخت لہجے میں بتایا۔ ''نقشہ اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو۔ پھر اسے جلا دینا، ٹھیک ہے؟''

''لگتا ہے کہ تم ٹی وی پر ضرورت سے زیادہ جاسوسی فلمیں دیکھتے رہے ہو'' میں نے تبصرہ کیا۔

لیکن ٹیڈ نے میری بات ان سنی کر دی۔ وہ اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا ''لیکن اسے جلانے میں زیادہ تیزی بھی مت دکھانا۔ ورنہ تم اسے بھول جاؤ گے۔ میں تمہاری یادداشت سے بہ خوبی واقف ہوں۔''

''اچھا بس اب یہ فضول باتیں رہنے دو۔'' میں نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ کہ میں وہاں پہنچوں گا کیسے؟''

یہ سنتے ہی ٹیڈ نے اپنی انگلی بیئر کے جام میں ڈبوئی اور میز پر نقشہ بناتے ہوئے بولا ''یہ 'دی رائل ٹری' ہے۔ یہاں سے تم بائیں طرف مڑ جانا، پھر بائیں، پھر دائیں.....'' بیئر کی لکیر میز کی سطح پر بل کھاتی ہوئی رینی روڈ پر جا کر ختم ہو گئی۔ ''تم اپنی وین یہاں پر پارک کر سکتے ہو۔ پھر دیوار پھلانگ کر احاطے میں کود جانا۔ باتھ روم اس جگہ پر ہے اور وہ کھڑکی اس مقام پر ہے۔ تم کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بائیں جانب کا پہلا دروازہ.....''

☆☆☆

چار گھنٹے بعد میں اسٹنگٹن ایونیو پر اپنی وین میں سوار گشت کر رہا تھا۔ کونے کا مکان مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر جب میں نے وین کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مکان کے دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر ایک پائنٹ دودھ کی بوتل اور لیٹر بکس میں اخبار رکھے دیکھے تو ایک طریقے سے خوشی بھی ہوئی۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ مکان میں کوئی موجود نہیں ہے اور غالباً مکینوں کی جلد واپسی کا امکان بھی نہیں ہے..... کم از کم آج کی شب ان کی واپسی متوقع نہیں ہونی چاہیے، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر میں عقبی گلیوں سے ہوتا ہوا رینی روڈ پر نکل آیا۔ میں نے اپنی وین روشنیوں سے دور ایک تاریک مقام پر کھڑی کر دی اور وین سے اتر کر پیدل اس مکان کی جانب چل دیا۔

مکان مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے کسی حصے میں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی، میں دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا..... باتھ روم سامنے ہی تھا۔ میں نے اطمینان سے کھڑکی کا شیشہ کاٹا اور ہاتھ ڈال کر چٹخنی گرا دی۔ پھر کھڑکی کا پٹ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

ٹیڈ نے صحیح کہا تھا۔ مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

سامنے ہی زینہ تھا۔ میں بے دھڑک سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے بائیں جانب کے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کھڑکی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں سیدھا کھڑکی کی طرف بڑھا اور.....

اب تک تمام کام ٹیڈ کے کہنے کے عین مطابق ہوتا چلا آیا تھا، لیکن پھر معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔

ہوا یوں کہ کھڑکی کے نزدیک پہنچ کر جوں ہی میں نے پردے کو اٹھانا چاہا، کمرے میں اچانک روشنی کا طوفان سا آ گیا۔ ساتھ ہی ایک شیریں آواز ابھری ''آہستہ آہستہ گھوم جاؤ!'' انداز تحکمانہ تھا۔

میں حکم کی تعمیل میں دھیرے دھیرے گھوم گیا۔

فوراً ہی روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔

میری آنکھیں چند لمحوں کے لیے چندھیا گئیں۔ پھر میری نگاہ اس لڑکی پر پڑی جو بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی..... وہ ایک جوان اور پُرکشش لڑکی تھی..... اور اس کے ہاتھ میں ایک کیمرا دبا ہوا تھا۔

کیمرے پر نگاہ پڑتے ہی میں سمجھ گیا کہ چند لمحوں قبل روشنی کا جو جھماکا ہوا تھا وہ اسی کیمرے کی فلیش گن کا تھا۔ یقیناً اس لڑکی نے میری تصویر اتاری تھی۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' میں نے اس لڑکی سے خوشامدی لہجے میں کہا۔ میرا انداز بے تکلفانہ بھی تھا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ جب اس لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ کیوں رسید نہیں کیا؟ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی موقع پر تشدد سے کام نہیں لیا تھا اور نہ ہی اس موقع پر اس کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ تو ایک دلکش اور نوجوان لڑکی تھی!

اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات کا بھی خطرہ تھا۔ وہ یہ کہ اس نے مجھے مکان میں کودتے دیکھ کر پہلے ہی پولیس کو فون نہ کر دیا ہو! ویسے بھی پولیس کے البم میں میری نہایت عمدہ تصویر پہلے سے موجود تھی۔ اگر میں اسے بے ہوش کر کے فرار ہو جاتا تب بھی ہوش میں آنے کے بعد وہ میرا حلیہ بہ آسانی پولیس کو بتا سکتی تھی۔ اور پھر البم میں لگی ہوئی میری تصویر سے میری شناخت میں اسے کوئی دقت پیش نہ آتی۔

میں اسے تشدد کے بجائے پیار سے رام کرنا چاہتا تھا۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا!'' اس لڑکی نے قدرے طنزیہ لہجے میں میرا جملہ دُہرایا۔ ''کیا تمہارے پاس اس سے بہتر کوئی اور بہانہ نہیں ہو سکتا؟''

''آل رائٹ'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کھڑکی سے دھواں نکلتے ہوئے دیکھا تو بلا اجازت اندر گھس آیا تاکہ اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو اسے بچایا جا سکے۔''

وہ لڑکی میرے اس جواب سے یقیناً محظوظ ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی یہ کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی۔

پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور بولی ''ادھر آؤ.....''

اشارہ پاتے ہی میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ''ہائے، ہائے.....! مزہ آ گیا.....'' میں نے خود سے کہا..... پھر ایک شانِ بے نیازی سے بستر کی جانب چل دیا۔

''میں نے تمہاری تصویر اتار لی ہے۔ وہ اس میں محفوظ ہے۔'' اس نے کیمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اب میں تم سے کچھ کہوں گی تمہیں وہ کرنا ہوگا۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں یہ تصویر پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' لڑکی نے آخری جملہ سرزنش کے انداز میں کہا تھا۔

''ہائے، ہائے۔'' میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''یہ اس قماش کی لڑکی ہے اور اس طرح لوگوں کو اپنے جال میں پھنساتی ہے۔'' ساتھ ہی میرا ہاتھ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے کے لیے کالر کی جانب رینگ گیا۔

''نہیں.....'' لڑکی نے میرا ارادہ بھانپ لیا اور غراتے ہوئے بولی ''چپ چاپ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ جاؤ.....''

میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خاموشی سے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ مجھے دل ہی دل میں اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی آخر اس قماش کی کیوں نہیں تھی جس کا چند لمحے قبل میں تصور کر رہا تھا۔ تب میں نے اس لڑکی کا قریب سے جائزہ لیا۔

وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک اسمارٹ لڑکی تھی جس کی عمر پچیس سے تیس برس کے درمیان رہی ہوگی۔

جب اس لڑکی نے آگے کی جانب بڑھ کر ایک طرف رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر اٹھایا تو میں چونک گیا۔

''تم میری آواز ٹیپ نہیں کرو گی۔'' میں نے تیزی سے کہا ''یہ بات بھی میرے لیے اتنی ہی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے جتنی کہ تمہارے اس ذلیل کیمرے میں محفوظ میری تصویر!''

وہ لڑکی قدرے تذبذب میں پڑ گئی۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور اسے کریدنے کی کوشش کی۔ ''آخر تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ اصل ماجرا کیا ہے؟'' میں نے کہا ''کیا تم شور مچا کر پولیس کو بلانے کا ارادہ رکھتی ہو؟ وہ تمہیں بھی قصور وار گردانیں گے کہ تمہیں اس طرح دروازے کی سیڑھیوں پر دودھ کی بوتل اور اخبار نہیں چھوڑنے چاہئیں۔ یہ چیزیں لوگوں..... اور خاص طور پر چوروں کو سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔''

''کیا تم اسی کے دھوکے میں اندر آئے تھے؟''

''ہاں..... میں ان ہی چیزوں سے دھوکا کھا کر اندر آ گیا تھا۔'' میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ہمارے منصوبے کا ایک حصہ تھا.....'' لڑکی نے کہا۔

''منصوبہ.....؟ ..... کیسا منصوبہ؟''

''یہی منصوبہ..... اور یہ کہ بات صحیح ذرائع سے متعلقہ فرد تک پہنچ جائے۔'' لڑکی نے کہا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا آج تک ٹیڈ کے پاس کوئی صحیح اطلاع بھی پہنچی ہے.....؟ اور پھر یہ کہ اس لڑکی نے یہ اطلاع ٹیڈ تک کس طرح پہنچائی ہوگی جو اس نے مجھے اس جال میں لا پھنسایا؟

''میں تمہارا منصوبہ سمجھ گیا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم جان بوجھ کر ڈکیتی کرانا چاہتی ہو.....! یہی بات ہے نا؟ کیا بیمے وغیرہ کا کوئی چکر ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' لڑکی نے منہ بناتے ہوئے کہا ''میں ایک رپورٹر ہوں..... فری لانس رپورٹر۔ آج کل جرائم کی سیریز پر کام کر رہی ہوں اور اس سلسلے میں..... اگر تم میری حقیقت پسندی کا برا نہ مانو تو کہوں..... کہ میں چھوٹے مجرموں کے تاثرات لینا چاہتی ہوں تاکہ قاری تک صحیح صحیح بات پہنچ جائے۔''

یقیناً یہ بات مجھے بہت بری لگی کہ اس نے مجھے چھوٹے مجرموں میں شمار کیا۔ لیکن چونکہ وہ پہلے ہی معذرت طلب کر چکی تھی اس لیے میں نے اس کی ''حقیقت پسندی'' کو درگزر کر دیا۔

''بے شک، میں چاہتی تو اس بارے میں شہر کے مختلف مے کدوں سے درجنوں ایسے افراد کے انٹرویو لے سکتی تھی جو بڑھ بڑھ کر یہ بیان دیتے کہ میں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا، میں نے وہ تیر مارا، حالانکہ حقیقت میں انہوں نے اکثر و بیشتر یہی چوری کی ہوگی کہ بس میں سفر کے دوران میں کرایہ نہ ادا کیا ہو۔'' وہ لڑکی اپنی بات کا سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ہو سکتا ہے کہ تم بھی مجھ سے گفتگو کے دوران مبالغہ آرائی سے کام لو، لیکن کم از کم مجھے تو اس بات کی تسلی ہوگی کہ میں نے اپنے موضوع کے لیے ایک حقیقی مجرم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ چاہے وہ چھوٹا مجرم تھا!''

''تو تم بس مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ ''اور اس بات کے لیے تم نے اتنا گورکھ دھندا پھیلایا!''

''ہاں.....'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا..... ''اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں..... کیا تمہیں اس سے مایوسی ہوئی؟''

''ضروری نہیں کہ آدمی کا ہر تیر نشانے پر لگے، کچھ نشانے خطا بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا ''بہرحال تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟

''میں تمہارا انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔''

''اور اگر میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تو پھر کیا ہوگا؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''اگر تم اپنا انٹرویو دو گے تو میں تمہیں وہ تصویر..... بلکہ ریل سمیت کیمرا بھی دے دوں گی۔ یہ ایک عمدہ کیمرا ہے اور تمہارے لیے خاصا کارآمد ہو سکتا ہے۔ پھر میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے بعد تمہیں خدا حافظ کہہ دوں گی اور بات یہیں ختم ہو جائے گی..... مزید یہ کہ اگر تم اتوار کے اخبارات خریدتے ہو تو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم میں سے کون زیادہ فائدے میں رہا ہے۔''

''اس پیشکش کا شکریہ.....''

''بائی دا وے، میرا نام اینجل ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے کی جانب جھکی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے جھک کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے بڑی مسحور کُن خوشبو لگائی ہوئی تھی۔

اس نے ایک نوٹ بک اور پینسل اٹھائی۔ ''میری شارٹ ہینڈ رائٹنگ خاصی اچھی ہے۔'' اس نے انٹرویو کا آغاز کرنے سے پہلے کہا ''ابتدا ہم تمہارے بچپن سے کرتے ہیں۔ لیکن پہلے تم اپنی تعلیم کے بارے میں بتاؤ کیونکہ تم مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے دکھائی دے رہے ہو۔''

''بس یونہی واجبی سی تعلیم ہے۔'' میں نے بتایا ''لیکن میرا تعلق پبلک اسکول سے نہیں رہا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اینجل نے اپنی نوٹ بک پر پینسل گھسیٹتے ہوئے کہا ''اب تم اپنی زندگی کے پہلے جرم کی تفصیل بتاؤ۔''

.....اور اس طرح میں نے اپنی زندگی کی تمام داستان سنا ڈالی۔ اسے یہ بھی بتا دیا کہ ابتدا میں مختلف گیراجوں سے کس طرح پرزے چوری کیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے اسے اپنی چند حسین بلبلوں کے واقعات بھی سنائے جن کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی یاد اب بھی میرے خون کی گردش تیز کر دیتی تھی۔ البتہ میں نے ان وارداتوں کی مکمل تفصیل بیان کرنے میں خاصی احتیاط سے کام لیا جن میں مجھے نہ صرف بڑی کامیابی ہوئی تھی بلکہ پولیس بھی ابھی تک ان وارداتوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ پولیس کے لوگ بھی ہماری طرح انسان ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر اتوار کے اخبارات بڑی دلچسپی اور تفصیل سے پڑھا کرتے ہیں۔

☆☆☆

جب میں اس مکان سے باہر نکلا تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔

چونکہ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اس لیے باہر ابھی تاریکی کا راج تھا۔ اینجل نے وعدے کے مطابق انٹرویو مکمل ہونے کے بعد وہ کیمرا فلم سمیت میرے حوالے کر دیا تھا اور وہ اب میری جیب میں موجود تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے احاطے کی دیوار پر چڑھ کر باہر کی جانب کود گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میں اگر پکڑا گیا تو میری تمام شہرت خاک میں مل جائے گی..... لیکن یہ میری خوش قسمتی

رہی کہ کسی نے مجھے دیوار پھلانگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ باہر دروازے پر دودھ کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ابھی دودھ والا نہیں آیا۔ لیکن وہ کسی بھی وقت دودھ کی نئی بوتل رکھنے آسکتا تھا۔

میں تیز تیز قدموں سے اپنی وین کی جانب چل دیا۔

راستے میں کہیں پر بھی کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد میری وین سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ کیمرا میں نے اپنی وین کے دستانوں کے کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا تھا۔

لیکن ابھی میں ایلکٹن ایونیو سے زیادہ دور بھی نہیں پہنچا تھا کہ لینڈ روور میں سوار دو پولیس افسران نے مجھے وین روکنے کا اشارہ کیا..... وہ اچانک ہی ایک بغلی سڑک سے نکل کر سامنے آگئے تھے۔

میں نے وین روک دی۔ ان میں سے ایک پولیس افسر گاڑی سے اتر کر وین کے نزدیک آگیا اور مجھے باہر آنے کو کہا۔ اس نے وین کی تلاشی لینا شروع کردی۔ دوسرا افسر لینڈ روور ہی میں بیٹھا رہا چونکہ میرے پاس یا وین میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو میرے لیے کسی مشکل کا باعث بنتی اس لیے میں اطمینان سے ایک جناب کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو میں بھی کا پسینے میں شرابور ہوگیا ہوتا۔

وہ پولیس افسر جب وین کی تلاشی لے کر پلٹا تو اس کے ہاتھ میں وہ کیمرا تھا جو مجھے چلتے وقت انجل نے دیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس پولیس افسر نے میری جانب کیمرا لہراتے ہوئے پوچھا۔

''میں ایک حسین بلبل سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ اس نے میری ایک تصور اتاری ہے۔'' میں نے کیمرے کی موجودگی کی وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اور تصویر اتارنے کے بعد اس نے کیمرا تمہیں دے دیا؟''

''ہاں..... یہ ہماری ملاقات کا یادگار ایک تحفہ سمجھو.....'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

لیکن اس پولیس افسر پر میری مسکراہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا..... وہ سنجیدہ اور محتاط نگاہوں سے کیمرے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

''اس میں ابھی تک گیارہ تصویریں کھینچی جاچکی ہیں۔ کیا وہ سب کی سب تصویریں تمہاری ہیں؟''

''نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر باقی دس تصویریں کیسی ہیں؟

اسی اثنا میں لینڈ روور میں بیٹھا ہوا دوسرا پولیس افسر نیچے اتر آیا۔ وہ ٹہلتے ہوئے میرے نزدیک آگیا اور طنزیہ لہجے میں بولا ''ایونگ، جوزف!''

لہٰذا جب وہ مجھے اپنے ہمراہ پولیس اسٹیشن لے گئے تو انہوں نے مجھے لاک اپ میں بند کردیا تو مجھے قطعی کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

☆☆☆

بالآخر انہوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ البتہ کیمرا انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ یہ میرے لیے کوئی بری بات نہیں تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی تصویر اور ریکارڈ پولیس کے پاس موجود ہو تو وہ اس سے شاہانہ سلوک روا رکھنے سے رہے۔ مجھے تو اطمینان یہ تھا کہ کیمرے کے بدلے جاں بخشی تو ہوئی۔ یوں بھی کیمرا میرا نہیں تھا۔ اس لیے اس کے جانے کا افسوس بھی نہیں تھا۔

میں اپنی پرانی وین میں گھر کی سمت چل پڑا۔ جب میں گھر میں داخل ہوا اس وقت کیرن دفتر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ''تم نے دیر سے گھر آنے کو کہا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ صبح کو لوٹو گے!''

اس کے تیور اتنے خطرناک تھے کہ میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی یہ ایک طویل داستان تھی۔ اگر میں اسے سب کچھ سنا دیتا تب بھی وہ کہانی کے اس حصے پر بالکل یقین نہ کرتی جس میں سنہرے بالوں والی دلکش لڑکی کا تذکرہ تھا۔

سو میں نے صرف معافی مانگنے پر اکتفا کیا اور وعدہ کیا کہ اسے نیا کوٹ خرید کر دوں گا، تب کہیں جا کر کیرن کا موڈ درست ہوا۔ اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے کام پر چلی گئی۔

مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور سیدھا بستر پر دراز ہوگیا۔

میں اس وقت خواب میں سنہرے بالوں والی لڑکی کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا تھا جب بیرونی دروازے پر ہتھوڑے سے بجنے لگے لگتا تھا جیسے دستک دینے والا دروازہ توڑ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دروازے پر کون ہوسکتا ہے۔

دستک کے انداز سے تو گمان ہو رہا تھا کہ یہ اس سنہرے بالوں والی لڑکی کا شکی مزاج شوہر ہوسکتا ہے جس نے اندھیرے میں مجھے اپنے مکان کی دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک چلا آیا ہو۔ لیکن پھر

دھیان آیا کہ مجھے تو راستے میں پولیس نے دھر لیا تھا۔ تب یہ خیال آیا کہ شاید وہ بک میکر کے بدمعاش ہوں گے جو قرضہ وصول کرنے کے لیے صبح سویرے آدھمکے ہیں۔

اس دوران دروازے پر زوردار دستکوں کا اِک سلسلہ جاری رہا۔

میں نے اٹھ کر اپنے جسم پر ڈریسنگ گاؤن لپیٹا اور ڈگمگاتے قدموں سے بیرونی دروازے کے سمت چل پڑا۔

دروازہ کھولنے پر جن افراد پر نگاہ پڑی، میں ان کے لیے خوش اخلاق، شائستہ اور مہذب کے الفاظ ہی استعمال کرسکتا ہوں۔ سرد مہری ان کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ میں نے ابھی سوچا بھی نہ تھا کہ انہیں مدعو کروں..... کہ وہ بن بلائے مہمانوں کے مانند دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔

ان کے ڈیل ڈول اور ارادے دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ یقیناً ان کا تعلق گسٹاپو سے ہے۔ یا پھر یہ لوگ کرائے کے قاتل ہیں۔

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ان میں سب سے دراز قد والے نے میرے خیالات پڑھ لیے۔

وہ اپنی کرخت آواز میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتے ہوئے بولا ''اسپیشل برانچ''

میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ان کا تعلق ایسے ہی ادارے سے نکلا جن کے نزدیک قتل و غارت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اُف خدایا۔ اب کیا ہوگا؟

''ہم اس فلم کے سلسلے میں آئے ہیں جو تمہارے کیمرے میں موجود تھی۔ اور بہ قول تمہارے تمہیں وہ کیمرا کسی بلبل نے تحفے میں دیا تھا! اس گرل فرینڈ کا نام؟'' اس دراز قد والے نے پوچھا۔

اس کے باقی ساتھی مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

''وہ.....'' میں قدرے ہچکچایا۔

''رائٹ.....'' اس شخص نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ پھر مجھے میرے حقوق سناتے ہوئے اس بات کی نشان دہی کی کہ میں جو کچھ کہوں گا! وہ میرے خلاف استعمال بھی ہوسکتا ہے۔

اسپیشل برانچ کے ایجنٹوں کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں قطعی نہیں آرہا تھا، میرا ذہن الجھن میں پڑ گیا۔

اس دراز قد نے ایک بار پھر میرے خیالات بھانپ لیے۔ یا پھر شاید اسے میری حالت پر رحم آگیا تھا۔ وہ بولا ''ہم تمہیں جاسوسی کے جرم میں گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

یہ خبر میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی!

پھر میں نے سوچا کہ جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہونے کے مقابلے میں ڈکیتی کی کوشش میں گرفتار ہونا اور مقدمہ جھیلنا زیادہ محفوظ اور سہل ثابت ہوسکتا ہے۔ سو میں نے مختصراً انہیں تمام روداد سنا ڈالی۔

لیکن ان لوگوں کو میری کہانی تو کیا اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آیا۔

وہی دراز قد والا بولا ''اور تمہارے رابطے کا نام اور پتا.....؟''

''نہ تو کوئی جاسوس ہوں اور نہ ہی میرا اس لڑکی سے کسی قسم کا رابطہ ہے۔'' میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اس لڑکی کا نام..... جین..... جل..... اے انجل ہے اور اس کا مکان کونے پر واقع ہے۔ اس سڑک کا نام.....''

میں بھول رہا تھا۔ لعنت ہو، ٹیڈ نے میری یادداشت کے بارے میں سچ ہی کہا تھا۔

لیکن چند لمحوں تک ذہن پر زور دینے کے بعد مجھے اس جگہ کا نام یاد آگیا ''..... وہ ایلکٹن ایونیو کا علاقہ ہے۔ اتنا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے..... اور ہاں..... کیا نام ہے اس درخت کا..... وہی کم بخت جو بیرونی باغ میں ہے.....؟ صنوبر؟ ہاں، یہی نام ہے، صنوبر!''

لیکن وہ تو میری ایک سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پھر بھی میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ میرے ساتھ چل کر کم از کم اس مکان کو تو دیکھ لیں۔

کچھ دیر بعد میں ان کی کار میں سوار ایلکٹن ایونیو کی جانب جا رہا تھا۔ وہ دراز قامت اور اس کا ایک ساتھی میرے ہمراہ عقبی نشست پر براجمان تھے۔ مجھے انہوں نے درمیان میں بٹھایا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

ہم نے کونے کا وہ مکان تلاش کرلیا جس کے بیرونی باغ میں صنوبر کا بڑا سا درخت دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ ہم کار سے اتر کر صنوبر کے درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے اس مکان کے داخلی دروازے تک جا پہنچے۔ ان میں سے ایک شخص نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

سریلی جھنکار دور سے آتی سنائی دی۔

پھر جس لڑکی نے دروازہ کھولا وہ خود بھی کسی سریلی جھنکار سے کم نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں اور بالوں..... دونوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ اس کا قد قدرے چھوٹا تھا..... البتہ لڑکی قابلِ دید تھی۔ لیکن یہ وہ لڑکی ہرگز نہیں تھی جس سے گزشتہ

شب یہاں ملاقات ہوئی تھی اور جس نے میرا طویل انٹرویو لیا تھا۔

سب سے پہلے اسپیشل برانچ کے ایجنٹوں کے لیڈر نے اپنا تعارف کرایا۔ اخلاقاً لڑکی کو بھی اپنا تعارف کرانا پڑا۔ پھر قدرے تذبذب کے بعد لڑکی نے ہمیں اندر مدعو کرلیا۔ وہ ہمیں سیدھا لائبریری میں لے گئی۔

''کیا تم نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟'' دراز قد نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے میری طرف ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے انکار میں سرہلا دیا اور بولی..... ''نہیں.....''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' میں لڑکی کی تائید کرتے ہوئے درمیان میں بول پڑا ''یہ وہ لڑکی ہرگز نہیں جو گزشتہ شب یہاں موجود تھی۔''

میری اس بات پر لڑکی کے چہرے پر چھائے ناگواری کے تاثرات مزید گہرے ہوگئے۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولی ''مجھے پیرس سے آئے ہوئے ابھی صرف ایک گھنٹا ہوا ہے..... اور میں یہ بات ثابت کرسکتی ہوں۔''

''وہ کوئی اور لڑکی تھی۔'' میں نے دراز قامت ایجنٹ کو یقین دلانا چاہا۔

وہ جواباً مجھے گھورتے ہوئے بولا ''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہی وہ مکان ہے جہاں تم نے رات گزاری تھی؟''

''یقیناً..... میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں..... میں نچلی منزل کے باتھ روم کی تفصیل بیان کرسکتا ہوں..... اس میں نیلے رنگ کا دھاری دار وال پیپر لگا ہوا ہے۔ کھڑکی کی چٹخنی ایسی ہے کہ کوئی بچہ بھی کھول لے۔''

دراز قد کے کہنے پر وہ لڑکی ہمیں مکان کے اس حصے میں لے گئی جدھر وہ باتھ روم بنا ہوا تھا جس کی کھڑکی کے راستے میں گزشتہ شب اس مکان میں داخل ہوا تھا۔

..... اور باتھ روم میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

باتھ روم میں جو وال پیپر چسپاں تھا اس میں پیلے اور ہرے رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے، باتھ روم کی کھڑکی میں دو نہایت مضبوط قسم کے تالے دکھائی دے رہے تھے!

مجھے یاد نہیں کہ اس مکان سے اسپیشل برانچ کے ٹھکانے تک کا سفر کس طرح طے ہوا تھا۔ مجھ پر تو تمام راستے سکتے کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔

پھر مجھ سے مسلسل چوبیس گھنٹے تک پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ اس دوران مجھے بھانت بھانت کے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک مرتبہ مجھے کچھ دیر کے لیے بھاری جبڑے والے ایک خوف ناک شخص کے پاس لے جایا گیا جسے دیکھ کر ذہن میں بل ڈاگ کا تصور ابھرتا تھا۔ اس شخص نے مجھے حوالات میں بند کرنے کا حکم دے دیا۔

کوٹھری میں، میں یہی سوچتا رہا کہ غالباً مجھ سے مکان کی نشان دہی میں غلطی ہوگئی تھی، لیکن اب تو کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر یاد آیا کہ ٹیڈ کو صحیح مکان کا یقیناً علم ہوگا۔ وہ اس مکان تک راہ نمائی کرسکتا ہے۔

لیکن الجھن یہ تھی کہ ٹیڈ کو اس معاملے میں ملوث کیسے کیا جائے؟ پھر خیال آیا کہ کیرن بھی ہوسکتی ہے۔ میں ان میں سے کسی کے ذریعے یہ پیغام ٹیڈ تک پہنچادوں گا۔

اس تصور سے میری ڈھارس سی بندھ گئی۔

لیکن مجھ سے ملاقات کرنے صرف ایک شخص آیا۔ اور وہ شخص وہ وکیل تھا جسے میرے مقدمے کی پیروی کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ یہ ملاقات زیادہ طویل نہیں تھی۔ اور نہ ہی ہمیں تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع دیا گیا۔

میں نے اپنے وکیل سے درخواست کی کہ وہ میری خاطر اس علاقے میں کونے کے مکانات کے بارے میں مکمل چھان بین کرے کہ ان میں سے کس مکان میں جین یا اینجل نامی لڑکی رہتی ہے۔

لیکن وکیل نے اس سلسلے میں میری کوئی بھی مدد کرنے سے صاف انکار کردیا۔ جب میں نے وجہ جاننا چاہی تو اس نے بتایا کہ اسے جاسوسوں سے سخت نفرت ہے۔ اور خاص طور پر وہ جاسوس جو اپنے ہی ملک سے غداری کے مرتکب ہورہے ہوں! اسے یہ یقین تھا کہ میں نے جاسوسی کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میرے پاس سے برآمد ہونے والے کیمرے کی ریل میں جو تصویریں کھینچی گئی تھیں ان میں صرف ایک تصویر میری تھی جس میں، میں اس انداز سے کیمرے کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے مجھے عین موقع پر پکڑ لیا گیا ہو۔ باقی دس تصویریں نہایت شان دار تھیں!

اور یہ دس کی دس تصویریں برطانیہ کے جدید ترین اور خفیہ ہتھیار کی تھیں جو نہایت رازدارانہ طریقے سے تیار کیا گیا تھا! آخر یہ تصویریں میری کیمرے میں کیوں کر آگئی تھیں؟

وکیل کا یہ انکشاف میرے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم ثابت نہیں ہوا۔

میں گزشتہ بارہ برس سے چوریاں کرتا آرہا تھا..... بلکہ

یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کامیابی سے چوریاں کرتا چلا آرہا تھا۔ اس پیشے میں رہ کر ایک آدھ بار قسمت کا یاور نہ ہونا کوئی ایسی پریشانی کن بات نہیں تھی۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا!

اس الزام پر میرے جذبات کو خاصی ٹھیس پہنچی تھی..... اس ملک کے ہر باشندے کے مانند میں بھی ایک محب وطن اور وفادار شہری تھا۔ میں نے مادرِ وطن سے غداری کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا اور اب مجھ پر اتنا بڑا سنگین الزام عائد کرتے ہوئے مجھے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔

موجودہ حالات کی روشنی میں مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ کال کوٹھری میرا مقدر تھی۔ میں سوچنے لگا' ہوسکتا ہے کہ برطانیہ کے کسی جاسوس کی رہائی کے عوض یہ لوگ مجھے روس کے حوالے کردیں..... اور پھر بقیہ تمام زندگی سائبیریا کی دائمی سردیاں جھیلنا پڑیں!

☆☆☆

وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی تھی۔

مجھ سے ملاقات کے لیے کوئی نہیں آیا..... حتیٰ کہ کیرن نے بھی مجھ ''غدار'' سے ملنا گوارا نہیں کیا حالانکہ میں نے اسے دو خط بھی لکھے جن میں ملاقات کرنے کی تاکید کی تھی۔

اور تو اور وہ وکیل جسے میری پیروی کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ اس نے بھی پلٹ کر کوئی خبر نہیں لی اور نہ ہی اسپیشل برانچ کے ان کمینوں میں سے کوئی ملنے کے لیے آیا جنہوں نے مجھے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔

میں دن رات کال کوٹھری میں بند اپنی قسمت کو روتا رہتا تھا..... اور تب وہ معجزہ رونما ہوا جس کی کم از کم مجھے کوئی توقع نہیں تھی.....!

ہوا یوں کہ کسی نے غلطی سے مجھے ڈاک کے ذریعے اخبار ''سنڈے ورلڈ'' کی کاپی بھیج دی..... اور اس اخبار میں سنہرے بالوں والی پستہ قد اینجل کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی شہ سرخیوں کے ساتھ ایک آرٹیکل بھی تھا جو اس لڑکی نے تحریر کیا تھا۔ اخبار کے مطابق وہ فری لانس رائٹر اخبارات میں مختلف سیریز کے آرٹیکل تحریر کرچکی تھی۔

کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اخبار میں شائع ہونے والا وہ آرٹیکل کس شخصیت کے بارے میں تھا.....؟

اس آرٹیکل میں کسی کا نام تو موجود تھا لیکن میری اوسط درجے کی صلاحیتوں کے ضائع ہونے سے متعلق چند بے حد کھری کھری باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ آرٹیکل کا بیشتر حصہ اس انٹرویو پر مبنی تھا جو میں نے اس رات اس فری لانسر صحافی کو دیا تھا جب میں ٹیڈ کے مشورے پر اس کونے کے مکان میں چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا اور اس لڑکی نے وہاں اپنی موجودگی سے نہ صرف مجھے چونکا دیا تھا بلکہ اس موقع کی تصویر اتار کر مجھے انٹرویو دینے پر بھی مجبور کردیا تھا۔

آرٹیکل پڑھتے ہی میں نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔ میرا مطالبہ تھا کہ میرے وکیل اور اسپیشل برانچ کے ایجنٹوں کو فوراً طلب کیا جائے اور مجھے ان سے فوری ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے۔

ان لوگوں نے میری بات پوری توجہ سے سنی۔ پھر اینجل نامی اس صحافی لڑکی سے رابطہ قائم کیا جس نے انہیں بتایا کہ اس کیمرے میں اس نے ویمبلڈن ٹینس ٹورنامنٹ کے فائنل کی تصویریں اتاری تھیں۔ ایک تصویر بچ رہی تھی سو اس نے میری تصویر کھینچ لی تھی۔ لڑکی کے بیان کی تصدیق کے لیے جب انہوں نے کورٹ میں اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے لوگوں کو ڈھونڈا اور ان سے بیانات لیے تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ لڑکی فائنل کے موقع پر حقیقت میں کورٹ میں موجود تھی اور میچ کے دوران تصویریں بھی اتار رہی تھی..... پھر انہوں نے لڑکی کے کیمرے کی وہ بیمہ پالیسی نکلوائی جس میں لڑکی کے ذاتی کیمرے کا نمبر درج تھا..... اس نمبر کو انہوں نے میرے پاس سے برآمد ہونے والے کیمرے کے نمبر سے ملایا۔

دونوں نمبر مختلف نکلے!

اس تصدیقی بھاگ دوڑ میں خاصا وقت لگ گیا۔

بالآخر انہیں قائل ہونا پڑا کہ ٹینس فائنل کے دوران ویمبلڈن کے کورٹ میں جوش و خروش کی فضا میں اس لڑکی کا کیمرا کسی دوسرے فرد کے کیمرے سے تبدیل ہوگیا تھا۔

پھر اس کی تصدیق ایک گواہ کے بیان سے ہوگئی جس نے ایک موٹے آدمی کو جو اینجل کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میچ کے اختتام پر غلطی سے اپنے کیمرے کے بجائے اینجل کا کیمرا اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ چوں کہ دونوں کیمرے ایک جیسے تھے اس لیے اسے اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ جس گواہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ وہ اتنی دور تھا کہ اس موٹے شخص کو اس کی غلطی کی جانب متوجہ نہیں کرسکا تھا۔

اسپیشل برانچ کے ایجنٹوں اور پولیس نے جب اینجل کی رائے معلوم کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ مجھ پر کسی قسم کے الزامات عائد نہیں کرنا چاہتی..... پھر جب پولیس کو یہ پتا چلا کہ اس لڑکی نے کس طرح دانہ ڈال کر مجھے اپنے جال میں

پھنسایا تھا تو انہوں نے بھی میری معصومیت کا اعتراف کرلیا۔
یوں مجھے رہا کردیا گیا۔ مجھ پر کسی قسم کا کوئی الزام باقی نہیں رہا تھا۔

ادھر اسپیشل برانچ کے ایجنٹوں نے میری بے گناہی ثابت ہونے پر اس طرح بے رخی برتی جیسے ان کے نزدیک میری قید اور رہائی کوئی معنی ہی نہیں رکھتے تھے! حتیٰ کہ انہوں نے مجھ سے معذرت کرنا بھی گوارا نہیں کی!

مجھے ان سنگ دل لوگوں کے رویے پر بے حد طیش آیا لیکن دوسری جانب اپنی آزادی اور رہائی کی بے پناہ خوشی تھی۔ یہ خوشی میرے تمام جذبات پر غالب آگئی۔

پھر جب میں ایک آزاد اور محبِ وطن شہری کی حیثیت سے گھر واپس پہنچا تو کیرن نے آنسوؤں سے میرا استقبال کیا۔ میں خود بھی رو پڑا تھا۔

لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے!

☆☆☆

اگلے جمعے کی شب حسبِ معمول ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر میں نے ''دی ڈاگ اینڈ ڈک'' نامی بار کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا میں حسبِ عادت سیدھا کاؤنٹر پر چلا گیا۔

''ایوننگ، میری'' میں نے بار کی خادمہ سے کہا جو ہمیشہ کی طرح کاؤنٹر پر کہنیاں لٹکائے بیٹھی تھی۔

''ایوننگ، جوزف.....'' وہ مسکرادی'' اتنے دن کہاں رہے؟ کیا کہیں گئے ہوئے تھے؟''

''ہاں، ذرا مختصری تعطیلات منانے چلا گیا تھا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''وہی مخصوص مشروب؟''

''پلیز'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ پمپ کی جانب پلٹ گئی۔ چند لمحوں بعد نصف شراب اور نصف جھاگ سے لبریز جام میرے سامنے تھا۔

''اور تم کیا پسند کروگی؟'' میں نے پوچھا۔

''کمپاری!'' وہ مسکراتے ہوئے بولی ''شکریہ۔ ہاں، یاد آیا! وہ ٹیڈ تمہارے بارے میں کئی مرتبہ پوچھ چکا ہے۔''

''اوہ!'' میں چونک پڑا۔

اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں واپس آکر سخت غلطی کی ہے۔ اس واقعے کے بعد شراب نوشی کے لیے مجھے کوئی نیا بار تلاش کرنا چاہیے تھا۔ قسمت ایک بار یاوری کرتی ہے، بار بار نہیں۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔

اتنے میں مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ ٹیڈ تھا اور اس نے مجھے اپنے مخصوص گوشے کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں، ٹیڈ.....'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب بزنس کی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' میرا لہجہ خشک تھا۔

''سوری جوزف!'' اس نے خلوص سے میرا شانہ دباتے ہوئے کہا۔ لہجے میں معذرت شامل تھی۔ ''میں کوئی بزنس کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو یہ سوچ کر تمہارے پاس آیا تھا کہ شاید تم اس موٹے آدمی کے بارے میں جاننا چاہتے ہوگے..... خیر، تمہاری مرضی.....'' اس نے یہ کہتے ہوئے شانے اچکا دیے اور اپنی میز کی جانب پلٹ گیا۔

قدرے تذبذب کے بعد میں بھی منہ لٹکائے اپنا گلاس لیے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ نیم تاریک گوشے میں اپنی مخصوص میز پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کے سامنے کی کرسی سنبھال لی۔

''تم کس موٹے آدمی بات کررہے تھے؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ٹیڈ نے جواب دینے سے پہلے بیئر کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا..... ''وہی موٹا آدمی جس کی جگہ تم سرکاری مہمان خانے کی سیر کرکے آئے ہو..... وہی جو ویمبلڈن ٹینس فائنل کے موقع پر اپنے کیمرے کے بجائے غلطی سے اس لڑکی کا کیمرا اٹھا کر لے گیا تھا!''

''تو اس موٹے آدمی کو کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا! اس نے خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردیا ہے اور آج کل اسپیشل برانچ کی تحویل میں ہے۔'' ٹیڈ نے جواب دیا اور بیئر کا گلاس پھر ہونٹوں سے لگالیا۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ٹیڈ نے تیکھی نظروں سے مجھے گھورا تو میں نے لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے کہ اس نے خود کو قانون کے حوالے کیوں کیا؟''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ ان غیر ملکی مخبروں کی مسلسل جرح سے تنگ آگیا ہے جو اس سے بار بار یہی سوال کرتے تھے کہ آیا وہ جدید ترین خفیہ ہتھیار ٹینس کے ریکٹ میں پوشیدہ ہے یا اس کی گیند میں؟''

⌘⌘

میں نے گزشتہ ہفتے کے اخبار کا تراشہ نکالا اور اسے دیکھتے ہوئے ریگن سے کہا۔ ''ریگن! اس مرتبہ ہم ایک عجیب و غریب چیز کو اغوا کرنے جارہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میرے چور دوست نے حیرت سے سوال کیا۔

''اس بار ہم ٹماٹر کے بیجوں کو اغوا کریں گے..... وہ بھی پورے پانچ سو پاؤنڈز بیج.....''

''ٹماٹر کے بیجوں کا اغوا!'' ریگن ابھی تک حیران تھا۔

''ہاں یار! ہماری کاروبار کی صورتِ حال بڑی عجیب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کبھی ہزاروں ڈالر ہاتھ آجاتے ہیں تو کبھی ایک ایک سینٹ کے محتاج ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا جو بھی ملے پکڑ لو۔ تمہیں یاد ہوگا ایک بار ہم نے آلو اڑائے تھے اور ایک بار لیموں کا ٹرک چوری کیا تھا۔''

''ہاں..... میں یہ واقعہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔'' ریگن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس میں ڈر بھی بہت لگا تھا اور مزہ بھی بہت آیا تھا۔''

پھر اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم نے ٹماٹر کے بیجوں کے اغوا کی بات کی ہے..... یہ بات ذرا الجھا رہی ہے۔''

''بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اخباری تراشے پر نظر

آسان کام

رضوانہ منظر

غالب نے کہا تھا کہ ۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہوگئیں
مگر کچھ لوگ ایسی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں کہ وہ مشکلات کو اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتے ..... اپنے کاموں میں بھی وہ آسانیوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ دو ایسے ہی دوستوں کا قصہ جنہیں ایک سہل ٹاسک مل گیا تھا۔

ٹماٹر کے بیجوں کے اغوا سے شروع ہونے والی ایک پرمزاح تحریر

دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے..... جے سی سویڈن سیڈز کمپنی کا نام سنا ہے؟''

''ہاں سنا ہے۔'' ریگن نے جواب دیا۔

''اس کمپنی کے تجرباتی فارم پر پیوند کاری کے ذریعے ٹماٹر کی ایک بہت اچھی قسم تیار کی گئی ہے۔ یہ ٹماٹر سائز میں بھی بڑا ہے اور خوب سرخ ہونے کے ساتھ میٹھا بھی ہے۔ اس کی خوشبو بڑی اچھی ہے۔ ٹماٹر کی اس انوکھی قسم کو ''سرخ شیر دل'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ٹماٹر نہ تو آسانی سے پھٹتا ہے اور نہ اس کا چھلکا زیادہ باریک ہے۔ جے سی سویڈن سیڈز کمپنی کا دعویٰ ہے کہ اس کے تیار کردہ ٹماٹر کا پوری دنیا میں ثانی نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے ریگن کی طرف دیکھا۔ ابھی تک وہ میری باتوں سے ذرا بھی متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

''مسٹر سویڈن نے بتایا ہے کہ انہوں نے ''سرخ شیر دل'' پورے دس سالہ تجربات کے بعد تیار کیا ہے۔'' میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''مگر اس سال وہ مارکیٹ میں سرخ شیر دل کے صرف پانچ سو پاؤنڈ بیج فروخت کے لیے پیش کریں گے۔ اس بیج کو جے سی سویڈن کمپنی کی موسم بہار کی کیٹلاگ میں شامل کر لیا جائے گا۔ ان بیجوں کی قیمت پچھتر سینٹ فی پیکٹ مقرر کی گئی ہے۔ گویا نصف اونس کے بیج کے لیے پانچ ڈالر ادا کرنے ہوں گے اور ایک اونس کے لیے دس ڈالر!''

''اچھا!'' ریگن نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''مگر میرے خیال میں تو یہ قیمت خاصی زیادہ ہے۔''

''ہاں..... جے سی سویڈن مارکیٹ میں پانچ سو پاؤنڈ سرخ شیر دل کے بیج پیش کرے گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس سارے بیج کی قیمت اسی ہزار ڈالر بنتی ہے۔''

''ہمیں کیا کرنا ہے؟'' ریگن نے سوال کیا۔ میں اس کی بے صبری کو سمجھ گیا۔

''ہم تمام بیجوں کو اغوا کر لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اور پھر مسٹر سویڈن سے دس ہزار ڈالر طلب کریں گے۔ یہ زرِ تاوان ہوگا۔ وہ دس ہزار ڈالر ہمیں دے دیں اور اپنے اسی ہزار ڈالر کے بیج لے جائیں۔''

''کیا مسٹر سویڈن ہمارا مطالبہ مان لیں گے؟'' ریگن نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''بالکل مان جائیں گے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''یہ ان کی دس سال کی محنت کا پھل ہے اور دنیا بھر میں فی الوقت سرخ شیر دل کی واحد سپلائی ہے۔''

''یار! اگر یہ بیج اتنے ہی قیمتی ہیں تو ہم... انہیں چوری کیوں نہ کر لیں.....؟ اس ساری مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ریگن نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اصل مسئلہ ان بیجوں کو نقدی میں منتقل کرنے کا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم سرخ شیر دل کو ایک ساتھ سپلائی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے اس کے پیکٹ بیچنے شروع کیے تو کھا کما لیا..... جلد ہی پکڑے جائیں گے۔ ہول سیلرز کے ساتھ ریٹیلرز بھی ہوشیار ہو جائیں گے۔ نہیں بھئی..... ہم انہیں چوری کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ انہیں اغوا کرنا ہی ٹھیک رہے گا۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔''

''مگر ان بیجوں کی سخت حفاظت ہو رہی ہوگی۔ ہے نا؟'' ریگن نے سوال کیا۔

''بیجوں کی حفاظت!'' میں نے ریگن کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس دنیا میں کون بے وقوف ہوگا جو ٹماٹر کے بیجوں کی حفاظت کرے گا؟''

☆☆☆

میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ ریگن میرے برابر میں بیٹھا تھا۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بلند پہاڑی پر پہنچ گئے۔ وہاں میں نے کار روک دی اور ریگن سے کہا۔ ''وہ دیکھو اس پہاڑی کے دامن میں جو عمارت نظر آ رہی ہے..... یہ جے سی سویڈن سیڈز کمپنی کی ہے۔''

ہم جہاں رکے ہوئے تھے اس سے ایک سڑک ہائی وے نمبر 7 کی طرف جا رہی تھی اور دوسری شاہراہ نمبر 12 کی طرف۔ میں نے اپنی کار سڑک کے آغاز پر ہی روک دی تھی۔ اسی مقام سے وہ دونوں سڑکیں الگ الگ ہو رہی تھیں۔ دوسرے سیڈ ہاؤسز کی طرح جے سی سویڈن سیڈز کمپنی بھی دیہی علاقے میں واقع تھی۔ ریگن بڑے غور سے اس عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے پورا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''اس عمارت کے پارکنگ لاٹ میں کوئی بیس گاڑیاں موجود ہیں۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سب اس کمپنی میں کام کرنے والے ملازمین کی کاریں ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو یہاں اس وقت آئیں گے جب یہ کمپنی بند ہوگی۔ صرف چوکیدار ہوگا۔ میں کئی روز سے یہاں آ رہا ہوں اور اس جگہ کا جائزہ لے رہا ہوں۔ رات کو میں نے یہاں صرف ایک پرانی سی سیڈان کھڑی دیکھی ہے جو چوکیدار کی ہے۔''

''ہمیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس کمپنی میں سرخ شیر دل کے بیج ابھی تک موجود ہیں؟'' ریگن نے پوچھا۔ ''یہ بھی تو ہو

سکتا ہے کہ وہ سب فروخت ہو چکے ہوں؟''

''کل میں اس کمپنی کے دفتر گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں نے کمپنی کی موسم بہار کی کیٹلاگ طلب کی تھی۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوا کہ ابھی تک نئی فہرست اس کیٹلاگ میں شامل نہیں کی گئی لہٰذا مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ ابھی سرخ شیر دل کی سپلائی نہیں آئی ہے ورنہ اس کا نام فہرست میں شامل ہو چکا ہوتا۔ پھر میں نے آفس میں کام کرنے والی ایک لڑکی سے سرخ شیر دل کے بیجوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اپنے دعوے کے مطابق میں وہ بیج خریدنا چاہ رہا تھا۔ تب اس سیلز گرلز نے مجھے بتایا کہ سرخ شیر دل کے بیج آ تو گئے ہیں مگر ابھی بڑے تھیلوں میں ہیں، ان کے پیکٹ تیار نہیں کیے گئے۔ جب پیکٹ تیار ہو جائیں تبھی ان کی فروخت شروع ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرخ شیر دل کے بیج ابھی تک کمپنی میں ہی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں کیسے اڑایا جائے؟'' ریگن نے سوال کیا۔

''آج رات ہم آپریشن کریں گے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جے سی سویڈن سیڈز کمپنی کے عقبی حصے سے عمارت کے اندر داخل ہوں گے۔ سب سے پہلے ہم وہاں موجود چوکیدار کے ہاتھ پیر باندھیں گے۔ اس کے بعد سرخ شیر دل کے بیجوں کی بوریاں اپنی گاڑی میں پہنچائیں گے۔ جب ہم کامیابی کے ساتھ واپس پہنچیں گے تو مسٹر جے سی سویڈن سے فون پر رابطہ کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ وہ ہمیں دس ہزار ڈالر ادا کر دیں..... سیدھی سی بات ہے۔''

ریگن سر ہلا کر رہ گیا۔

دوسری رات، لگ بھگ ایک بجے میں اور ریگن اپنی گاڑی میں جے سی سویڈن سیڈز کمپنی پہنچے۔ اس وقت پارکنگ لاٹ میں صرف چوکیدار کی گاڑی کھڑی تھی۔ ریگن نے گودام کے عقبی دروازے پر کام شروع کر دیا۔ چند منٹوں بعد ہی ہم دونوں اندر پہنچ چکے تھے۔ وہاں ہر طرف بوریوں اور بیگز کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ چھت تک بوریاں چنی ہوئی تھیں۔

''کیا یہ سب سرخ شیر دل کے بیجوں کی بوریاں ہیں؟'' ریگن نے سیٹی بجاتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں..... مجھے تو یہ مٹر، دالوں اور جوار کے بیجوں کی بوریاں لگ رہی ہیں۔'' میں نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خاصا بڑا گودام تھا اس میں کہیں کہیں کم طاقت کے بلب روشن تھے جن کی وجہ سے ہلکا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اور ریگن محتاط قدموں سے آگے بڑھے۔ آگے ایک راہداری کے سرے پر ایک خستہ سی میز کے سامنے ٹوٹی پھوٹی سی کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔

وہ سینڈوچ کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر بہت سی موٹی موٹی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

ریگن نے آگے بڑھتے ہی اپنی جیب سے پستول نکال کر اس نوجوان پر تان لیا اور آہستگی سے کہا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ.....''

وہ نوجوان اس کمپنی میں رات کا چوکیدار تھا۔ اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنا سینڈوچ نیچے رکھ دیا اور دونوں ہاتھ بلند کر دیے پھر وہ بولا۔ ''تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو کیونکہ کمپنی میں آنے والا سارا کیش روز کے روز بینک میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ سیف خالی ہے خود دیکھ لو۔''

''ہمیں تمہارے سیف سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں نوجوان چوکیدار سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ وہ ٹماٹر کے..... سرخ شیر دل کے بیج کہاں رکھے ہیں؟''

یہ سن کر نوجوان حیران رہ گیا اور بولا ''وہ کیوں؟''

''سوال کرنا تمہارا حق نہیں ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ حق صرف ہمارا ہے..... ہم دونوں کا۔''

اس نے کندھے جھٹکے اور ہمیں اندر ایک بڑے ہال میں لے گیا۔ اس کے ایک کونے میں چھوٹے بڑے بیگ اور بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ ہیں ٹماٹر کے بیج!'' نوجوان چوکیدار نے کہا۔

''کیا یہی سرخ شیر دل ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ ''صرف یہ معلوم ہے کہ یہ ٹماٹر کے بیج ہیں ویسے تمام بوریوں اور بیگز پر لیبل لگے ہوئے ہیں۔''

صرف پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد میں نے اور ریگن نے سرخ شیر دل کے بیجوں والی بوریاں ڈھونڈ لیں۔ وہ بیج بیس بیس پاؤنڈ والی چھوٹی بوریوں میں تھے۔

''مجھے اجازت دو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو..... اور کیا چاہتے ہو؟'' نوجوان چوکیدار نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بالکل..... تمہیں اجازت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ہم تمہیں خود ہی پوری تفصیل بتائیں گے۔'' تبھی تو ہماری بات آگے مسٹر سویڈن تک پہنچاؤ گے۔ بات یہ ہے کہ ہم سرخ شیر دل والے ٹماٹروں کے ان بیجوں کو اغوا کر کے لے جا رہے

ہیں۔ اپنے مسٹر سوئیڈن سے کہہ دینا کہ اگر انہوں نے ہمیں دس ہزار ڈالر نقد ادا کر دیئے تو ہم سرخ شیر دل کو رہا کر دیں گے ورنہ.....''

''کیا؟'' نوجوان نے حیرت سے کہا۔ ''بچوں کا اغوا! فرض کرو مسٹر سوئیڈن تمہارا مطالبہ تسلیم نہیں کرتے اس صورت میں تم کیا کرو گے؟''

''اس صورت میں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس صورت میں ہم ایک چھوٹا طیارہ کرائے پر حاصل کریں گے اور اس کے ذریعے یہ تمام بیج فضا میں بکھیر دیں گے۔ پھر اس ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سرخ شیر دل ٹماٹر ہی اگے ہوئے نظر آئیں گے۔''

ہم دونوں نے اس چوکیدار کی خدمات بھی حاصل کیں اور اس نے ہمارے حکم پر سرخ شیر دل کے بیجوں کی بوریاں ہماری گاڑی میں لدوائیں۔ جب سارا ''مال'' گاڑی میں پہنچ گیا تو ہم اس نوجوان چوکیدار کو واپس اس کی جگہ لے گئے، اسے اس کی کرسی پر بٹھایا اور رسی سے اچھی طرح باندھ بھی دیا۔

اس کے بعد میں نے چوکیدار سے کہا۔ ''ہاں..... ایک بات اور..... سوئیڈن سے کہنا کہ پولیس کو اطلاع دینے کی حماقت ہرگز نہ کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو ہم سارے بیج ٹھکانے لگا دیں گے اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔''

اس کو باندھنے کے بعد میں نے نوجوان کی میز پر رکھی ہوئی کھلی کتاب اٹھائی جو غالباً ٹیکسٹ بک تھی اور کہا۔ ''اوہ..... تو تم پڑھتے بھی ہو؟ شاید یہ ملازمت تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کر رہے ہو۔ واہ..... شاباش! مگر تمہارا مضمون کیا ہے؟ سائنس؟''

''ہاں۔ میرا مضمون نباتیات ہے۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے باغبانی سے بہت دلچسپی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مسٹر سوئیڈن تم سے کیسے رابطہ کریں؟''

''ہم کل دن میں کسی وقت انہیں خود ہی ٹیلی فون کر لیں گے؟'' میں نے کہا۔ ''تمہیں اس کے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''مگر..... وہ..... مسٹر سوئیڈن تو اسپتال میں داخل ہیں۔'' نوجوان نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں..... کیا ہوا ہے انہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کل وہ اپنی کار میں کہیں جا رہے تھے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جس میں ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔''

نوجوان چوکیدار نے افسردگی سے کہا۔

''خیر..... کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنا نام بتاؤ۔''

''میرا نام ولیم ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا فون نمبر؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نمبر بھی بتا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ اب تم ہمارے اور مسٹر سوئیڈن کے درمیان رابطے کا کام انجام دو گے۔ تم اسپتال جا کر ہمارا پیغام مسٹر سوئیڈن کو پہنچا دو۔ بعد میں ہم تم سے تمہارے فون پر بات کر کے معلوم کر لیں گے کہ آگے کی لائن آف ایکشن کیا ہوگی۔''

اس نے سر ہلا کر رضا مندی ظاہر کر دی تو ریگن نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم دونوں ایک موٹیل پہنچے۔ گاڑی وہاں پارک کی اور آرام سے سو گئے۔ صبح ہوتے ہی ہم ویران اور سنسان مقامات پر کسی غیر آباد فارم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم نے متعدد کھلیان دیکھے۔ متعدد خستہ حال فارمز پر نظر دوڑائی اور آخر کار ایک بالکل اجاڑ جگہ پر ہمیں ایک بوسیدہ فارم ہاؤس نظر آیا جس میں کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے اس کا مالک کہاں تھا؟

مر گیا تھا یا زندہ تھا؟ بہر حال وہ جگہ ہمارے لیے بہترین تھی۔ ہم نے گاڑی سے سرخ شیر دل کے بیجوں کی بوریاں اتاریں اور ایک خشک کمرے میں ایک کونے میں رکھوا دیں۔ ان پر اطمینان بھری نظر ڈالنے کے بعد ہم واپس روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

سہ پہر کو میں ایک ٹیلی فون بوتھ میں گیا اور وہاں سے ولیم نامی اس نوجوان چوکیدار کا نمبر ملایا جسے ہم رات کو اس کی کرسی کے ساتھ باندھ آئے تھے۔ ولیم نے پہلی ہی گھنٹی پر کال کا جواب دیا۔

''ولیم! کیا تم نے ہمارا پیغام مسٹر سوئیڈن کو پہنچا دیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں'' ولیم نے مختصر جواب دیا۔

''شاباش! بس، ٹھیک ہے..... کل صبح دس ہزار ڈالر کی رقم ایک سادہ بیگ میں رکھ کر اپنی گاڑی میں مغرب کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر چلے آنا۔ کوئی بیس میل کے سفر کے بعد دائیں طرف ایک ابھری ہوئی جگہ آئے گی۔ وہاں سنگ میل کی تختی بھی لگی ہوئی ہے۔ اس کے قریب اونچی اونچی گھاس میں رقم کا بیگ رکھ کر واپس چلے جانا۔'' میں نے تفصیل سے ہدایات دیں۔

''بہتر جناب!'' دوسری طرف سے ولیم نے کہا۔ ''مگر وہ بیج..... میرا مطلب ہے سرخ شیر دل ٹماٹر کے بیج کب ملیں گے؟''

''وہ میں تمہیں بعد میں فون کر کے بتاؤں گا۔'' میں نے کہا ''اور ہاں..... ایک بات کا خیال رکھنا..... ہم میں سے صرف ایک وہ رقم اٹھانے جائے گا جب کہ دوسرا دور رہ کر اس پر نظر رکھے گا اگر تم نے پولیس کی مدد لی یا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بہت برا ہوگا۔''

''نہیں جناب! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' ولیم نے کہا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح کے وقت اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم نے تاس کیا کہ رقم اٹھانے کون جائے گا۔ میں تاس ہار گیا لہٰذا مجھے اپنی کار میں رقم اٹھانے کے لیے جانا پڑا۔ میں اپنی کار میں سوار ہوا اور اسے آہستہ آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلاتا ہوا مقررہ مقام تک پہنچ گیا۔ گاڑی روک کر میں نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی پھر سامنے دیکھا اس ویران سڑک پر میری کار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

میں نے گاڑی سے اتر کر لمبی گھاس میں نظر دوڑائیں تو رقم کا بیگ نظر آ گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر احتیاطاً کھول کر دیکھا۔ وہ ڈالرز سے بھرا ہوا تھا۔ رقم یقیناً پوری ہوگی۔ رقم کا بیگ گاڑی میں رکھنے کے بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس بار میں پہلے سے بھی زیادہ محتاط تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا نہ کسی نے تعاقب کیا تھا اور نہ ہی مجھ پر کوئی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے راستے میں پڑنے والے ایک موٹیل کی طرف اپنی گاڑی موڑ دی اور وہاں کمرا لے لیا۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے اسی موٹیل سے ولیم کو فون کر کے بتا دیا کہ سرخ شیر دل ٹماٹر کے بیج کہاں ہیں۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

اگر پولیس نے میرا تعاقب کیا تھا اور مجھ پر نظر رکھی تھی تو اسے اب تک میرے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں پکڑا گیا تو پولیس کو اپنے ساتھی ریگن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں اسے ہرگز نہیں پکڑوانا چاہتا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔

وقت گزرتا رہا مگر نہ پولیس آئی اور نہ کوئی اور آیا..... ولیم نے یا مسٹر سوئیڈن کے کسی آدمی نے بھی مجھے اپنا چہرہ نہیں دکھایا۔

دوپہر کو میں اپنے موٹیل سے نکلا، اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ریگن کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اسے اس کے حصے کی رقم دے سکوں۔ ریگن میری کامیاب واپسی پر بے حد خوش ہوا۔ جب میں نے بیگ کھول کر اس میں سے آدھی رقم پورے پانچ ہزار ڈالر ریگن کے حوالے کیے تو وہ رقم ہاتھ میں لے کر پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ وہ بار بار اس گڈی کو چوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''اب میں اپنی پسند کی شاپنگ کروں گا۔ اپنی پسند کا لباس خریدوں گا۔'' یہ کہتے ہی وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سوٹ کیس پیک کرنے شروع کر دیئے۔ یہ کام نہایت آسان ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمدگی سے تکمیل نے مجھے خوش کر دیا تھا۔ میرا اصول تھا کہ جب میں کسی شہر میں کوئی واردات کرتا تھا تو کچھ عرصے کے لیے وہاں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اس بار میں نے مغربی ساحل کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ سال کے اس حصے میں وہاں کا موسم بہترین ہوتا تھا۔

سوٹ کیس پیک کرنے کے بعد میں نے ایک ڈرنک تیار کی اور بے خیالی میں ٹی وی کھول دیا۔ اچانک میں چونک گیا۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر جے سی سوئیڈن نظر آ رہا تھا۔ سیڈز کمپنی کا مالک..... مگر وہ اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہوا تھا جب کہ ولیم نے مجھے بتایا تھا کہ ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں اور وہ اسپتال میں داخل ہے۔ میں نے مسٹر سوئیڈن کو اس لیے پہچانا کہ کمپنی کی کیٹلاگ پر اس کی تصویر میں دیکھ چکا تھا۔ ایک نیوز کاسٹر مسٹر سوئیڈن سے بات چیت کر رہی تھی۔ میری پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ ولیم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔

سوئیڈن کہہ رہا تھا۔ ''وہ چور ہوں، ڈاکو ہوں یا اغوا کرنے والے..... وہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچے گا۔''

نیوز کاسٹر بولی۔ ''کیا تمہیں اغوا شدہ بیج واپس مل گئے؟''

''ہاں۔'' سوئیڈن نے کہا۔ ''ہمارا اغوا شدہ سامان دو الگ الگ جگہوں پر لے جایا گیا تھا۔ ایک حصہ تو ایک اجاڑ اور غیر آباد فارم ہاؤس سے ملا تھا اور دوسرا کامن تالاب کے کنارے ایک درخت کے پاس رکھا ہوا تھا۔ بہر حال دونوں مقامات سے ہم نے اپنا سارا مال اٹھوا لیا۔''

''مسٹر سوئیڈن! تم نے تاوان کی کتنی رقم ادا کی؟'' نیوز کاسٹر نے اگلا سوال کیا۔

''ایک لاکھ ڈالر!'' مسٹر سوئیڈن نے گویا بجھے دل سے

کہا۔

یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ میری نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ میں ایک لاکھ..... ایک لاکھ..... ایک لاکھ..... کی گردان ہو رہی تھی۔ سوئیڈن کہہ رہا تھا۔ ''ویسے مجرم بڑے ہوشیار اور ماہر تھے۔ انہوں نی نہایت عمدہ بیجوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ ہمارا شمالی علاقوں کے مشہور پھول اینودنکا کے بیجوں کا سارا اسٹاک لے گئے تھے جو سات پاؤنڈ کے قریب تھا۔ پھولوں کی یہ قسم معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار ہے اور نہایت نایاب ہے۔ دوسرا جسپو فیلیا تھا۔ یہ بنگلہ دیش میں پیدا ہوتا ہے اور اب آہستہ آہستہ اس کی نسل بھی ختم ہو رہی ہے۔ یہ بھی نادر و نایاب ہے۔ یہ بیج کوئی انیس پاؤنڈ تھے۔ اس کے علاوہ رومانیہ کے ایک پودے کے بیج بھی تھے۔ یہ بھی نہایت اعلیٰ اور کمیاب قسم ہے۔ اس کے بیجوں کا کل وزن تیس پاؤنڈ تھا۔''

''یہ سب ملا کر کتنے بنے؟'' نیوز کاسٹر نے سوال کیا۔

''یہ سب انتیس پاؤنڈ وزن کے بیج تھے۔'' سوئیڈن نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ وہ پانچ سو پاؤنڈ وزن کے سرخ شیر دل ٹماٹر کے بیج بھی لے گئے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ ہانپنے لگا۔

یہ سنتے ہی میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ روؤں یا قہقہے لگاؤں۔ اسی دوران نیوز کاسٹر نے اگلا سوال کیا تو اس کا جواب دیتے ہوئے سوئیڈن نے کہا۔ ''وہ لوگ اچانک ہی میرے گودام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے رات والے چوکیدار کو اسٹور روم میں بند کیا اور تمام نادر و نایاب بیجوں کی بوریاں ساتھ لے گئے۔''

''نہیں..... نہیں..... ہم نے اسے اسٹور روم میں لاک نہیں کیا تھا بلکہ اسے اس کی کرسی کے ساتھ باندھ دیا تھا اور وہ کھلی راہداری میں بیٹھا تھا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی آنکھ سے اس سارے واقعے کو دیکھنے لگا کہ یہ کس طرح ہوا ہوگا؟ ہم نے ولیم کو کرسی سے باندھ دیا تھا۔ اس نے یقیناً اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہوگا اور ہماری روانگی کے بعد حرکت میں آیا ہوگا وہ ویسے بھی علمِ نباتات پڑھ رہا ہے۔ تمام پودوں اور پھولوں کی اعلیٰ نسلوں کے بیجوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا وہ دیگر اعلیٰ اقسام کے پھولوں اور پودوں کے بیج اپنی گاڑی میں رکھ کر کامن تالاب لے گیا ہوگا۔ وہاں بیج چھپا کر واپس آنے کے بعد اس نے مسٹر سوئیڈن کو ہمارا پیغام پہنچایا ہوگا مگر اس میں سرخ شیر دل کے ساتھ بیجوں کے اغوا کا بھی ذکر ہوگا اور تاوان کی رقم اس نے ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ ڈالر کر دی ہوگی جس میں سے ہزار ڈالر اس نے میری فرمائش کے مطابق مقررہ مقام پر دیے اور باقی نوے ہزار ڈالر اپنی محنت کا انعام سمجھ کر پاس رکھ لیے۔

''واہ ولیم واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔'' میں نے دل میں کہا۔ ''کل کے لڑکے نے ہمیں چکر دے دیا۔''

میں نے فوراً ولیم کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔

''ہر چور اپنے چور بھائی کا طرفدار ہوتا ہے مگر معاملے میں تم نے جو دھوکا کیا ہے اس کے بعد تم کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہو۔ میں پولیس کو فون کر رہا ہوں کہ.....''

''یہ حماقت نہ کرنا۔'' ولیم نے کہا۔ ''میں پولیس کو بتا دوں گا کہ تم اس معاملے میں میرے ساتھی تھے۔''

''تمہیں کیا معلوم کہ میں کون ہوں اور میرا اصل نام کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری شناخت کیسے ہوگی؟''

''میرے پاس تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔'' اس نے کہا ''وہ میں فوراً پولیس کو دے دوں گا۔''

''میں بہت محتاط انسان ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جب میں اس گودام میں داخل ہوا تھا تو میں نے مرکزی دروازے کے ہینڈل کو پکڑا تھا اسے بھی بعد میں رومال سے صاف کر دیا تھا۔'' میں نے فاتحانہ انداز سے کہا تو دوسری طرف سے ولیم کی آواز آئی۔

''تم شاید یہ بھول گئے کہ تم نے میری علم نباتات کی ٹیکسٹ بک اٹھائی تھی۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشان واضح اور صاف ہیں۔ تم نے اس کتاب پر سے یہ نشان صاف نہیں کیے تھے۔''

میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ ولیم بے حد خوش اور مسکرا رہا ہے اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

میں نے غصے کے عالم میں سلسلہ منقطع کر دیا اور پروگرام تیار کرنے لگا۔ ریگن شاپنگ سے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اس نے مجھے اپنا سوٹ دکھایا جو وہ مارکیٹ سے خرید کر لایا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے ہم نے اپنی پوری زندگی میں اتنا آسان اور زبردست کام نہیں کیا۔ ہے نا؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دینا کیا؟ میری بات سن کر اسے دکھ ہوتا اور میں اس کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

✵

عجیب بلیک میلر

یعقوب جمیل

انسان کی معاشی حالت دگرگوں ہو تو پھر اس کی ذہنی رو کسی بھی سمت بھٹک سکتی ہے..... بعض حالات میں اس کی عقل ایسی کرشمہ سازی دکھاتی ہے..... کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔

بقائے حیات کے لئے ایک انوکھا طریقہ اختیار کرنے والے شخص کی ذہانت، ہندی ادب سے انتخاب

میں اپنی دکان میں ایک کرسی پر بیٹھا باہر سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک نیا اور [illegible] گاہک دکان میں داخل ہوا۔ میں اپنے ہر گاہک کو پہچانتا ہوں بلکہ ان کو تو میں پہلی بار اپنی دکان میں داخل ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی عجیب سے پیلاہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اس کی عمر پینتالیس سے زیادہ ہی تھی۔

تھوڑی دیر تک نہیں بلکہ کافی دیر تک وہ دروازے پر ہی رک کر مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر آئینے کے سامنے رکھی ہوئیں کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس وقت ساری ہی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ کیونکہ وہ پہلا گاہک تھا اس لیے مجھے اٹھ کر مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرنا پڑا پھر اس کی گردن کے آس پاس تولیہ لپیٹنے کے بعد میں نے پوچھا ''بال بنوائیں گے یا صرف شیو؟''

''بال۔'' آنکھیں بند کیے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہوئے اجنبی گاہک نے آنکھیں کھولے بغیر دھیرے سے کہا۔ میں نے قینچی..... اور برش وغیرہ سامنے رکھنے کے بعد اپنا کام شروع کرتے ہوئے کہا ''میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس دکان میں آپ آج پہلی بار ہی تشریف لائے ہیں؟''

جواب میں اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کیا نزدیک ہی کہیں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے۔" اجنبی گاہک نے منہ تو کھولا لیکن اس کا یہ عجیب جواب سن کر مجھے ذرا حیرت سی ہوئی پھر اچانک مجھے لگا کہ کہیں یہ شخص کوئی پاگل نہ ہو۔

"کیا کام کرتے ہیں آپ؟" میں نے پھر پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" جواب دینے کے بجائے اس نے ہی سوال کر دیا۔

"میں بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے کہا "آج پہلی بار آپ کو دیکھا ہے اس لیے کیا اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

"پھر بھی کچھ تو سوچا ہی ہوگا آپ نے؟" وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔

"شاید کسی دفتر میں کام کرتے ہیں یا پھر سیلز مین۔"

"ارے کیا میں تمہیں سیلز مین جیسا لگتا ہوں؟" یکایک میری بات کاٹ کر اس نے مجھے تم سے مخاطب کیا تھا اور اسی لیے میں ذرا دیر تک چپ رہ گیا مگر پھر کہا "مجھے کیا خبر..... یہ تو میں اندازہ لگا رہا ہوں۔"

"نہیں دوست ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس بار اجنبی گاہک اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر بولا "لیکن خیر کوئی بات نہیں میں کیا کام کرتا ہوں اس کا تمہیں بہت جلد پتا چل جائے گا..... اور ہاں اب تو میں یہاں اکثر آتا رہوں گا۔"

"ضرور۔" میں ہنس کر بولا "مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔" اس کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی، صرف میری قینچی کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ پھر یکایک ہی اجنبی گاہک نے کرسی پر ذرا سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی پھر بولا "دوست تمہارا پورا نام سانگوڈی مورا ہے، ہے نا؟"

"جی ہاں۔" اپنا نام سن کر مجھے حیرت سی ہوئی "مگر میرا پورا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ لگتا ہے باہر لگے ہوئے بورڈ پر آپ نے میرا نام پڑھ لیا ہوگا؟"

"نہیں، میں نے باہر لگا ہوا بورڈ نہیں پڑھا ہے۔" وہ عجیب پُراسرار لہجے میں بولا "میں پچھلے ایک مہینے سے تمہیں تمہارے پورے نام کے ساتھ جانتا ہوں۔"

"اچھا....."

"ہاں۔" کہہ کر وہ پھر چپ ہو گیا اور میں اس کے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگا میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کون ہو سکتا ہے اور اسے میرا نام اور میرا کام جاننے کی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟ میں ہاں کہہ کر منہ بند کر کے چپ چاپ بیٹھ جانے والے اس گاہک کی طرف منہ پھاڑ کر رہا، مجھے لگ رہا تھا کہ بس اب آگے وہ کچھ کہنے ہی والا ہے اب وہ تفصیل سے پوری بات بتانے لگے گا نہیں..... ہاں کہنے کے بعد تو جیسے اس نے اپنے ہونٹوں پر ہی لگا دیا تھا۔ مجھے اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے قینچی بال تراشنے والی مشین اٹھالی میں نے جان بوجھ کر قینچی کی تھی۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ غصے کی حالت میں قینچی جیسی چیز کو ہاتھ میں نہیں رکھنا چاہیے یہ ہی سوچ کر میں قینچی کی جگہ مشین ہاتھ میں لے لی تھی لیکن تب ہی وہ پڑا "تمہاری وہ سفید کار تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

اتنا کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا میرا چہرہ پھیکا تھا۔ لیکن میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ارے بھلے آدمی تم ابھی تک کچھ نہیں سمجھے؟ اتنی چیت ہونے کے بعد تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی بات کا مقصد سمجھ جاتا ہے پھر بھی تم میرے ہی منہ سے سننا چاہتے ہو تو سنو دو مہینے قبل ایک دن اوشیان پارک کے قریب تم نے دس سالہ بچی کو اپنی کار کے نیچے کچل ڈالا تھا۔ وہ بے چاری معصوم بچی کنڈر گارڈن میں پڑھتی تھی، درست ہے نا؟"

میرے تو ہوش اڑ گئے تو یہ بات ہے؟ لیکن اس کے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا۔ وہ اجنبی گاہک سر اٹھائے میری طرف دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولا "بہت فکر مند نظر آنے لگے ہو؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم کو ابھی پتا چل جائے گا میرے کام کے بارے میں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پیلے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

میرے جسم میں دوڑتے خون کی گردش تھم گئی تھی۔ اچھا میں ابھی تک کوئی اور گاہک نہیں آیا تھا صرف ہم دونوں ہی دکان میں اکیلے تھے۔ لیکن دوست پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت میرے سوا اس سنسان سڑک پر کوئی اور نہیں تھا حالانکہ تم نے تو یہ سوچ کر اپنی کار کھڑی کی تھی کہ کسی نے تمہیں دیکھا نہیں ہے لیکن خدا تو سب کچھ دیکھتا ہے نا؟"

"ہاں" میں دانت پیس کر بولا پھر دل ہی دل میں اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر بولا "اب تم کہنا کیا چاہتے ہو، دو جلدی سے۔"

"میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔" اس نے کچھ اس طرح سے کہا جیسے اس نے میری بات سن لی ہو۔

"ہاں مگر....."

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خود ہی خدا ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کر فوراً ہی بولا "لیکن میں نے ... اس حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ بچی بے چاری تو اس وقت وہاں دم توڑ گئی تھی۔"

میں اب تک اس کے بال کاٹ چکا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل سے اس کے سر پر اسپرے کیا پھر تولیے سے اس کا سر خشک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "شکریہ دوست تم نے بڑے اچھے بال سیٹ کیے ہیں لیکن تمہارے پوچھنے سے پہلے میں خود ہی بتا دیتا ہوں کہ آج میں شیو نہیں بنواؤں گا کیونکہ میں تمہیں زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب یہ بتاؤ بال بنانے کے کتنے پیسے ہوئے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے میلے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک رسید بک نکالی، میں پیسے کے بجائے اس کے ہاتھ میں رسید بک دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا یا کچھ کہتا وہ خود ہی کہنے لگا "میں نے تمہارے نام کی ایک پوری رسید بک ہی چھپوالی ہے سمجھے نا؟ تاکہ سند بھی رہے اور بوقت ضرورت کام بھی آئے تمہیں بھی اور مجھے بھی کیوں ٹھیک ہے نا؟" یہ کہہ کر اس نے پھر اپنے گندے اور پیلے دانت دکھائے "کیوں یار کچھ بولتے کیوں نہیں ہو؟ اب تو ہمارا بار بار ملنا ہوگا۔ چلو اب یہ بتاؤ کتنے کی رسید بناؤں؟"

میں اس اجنبی اور پُراسرار گاہک کا ارادہ خوب اچھی طرح سمجھ گیا تھا لیکن بولنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ میں بری طرح سے پھنس گیا تھا اور مجھے چکر آنے لگے تھے۔

"تمہیں شاید حیرت ہو رہی ہے یہ سب دیکھ کر ہے نا؟" وہ پھر بولنے لگا "لیکن اس دن تمہاری سفید کار کا نمبر نوٹ کرنے کے بعد میں نے ٹریفک رجسٹریشن کے دفتر میں جا کر اس نمبر سے تمہارا نام پتا وغیرہ سب معلوم کر لیا تھا سمجھے یا نہیں؟ خیر اب جلدی سے بتا دو کہ بال بنانے کے پیسے کتنے ہوئے؟"

"چار سوبیس۔" میں نے بہ مشکل کہا۔

"اچھا۔" کہہ کر اس نے میری جیب میں لگے ہوئے بال پین کو ہاتھ بڑھا کر نکال لیا اور رسید بک پر چار سو بیس کی رقم لکھ کر اس پر بڑے ٹھاٹ سے دستخط کرنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا "اب اس رسید کو تم سنبھال کر رکھنا اور اگر رکھنا نہ چاہو تو پھاڑ کر پھینک دینا سمجھے؟ اس طرح کی اور رسیدیں میں تمہیں اکثر دیتا رہوں گا یہ ضرور تمہارے کام آئیں گی اچھا اب میں تم سے اجازت چاہتا ہوں۔"

میں منہ پھاڑے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ بدمعاش، کمینہ، کتا، نالائق کہاں سے ٹپک پڑا میری زندگی میں؟ اب یہ اکثر دکان پر آتا رہے گا اور مفت میں اپنی حجامت بنواتا رہے گا۔ بات اگر حجامت بنوانے تک ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن اس کا ارادہ صرف مفت میں حجامت بنانے تک محدود نہیں لگتا۔ اس کی باتوں سے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بار بار مجھے ذہنی اذیت دیتا رہے گا..... سوچتے سوچتے میں اسی کرسی پر لڑھک گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے وہ بدمعاش بیٹھا تھا۔

☆☆☆

چھٹے روز وہ پھر میری دکان میں داخل ہوا، وہی دوپہر کا وقت تھا جب دکان میں کوئی گاہک نہیں ہوتا۔ وہ آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا، میں نے اس کی بالوں کو سیٹ کرنے کے بعد اس کی شیو بھی بنا دی۔

اس نے اپنا چہرہ تولیے سے صاف کیا پھر اپنی جیب سے رسید بک نکالی اور اس پر پانچ ہزار ین کی رقم لکھنے کے بعد دستخط کیے اور رسید پھاڑ کر میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "یہ پانچ ہزار ین کی رسید ہے اب چار ہزار چھ سو ین تمہیں مجھے نقد دینے

ہیں سمجھ گئے؟ تاکہ پورے پانچ ہزار کی رقم بن جائے۔'' میں نے چپ چاپ اپنی جیب سے اپنا پرس نکالا اور چار ہزار چھ سو ین نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے جسے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالنے کے بعد کہا ''بہت بہت شکریہ میرے دوست' اب میں چلتا ہوں اور ہاں اس رسید کو سنبھال کر رکھنا۔''

اس کے بعد اس کے آنے جانے کا سلسلہ چل نکلا وہ چند روز کے وقفے کے بعد آنے لگا کبھی پانچ ہزار کبھی دو ہزار اور کبھی چھ ہزار کی رسیدیں لکھ کر مجھے دینے لگا۔ دھیرے دھیرے میری جمع پونجی ختم ہوتی گئی اور میں پریشان رہنے لگا۔ مجھے کھویا کھویا اور پریشان حالت میں دیکھ کر میری بیوی روزانہ ہی مجھ سے کہتی ''اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تو کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے بیوی کو تسلی دینے کی کوشش کی ''کوئی خاص بیماری نہیں ہے' موسم کی تبدیلی کا اثر ہے اور کچھ نہیں۔''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' وہ بولی ''رات کو ٹھیک سے سوتے بھی نہیں ہو اور کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھاتے کبھی کبھی تو نیند میں چونک کر جاگ جاتے ہو' دکان سے جلدی گھر واپس آجاتے ہو مگر چپ چاپ بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے ہو آخر ایسی کیا مصیبت آپڑی ہے؟''

لیکن ہر بار میں بیوی کو الٹے سیدھے جواب دے کر ٹال جاتا تھا کیونکہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس سے کہوں اور کیا کہوں؟

پھر ایک دن وہ شخص میری دکان پر آیا اور بولا ''دوست آج میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ مجھے اس وقت صرف چالیس ہزار ین کی ضرورت ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنی جیب سے رسید بک نکالنے لگا۔

''چالیس ہزار ین؟'' میری آواز پھٹ گئی جس سے میری بے بسی بھی صاف جھلک رہی تھی ''آپ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ اتنی رقم اس وقت میرے پاس موجود ہوسکتی ہے؟''

''دکان میں نہیں تو گھر میں ہوگی..... بینک میں ہوگی آخر کہیں تو تم رقم رکھتے ہی ہوگے؟'' اس نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر تھوڑی دیر بعد بولا ''اچھا تو یوں کرو کہ میرے بال بھی بنادو اور شیو بھی کردو اس طرح تمہیں چار پانچ سو ین کم دینا پڑیں گے۔'' پھر ذرا دھمکی آمیز لہجے میں اس نے آگے کہا ''مجھے دیر ہورہی ہے تم جلدی سے اپنا کام شروع کرو شاباش!''

میں نے چپ چاپ اس کا حکم بجالانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور آگے بڑھ کر اس کی گردن پر تولیا لپیٹنے لگا۔ بال کاٹنے کے بعد میں شیو بنانے کے لیے اس کے گالوں پر صابن کا جھاگ لگانے لگا۔

''یار تم اتنی سی بات پر اس قدر غصے میں کیوں آگئے ہو؟'' اس نے اچانک ہی دھیمے لہجے میں کہا ''میں تو ہمیشہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ ہماری دوستی کوئی آج کل کی تو نہیں ہے ہماری دوستی کو تو مہینے ہوگئے ہیں اور بھلے آدمی دوستی میں اتنی ناراضی بھی کہیں ہوتی ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے پھر گندے اور پیلے دانت نکال دیے۔

میرے ہاتھ میں اس وقت استرا تھا۔ میں سخت غصے میں تھا' میری آنکھوں کے سامنے جو بھی چیز تھی وہ سب مجھے لال لال نظر آرہی تھیں' ہر چیز لال..... اچانک میرا ہاتھ گھوم گیا اور استرے پر میرے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا۔ استرا اس کی گردن میں اتر گیا اس کے ساتھ ہی اس نفرت انگیز شخص کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تولیا جو کہ سفید تھا اب دھیرے دھیرے لال ہوتا جارہا تھا' میں بری طرح گھبرا گیا اور میرے ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے کہ تب ہی اس شخص کی ڈوبتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا ''پولیس آجائے تو اس سے کہنا کہ گاہک نے اچانک ہی گردن گھما کر سڑک کی جانب دیکھنے کی کوشش کی تھی تم چونکہ اس وقت اس کی داڑھی بنارہے تھے اس لیے استرا اس کی گردن میں لگ گیا جس سے گردن کی رگ کٹ گئی۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میرے ہاتھ پاؤں پر کپکپاہٹ طاری تھی اور جسم پسینے میں شرابور ہوچکا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے میں نے ہمت کی اور اس پیلے اور گندے دانتوں والے بلیک میلر کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رسید بک نکال لی اور اسے دکان کے باتھ روم میں لے جاکر پھاڑ کر کموڈ میں ڈال کر بہادیا تاکہ پولیس کو میرے اور اس اجنبی گاہک کے درمیان کسی تعلق کا کوئی ثبوت نہ مل سکے۔

اور ہوا بھی یہی، لاکھ کوشش کے باوجود پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ کہ میں نے اس کو جان بوجھ کر قتل کیا ہے' پولیس کو تو وجہ قتل بھی معلوم نہیں ہوسکی پولیس کو اپنا بیان دینے کے بعد میں عدالت میں بھی اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا تھا کہ ''میں اس گاہک کی شیو بنارہا تھا وہ جب آکر کرسی پر بیٹھا تھا تو اسی وقت سے وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جب میں اس

کے گال پر استرا پھیر رہا تھا تو اس نے سڑک کی جانب دیکھنے کے لیے اچانک ہی اپنی گردن موڑ دی جس کی وجہ سے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے استرے کی دھار نے اس کی گردن کی رگ کاٹ دی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ اس شخص سے میری کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں تھا وہ پہلی بار ہی میری دکان پر آیا تھا اور میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔''

چونکہ پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے عدالت نے بھی مجھے قاتل نہیں ٹھہرایا' البتہ مجھے غفلت کا قصوروار ٹھہرا کر مجھے تین مہینے قید کی سزا سنادی۔ میں نے اس سزا کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی اور جیل چلا گیا۔ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جب میں گھر آیا تو اسی شام ایک خاتون مجھ سے ملنے کے لیے میرے گھر آئی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ میری دکان میں مرنے والے شخص اگاریسی کی بیوہ ہے۔ بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ پھر اس نے اپنے پرس سے ایک موٹا سا لفافہ نکال کر مجھے دیا اور بولی ''اپنے شوہر کے کاغذات میں سے مجھے یہ لفافہ ملا ہے جس پر آپ کا نام اور پتا لکھا ہوا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے ایک دوسرا لفافہ نکالا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''اور اس میں آپ کی وہ رقم ہے جو انہوں نے آپ سے لی تھی۔''

دونوں لفافے اپنے ہاتھ میں تھامے میں حیرت بھری نظروں سے اس خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کوئی بلیک میلر اپنی موت کے بعد بلیک میلنگ سے حاصل کی ہوئی رقم بلیک میل ہونے والے شخص کو واپس بھی کرسکتا ہے؟ میں نے دھیرے دھیرے پہلے والا لفافہ کھولا اس میں میرے نام لکھا ہوا ایک خط تھا' جس میں اس بلیک میلر نے لکھا تھا۔

''میرے پیارے دوست' سانگوڈی مورا

میں اسٹیج کی دنیا کا ایک مشہور اداکار تھا۔ میرا بھی ایک بہت ہی شاندار زمانہ تھا لیکن میرا وہ زمانہ اور میرا وہ کام تمہیں کہاں یاد ہوگا کیونکہ اس وقت شاید تم پرائمری اسکول میں تیسری چوتھی کلاس میں طالب علم ہوگے' بہرحال میں نے پورے بیس برس تک اسٹیج پر اپنی شاندار اداکاری کے جوہر دکھائے تھے لیکن دھیرے دھیرے جب میری عمر بڑھنے لگی تو اسٹیج کی دنیا میں نئے اور نوجوان فن کاروں نے آکر مجھے نظر انداز کرنا شروع کردیا پھر انہوں نے مجھے تخت سے نیچے اتار دیا' میرے زوال کا زمانہ شروع ہوا تو میں سوچنے لگا کہ زندگی گزارنے کے لیے اس عمر میں اب کیا کام کروں؟ میں نے بہت کوشش کی مگر میرے لائق کہیں کوئی کام نہیں ملا' ایک دن میں کام کی تلاش میں بھٹک رہا تھا' مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ میرے بچے بھوکے ہیں' مجھے ان کو پڑھانا لکھانا ہے' ان کا مستقبل بنانا ہے' میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے مجھے اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی زندگیاں بھی اندھیرے میں ڈوبتی نظر آرہی تھیں۔ تب اچانک ہی اوشیان پارک کے نزدیک ایک دس سالہ اسکول میں پڑھنے والی بچی کو تم نے اپنی کار سے کچل دیا۔ البتہ تم نے اس بچی کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن شاید موت ہی اس کا مقدر تھی' چونکہ اس وقت اتفاق سے وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا میں اکیلا ہی اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا لیکن تم نے مجھے نہیں دیکھا تھا اور تم اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔

پھر میں نے پیسے کمانے کی ایک ترکیب سوچی اور اس ترکیب پر عمل کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا وہ تم جانتے ہی ہو لیکن، ایک بات تم نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ تم سے ملنے والی پہلی نقد رقم سے میں نے اپنا تیس لاکھ ین کا بیمہ کرالیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم غصے میں آکر میرا خون کرکے مجھے اپنے راستے سے ضرور ہٹادو گے اور میں اس کے لیے بالکل تیار تھا تم سے ہر بار ملنے والی رقم سے میں اپنی بیمہ پالیسی کی قسطیں ادا کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آٹھ دس قسطوں کی ادائیگی ہوجائے اس کے بعد ہی تمہارے سامنے تمہاری موت کی کرسی پر بیٹھا جائے اور ہوا بھی وہی جو میں نے سوچا اور چاہا تھا' یہ خط میں نے موت کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے' مجھے پورا یقین ہے کہ میری موت کے دو ماہ بعد میری بیوی کو بیمے کے تیس لاکھ ین مل جائیں گے اور وہ تمہیں وہ ساری رقم لوٹا دے گی جو تم نے مجھے دی تھی۔ اس رقم میں وہ تین ہزار دو سو تیس ین بھی شامل ہیں جو میرے بال اور شیو بنانے کے لیے تمہاری اجرت بنتی ہے۔ میں نے تمہیں بہت تکلیف ہے۔ اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں اور جاتے جاتے ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر تم نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میری مشکل اتنی آسان نہ ہوتی اور میرے بیوی بچے تیس لاکھ ین کے مالک نہیں بن سکتے تھے' اب مجھے کم از کم یہ دکھ تو نہیں رہے گا کہ میرے بچے بھوکے رہیں گے۔

فقط تمہارا دوست

اگاریسی''

✲✲

ہر لمحہ سنسنی اور ہر سطر تحیر کے ساتھ بے پناہ سسپنس کا حامل ایک یادگار سلسلہ

طاہر جاوید مغل

دیوی

آٹھویں قسط

وہ نزاکت و لطافت کا پیکر تھی۔ خوب صورت اور چھوئی موئی سی دلکش دوشیزہ، اپنی دنیا میں مگن پھر اچانک حالات کا جبر اسے ایک ایسے زنداں میں لے گیا جہاں کسی نادیدہ دیواریں آسمان تک بلند تھیں۔ اس قفس میں نہ صرف اس کا نازک سراپا وحشتوں تلے کچلا گیا بلکہ اس کی روح تک کو چھلنی کرنے کے اسباب مہیا کئے گئے۔ شاید اسے قید کرنے والے اس طرح سے اس کا امتحان لے رہے تھے اور وہ ہر امتحان اور ہر آزمائش پر پوری اترتی رہی لیکن یہ سرخ روئی اس کے حق میں ستم پر ستم لانے کا سبب بنتی رہی۔ اس کے باوجود اس کا صبر، ایثار اور استقامت ناقابل شکست ٹھہرا، اس نے ہر ظلم مسکرا کر سہا اور ہر نئے ستم پر سر تسلیم خم کئے رکھا۔ ایک مجبور مگر پرعزم اور حوصلہ مند دوشیزہ کی انوکھی داستان جس میں زمانے کی نیرنگیوں کے ساتھ قسمت کی کار فرمائیاں بھی اپنے اوج پر نظر آتی ہیں۔

ظلم و ستم اور جبر کی بھٹی میں کندن ہو جانے والی ایک معصوم دوشیزہ کا ماجرائے روح شکن

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ کیوں ہو رہا تھا؟ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ در و دیوار لرزنے لگے تھے۔ پھر ایک پتھر اڑتا ہوا آیا اور کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا۔ شیشہ چکنا چور ہو کر صوفے اور قالین پر بکھر گیا۔ شانی چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا میں سے دیکھا اور لہو رگوں میں جمنے لگا۔ شام کے جھٹپٹے میں کم و بیش بیس افراد برآمدے میں دکھائی دے رہے تھے، یہ سب کے سب نارپور کے چوہدری تھے۔ ان میں سے کئی ایک کی اونچی پگڑیوں کے شملے دور ہی سے لہراتے دکھائی دیتے تھے۔ گھنی مونچھیں، سرخ آنکھیں، تمتماتے ہوئے چہرے..... آستینیں چڑھی ہوئی تیور بگڑے ہوئے۔ قادر برآمدے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹھ ایم ایم رائفل تھی۔ اس کے عقب میں بھی دو افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھی کے گارڈز انیکسی کے لان میں بکھرے ہوئے تھے۔

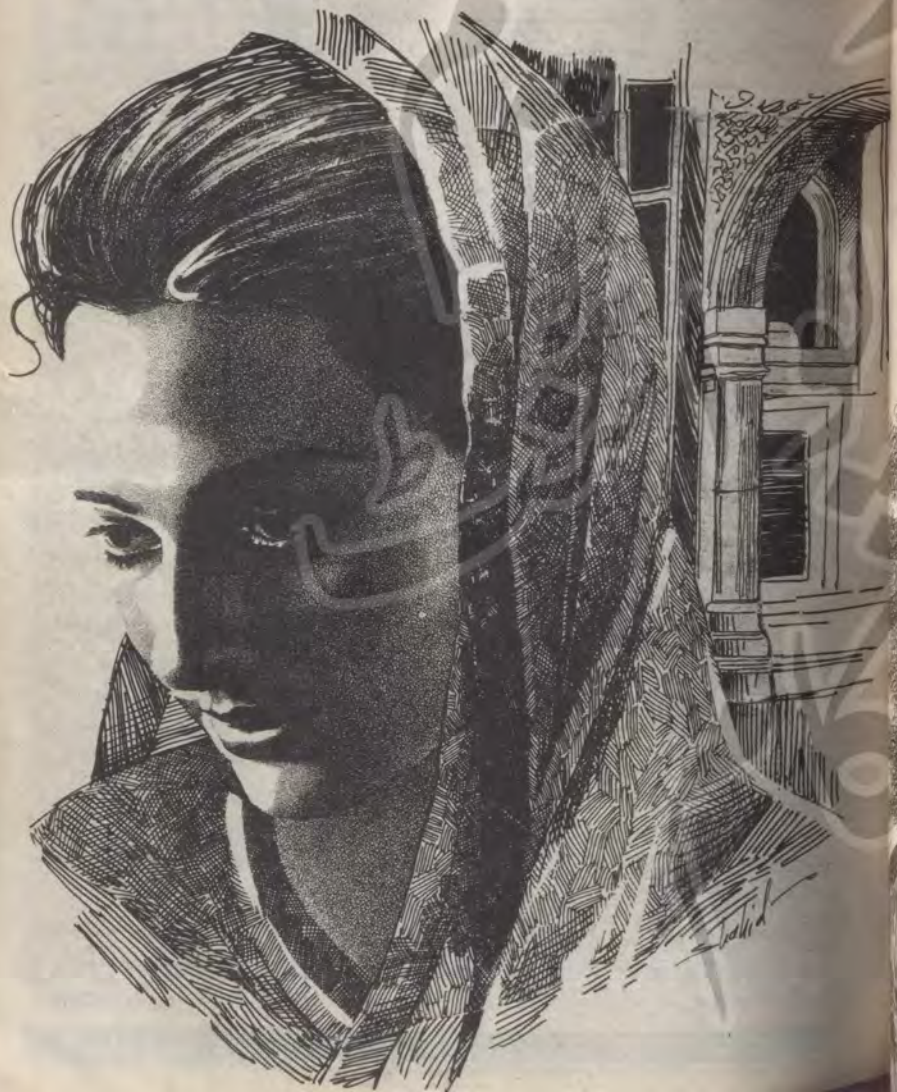

قادر اور چند نوجوان افراد شانی کے کمرے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو تین عمر رسیدہ افراد انہیں روک رہے تھے۔ مگر آگے بڑھنے والوں کا غم و غصہ بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی بھی وقت مزاحمت کرنے والوں کو دھکیل کر کمرے کے دروازے پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ پھر شانی نے چوہدری بشیر کو دیکھا۔ وہ اپنے دو گارڈز کے ہمراہ تیزی سے آیا اور ہجوم کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ قادر ادھاڑا ''سامنے سے ہٹ جاؤ بشیر! آج میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔''

''تو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔'' بشیر بولا۔ ''تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔'' اس کے ساتھ ہی بشیر نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔

''بشیر..... تو سامنے نہ آ..... ورنہ تیرا نقصان ہو جائے گا۔ پیچھے ہٹ جا'' ایک بھاری آواز نے للکار کر کہا۔

''میں کہتا ہوں تم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' چوہدری نے للکارا ''میں تمہیں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنے دوں گا۔ اگر وہ گناہ گار ہے تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے تمہارے سامنے ذبح کروں گا۔ پر اگر وہ بے قصور ہے تو پھر ہم اس کا خون اپنے سر نہیں لے سکتے۔''

ایک ادھیڑ عمر گنجا چوہدری گرجا۔ ''تو نے ہمارے پیو کی قاتل سے یاری لگائی ہوئی ہے، اس کو معشوق بنا کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اگر تو ہمارے رستے میں آیا تو تیری ساری عشق معشوقی بھی اسی جگہ نکال کر رکھ دیں گے۔''

اس دوران میں قادر نے جوش کھا کر آگے بڑھنا چاہا۔ چوہدری بشیر نے اسے دھکا دیا۔ اس کا ایک پاؤں برآمدے کی سیڑھی پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی پر گرا۔ ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر بڑے زور کا طمانچہ چوہدری بشیر کو مارنا چاہا۔ چوہدری بشیر نے اس کی کلائی تھام لی۔ ادھیڑ عمر گنجے شخص کے پیچھے کھڑے دو تین افراد نے ایک دم اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ دوسری طرف چوہدری بشیر کے پیچھے گارڈز نے بھی اپنی رائفلوں کو سونت لیا۔ دو تین سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ ابھی یہاں دھماکے ہوں گے اور لاشیں گرتی نظر آئیں گی۔ شانی جیسے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ پھر یکا یک بیچ بچاؤ کرانے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ وہ متحارب افراد کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے زور دار آوازیں بلند کیں اور گرج برس کر دونوں فریقوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ بہر حال آنکھیں ابھی تک شعلے اگل رہی تھیں اور چہرے انگارہ ہو رہے تھے۔ چوہدری بشیر کے پیچھے اب اس کے چار یا پانچ گارڈز آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دو تین ساتھی بھی کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

بڑی عمر کے ایک سیاہی مائل چوہدری نے اپنی کھسکی ہوئی پگڑی کو سیدھا کرتے ہوئے کہا ''خبردار! کوئی رائفل سیدھی نہ کرے۔ نیچے کرو رائفلیں..... اور پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ایک دوسرا بزرگ بولا ''گولی چلانے سے کسی بات کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ ہم ایک غیر زنانی کے لیے کیوں اپنی جانوں کے دشمن بن رہے ہیں۔ بشیر پتر نے ٹھیک کہا ہے۔ جو بات بھی کرنی ہے بیٹھ کر کرو..... اور پھر جو فیصلہ بھی ہو اس کو سارے سچے دل سے مان لو۔''

''ٹھیک ہے، بلا لو سب کو..... آج ہی فیصلہ کرو'' ایک کرخت آواز نے کہا۔

''بالکل، آج ہی فیصلہ ہونا چاہیے، اور اگر یہ گناہ گار نکلتی ہے تو ابھی..... اسی وقت گزارو اسے بجلی کے توکے میں سے.....'' قادر ادھاڑا۔

شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا دل دھڑکنا بند کر دے گا اور وہ ابھی گر جائے گی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ باہر کی خوفناک آوازوں سے اپنی سماعت کو بچانے کے لیے اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کافی دیر بعد جب اس نے انگلیاں کانوں سے نکالیں تو شور مچاتی ہوئی غضب ناک آوازیں کوٹھی کی طرف جا چکی تھیں۔ بس ہلکی سی بھنبھناہٹ باقی تھی۔

دروازہ کھلا اور آبدیدہ زہرا اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے شانی کو دیکھا۔ پھر ارد گرد نظر دوڑانے کے بعد ہولے سے بولی۔

''چوہدرانی جی! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کیا کہہ رہے ہیں.....؟''

''یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اللہ بخشے چوہدری فاخر جی کی بیوی ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد آپ نارپور کی حویلی سے غائب ہو گئی تھیں۔''

شانی نے سر جھکایا۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے ''اور کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟'' شانی نے پوچھا۔

''دراصل..... دراصل آپ کو نارپور پنڈ کی دو عورتوں نے پہچانا تھا۔ جب ڈی چوہدرانی جی نے دم دیے (آخری سانس لی) تو آپ کوٹھی میں ہی تھیں۔ پھر آپ روتے روتے بے ہوش ہو گئیں۔ اس وقت آپ کو نارپور کی ان عورتوں نے دیکھ لیا.....'' زہرا نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر رحم آمیز نظروں

سے شانی کو دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولی ''آپ کو کوٹھی میں نہیں جانا چاہیے تھا چوہدرانی۔ آپ کو چوہدری صاحب نے کہا بھی تھا کہ آپ ان سے پوچھے بغیر وہاں نہ جائیں۔ شاید ان کو یہی ڈر تھا کہ کوئی آپ کو پہچان لے گا.....''

شانی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا ''زہرا! بھابو اب کہاں ہے؟''

زہرا نے سسکی لے کر کہا ''ان کو کل شام دفنا دیا گیا تھا۔ آج جمعے کی نماز کے بعد ان کے قل ہوئے ہیں۔''

شانی نے ماتھا گھٹنوں پر ٹکایا اور چہرہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ زہرا نے جل کر کہا ''اللہ کی مار ہو اس ماسی جالاں پر، اتنی بری بری باتیں کرتی ہے کہ دل کرتا ہے کہ اس کا منہ توڑ دیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کہہ رہی تھی کہ وڈی چوہدرانی کی جان آپ کی وجہ سے گئی۔ آپ نے کمرے میں گھس کر حضرت صاحب کی بیبیوں کو مارا..... ان کے نوری علم والے برتن توڑے..... اور بنا بنایا کام بگاڑ دیا..... اور یہ باتیں صرف جالاں ہی نہیں کہہ رہی، کوٹھی میں کئی نوکرانیاں بھی یہی بات کرتی ہیں۔ ابھی آپ کے کمرے سے باہر چوہدری جمع ہوئے تھے وہ بھی یہی بات کر رہے تھے..... وہ کہتے ہیں..... وہ کہتے ہیں.....'' زہرا ہکلا کر چپ ہو گئی۔

''کیا کہتے ہیں.....؟'' شانی نے روتے روتے پوچھا۔

''منحوس کہتے ہیں ناں، ڈائن اور چڑیل کہتے ہیں ناں..... کون سا غلط کہتے ہیں۔ میں ایسی ہی تو ہوں زہرا۔ میری وجہ سے میرا چاچا جاوا اور میرا بھائی مرے۔ پھر میرے ابا جی کی جان گئی، سسرال میں آئی تو اپنے خاوند کو کھا گئی۔ اپنے دادا سسر کو قبر میں اتار دیا۔ اور اب یہاں آئی ہوں تو اپنی بھابو کو قتل کر دیا ہے۔ ہاں میں قاتل ہوں زہرا..... تم جاؤ..... تم جاؤ' چوہدری جی کو بلا لاؤ۔ ان سے کہہ دو..... مجھے اپنے سارے گناہ قبول ہیں۔ مجھے مار دیں، زندہ جلا دیں۔ یا پھر میرے ٹکڑے کر دیں۔ جاؤ زہرا، بلا لاؤ چوہدری کو.....''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ زہرا نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ یہی وقت تھا جب جالاں دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے حسبِ عادت ماتھے پر اپنا دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ زہرا کو شانی کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ اور بھی آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے لپک کر زہرا کو بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر دروازے کی دہلیز پر دھکیل دیا۔ ''حرامجادی' کتی، کنجری! لکھ بار کہا ہے تجھ سے اپنے کام سے کام رکھا کر۔ نہ اس کے پاس بیٹھ کر باتوں کے چسکے لیا کر..... چل دفع ہو

''آپ نے میری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر دیا؟ بہت بہت شکریہ..... اب میں کم از کم اپنی سائیکل میں پنکچر تو لگوا لیا کروں گا۔''

یہاں سے، چل مر.....''

زہرا جان بچا کر کھسک گئی۔ جالاں نے نہایت قہر ناک نگاہ شانی پر ڈالی۔ پھر نفرت انگیز انداز میں سر ہلایا اور دروازے کو ایک دھماکے سے بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ غالباً اس کا بس نہیں چلتا تھا، ورنہ اس نے جو سلوک زہرا سے کیا تھا اور جو سلوک چند دن پہلے انوری سے کیا تھا، شاید وہی شانی کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ شانی کے سینے میں زبردست ٹیس اٹھی۔ اسے منے اور ندیم کا خیال آیا۔ وہ کہاں تھے کس حال میں تھے؟ پھر رستم کے خیال نے اس کے سینے پر گھونسا مارا۔ وہ کہاں تھا؟ زندہ تھا یا وہ بھی کہیں دور جا چکا تھا؟ اسے یہی لگا کہ اس کا دوسرا خیال صحیح ہے۔ موت کی اس گرم بازاری میں رستم بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ رستم کی موت کے بارے میں سوچنے کے بعد شانی کو مرنا اور بھی سہل لگنے لگا۔ ان لمحوں میں اسے لگا کہ موت کسی خوفناک شے کا نام نہیں۔ یہ تو بس ایک کروٹ ہے۔ بائیں سے دائیں یا دائیں سے بائیں۔ ایک طرف زندگی ہے دوسری طرف موت..... فضا میں ایک ہولناک سراسیمگی تھی۔ اس سراسیمگی اور خاموشی میں وال کلاک کی ٹک ٹک بہت اہم ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گزرنے والا ہر لمحہ ایک انوکھی منزل کو شانی سے قریب تر کر رہا ہے۔ وہ جانتی تھی، اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں نارپور کے بہت سے غضب ناک چوہدری سر جوڑے بیٹھے ہیں اور اس کے لیے کوئی قرار واقعی سزا تجویز کر رہے ہیں۔

وہ ہر سزا کے لیے تیار تھی۔ ہر موت کا سامنا کر سکتی تھی۔ موت کے بارے میں سوچتے ہوئے صرف تین نام تھے.....

صرف تین نام جو اس کے دل و دماغ میں تھوڑا سا دکھ ابھارتے تھے..... منا..... ندیم..... رستم۔

اچانک دروازہ کھلا اور چوہدری بشیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس کی ناک کے اوپر نظر آنے والی سلوٹ بہت نمایاں تھی اور یہ سلوٹ ظاہر کر رہی تھی چوہدری بے حد پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ غصے میں بھی ہے۔ چوہدری کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اس کا آدھے سے زائد چہرہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ ایک گرم چادر اس نے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ یہ شخص باہر برآمدے میں ہی رک گیا۔ چوہدری اندر آ گیا۔ اس کے کلف لگے سفید کرتے پر پانی کے قطرے ظاہر کرتے تھے کہ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔ وہ طیش بھری سرگوشی میں بولا ''شانی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے تم سے..... تمہیں مجھ سے پوچھے بغیر کوٹھی میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ کام بہت خراب ہو گیا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے.....'' شانی نے پہلی بار چوہدری کے مضبوط لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کی۔ چوہدری نے تیزی سے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ''تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ابھی اسی وقت۔ یہ بندہ جو میرے ساتھ آیا ہے' میرا وفادار ملازم ہے۔ یہ تمہیں محفوظ ٹھکانے تک پہنچائے گا.....''

''لیکن.....''

''چپ رہو.....'' چوہدری نے زہریلی سرگوشی کی ''تمہیں پتا نہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں..... جان چلی جائے گی تمہاری..... یہ لوگ ٹکڑے کر دیں گے تمہارے۔''

''تو کر لینے دیں ٹکڑے۔ ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو لینے دیں۔ میرے لیے اپنے خونی رشتوں سے دشمنیاں مول نہ لیں آپ.....'' وہ آنسو بہاتے ہوئے صدقِ دل سے بولی۔

چوہدری کی انگارہ آنکھوں کی سرخی ذرا کم ہو گئی، وہ مضبوطی سے اس کا شانہ تھام کر گویا ہوا ''میں جو کہتا ہوں، وہی کرو، یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے..... اور دیکھو..... ضائع کرنے کے لیے ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔''

پھر شانی کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنے کارندے کو آواز دی ''ریاست اندر آ جاؤ۔''

لمبا تڑنگا شخص کمرے میں آ گیا۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پاؤں میں گرگابی تھی۔ وہ کسی قدیم لشکری کی طرح تن کر کھڑا تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔

چوہدری نے بستر پر پڑا ہوا شانی کا سویٹر اٹھایا اور اسے تھماتے ہوئے بولا ''اسے پہن لو۔ فوراً''

شانی بدستور تذبذب میں تھی۔

چوہدری نے ایک بار پھر اسے گھورا۔ اس کی نظروں میں انتہا درجے کی سختی کے ساتھ ساتھ بہت ہمدردی اور اپنائیت بھی تھی۔

شانی سویٹر لے کر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ وہ سویٹر پہن کر نکلی تو چوہدری نے گرم شال اس کے کندھوں پر ڈال دی اور کہا کہ وہ اس میں منہ سر اچھی طرح لپیٹ لے۔ شانی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اب وہ کمرے میں موجود ریاست نامی شخص کو کافی حد تک پہچان گئی۔ یہ وہی دراز قد رائفل بردار تھا جو شانی کو قاسم برلاس کے چنگل سے نکال کر لایا تھا۔ دوسرے لفظوں میں قاسم برلاس جن لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس شخص کے ساتھیوں میں نواز اور ماکھا وغیرہ شامل تھے۔ بعد ازاں اس شخص نے شانی کو مینارِ پاکستان کے قریب جالاں کے حوالے کر دیا تھا اور خود اپنے زخمی ساتھی کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ آج ایک بار پھر یہ شخص شانی کو ایک مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لیے یہاں موجود تھا۔

چوہدری نے شانی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد چوہدری' شانی اور ریاست انیکسی کے آخری کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ شانی جب سے یہاں آئی تھی اس نے اس کمرے کا دروازہ مقفل ہی دیکھا تھا۔ چوہدری کے اشارے پر جالاں نے دروازے کا تالا کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ چوہدری بشیر، شانی اور ریاست کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، کمرا تقریباً خالی تھا۔ بس ایک طرف چند چارپائیاں کھڑی کی گئی تھیں۔ فرش کے وسط میں قالین کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا، چوہدری نے عجلت میں یہ ٹکڑا اٹھایا۔ شانی دیکھ کر حیران ہوئی کہ یہاں تقریباً چھ ضرب چھ فٹ کا ایک چوبی تختہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دراصل ایک دروازہ تھا۔ چوہدری نے ریاست اور جالاں کی مدد سے اس بھاری تختے کو اٹھا کر سیدھا کیا۔ نیچے زینے دکھائی دیے۔ شانی نے وہ بو باس محسوس کی جو بند تہ خانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چوہدری نے ایک بٹن دبایا تو یہاں بھی بلب کی مدھم روشنی پھیل گئی، زینوں پر گرد کی تہیں تھیں اور چھت پر دو چار جگہ جالے بھی نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کافی عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ شانی چوہدری کے پیچھے ڈرتی ڈرتی زینوں پر اتری۔ اس کے عقب میں قوی ہیکل ریاست تھا۔ تھوڑا آگے جا کر یہ

زینے راہداری کی شکل اختیار کر گئے۔ تیس چالیس قدم آگے جانے کے بعد چوہدری نے ایک اور بٹن دبایا۔ اس سے آگے کا راستہ روشن ہو گیا..... کم و بیش ڈیڑھ سو میٹر فاصلہ طے کر کے وہ پھر زینوں کے سامنے آ گئے۔ شانی، چوہدری سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن چوہدری کی عجلت اور برہمی دیکھتے ہوئے وہ چپ تھی۔ پھر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریاست ان کے ساتھ تھا۔

زینوں کے آخری سرے پر مکمل تاریکی تھی۔ تاہم سرد ہوا کی آمد سے پتا چل رہا تھا کہ نکاسی کا راستہ پہلے سے کھلا ہے۔ وہ زینے چڑھ کر باہر نکلے۔ یہ چھوٹی سی چار دیواری تھی۔ شانی نے پہچان لیا۔ یہ سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ والی جگہ تھی۔ یہاں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ شانی نے کئی بار انیکسی کی چھت پر سے اس چار دیواری کو دیکھا تھا۔ گاڑیوں کے پرانے ٹائر، درختوں کے کٹے ہوئے تنے..... پرانے دروازے، بہت کچھ یہاں دکھائی دیتا تھا۔ ان میں سے ایک اہم چیز ایک جلی ہوئی پرانی شیورلیٹ کا ڈھانچا تھا۔ چار دیواری کے وسط میں موجود وہ ڈھانچا اب اپنی مقررہ جگہ سے دس بیس فٹ دائیں جانب پڑا تھا۔ دراصل اس پوشیدہ راستے کا بیرونی دروازہ شیورلیٹ کے ڈھانچے سے برآمد ہوا تھا۔

کھلی فضا میں آتے ہی شانی کو بے پناہ سردی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پتا چلا کہ بوندا باندی ہو رہی ہے۔ چار دیواری کے دروازے کے عین سامنے ایک سوزوکی لوڈر موجود تھی۔ اس پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے شانی کا بازو پکڑا اور سے لوڈر کے پچھلے حصے میں سامان کے درمیان یوں بٹھا دیا کہ اسے باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔ ریاست نے سامان کے اوپر پوتھین کی ایک بڑی شیٹ پھیلا دی۔

چوہدری تسلی بخش انداز میں شانی کا کندھا دباتے ہوئے بولا ''گھبرانا نہیں..... مجھ پر بھروسا رکھو..... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی..... میں جلد ہی دوبارہ تم سے ملوں گا۔''

شانی بس ایک سسکی لے کر رہ گئی۔ اسے بائیں جانب کچھ فاصلے پر انیکسی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ دائیں طرف کوٹھی کی روشنیاں تھیں، بلند دروازوں اور موٹی دیواروں والی وہ عظیم الشان کوٹھی، جہاں بہت سے پُرغضب لوگ کسی بند کمرے میں بیٹھ کر شانی کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ دشمن خانوادے کی بیٹی کے لیے کوئی ایسی سزا تجویز کر رہے ہوں جو ناقابلِ فراموش ہو..... اور جس کی سختی و عبرت ناکی کے احساس سے ان کی پگڑیوں کے شملے کئی

بیرون ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ

ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائرمیل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے زرِ سالانہ فی ڈائجسٹ

2000 روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے زرِ سالانہ فی ڈائجسٹ

2500 روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر/ملک ادائیگی کے لئے بینک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

برسوں تک بغیر کلف کے اونچے رہیں۔

لمبا تڑنگا ریاست گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی پک اپ اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اب کوٹھی کی حدود سے نکلنے سے پہلے پک اپ کو اندرونی اور بیرونی گیٹ سے گزرنا تھا۔ پہلے وہ اندرونی گیٹ سے گزری پھر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ شانی جس ساز و سامان میں دبکی بیٹھی تھی، وہ قناتوں، دریوں اور برتنوں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دریوں سے چپکے ہوئے چاولوں اور چکنائی کی بو شانی کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ یہ کسی تقریب کا ساز و سامان تھا؟ پھر اچانک اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ یہ یقیناً اس کی بھابو کی دعا کی تقریب ہوگی۔ کل شام بھابو کی تدفین ہوئی تھی۔ آج سہ پہر اس کے لیے قرآن خوانی ہوئی ہوگی۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ نجانے کیوں اس نے ان دریوں کے ساتھ چہرہ لگایا اور سسکنے لگی۔ اپنی بھابو کی آخری رسومات میں اس کی ''یہ شرکت'' تصوراتی ہی تھی۔

اچانک بیرونی گیٹ پر پک اپ رک گئی، اسے گارڈز نے معمول کے چیک اپ کے لیے روکا تھا۔ گارڈز نے ریاست سے دو تین باتیں پوچھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پک اپ کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتے، شانی نے ایک گھڑسوار کو دیکھا۔ وہ احاطے کی طرف سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پک اپ کی طرف آرہا تھا۔ اس کی پگڑی اور لباس وغیرہ سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نارپور کا ہی کوئی فرد ہے۔ وہ پک اپ کے قریب آکر دیہاتی لب و لہجے میں رعب سے بولا ''کون ہے اس گڈی میں؟''

''کوئی نہیں ہے جی..... بس تمبو اور قناتیں واپس جا رہی ہیں۔'' دونوں گارڈز میں سے ایک نے جواب دیا۔

گھڑسوار اپنا گھوڑا پک اپ کے بالکل پاس لے آیا تھا۔ اس نے چاروں طرف سے ٹھونک بجا کر کر پک اپ کو دیکھا۔ پھر الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ پک اپ آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ گیٹ سے بہ مشکل بیس پچیس میٹر دور ہی گئی ہوگی کہ گھڑسوار نے پکار کر کچھ کہا وہ شاید پک اپ کو روکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ریاست نے غالباً اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ وہ پک اپ کو اسی طرح دوڑاتا چلا گیا۔ گھڑسوار گھوڑا بھگا کر پیچھے آیا۔ وہ بڑی تیزی سے پک اپ کے قریب پہنچ گیا۔ اور پکار پکار کر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہنے لگا۔ اب اس کی آواز نہایت واضح تھی اور الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے، لیکن پک اپ کی رفتار میں کمی نہیں آئی بلکہ شاید رفتار پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔

تقریباً ایک کلومیٹر آگے آنے کے بعد پک اپ سڑک سے اتری اور نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ گھڑسوار برق رفتاری سے پیچھے آرہا تھا۔ شب کی تاریکی میں شانی کو اس کا ہیولا ایک خونخوار پرچھائیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کبھی پک اپ کی رفتار کے سبب... کچھ فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ شانی کو شک ہو رہا تھا کہ گھڑسوار کے ہاتھ میں رائفل ہے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چوہدری کے کارندے ریاست نے پک اپ نیم پختہ راستے پر کیوں اتار دی۔ اگر وہ ہموار پختہ سڑک پر رہتا تو تین منٹ میں ہی اس ڈھیٹ گھڑسوار کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ ابھی تک گھڑسوار اکیلا ہی تھا۔ پھر دھماکے کی آواز سنائی دی اور گھڑسوار کی طرف سے ایک شعلہ سا لپک کر پک اپ کی باڈی سے ٹکرایا۔

شانی کا اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ گھڑسوار کے ہاتھ میں رائفل نہ صرف موجود تھی، بلکہ اس نے اسے استعمال بھی کیا تھا، شاید وہ پک اپ رکوانے کے لیے اس کے ٹائر وغیرہ پھاڑنا چاہتا تھا۔ صورتِ حال سنگین ہوتی جا رہی تھی، چاروں طرف ہوا سے جھومتے ہوئے درخت تھے اور تاریکی تھی۔ نیم پختہ راستہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہو گیا تھا۔ دو تین گہرے گڑھوں سے گزرتے ہوئے پک اپ کی رفتار دھیمی ہوئی اور گھڑسوار آناً فاناً سر پر پہنچ گیا۔ ''رک حرامزادے، ورنہ گولی مار دوں گا۔'' وہ جنونی انداز میں گرجا۔

اب وہ بڑی مہارت سے پک اپ کی دائیں کھڑکی کے ساتھ ساتھ گھوڑا بھگا رہا تھا۔ شانی ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی لیکن اس کا اندازہ یہی تھا کہ گھڑسوار نے بھاگتے گھوڑے پر سے رائفل کے کندے کی ضرب ریاست کے سر پر لگائی تھی۔ پک اپ کی رفتار پہلے سے سست ہو چکی تھی۔ وہ گیلی زمین پر پھسلی اور چند چھوٹے پودوں کو توڑتی اور روندتی ہوئی رک گئی۔

چند سیکنڈ بعد شانی کو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ریاست اور رائفل بردار گھڑسوار بری طرح گتھم گتھا ہیں۔ گاہے بگاہے گالی کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ نجانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ رائفل بردار شخص، ریاست پر بھاری پڑ رہا ہے۔ ''اگر رائفل والے نے ریاست کو مار دیا تو کیا ہوگا؟'' یہ سوال بڑی شدت سے شانی کے ذہن میں ابھرا۔

اس کے دل سے آواز آئی..... شانی..... یہ موقع ہے یہاں سے بھاگ جا۔ اگر یہ گھڑسوار، ریاست پر حاوی ہو گیا

تو تھوڑی ہی دیر میں ایک بار پھر نارپور کے خونخوار چوہدری کے قبضے میں ہوگی۔

اس نے اپنے جسم کو حرکت دی اور تھوڑی سی کوشش کر کے پک اپ..... سے باہر آگئی۔ پک اپ کی ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں ان لائٹس میں بارش کی پھوار نظر آرہی تھی، لیکن جو زیادہ اہم منظر ان لائٹس میں نظر آرہا تھا وہ چوہدری کے وفادار کارندے ریاست اور نارپور کے گھڑسوار کے درمیان تصادم کا تھا۔ وہ دو وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے۔ دونوں قوی ہیکل اور زور آور تھے، دونوں کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ کسی بھی وقت کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہو سکتا تھا۔ شانی نے چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی اور تیزی سے درختوں میں داخل ہو گئی۔

یخ بستہ ہوا اس کی ہڈیوں میں اترنے لگی۔ اس کی چادر خاردار جھاڑیوں سے الجھ رہی تھی۔ شاخیں اس کے چہرے اور جسم کے ننگے حصوں سے ٹکرا رہی تھیں مگر وہ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔ وہ تین چار منٹ ہی بھاگی ہوگی کہ اچانک اس کے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ اسے یہی لگا جیسے زمین دفعتاً اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بائیں ٹخنے سے ذرا اوپر درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ پہلو کے بل گیلی زمین پر گری اور کسی خاردار پودے کی چبھن اس نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔ اس کے ہانپتے ہوئے سینے سے ایک دلدوز کراہ نکل کر رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا پاؤں کسی گڑھے میں گیا ہے اور کسی شکنجے جیسی شے میں بری طرح جکڑ گیا ہے۔ اضطراری حرکت کے تحت اس نے پاؤں نادیدہ گرفت سے نکالنے کی کوشش کی اور اس کے ہونٹوں سے ایک اور کراہ نکلی۔ پاؤں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔

اس نے اپنی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پاؤں کو دیوانہ وار کئی جھٹکے دیے لیکن بے سود..... وہ اپنی تکلیف میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکی۔ وہ اب صورتِ حال کو کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ پیپل کے ایک درخت نے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا درخت کی کچھ موٹی جڑیں ایک گڑھے میں سے نکلی ہوئی تھیں۔ یہ گڑھا اندازاً ڈھائی تین فٹ گہرا تھا اور اس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ بھاگتے بھاگتے شانی کا پاؤں شومیِ قسمت اس گڑھے میں گیا تھا اور دو جڑوں کے درمیانی خلا میں پھنس گیا تھا۔ وہ پاؤں نکالنے کے لیے زور لگاتی تو خم دار جڑیں اوپر کی طرف اٹھ آتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے مزید مضبوطی سے پاؤں کو جکڑ لیا ہے۔

''یا اللہ.....! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ سوال ایک دلدوز آہ بن کر نکلا۔

اس کی شال تو درختوں کے درمیان بھاگتے ہوئے شاخوں سے الجھ کر اس کے سر سے اتر چکی تھی۔ سویٹر، قمیص، دوپٹہ سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ تشویش کو مزید بڑھانے والی بات یہ تھی کہ وہ ابھی اس مقام سے زیادہ دور نہیں آئی تھی جہاں گھڑسوار اور ریاست میں تصادم ہوا تھا۔ ابھی کوئی ایک منٹ پہلے اس نے درختوں میں گونجتی ہوئی ایک دور افتادہ چنگھاڑ سنی تھی۔ یقیناً یہ انہی دونوں افراد میں سے کسی کی تھی جنہیں وہ پک اپ کے پاس برسرِ پیکار چھوڑ آئی تھی۔

شانی نے اکثر سنا تھا کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اس پر بھی مصیبتیں ''با جماعت'' حملہ آور ہوئی تھیں۔ آفات کا ایک جمگھٹا تھا جو درد و کرب کے جنگل میں، وحشت کے نقارے پیٹتا اس کو بھگا رہا تھا۔

اچانک کچھ فاصلے پر بلند ہونے والی آوازوں نے شانی کے اعصاب کو جھنجوڑا..... یہ چتوں کے سرسرانے اور شاخوں کے ٹوٹنے کی آوازیں تھیں۔ یہ اس طرف سے بلند ہوئی تھیں جہاں سے وہ آئی تھی۔ یہ ایک سنسان رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی..... دور و نزدیک کسی متنفس کا پتا نہیں ملتا تھا۔ ایک طویل رات میں دھیمی بارش، سردی اور تاریکی نے اس جگہ کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ ایسے میں یہاں کون اس کی مدد کو آسکتا تھا۔ لیکن انسان کا دل ایک ایسی چیز ہے جو بدترین حالات میں بھی اپنے لیے امید کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ پھانسی دیے جانے والے شخص کے سینے میں بھی اس وقت تک زندگی کی امید موجود رہتی ہے جب تک تختہ پاؤں کے نیچے سے کھسک نہیں جاتا۔ شانی بھی یہ امید کر رہی تھی شاید جو آہٹیں سنائی دیں، میں وہ کسی ایسے فرد یا افراد کی ہوں جو اس کی مدد کر سکیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ مدد کے لیے پکارے۔ مگر اس پکار کا اثر الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ مدد کے بجائے مصیبت بھی پہنچ سکتی تھی۔

وہ شکنجے میں پھنسی کراہتی رہی اور آمدہ گھڑیوں کا انتظار کرتی رہی..... گاہے بہ گاہے وہ اپنے پاؤں کو چھڑانے کی کوشش کرتی تھی مگر ہر بار ناکام ہوتی تھی۔ ٹخنے سے اوپر اس کی پنڈلی جیسے دم بہ دم درد سے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جب ذہنی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے تو جسمانی تکلیف اس میں دب جاتی ہے، شانی کا حال بھی یہی

تھا۔ عام حالات میں شاید پنڈلی اور ٹخنے کی تکلیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی لیکن اب یہ تکلیف پس منظر میں تھی۔ پیش منظر میں بدترین خدشات تھے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی موت کب واقع ہونے والی ہے؟ اس کی موت کتنی سہل یا کتنی اذیت ناک ثابت ہونے والی ہے..... اور اگر اس کی قسمت میں ابھی مزید زندگی بھوگنا لکھا ہے تو اس زندگی کی نوعیت کیا ہوگی؟

گھڑسوار کوٹھی کے بیرونی گیٹ سے یک اپ کے پیچھے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے کچھ ساتھی بھی یک اپ کے تعاقب میں چل پڑے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ نارپور کے چوہدریوں کو چوہدری بشیر کی ہوشیاری کا پتا چل گیا ہو۔ وہ جان گئے ہوں کہ شانی تو کوٹھی میں موجود ہی نہیں۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر قرب و جوار میں اس کی تلاش وسیع پیمانے پر شروع ہوسکتی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں الجھ رہی تھی جب یکا یک اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... کوئی نادیدہ شخص اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ بہ مشکل پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر اسے ٹارچ کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی شاخوں اور پتوں کے سرسرانے کی آوازیں آئیں۔ یہاں سبزہ اتنا گنجان تھا کہ اس میں سے راستہ بنا کر گزرنا پڑتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی مختلف اطراف میں حرکت کرتی دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔ جیسے دام میں پھنسا ہوا کوئی چرندہ، اپنے شکاری کو قریب دیکھ کر آخری بار خود کو چھڑانے کی فطری کوشش کرتا ہے، شانی نے بھی تڑپ مچل کر اپنا ٹخنہ جڑوں کے ''دو شاخ'' میں سے نکالنا چاہا۔ اس نے اپنے آزاد پاؤں کی دھکیل کے ساتھ زخمی پاؤں کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی..... مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سسکاریاں نکل کر رہ گئیں۔ وہ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ اس کے آزاد پاؤں پر کیچوا یا اسی قسم کا کوئی دوسرا کیڑا رینگ رہا ہے۔

ٹارچ بردار دائیں بائیں بھٹکنے کے بعد اب سیدھا پیپل کی طرف آ رہا تھا۔ شاید گیلی زمین پر پاؤں کے نشانات سے بھی اسے کچھ مدد مل رہی تھی۔ شانی کی نگاہوں کے سامنے اس کا ہیولا اب بالکل واضح تھا، یقینی بات تھی کہ وہ گھڑسوار یا ریاست میں سے ایک ہے۔ تاہم اس کی قد و قامت سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ دونوں ہی لمبے تڑنگے تھے۔ صرف ایک بات تھی جو شانی کی تشویش میں اضافہ کر رہی تھی۔ اگر یہ شخص ریاست تھا تو پھر اسے خاموش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے شانی کو پکارنا چاہیے تھا۔ وہ پکار نہیں رہا تھا۔ بس خاموشی سے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر اس کی کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی تھی..... وہی امید جو ''تختہ نکلے'' تک موجود رہتی ہے..... ٹارچ کی روشنی زمین پر پھینکتا قریب آتا چلا گیا۔ تب ٹارچ کی روشنی شانی کے چہرے پر پڑی اور ساکت ہوگئی۔ وہ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر وہ روشنی کے عقب میں تھا اس لیے چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شانی کو لگا' وہ ریاست ہے۔

''کک..... کون.....؟ ریاست؟'' شانی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''ریاست کی ماں کا سر، میں تیرا خصم بابر ہوں..... حرامزادی'' ایک دیہاتی آواز نے کڑک کر کہا اور اس کے ساتھ ہی شانی کے بھیگے بال ایک بے رحم گرفت میں جکڑ گئے۔

وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ یک اپ کے قریب ہونے والی لڑائی میں ریاست کو مات ہوئی تھی۔ اب نارپور کا غصیلا گھڑسوار اس کے سامنے تھا۔

شانی اب اس کے مدھم خدوخال دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ناک غیر معمولی طور پر موٹی تھی۔ بال گھونگریالے اور جڑے چوڑے تھے۔ اس کی پیشانی سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ لڑائی میں اس کی پگڑی کہیں گر گئی تھی۔ سویٹر اور کرتہ دونوں اس طرح پھٹے ہوئے تھے کہ پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔ اس کے خدوخال گواہی دے رہے تھے کہ وہ مہر جی کے خانوادے کا ہی کوئی بگڑا ہوا چوہدری زادہ ہے۔ وہ بے حد طیش میں تھا۔ شانی کے بال مٹھی میں جکڑنے کے لیے اس نے اپنی رائفل پیپل کے تنے سے نکادی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی سیدھی شانی کی آنکھوں میں گھس رہی تھی۔

''چل..... کتے کی بچی..... اٹھ..... وہاں کوٹھی میں تیرے دو سو مہاراج تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تو ماں کی رن یہاں آدھی رات کو اپنی پت مار رہی ہے (نہا رہی ہے)''

اس نے شانی کو بازو سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ شانی کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔ اس وقت گھڑسوار کو پتا چلا کہ شانی کا پاؤں کہیں پھنسا ہوا ہے۔

اس نے ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ ''باہر نکل..... کہہ ٹانگ پھنسا بیٹھی ہے بھگوڑی؟'' وہ بے حد کرخت آواز میں بولا۔

شانی اس مرتبہ چلا اٹھی۔ گھڑسوار نے ٹارچ کی روشنی گڑھے میں پھینکی۔ پھر شانی کا بازو چھوڑ کر ایک ہاتھ پانی میں گھسایا۔ اس نے ٹٹول کر وہ ''دو شاخہ'' جڑیں دریافت

جنہوں نے شانی کا ٹخنہ بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس نے ٹارچ بھی ایک طرف رکھ دی اور دونوں ہاتھ پانی میں ڈال کر شانی کا ٹخنہ چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کی زور آزمائی کے سبب شانی درد سے چیخ اٹھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ٹانگ دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ درحقیقت پاؤں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ شانی جب بھاگتی ہوئی آئی تھی تو جسمانی وزن کے سبب پاؤں مضبوط جڑوں میں گھس تو گیا تھا مگر اب اس کو واپس کھینچنا ناممکن ہو رہا تھا۔ دوسری طرف یہ بابر نامی گھڑسوار تھا کہ جلد از جلد اس کی ٹانگ گڑھے میں سے کھینچ لینا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ شانی کے سلسلے میں بے حد پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے اپنے خاندانی دشمنوں کی بیٹی کو چوری چھپے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ نہ صرف پکڑا تھا بلکہ یہ کارنامہ تن تنہا انجام دیا تھا۔ اب وہ اسے جلد از جلد کوٹھی میں اپنے بھائی بندوں کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔ فخر سے سینہ تان کر یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کس طرح جان خطرے میں ڈال کر اکیلے یک اپ کا پیچھا کیا اور چوروں کی طرح بھاگتی ہوئی دشمن زادی کو پکڑا۔

بارش کچھ تیز ہوگئی تھی۔ شانی کی بے بسی بڑھتی جا رہی تھی۔ بابر نامی یہ گھڑسوار بے رحمی سے شانی کی ٹانگ کو جھٹکے دے رہا تھا اور ہر بار جب وہ ایسا کرتا' شانی تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ وہ جھلاہٹ آمیز انداز میں گالیاں بکنے لگا۔ شانی کو برا بھلا کہنے لگا۔ ''یہاں تیری بے بے بیٹھی ہوئی تھی جو بھاگی آ رہی تھی اس طرف.....؟ ہاں کہاں جا رہی تھی؟ کہاں جا رہی تھی؟'' اس نے شانی کے سر کو زور سے جھٹکا دیا..... وہ سسکنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔

''یا کوئی تیرا یار تھا، کون تھا یہاں.....؟'' اس نے پھر شانی کے سر کو جھٹکا دیا۔ وہ کچھ نہیں بولی تو وہ بڑبڑانے لگا ''اندھی کہیں کی ٹانگ بھی پھنسائی ہے تو کیسی بھیڑی جگہ پر۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر کو جھٹک کر گڑھے سے پانی نکالنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کام کے لیے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو پیالے کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ٹارچ ایسے انداز سے رکھ دی تھی کہ اس کی روشنی گڑھے پر پڑ رہی تھی، لیکن یہ روشنی گڑھے پر پڑنے کے ساتھ ساتھ شانی کے زیریں جسم پر بھی پڑ رہی تھی۔ گڑھے سے پانی نکالتے نکالتے یہ بابر نامی شخص جیسے ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں سے نکل کر اس نے جیسے پہلی بار غور سے شانی کو سر تا پا دیکھا تھا۔ وہ مصیبت میں تھی۔ بدحال تھی، لیکن حسن پھر بھی حسن ہوتا ہے۔ سات پردوں میں چھپ کر اور کیچڑ میں لتھڑ کر بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ٹارچ کی روشنی شانی کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر رخساروں سے چپکے تھے۔ بارش کا پانی قطرہ قطرہ اس کے چہرے اور گردن پر بہہ رہا تھا۔ وہ شروع میں اوندھی گری تھی مگر ٹانگ کے ساتھ مسلسل ہونے والی جدوجہد کے بعد اب وہ سیدھی ہوگئی تھی۔ بارش کے سبب اس کا لباس اس کے جسم کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ بابر نے ٹارچ زمین سے اٹھائی اور اس کی روشنی کو شانی کے جسم پر دھیرے دھیرے سرکانے لگا۔ پندرہ بیس سیکنڈ میں ہی اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ وہ عجلت اور تیزی اس کی حرکات و سکنات سے مفقود ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے تک دکھائی دیتی تھی۔ وہ چند گہرے سانسیں لے کر شانی کے قریب گیلی زمین پر بیٹھ گیا۔ عورت کی چھٹی حس اسے ''اس قسم'' کی تبدیلیوں سے بہت جلد آگاہ کر دیتی ہے اور شانی نے تو اپنے بابل کے آنگن سے نکلنے کے بعد بس یہ ''تبدیلیاں'' ہی دیکھی تھیں۔ یہ چڑھی ہوئی سانسیں، یہ بہکی ہوئی نگاہیں..... یہ جسم کو کچلنے کے لیے بے تاب ہاتھ..... بابر نامی اس شخص کی حرکات و سکنات نے شانی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی..... اور خطرہ تو بالکل واضح تھا۔ یہ اندھیری، ابر آلود رات، یہ سنسان جنگل، ایک بااختیار مرد اور مجبور شانی۔ ان لمحوں میں وہ دام میں پھنسی ہوئی ہرنی کی طرح تھی شکاری رائفل بدست اس کے سر پر کھڑا تھا۔

پھر شکاری نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا، اس کی بھاری سانس شیطانی پھنکار کی طرح تھی۔ اس کا کھردرا ہاتھ شانی کے رخسار اور گردن پر پھسلنے لگا۔ اس کے بالوں میں الجھنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو..... پیچھے ہٹ جاؤ مجھ سے.....''

''اوہو..... ہو..... رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''دیکھو، میرے قریب آئے تو میں اپنی جان لے لوں گی۔ ختم کرلوں گی خود کو.....''

''ختم تو اب تم نے ہو ہی جانا ہے میری جان..... اگر..... اس سے پہلے کسی کا تھوڑا سا فائدہ ہو جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔'' وہ ڈھٹائی اور بے رحمی سے بولا۔

''کک..... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''گل یہ ہے میری سوہنی کہ تیرے مقدر کا فیصلہ تو کوٹھی میں ہو چکا ہے۔ اب تیری جان بچتی نظر نہیں آتی ہے۔ بھائیا بشیر تیرے بدلے اپنی جان دینے سے تو رہا۔ جان تو خیر سے

تجھے ہی دینی پڑے گی۔"

"کیوں جان دینی پڑے گی۔ میں نے کیا کیا ہے۔"

"اوہو..... ہو..... تو نے کچھ کیا ہی نہیں۔" اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں شانی کے دونوں رخساروں کو اس طرح دبایا کہ شانی کا بالائی ہونٹ ناک کی نوک سے چھونے لگا۔ اور شکل مضحکہ خیز بن گئی۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولا "تو نے اس کتے رستم سیال کے ساتھ ساز باز کی۔ تو نے اسے حویلی میں بلایا۔ تو نے اس کے ہاتھوں بھائی فاخر اور مہر جی کو قتل کرایا۔ تو نے اس کے ہاتھوں ہماری پرکھوں کی حویلی کو آگ لگوائی۔ ہمارے درجنوں بھین بھرا سڑ کر سواہ ہو گئے..... اور ماں کی لاڈو.....! تو کہتی ہے کہ تو نے کچھ کیا ہی نہیں....." شانی کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا، لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ اگر رستم میرے کہنے سے حویلی میں آیا تھا تو پھر میں اس کے ساتھ حویلی سے جاتی..... اس کی حفاظت میں رہتی۔ میں تو لاہور میں تھی۔ چوہدری بشیر، جالاں، قادر اسب جانتے ہیں۔ وہ رکشا والا ذکریا گواہ ہے اس بات کا..... لیکن..... لیکن اس وقت یہ باتیں کرنے کا موقع نہیں۔ مجھے یہاں سے نکالو....." وہ کراہی۔

"تو جتنی مرضی صفائیاں پیش کرے پر سب جانتے ہیں کہ حویلی سے بھاگنے کے بعد تو کم از کم دو مہینے کہیں غائب رہی ہے۔ کہاں رہی ہے؟ یہ تو جانتی ہوگی یا تیرے ساتھ سونے والے تیرے عاشق جانتے ہوں گے۔"

"یہ سب..... بہتان ہے، بکواس ہے۔ میں تم لوگوں کے سامنے ہر ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔" شانی سسکاری لیتے ہوئے بولی۔

بابر نے ایک گہری سانس لے کر ایک بار پھر ٹارچ کا روشن دائرہ شانی کے جسم پر سرکایا۔ "میں اس بحث جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا میری دلبر جانی۔ میں تو بس تیری شہد بھری جوانی سے تھوڑا سا حصہ لینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوگا، یہ پھر دیکھا جائے گا....." وہ شانی کو دبوچتے ہوئے بولا۔

"خدا کا خوف کرو۔ تم نے بھی ایک دن اللہ کو جان دینی ہے۔" شانی کراہی اور اس کے ہاتھوں کو جھٹکا۔

"میں کافر نہیں ہوں میری جان! پر تو اتنی سوہن حلوہ ہے کہ دل ہاتھوں سے پھڑک کر نکل گیا ہے۔ شاید بھائیا بشیر تیرے لیے ٹھیک ہی جھلا ہوا ہے۔ تیرے پیچھے مکھڑے میں کوئی ایسی بات ہے کہ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی، بابر نے ہیجانی انداز میں دائیں بائیں دیکھا، پھر ایک جھٹکے سے اپنا لپٹا ہوا سویٹر اور کرتہ اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے شانی کی بھیگی ہوئی لمبی چوٹی پکڑی اور تیزی کے ساتھ اسے ایک شاخ کے گرد گرہ دے دی۔ جب وہ ایسا کر رہا تھا۔ شانی کے پاؤں کو زوردار جھٹکے لگے اور وہ درد سے چیخ اٹھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا "ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیوں عورت کو ایسے ذلیل کرتے ہو تم..... کیا ملتا ہے اس طرح تمہیں؟"

"بہت کچھ ملتا ہے....." وہ ہانپتے ہوئے لہجے لیکن پُرسکون انداز میں بولا "اور تم صرف عورت نہیں ہو۔ تم دشمن کی عورت ہو۔ دشمن کی عورت کو ذلیل کرنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔"

"تمہارے گھر کی کسی عورت کے ساتھ کوئی ایسا کرے تو پھر.....؟"

اس نے پھر شانی کے رخساروں کو اپنے ہاتھ میں جکڑا اور پھنکارا "جو کرتا ہے، وہی بھرتا ہے، جنہوں نے کیا ہی نہیں وہ بھریں کیوں؟"

شانی اس کی آنکھوں میں وحشت کی چنگاریاں دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے ریاست کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اسے مار دیا تھا یا کہیں بے ہوش کر کے پھینک آیا تھا۔ اب وہ اس بھیگے ہوئے ویرانے میں مختارِ کل تھا۔ شانی بھانپ رہی تھی کہ اس کی موت اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اگر شیطان صفت بابر نے وہ "سب کچھ" کر لیا جو وہ کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ وہ شانی کو زندہ سلامت اپنے بھائی بندوں کے سامنے پیش کرے..... اور اپنے کرتوت کا پول کھلوائے۔ اس کے لیے یہ بہانہ بنانا بہت آسان تھا کہ اس نے مفرور شانی اور اس کے ساتھی کو بھاگنے سے روکنے کے لیے گولی ماری۔

اور حقیقت یہ تھی کہ شانی کو موت سے کسی طرح کا خوف بھی نہیں آ رہا تھا۔ بھابو کی ابدی جدائی اور رستم کی ممکنہ موت کے بعد اب اسے زندگی بے حد ناگوار محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ عزت سے مرنا چاہتی تھی۔ اس مخنوق گڑھے کے کنارے ایک وحشی بلی مار کے ہاتھوں تار تار ہو کر مرنے کا تصور بے حد اندوہ ناک تھا۔ بابر نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما اور اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ شانی کا مخنہ اذیت کے ناقابلِ بیان شکنجے میں تھا مگر جو شخص شانی کو موت تک دھکیلنے کا ارادہ رکھتا تھا، اسے مخنے کی تکلیف

کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ بالکل جنونی دکھائی دینے لگا تھا۔

اچانک وہ رک گیا۔ شاید اس نے کچھ سنا تھا۔ ایک مدھم سی آہٹ تو شانی نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ شانی سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ شروع میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ کسی جانور کی آواز تھی یا کسی انسان نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا تھا۔ کچھ دیر تک سن گن لینے کے بعد بابر ایک بار پھر شانی کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس مرتبہ اس نے رائفل اپنے بالکل قریب رکھ لی تھی۔ دفعتاً ایک بار پھر آواز بلند ہوئی۔ اس مرتبہ یہ خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی آواز تھی اور یہ ایک نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ تین چار افراد جھاڑ جھنکاڑ میں راستہ بناتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بابر نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کی حرکات وسکنات سے ہراس ٹپکنے لگا تھا۔ وہ جھک کر رائفل کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب شانی کو ایک رسی جیسی شے ہوا میں لہراتی نظر آئی۔ یہ شے بابر کی گردن کی طرف بڑھی..... اور وہ جھٹکے سے پشت کے بل گرا۔ اس کے سینے سے ایک ڈری ہوئی طویل آواز نکل گئی تھی۔ ایک شخص جست لگا کر بابر کی طرف بڑھا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اسی دوران میں تین چار مزید افراد نمودار ہوئے اور بابر پر پل پڑے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی انہوں نے اسے بے بس کر دیا۔ تب شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ مچلتے پھڑکتے بابر کو کسی شے سے باندھ رہے ہیں۔ بابر گالیاں بک رہا تھا اور خالص پنجابی زبان میں حملہ آوروں کو بدترین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ جواب میں ایک حملہ آور بھی اسے گالیوں سے نواز رہا تھا۔ جب بابر کی طرف سے قدرے اطمینان ہو گیا تو ایک شخص شانی کی طرف متوجہ ہوا۔ شانی کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سخت سردی میں بھی اس شخص کا بالائی جسم عریاں تھا۔ زیریں جسم پر ایک دھوتی نما شے دکھائی دیتی تھی۔ اس نے زمین پر پڑی ٹارچ اٹھائی اور اسے روشن کر کے دھیان سے شانی کو دیکھا۔ پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بابر کے ساتھ زور آزمائی میں شانی کی چوٹی کی گرہ شاخ پر سے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے یہ چوٹی شاخ سے چھڑا دی۔ تب اس نے پکارنے والے انداز میں کہا ''راجے.....! ادھر آ.....''

لمبا اونی چغا پہنے ہوئے ایک شخص پیپل کے نیچے آ گیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پہلے شخص نے کہا ''لگتا ہے اس کڑی کی ٹانگ نیچے جڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا کچھ کرو.....''

راجے نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک ساتھی کو بھی بلا لیا۔ اس شخص نے بھی موٹا چغا پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سردی سے بچانے کے لیے ایک صدری بھی اس کے جسم پر موجود تھی۔ وہ دونوں شانی کی ٹانگ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پانی میں ہاتھ ڈال کر ان جڑوں کو ٹٹولنے لگے جنہوں نے ٹخنے جکڑ رکھا تھا۔ شانی ایک بار پھر کراہنے لگی۔ پہلے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ گڑھے کو پانی سے خالی کر دیں۔ ان دونوں نے ہاتھوں کے پیالے بنائے اور بچا کھچا پانی گڑھے سے نکالنے لگے۔ دوسری طرف بابر دو آدمیوں کی گرفت میں مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی گئی ہیں۔ اس دوران میں اس کا منہ بھی بند کر دیا گیا۔ غالباً کوئی کپڑا وغیرہ ٹھونس دیا گیا تھا۔ اب بس وہ غوں غاں ہی کر پا رہا تھا۔ کہیں پاس سے ہی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں نے بابر کا گھوڑا ڈھونڈ لیا ہے۔ اگر انہوں نے گھوڑا ڈھونڈ لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ چوہدری کے وفادار کارندے ریاست کو بھی زندہ یا مردہ ڈھونڈ چکے ہوں گے۔ یہ کون لوگ تھے۔ یہاں سنسان رکھ میں کیا کر رہے تھے۔ اب وہ بابر کے بعد ان کی دسترس میں تھی۔ وہ اس سے کیا اچھا یا برا سلوک کرنے والے تھے؟ ایسے کئی سوالات شانی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ ٹارچ کے روشن دائرے کا رخ تو گڑھے کی طرف ہی تھا تاہم اس کی روشنی میں اردگرد کا منظر بھی کچھ واضح ہو گیا تھا۔ جو شخص سب سے پہلے شانی تک پہنچا تھا وہ عام جسم کا تھا لیکن اس کے شانے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ اس نے ٹنڈ کرا رکھی تھی۔ اور کھچڑی داڑھی جھاڑ جھنکار کی طرح نظر آتی تھی۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا۔ شانی نے اس کے گلے میں موٹے منکوں کی مالا نظر آئی۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں شے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ بڑی گونجدار آواز میں بولتا تھا جیسے ریڈیو یا ٹی وی پر اناؤنسمنٹ کی جا رہی ہو۔ گڑھا پانی سے خالی ہو گیا تو ٹارچ کی روشنی میں شانی کا پاؤں جڑوں کے دوشاخے میں سے چھڑانے کی کوشش کی جانے لگی۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ شانی بار بار تڑپ جاتی تھی۔ ٹنڈ والے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو روک دیا۔ ''پاؤں بری طرح پھنسا ہوا ہے، جڑوں کو کاٹنا پڑے گا کاکا۔'' اس نے گونجدار آواز میں کہا۔

''سرمد کے پاس کلہاڑا ہے پیر بادشاہ.....'' راجا نے کہا۔

''کھوتے! یہ کلہاڑی کا کام نہیں۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ کہیں سے آری وغیرہ کا بندوبست کرو۔''

''جی پیر بادشاہ.....'' راجا نے سر جھکایا۔

''چلو پھر جاؤ..... جلدی کرو، یہاں سردی بہت زیادہ ہے، کہیں سارے کے سارے اکڑ ہی نہ جائیں۔''

راجا اور سرمد جانے لگے تو ٹنڈ والے نے کہا ''اس جنگلی ریچھ (ریچھ) کو بھی اٹھا کر لے جاؤ یہاں سے۔'' اس کا اشارہ بابر کی طرف تھا۔

''آ..... آپ یہاں اکیلے رہیں گے۔'' راجا نے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں..... کوئی بات نہیں۔ بس تم آری لے کر آنا۔''

راجا نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ تین بندوں نے بندھے ہوئے گرانڈیل بابر کو اٹھا کر جھاڑیوں کا رخ کیا۔ چوتھے نے اس کی رائفل اٹھالی تھی۔ چند سیکنڈ بعد مختلف آوازوں سے..... اندازہ ہوا کہ وہ بابر کو گھوڑے پر لاد رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ وہ اپنے ڈیرے کی طرف چلے گئے ہیں۔

ٹنڈ والے نے ٹارچ اٹھائی اور اس کا روشن دائرہ دھیرے دھیرے شانی کے پورے جسم پر سرکایا۔ یہ وہی انداز تھا جو آدھ پون گھنٹا پہلے بدفطرت بابر نے اختیار کیا تھا۔ شانی کے دل میں نئے وسوسے سر ابھارنے لگے۔ جس شخص کو پیر بادشاہ کہا گیا تھا وہ کافی عمر کا تھا۔ مگر اب تک کے تجربوں نے شانی کو تو یہی بتایا تھا کہ عمر، حلیہ، پیشہ، رشتہ، کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اگر کوئی چیز معنی رکھتی ہے تو وہ جنس ہے۔ یہ ایک ایسے دیو کی طرح ہے جو ذرا سا موقع ملنے پر بند بوتل سے نکلتی ہے اور ہر اخلاقی قدر کو پامال کر دیتی ہے۔ اس نے بہت سنا تھا کہ اکیلی عورت کے لیے یہ دنیا درندوں سے بھرے ہوئے تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے، کوئی آنکھ اسے رحم کی نظر نہیں سے دیکھتی۔ ہر کوئی پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ وہ اس عملی تجربے سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پتھرائی ہوئی تھیں اور ہر اچھے برے انسان پر سے اس کا یقین اٹھ گیا تھا۔

شانی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج ایک ہی رات میں دوسرے ہوس کار سے اس کا واسطہ پڑنے والا ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں شانی کو بڑے دھیان اور بے پناہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شانی کی خوبصورتی کا عکس اس کی سرمے سے سنی ہوئی آنکھوں میں واضح طور پر ابھر رہا تھا۔ اس نے اپنے لمبے ہاتھ کی پشت ہولے ہولے شانی کے بھیگے رخسار پر پھیری۔

''بالکل ریشم ہو..... بہت نازک..... بہت ملائم.....''

شانی نے روتے ہوئے کہا ''میری ایک بات مانو گے؟''

''تم سو باتیں کہو..... کیوں نہیں مانوں گا۔''

''مجھے مار دو..... میں اپنا خون تمہیں معاف کرتی ہوں۔ میرا گلا گھونٹ دو یا کوئی پتھر اٹھا کر میرے سر پر مار دو۔ خدا کے لیے میری جان لے لو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' رنگ والی کے چوہدری ارشاد کی بیٹی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ ہنسا اور اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی۔ ''پیر بادشاہ کے ہوتے ہوئے تم موت کی تمنا کر رہی ہو؟ بڑی جھلی ہو۔ اوئے ہم تو مُردوں کو جینا سکھا دیتے ہیں، تم تو پھر سر سے پاؤں تک زندگی سے بھری ہوئی ہو۔ سولہ آنے فٹ ہو زندہ رہنے کے لیے.....'' اس نے شانی کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

شانی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کراہ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ سنبھالنے والے انداز میں بولا ''جھلیے! درویشوں، ملنگوں کے ساتھ اتنا غصہ نہیں کرتے۔ اگر میرے ساتھ میٹھا بول بولے گی تو دیکھنا سواہ (راکھ) کی دو چٹکیوں سے تیرا ہر دکھ درد دور کر دوں گا۔''

شانی کا دل غم و غصے سے لبریز تھا۔ وہ چلا کر بولی ''میں لعنت بھیجتی ہوں میں لعنت بھیجتی ہوں۔''

''کس پر لعنت بھیجتی ہو.....؟''

''تم جیسے درویشوں ملنگوں پر..... تم جیسے بہروپیوں پر..... تم جیسے جتنے سائیں جی، حضرت جی، پیر جی ہیں، میں سب پر تھوکتی ہوں۔ میں تھوکتی ہوں۔ دور چلے جاؤ مجھ سے..... دور ہٹ جاؤ.....''

وہ اپنی جگہ پتھرا سا گیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ نے حرکت کی، شاید وہ شانی کو چھونا چاہتا تھا۔ وہ گرجی ''خبردار مجھے ہاتھ لگایا تو، میں تمہارا منہ نوچ لوں گی، دور رہو مجھ سے۔''

ایک عجیب جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی شانی پر۔ غم کی انتہا کو چھو کر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ان لمحوں میں کوئی ہتھیار یا آلہ اس کے پاس ہوتا تو وہ سچ مچ اپنی جان لے لیتی۔ اس کا دل اندوہ سے لبالب تھا۔ وہ اس دنیا سے کچھ نہیں مانگ رہی تھی۔ اپنے بچھڑے ہوئے رشتے، نہ اپنی جوانی، نہ اپنی محبت، وہ تو بس موت مانگ رہی تھی عزت کی موت، اور یہ دنیا بھی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے لیے بھی

ترسا رہی تھی۔ کتنے نامہربان ہوگئے تھے یہ لوگ۔ کتنے سنگدل؟ کتنے وحشی؟

وہ کچھ دیر تک بہ غور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اب بارش تھم گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ سردی پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ ''تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔ میں تمہارے لیے آگ جلاتا ہوں۔'' اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

پھر شانی کا جواب سنے بغیر وہ درختوں کی طرف چلا گیا۔ دو چار منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ لکڑیاں تھیں اور پرالی تھی۔ اس نے چند اینٹیں جوڑ کر شانی کے بالکل پاس ہی ایک چولھا سا بنا دیا۔ پھر کچھ پتلی لکڑیاں خشک پرالی کے ساتھ رکھیں۔ پرالی کو آگ جلدی پکڑ لیتی ہے۔ اس شخص نے دیا سلائی جلائی اور دو تین منٹ کے اندر ہی شانی کے پاس الاؤ سا بھڑکا دیا۔ اس الاؤ نے شانی کے بھیگے اور ٹھٹھرے ہوئے جسم کو قدرے راحت دی۔ لیکن جب دل راحت سے خالی ہو تو جسمانی سکون کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تڑتڑ کرتے الاؤ کی سرخ روشنی میں شانی نے غور سے اس پیر بادشاہ کو دیکھا۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا سر صفاچٹ اور داڑھی خودرو تھی۔ اگر اس کا حلیہ ڈھنگ کا ہوتا تو شاید اسے ایک خوبصورت ادھیڑ عمر شخص کہا جا سکتا، نجانے کیوں شانی کو لگا جیسے اس نے کہیں ماضی میں اس شخص کو دیکھا ہوا ہے۔

اس نے دو اینٹیں جوڑ کر ایک چوکی سی بنالی اور اس پر بیٹھ کر آگ کی حدت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں زندگی نے کافی دکھ دیے ہیں۔'' اس نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔'' شانی کراہی۔

''ضرورت ہے..... میرا بچہ ضرورت ہے۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

شانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی، اس کا فقرہ پوری شدت سے شانی کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس فقرے میں دو لفظ ایسے تھے جنہوں نے شانی کو سرتاپا ہلا دیا تھا..... ''میرا بچہ'' یہ وہ دو لفظ تھے جو بے حد بے ساختہ انداز میں اس شخص کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ کوئی ایسی بات تھی ان الفاظ میں کہ شانی کے اندر کی دنیا تہ و بالا ہوگئی۔ وہ اسے دھی رانی کہتا، بیٹی کہتا یا اس طرح کا کوئی اور لفظ استعمال کرتا تو شاید اس کا وہ تاثر نہ ہوتا جو ''میرا بچہ'' کا ہوا تھا۔ شانی کو یہی لگا کہ جیسے وہ واقعی ایک چھوٹی سی بچی ہو، درد سے رو چلا رہی ہو اور مہربان بزرگ نے اسے گود میں لے کر اور ''میرا بچہ'' کہہ کر ہلکورے دینا شروع کر دیے ہوں۔

وہ اپنے ''بے پناہ'' لفظ کے غیر معمولی تاثر سے بے خبر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں کیونکہ مصیبتوں کے کالے سائے تیرا پیچھا کر رہے ہیں اور تو بھاگ بھاگ کر تھکی ہوئی ہے۔ بہت تھکی ہوئی۔ پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرا بچہ.....! جہاں حبس بہت ہوتا جاتا ہے وہاں تیز ہوا ضرور چلتی ہے اور جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے وہیں پر سویرے کی بنیاد پڑتی ہے۔ بس ہمت کی ہمت نہیں ٹوٹنی چاہیے۔ اس کا ایمان اس بات پر ہونا چاہیے کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

وہ ٹکر ٹکر صفاچٹ سر والے باریش شخص کو تکتی جا رہی تھی۔ یہ تو وہی بات تھی جو کبھی اس کے ابا جی کہا کرتے تھے۔ فرق میں فرق ضرور تھا مگر مفہوم تو وہی تھا، اس شخص نے گہری سوچ میں کہا ''میں جانتا ہوں تیرے دماغ میں بہت سے سوال مچل رہے ہیں۔ کچھ میرے بارے میں، کچھ اس جنگلی رقبے کے بارے میں جسے میرے ساتھی اٹھا کر ڈیرے پر لے گئے تھے اور کچھ اس بندے کے بارے میں جس کے ساتھ تو گاڑی میں جا رہی تھی۔''

''ہاں..... ہاں..... وہ کہاں ہے.....؟'' شانی نے پوچھا۔ اس کا اشارہ ریاست کی طرف تھا۔

''وہ ہمیں گاڑی کے پاس ملا ہے۔ وہی گاڑی جس میں دریاں اور قناتیں شناتیں لدی ہوئی ہیں۔ وہ وہاں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر پر کافی چوٹ آئی ہے۔ میرے ساتھی اس کی مرہم پٹی کر رہے ہیں۔''

''وہ بچ جائے گا ناں.....؟''

''اللہ نے چاہا تو بچ جائے گا.....''

اتنے میں شانی نے دیکھا۔ ایک بندہ بھاگتا ہوا پیچھے کی طرف آ رہا تھا۔ یہ وہی راجا نامی شخص تھا جسے باریش شخص نے آری لانے کے لیے کہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی آری موجود تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا، شاید کہیں دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس نے لالٹین گڑھے کے اندر شانی کے پاؤں کے بالکل پاس رکھ دی۔ پھر اپنے پیر بادشاہ، کی ہدایات کے مطابق بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ ایک موٹی جڑ کو کاٹنے لگا۔ پاؤں اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ جڑ کی تھوڑی سی جنبش بھی شانی کو تڑپا دیتی تھی۔ شانی کا دھیان بٹانے کے لیے باریش شخص شانی سے

ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد جڑ کٹ گئی۔ شانی کو یوں لگا کہ پاؤں کسی آہنی شکنجے سے آزاد ہوا ہے۔ اس نے گھوم کر لالٹین کی روشنی میں دھیان سے دیکھا۔ ٹخنے کے اوپر سے کافی کھال چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ باریش شخص نے ایک صافا نما کپڑا شانی کے ٹخنے پر باندھ دیا اور بڑی شفقت کے ساتھ اسے سہارا دے کر چند قدم چلنے کے لیے کہا۔

شانی نے چل کر دیکھا۔ درد ضرور ہو رہا تھا مگر ہڈی سلامت تھی۔ اسی دوران میں دو افراد بابر کے گھوڑے کے ساتھ درختوں سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی پیر بادشاہ کے دیگر ساتھیوں کی طرح لمبے چغے پہن رکھے تھے۔ ان کے سر کے بال صاف تھے اور داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ دبلے پتلے جسموں والے یہ مسکین صورت لوگ تھے۔ بارش ایک بار پھر شروع ہوگئی تھی۔ شانی کو جلد از جلد کسی چھت کی ضرورت تھی۔ باریش شخص ''پیر بادشاہ'' کے ساتھیوں نے شانی کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ اپنے زخمی پاؤں کی وجہ سے شانی کے لیے گھوڑے پر توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا، حالانکہ رنگ والی میں وہ چاندنی راتوں میں حویلی کے وسیع احاطے کے اندر باقاعدہ گھڑ سواری کیا کرتی تھی۔ شانی کو گھوڑے کی پشت پر مشکل میں دیکھا تو باریش شخص نے از خود گھوڑے کی رکاب میں اپنا ننگا پاؤں رکھا اور شانی کے عقب میں بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی نرمی سے شانی کو تھام لیا۔ شانی نے اس کی نرم داڑھی اپنے سر اور گردن کے پچھلے حصے پر سرسراتی محسوس کی۔ پھر شانی نے محسوس کیا کہ اس کی پشت باریش شخص کے چوڑے سینے سے چھو رہی ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ایک غیر مرد تھا لیکن پتا نہیں کیوں، شانی کو وہ اپنا لگا۔ بہت ہی اپنا۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ اپنی پشت کو اس کے سینے کے ساتھ کچھ اور بھی چپکا دے، بلکہ وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ٹیک لگا دے۔ اس کے جسم کی خوشبو اور اس کے پاکیزہ لمس کی لطافت کو محسوس کرتے ہوئے سکون کی نیند سو جائے مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ دل میں خود سے پوچھنے لگی۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے؟

گھوڑے کی لگام راجا کے ہاتھ میں تھی۔ باقی افراد پیچھے آ رہے تھے۔ بارش کی بوندیں برگ و بار پر ٹپ ٹپ کی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ تین چار منٹ کے مختصر سفر کے بعد وہ لوگ درختوں اور جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک ہموار قطعے پر پہنچے۔ یہاں گھاس پھونس کی چھتوں والی تقریباً نصف درجن جھونپڑیاں تھیں۔ ان میں سے دو تین جھونپڑیوں میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ کچھ بکریاں اور دو تین بھینس بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جھونپڑیوں کے عقب میں چند کھیت تھے۔

باریش شخص جسے اس کے ساتھی احترام سے پیر بابا یا پیر بادشاہ کہہ رہے تھے، ایک طویل جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اترا۔ بعد ازاں راجا اور سرمد کی مدد سے اس نے شانی کو بھی احتیاط سے گھوڑے سے اتارا اور سہارا دے کر جھونپڑی کے نیم گرم ماحول میں پہنچا دیا۔ یہ جھونپڑی اندر سے کافی کشادہ تھی۔ یہاں دو کھری چارپائیاں اور مٹی کے برتن وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ مٹی کی ہی ایک انگیٹھی میں چند ایک ادھ بجھے انگارے بھی موجود تھے، جھونپڑی کے پچھلے حصے کو ایک پردے کے ذریعے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ شانی نے قیافہ لگایا کہ اس حصے میں پیر بادشاہ کی بیوی یا کوئی اور خاتون خانہ موجود ہوگی۔

اب شانی پیر بادشاہ کو جھونپڑی کی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں سرمے کی دھاریاں تھیں اور کوئی سحر انگیزی کیفیت تھی۔ شاید اسی کیفیت کے زیر اثر شانی نے کچھ دیر پہلے خود کو ایک سحر میں جکڑا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ ابھی تک بابا یا پیر بادشاہ کی شخصیت کے حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ پیر بادشاہ نے شانی سے کہا ''تم اپنے یہ گیلے کپڑے بدل لو، کوئی زنانہ لباس تو یہاں ہے نہیں۔ فی الحال تمہیں مردانہ کپڑے ہی پہننا پڑیں گے۔''

اتنے میں راجا کسی لڑکے کی شلوار قمیص اور جرسی لیے اندر داخل ہوا۔ کپڑے شانی کے سامنے رکھنے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ پیر بادشاہ نے لالٹین اٹھائی اور بولا ''میرا بچہ.....! میں پچھلے حصے میں جا رہا ہوں۔ تم بڑے اطمینان سے کپڑے بدل لو.....''

اس نے طویل جھونپڑی کا درمیانی پردہ اٹھایا اور لالٹین سمیت پچھلے پورشن میں چلا گیا۔ جھونپڑی کے سامنے والے حصے میں تاریکی پھیل گئی۔ شانی نے جھونپڑی کا سامنے والا دروازہ اندر سے بند کیا اور صرف قمیص اور جرسی بدل لی۔ اس کی شلوار انگیٹھی کی حدت سے بتدریج خشک ہوتی جا رہی تھی۔

کپڑے بدلنے کے دوران میں شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جھونپڑی کے پچھلے حصے میں پیر بادشاہ کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ کبھی کبھی مدھم آواز میں بات چیت بھی سنائی دیتی تھی۔ شانی کا پاؤں اسے تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے پاؤں کو انگیٹھی سے قریب کھسکا دیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اور کسی وقت جھونپڑی کی کھڑکی سے باہر بجلی کی چمک بھی

محسوس ہوتی تھی۔ شانی کے ذہن میں رہ رہ کر ریاست کا خیال آرہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھا۔ باریش شخص (پیر بادشاہ) نے بتایا تھا کہ اس کے سر پر خاصی چوٹ آئی ہے۔

وہ بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ریاست کی حالت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نگاہ جھونپڑی کے وسط میں موجود بھاری پردے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ پیر بادشاہ اسی پردے کے پیچھے اوجھل ہوا تھا..... اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جھونپڑی عقب میں کسی دوسری جھونپڑی سے جڑی ہوئی ہے، کیونکہ جو مدھم آوازیں شانی تک پہنچ رہی تھیں، وہ ذرا فاصلے سے آرہی تھیں۔

اتنے میں جھونپڑی کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ دوسری طرف پیر بادشاہ کا ساتھی راجا تھا، اس کی آواز پہچان کر شانی نے لکڑی کا ٹیڑھا میڑھا دروازہ کھولا۔ راجا اپنے ہاتھوں میں مٹی کا پیالہ لیے اندر داخل ہوا۔ اس میں گرم دودھ تھا اور دودھ میں رس ڈبوئے گئے تھے۔ راجا نے سوندھی سوندھی خوشبو والا یہ پیالہ شانی کے قریب ایک لکڑی کی چوکی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کھلے منہ کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی شانی کے سامنے رکھی۔ اس میں سیاہ رنگ کی کوئی مرہم نما شے تھی۔ راجا بڑے یقین سے بولا ''دودھ رس کھانے کے بعد آپ یہ مرہم لگالیں جی۔ یہ پیر بابا کی کرشمے والی مرہم ہے۔ زخم کیسا بھی ہو۔ چوٹ ہو، ماس اترا ہو، کٹ لگا ہو، خدانخواستہ ہڈی ٹوٹی ہو، یہ مرہم سو دواؤں کی ایک دوا ہے۔''

شانی کچھ نہیں بولی۔ وہ ایسی باتوں پر کبھی یقین نہیں کرسکی تھی۔ اب کیسے کرتی۔ راجا نے جب دیکھا کہ شانی کا ردعمل حوصلہ افزا نہیں تو وہ خاموشی سے باہر چلا گیا ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اس ''معجزاتی دوا'' کے چند حیرت انگیز کرشمے بیان کرنے بیٹھ جاتا، شانی نے مرہم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دودھ بھی اسی جگہ رکھا رہا۔ شانی منتظر نگاہوں سے بھاری بھرکم پردے کی طرف دیکھتی رہی۔

دفعتاً اسے پردے کے پیچھے بھاگتے قدموں کی صدا سنائی دی۔ پھر مٹی کا کوئی برتن زمین پر گر کر ٹوٹا۔ اس کے بعد کسی مالا کے موٹے منکوں کی کھن کھن سنائی دینے لگی۔ پردے کے پیچھے کچھ ہو رہا تھا۔ کوئی پُراسرار کارروائی جاری تھی۔ شانی نے چند منٹ مزید انتظار کیا، پھر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی بھاری پردے کی طرف گئی۔ اس نے پردے کو درمیان سے ذرا سا واکر کے پچھلے حصے میں جھانکا۔ اس کا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ چوہدری بشیر کا وفادار کارندہ ریاست شدید زخمی حالت میں ایک چارپائی پر [illegible] اس کے سر کی چوٹ شانی کی توقع سے کہیں زیادہ سنگین [illegible] اندازہ ہوتا تھا کہ لڑائی کے دوران میں ریاست کا [illegible] شدت کے ساتھ پک اپ کے کسی ٹھوس حصے سے ٹکرایا [illegible] بابر نے اپنی وزنی رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال [illegible] ہوئے ریاست کے سر پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس [illegible] کے وسط سے شروع ہونے والا زخم پیشانی کے درمیان [illegible] چلا گیا تھا۔ کھوپڑی کے متاثرہ حصے سے خون بہہ بہہ کر صرف تکیے کو بھگو چکا تھا بلکہ چارپائی سے نیچے بھی ٹپکا تھا۔ [illegible] کی بات یہ تھی کہ اس زخم کو کسی شے سے ڈھکا نہیں گیا تھا [illegible] ہی مروجہ اصول کے تحت..... زخم پر دباؤ کے ذریعے خون روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ریاست کا چہرہ ہلدی کی طرح [illegible] تھا۔ وہ گہری بیہوشی میں تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ قریب المرگ ہے۔ جس باریش کو اس کے ساتھ پیر بابا اور پیر بادشاہ کہہ رہے تھے وہ ''بے سدھ ریاست'' [illegible] پہلو میں کھڑا تھا۔ موٹے دانوں والی مالا اب اس کے [illegible] کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک ہاتھ اپنی پشت [illegible] رکھے مضروب پر جھکا ہوا تھا۔ جس طرح فرنیچر پر پالش [illegible] رنگ کرنے والے اپنے ہاتھ کو تسلسل کے ساتھ اوپر [illegible] حرکت دیتے ہیں اسی طرح پیر بادشاہ بھی دے رہا تھا۔ [illegible] اپنے موٹے دانوں والی مالا کو ریاست کی پیشانی سے اس [illegible] جسم پر رگڑنا شروع کرتا تھا اور پیٹ تک لے آتا تھا، پھر [illegible] سے شروع ہو کر پیشانی تک چلا جاتا تھا۔ اس کا ایک ساتھی [illegible] کا بڑا پیالہ لیے ریاست کے سرہانے کھڑا تھا اور گاہے [illegible] پیالے میں سے تھوڑا سا پانی لے کر اس کے چھینٹے گرا [illegible] ریاست کے چہرے پر دیتا تھا۔ چہرہ جو بتدریج موت کی [illegible] میں چھپتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ تقریباً..... ویسا ہی منظر تھا [illegible] شانی نے چند روز پہلے چوہدری بشیر کی کوٹھی میں بھابو [illegible] حوالے سے دیکھا۔ بھابو مر رہی تھی۔ اسے فوری طور [illegible] اسپتال لے جانے کی ضرورت تھی اور شعبدہ باز حضرات [illegible] صاحب اس پر اپنے جادوئی ٹوٹکے آزمانے پر لگا ہوا تھا [illegible] یہاں بھی وہی عمل دہرایا جا رہا تھا۔ شانی نے بے چین [illegible] پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ اس کی آہٹ سنی تو پیر بادشاہ [illegible] اس کے ساتھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے [illegible] روہانسی آواز میں بولی ''خدا کے لیے..... بند کرو یہ سب [illegible] اس کی حالت خراب ہے۔ اسے کسی ڈاکٹر یا حکیم کے [illegible] لے جاؤ.....''

پیر بادشاہ کے چہرے پر عجیب سے تاثر ابھرا۔ [illegible]

مالا بے ہوش ریاست کے سینے پر رکھتا ہوا تیزی سے شانی کی طرف آیا اور اسے کندھوں سے تھام کر واپس جھونپڑی کے سامنے والے حصے کی طرف لے آیا۔ وہ اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا ''حوصلہ رکھ بچہ! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی حالت اب سنبھل گئی ہے۔ بس اب دو چار منٹ کی بات ہے.....''

''لیکن.....''

پیر بادشاہ نے منہ سے پچ پچ کی شفقت بھری آواز نکالی اور نفی میں سر ہلا کر شانی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، نجانے اس کے انداز میں کیا بات تھی کہ شانی مزید کوئی مزاحمتی بات نہ کہہ سکی۔ وہ اس کے سر پر تسلی بخش انداز میں ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس دوران میں پردے میں جنبش پیدا ہوئی اور سرمد نے بڑے مؤدب انداز میں جھک کر کہا۔ ''پیر بادشاہ! اس نے آنکھیں کھول دی ہیں۔''

پیر بادشاہ، شانی کو وہیں چھوڑ کر ایک بار پھر پردے کے عقب میں اوجھل ہوگیا..... چند سیکنڈ بعد جھونپڑی کے چوبی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور راجا اندر آگیا۔ اس نے سب سے پہلے دودھ والے پیالے کی طرف دیکھا۔ ''اوہو..... آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں۔''

''تو آپ یہ مرہم ہی لگالیتیں۔''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں کرنا..... میں ٹھیک ہوں۔''

''میرے لائق کوئی خدمت۔'' وہ بے حد حلیمی سے بولا۔ نجانے کیوں شانی کو اس سے کسی طرح کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ اب تک وہ جن حالات سے گزری تھی، وہ بے حد حوصلہ شکن تھے۔ کسی غیر مرد کی پرچھائیں بھی اسے ڈرا دیتی تھی۔

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''وہ بندہ کہاں ہے، جسے تم لوگ باندھ کر یہاں لائے ہو.....؟''

وہ اپنے مخصوص بے ضرر انداز میں مسکرایا۔ ''آپ ذرا غور سے سنیں۔ آپ کو کچھ آوازیں آرہی ہیں؟''

شانی نے اپنا سر جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ لگایا اور راجا کے انداز میں دھیان سے سننے کی کوشش کی، اسے غوں غاں کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ راجا نے کہا ''یہ وہی ہے ساتھ والی جھونپڑی میں پڑا ہے۔ بڑا غصے والا ہے، بہت اچھی طرح بندھا ہوا ہے پھر بھی خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

شانی نے کہا ''کیا تمہیں پتا ہے کہ یہ چوہدریوں کا بندہ ہے۔ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ اگر وہ اس بندے کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تو تم سب کے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی۔''

راجا کے اطمینان میں بالکل فرق نہیں پڑا۔ وہ بولا ''ایسی ساری باتیں پیر بادشاہ کے سوچنے کی ہوتی ہیں۔ ہم تو بس ان کے حکم پر چلتے ہیں۔ اب تک ہم نے جو کچھ کیا ہے ان کے حکم پر ہی کیا ہے۔ ہم سب سے پہلے گھوڑے کی آواز سن کر باہر نکلے تھے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ تھوڑی دور ایک پک اپ بھی درخت سے ٹکرائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہمیں آپ کا بے ہوش ساتھی ملا۔ اس کے بعد گیلی زمین پر پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے ہم اس پیپل تک پہنچ گئے جہاں یہ رائفل والا آپ کو گھیرے بیٹھا تھا۔''

شانی نے اس پیپل کے نیچے جو ڈیڑھ دو گھنٹے گزارے تھے ان کا تصور ہی لرزا دینے والا تھا۔ اس نے خود کو انسان سے زیادہ ایک بے بس جانور کی طرح محسوس کیا تھا، پھندے میں پھنسا ہوا ایک ایسا جانور جسے درندے پھاڑ کھانا چاہتے تھے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''تمہارے پیر بادشاہ کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی کیوں لگ رہی ہے۔''

وہ پھر مسکرایا ''ان کی شکل بہت سے لوگوں کو جانی پہچانی لگتی ہے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کو جو کچھ عرصہ پہلے تک فلمیں وغیرہ دیکھتے رہے ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ماضی میں فلموں کے مشہور اداکار آصف وارثی کو جانتی ہوں گی۔ یہ آصف وارثی ہی ہیں۔''

شانی کو یاد آگیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے تصور میں ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان کی شبیہ ابھری۔ جب وہ چھوٹی تھی تو عادل بھائی یا اباجی کے ساتھ کبھی کبھی لاہور کی سیر کو آیا کرتی تھی۔ عادل بھائی کے ساتھ اس نے چند فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ اسے وہ بھولے بسرے منظر یاد آگئے اور وہ سمجھ گئی کہ راجا نامی یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس بھیگے ہوئے ویرانے میں اس نے منڈے ہوئے سر اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والے جس شخص کو دیکھا تھا، وہ ماضی کا وہی خوبرو ہیرو تھا۔ حیرت کی ایک لہر شانی کے سینے میں اٹھ کر رہ گئی، وہ شخص جو مردانہ وجاہت کا نمونہ اور یقیناً لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا

ایک ننگ دھڑنگ سائیں کے روپ میں یہاں موجود تھا۔ اب شانی کی سمجھ میں یہ بات بھی آرہی تھی کہ پیر بادشاہ کی آواز ریڈیو آرٹسٹوں کی طرح گونجدار کیوں ہے۔

اس دوران میں وہ شخص بھاری پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ اس کے مدقوق چہرے پر اطمینان کی روشنی پہلے سے نمایاں تھی۔ وہ مسکرا کر بولا ''تمہارا سا اب ٹھیک ہے۔ اس نے مجھ سے بات کی ہے۔ تم بھی چاہو تو تھوڑی دیر میں اس سے بات کر سکتی ہو۔''

شانی خاموش رہی۔ راجا نے سر جھکا کر کہا۔ ''پیر بادشاہ.....! عظمت اللہ نے گاڑی اسٹارٹ کرلی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اسے یہاں لے آئیں؟''

''ہاں لے آؤ'' پیر بادشاہ نے کہا۔

شانی حیرت سے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ ماضی کے اس خوبرو و خوش لباس شخص نے خود کو اس طرح بدلا تھا کہ پہچان مشکل ہوگئی تھی۔

اس نے مٹی کی انگیٹھی میں تھوڑی سے لکڑیاں جھونکیں۔ جلد ہی آگ کی خوشگوار روشنی جھونپڑی کی دیواروں پر لرزنے لگی۔ بارش جاری تھی۔ پیر بادشاہ نے اپنے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور شانی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''تم نے ایسا کیوں کیا۔ ایک دم اندر چلی آئیں۔ ہم سب کو ڈرا ہی دیا۔''

''مم..... میں معافی چاہتی ہوں۔''

''چلو دے دی معافی۔'' وہ اس کے سر پر بے حد شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولا ''لیکن وجہ تو بتاؤ ناں میرا بچہ.....''

شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اسے شدید ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے' پیپل کے نیچے اس کی زبان سے کچھ نہایت نامناسب الفاظ ادا ہوئے تھے۔ اس نے اس باریش شخص کے لیے بہروپیے کا لفظ استعمال کیا تھا اور لعنت بھیجنے کی بات کی تھی بلکہ اس سے کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ نادم انداز میں بولی ''بابا جی! پچھلے کچھ دنوں سے میں ایسے حالات سے گزر رہی ہوں کہ ہر چیز پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ رہا ہے جنہوں نے اپنے اوپر کئی کئی خول چڑھا رکھے ہیں۔ ان میں سے ہی ایک شخص ایسا ہے جو پیری فقیری کے نام پر سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے..... میں نے اپنی آنکھوں سے.....'' وہ بات مکمل نہ کرسکی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

باریش شخص نے اسے دلاسا دیا اور اپنی بات مکمل کرنے کے لیے کہا۔ شانی اپنے سینے کا روتا بلکتا دکھ اس کے سامنے بیان کرنے لگی۔ اس نے پیر بادشاہ کو تفصیل کے ساتھ اپنی بہن اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں بتایا۔ بھابو کی بیماری سے لے کر اس کی موت تک سب کچھ اس نے پیر بادشاہ کے گوش گزار کردیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی جو بتانا چاہتی تھی وہ چھپانا چاہ رہی تھی' وہ بھی اس شخص سے چھپا نہیں پا رہی تھی۔

وہ بڑی توجہ سے ہمدردی سے سنتا رہا۔ شانی چپ ہوئی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا ''دیکھو میرا بچہ! یہ سامنے لالٹین رکھی ہے۔ اس لالٹین میں سے جو چیز نکل رہی ہے وہ روشنی ہے۔ اب اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ لالٹین میں سے اندھیرا نکل رہا ہے یہ غلط ہے۔ ایک کے بجائے دو تین یا آٹھ دس بندے بھی یہ بات کہیں تو یہ غلط ہوگی۔ ہم روشنی کو غلط نہیں کہیں گے ان بندوں کو غلط کہیں گے۔ اسی طرح میرا بچہ.....! دنیا میں وہ چیز بھی موجود ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔ روح سے روحانیت بنتی ہے۔ روحانیت کے ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے مانے بغیر گزارا ہی نہیں ہے۔ لوگ اس کو غلط نام دیتے ہیں اس کے نام پر دھوکا کرتے ہیں، لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، لیکن یہ سارے گناہ لوگوں کے ہیں۔ جو لوگ قدرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ قدرت ان کے لیے معجزے دکھاتی ہے اور دکھاتی رہے گی۔ شرط صرف یہی ہے کہ لگن سچی ہو اور صبر سے انتظار کیا جائے۔''

شانی نے سر جھکا کر کہا ''میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ پریشانی اور دکھ میں میرے منہ سے کچھ غلط باتیں نکل گئی تھیں۔''

پیر بادشاہ نے بے ساختہ آگے کو جھک کر شانی کا سر چوما ''نہ میرا بچہ! تو نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تعویذ گنڈے، عملیات، نوری علم، کالے علم اور پتا نہیں کن کن ناموں سے لوگوں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ ہم اپنی اصل سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اصل یہی ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے، قدرت نے اپنی ساری مخلوق کے لیے کچھ اصول بنائے ہیں۔ جو بھی ان اصولوں کے خلاف چلتا ہے نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثال یہی ہے کہ ایک شخص ہاتھ بڑھا کر روٹی نہ اٹھائے اور یہ کہے کہ لقمہ خود بہ خود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ یا ایک شخص آنکھیں بند کرکے سڑک پار کرے اور یہ سمجھے کہ قدرت اس کو بچائے گی..... تو یہ غلط ہے..... یہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے، لیکن میرا بچہ..... ایسی بات بھی نہیں ہے کہ نعوذ باللہ قدرت اپنے اصول بنا کے بعد بے بس ہوگئی ہے۔ وہ اپنے نیک اور صابر بندوں کے لیے کبھی کبھی اپنے اختیار کے کرشمے بھی دکھاتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں کو ایک طرف رکھتی ہے اور کوئی انہونی کر دیتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ باتیں واقعی اس پر اثر کر رہی تھیں۔

''انہونیاں ضرور ہوتی ہیں دھی رانی..... لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ ہر وقت انہونیوں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ انہونیوں سے ملاقات کے لیے سخت ترین آزمائشوں کے لیے تیار رہنا چاہیے، دیکھو..... میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں..... ذرا اسے پہچانو، یہ کیا ہے؟'' باریش شخص نے چارپائی کے بچھونے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کاغذ میں لپٹا ہوا ایک نگینہ نکال لیا۔

''یہ کیا ہے.....؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید ہیرا ہے'' شانی نے کہا۔

''ہاں یہ ہیرا ہی ہے۔ لیکن آج سے لاکھوں سال پہلے ایک پتھر تھا۔ بے قیمت اور بے کار پتھر۔ آج یہ بالکل مختلف ہے۔ اس کی بے پناہ قیمت ہے۔ اسے چوما جاتا ہے، گلے کا ہار بنایا جاتا ہے۔ بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ ایک کنکر، انمول ہوگیا۔ یہ ایک انہونی ہے۔ لیکن اس انہونی تک پہنچنے کے لیے اس کنکر کو ایک لمبی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہ زمین کی اتھاہ گہرائی میں لاکھوں سال تک دبا رہا، اس نے بے پناہ وزن اور گرمی برداشت کی۔ ہر طرح کی موسمی سختیاں جھیلیں اور آخر ہیرا بن گیا۔ ہیرے ایسے ہی بنتے ہیں۔ کندن بھی ایسے ہی بنتے ہیں..... سیپیوں میں موتی بھی ایسے ہی پروان چڑھتے ہیں۔''

ہر لفظ شانی کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا تھا۔ عجیب لہجہ تھا۔ اس شخص کا..... اس نے شانی کا ہاتھ۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں تھام لیا..... ''تو میرا بچہ! ہمت نہیں ہارنا۔ حوصلہ چھوڑنا نہیں کرنا، منزل ضرور نزدیک آئے گی۔ میں تیری پریشانی پر ایک ایسا ستارہ دیکھ رہا ہوں جو بہت بلندی پر چمکتا ہے۔''

شانی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس کا دل چاہا اس شخص کے سینے سے لگ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس سے کہے ''اے مہربان بزرگ! منزل ملنے یا نہ ملنے کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب مسافر زندہ رہے۔ اگر دکھوں نے جسم سے جان ہی کھینچ لی تو پھر باقی کیا بچے گا۔''

لیکن پھر اس نے خود کو ٹوٹ کر بکھرنے سے سنبھالا۔ یہ شخص اسے یہی تو نصیحت کر رہا تھا۔ وہ عجیب الوہی لہجے میں بولا ''آج کی 'یہ رات' منزل نہیں ہے۔ بچہ یہ ایک چھوٹا سا پڑاؤ ہے۔ تجھے اپنے راستے پر آگے بڑھنا ہے۔ بس آج پو پھٹنے سے پہلے پہلے تو آگے بڑھ جانا۔ جہاں جانا ہے چلی جانا۔''

شانی نے بہت عرصے بعد اپنے قریب ایک ایسا شخص دیکھا تھا جسے دیکھ کر اس کے دل کی گہرائی سے آواز آرہی تھی کہ وہ سچا ہے..... مخلص ہے..... وہ جیسا دکھائی دے رہا ہے اندر سے بھی ویسا ہی ہے..... نجانے ان لمحوں میں اسے کیا ہوا۔ وہ سسک کر بولی ''مجھے اپنے پاس رکھ لو پیر بابا۔ میں ابھی کہیں جانا نہیں چاہتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ کچھ آرہا ہے میرا بچہ! تجھے آگے بڑھنا ہے۔ آگ کے دریا میں تو کافی فاصلہ طے کرچکی ہے۔ پیچھے ہٹے گی تو نقصان ہوگا۔ اب اللہ کا نام لے کر چلتی جا۔ اللہ سوہنا، بھلی کرے گا۔ جا چلی جا جس طرف تیرا دل تجھے کھینچ رہا ہے۔''

''مم..... میرا دل مجھے کسی طرف نہیں کھینچ رہا بابا۔''

''تو غلط کہہ رہی ہے' ذرا اپنے دل میں جھانک۔ ایک پیاری سی معصوم سی کشش تجھے بلا رہی ہے۔ میں تیرا چہرہ دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ کسی معصوم کشش سے تیرا ناتا ضرور ہے..... اور ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور کشش بھی ہو۔ کوئی گہری پرانی کشش۔''

اتنے میں بھاری پردے کے پیچھے سے کراہنے اور کچھ بولنے کی آواز آئی۔ شانی نے پہچان لیا، یہ ریاست ہی کی آواز تھی۔ وہ واقعی ہوش میں آچکا تھا۔

پیر بادشاہ نے بات ادھوری چھوڑی اور جلدی سے اٹھ کر پردے کے پیچھے چلا گیا۔ شانی اپنی جگہ ساکت بیٹھی سوچتی رہی۔ شاید بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پیاری سی معصوم سی کشش تو شانی کو ہر گھڑی کھینچ رہی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سخت غیر یقینی کیفیت میں مبتلا تھی۔ حادثے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اسے اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا، لیکن پھر بھی منے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ اپنی ماں کو کھو کر اس پر کیا بیت رہی تھی..... وہ یقیناً اب زیادہ شدت سے شانی کی گود کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اور وہ دوسری کشش..... وہ دوسری گہری اور پرانی کشش کیا تھی جس کا ذکر بابا نے کیا تھا۔ شاید اس کشش کا تعلق اس شخص سے تھا جو دور رہ کر بھی ہمیشہ اس سے قریب رہا تھا اور اب شانی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ دور ہے یا بہت دور ہے، اتنے

فاصلے پر جس کو کبھی کوئی پاٹ نہیں سکا۔ شانی کو وہ ہولناک لمحے یاد آئے جب اس نے انیکسی کی چھت پر سے رستم کو چوہدری کے گھیرے میں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ رہا تھا، گر رہا تھا، پھر اٹھ رہا تھا۔ جیسے کوئی شیر، بھیڑیوں کے غول میں ہو، اور پھر وہ گر گیا تھا۔ شاید کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ رستم سیال کی وہ آخری جھلک تھی جو شانی نے دیکھی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پیر بادشاہ کی باتوں کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی دوران میں پک اپ کے انجن کی آواز نے شانی کو چونکایا۔ پک اپ جھونپڑی کے دروازے کے بالکل سامنے آکر رکی تھی۔ پھر اس کا انجن بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شانی کو اندازہ ہوا کہ پک اپ پر کچھ لادا جا رہا ہے۔ کوئی بھاری بھرکم شے۔ جھونپڑی کے بھاری پردے کے عقب سے بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور وہ شانی کے پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھوڑے سے پھول تھے، گلاب کی خوشبو تو شانی صاف پہچان سکتی تھی۔ بابا نے بڑی اپنائیت کے ساتھ یہ پھول شانی کے دوپٹے کے پلو سے باندھ دیے پھر وہ شانی کے پاس انگیٹھی کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھی کا نام ریاست ہے؟''

''آپ اسے میرا ساتھی نہ کہیں، یہ میرے لیے اجنبی ہے۔ بس میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔''

''چلو جو بھی ہے۔ بہر حال اب وہ ٹھیک ہے۔ اتنا ٹھیک ہے کہ سفر بھی کر سکتا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ اس قابل ہو جائے گا کہ تمہارے ساتھ پک اپ پر روانہ ہو سکے۔ لیکن ڈرائیونگ کرنا شاید اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اس کام کے لیے میں تمہارے ساتھ اپنے ساتھی راجا کو بھیج دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ تمہیں .... حفاظت کے ساتھ تمہاری منزل تک پہنچا دے گا۔''

''مم..... مجھے تو خود پتا نہیں کہ کہاں جانا ہے؟''

''تمہارے ہم سفر کو تو پتا ہوگا.....؟ وہ اب اس لائق ہے کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ سکے۔ بارش اب رک گئی ہے۔ تم تھوڑا سا کھا پی لو۔ تمہارے کپڑے تھوڑی دیر میں بالکل سوکھ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہارے روانہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔''

شانی وہاں سے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ کم از کم آج کی رات تو وہ سخت غیر یقینی کیفیت کا شکار تھی۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا باریش میزبان اسے جلد از جلد یہاں سے روانہ کر دینا چاہتا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے دیکھا کہ پیر بابا کے دو ساتھی زخمی ریاست کو دونوں طرف سے سہارا دیے جھونپڑی کے دروازے کی طرف لا رہے ہیں۔ ریاست کے سر پر اب بڑی سی سفید پٹی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ ہولے ہولے کراہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانی کپڑے بدل چکی تھی۔ اس کی زخمی پنڈلی پر پیر بابا نے اپنے مہربان ہاتھ سے خود مرہم رکھا اور پٹی باندھی تھی۔ شانی کو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا تھا کہ وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ تین چار گھنٹوں میں ہی اس شخص نے شانی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ شانی پچھلے چند مہینوں میں ایسے حالات سے گزری تھی کہ اسے اپنے سائے پر بھی شک ہوتا تھا۔ ایسی صورت حال میں ایک اجنبی پر اتنی جلدی یقین آ جانا اور اس سے وابستگی پیدا ہو جانا اچنبھے کی بات تھی۔

شانی کو اپنے ان الفاظ پر مسلسل ندامت ہو رہی تھی جو نادانی میں اس کی زبان سے ادا ہو گئے تھے۔ یہ بڑے سخت الفاظ تھے اور پیر بابا جیسے شخص کے شایان شان ہرگز نہیں تھے۔ وقتِ رخصت شانی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر پیر بابا سے معافی مانگ لے یا پھر بیٹھ کر ان کے پاؤں پکڑ لے اور کہہ دے کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ شاید وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا دیتی لیکن اچانک پیر بابا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ میرا بچہ..... چلیں'' پیر بابا نے کہا۔ انہوں نے جیسے شانی کے دل میں اٹھنے والے خیال کو پڑھ لیا تھا۔

شانی کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی اور وہ پیر بابا کے ساتھ باہر پک اپ کے سامنے پہنچ گئی، یہاں پیر بابا کے نصف درجن ساتھی موجود تھے اور ریاست بھی سرمد اور راجا کے سہارے کھڑا تھا۔ ریاست کو ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ شانی حسب سابق پک اپ کے پچھلے حصے میں دریوں اور قناتوں وغیرہ کے درمیان بیٹھی۔ پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ راجا نے سنبھال لی.....

پک اپ نے اسٹارٹ ہونے کے بعد اپنی جگہ سے سرکنا شروع کیا تو پیر بابا نے محبت سے شانی کے سر پر ہاتھ رکھا ''گھبرانا نہیں بچہ! تم اکیلی نہیں ہو۔ کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔''

شانی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ پک اپ ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی، درختوں سے گھری ہوئی وہ چھوٹی سی جھونپڑ بستی۔ اس کے مکین اور وہاں کا پیر بابا سب پیچھے رہ گئے۔ اندھیرے کی چادر کے پار اوجھل ہو گئے۔ شانی پیر بابا کے عجیب و غریب کردار کے بارے میں سوچنے لگی۔ ماضی قریب کا ایک خوبرو فن کار، لاکھوں دلوں کی

دھڑکن، اور اس جھونپڑ بستی میں نظر آنے والا ملنگ صورت پیر بابا، کتنا فرق تھا دونوں کرداروں میں، پھر پیر بابا کے آخری الفاظ شانی کے کانوں میں گونجنے لگے ”تم اکیلی نہیں ہو..... کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں“۔ ”کچھ لوگوں“ سے ان کی کیا مراد تھی۔ کیا وہ اپنے ساتھیوں کا ذکر کر رہے تھے؟ نہیں بات کچھ اور تھی۔ شانی کے دل سے آواز آئی..... شاید..... وہ اپنے ساتھ کسی اور کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ کون ہوسکتا تھا وہ کوئی اور.....؟ شانی پک اپ کے ساتھ ہچکولے کھاتی رہی اور سوچتی رہی۔ دفعتاً اس کا دھیان اپنی اوڑھنی کے پلو میں بندھے پھولوں کی طرف چلا گیا، ان میں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے پلو کی گرہ کھولی۔ مہک تیز ہوگئی۔ یہ گلاب اور گیندے کی ملی جلی مہک تھی۔ گلاب اور گیندا.....

اچانک شانی کے بدن کو کرنٹ سا لگا۔ اس کا دھیان ایک اور طرف منتقل ہوگیا تھا۔ گلاب اور گیندا، اس ملی جلی خوشبو کا تعلق نگینہ کے تصور سے تھا۔ کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا۔ محض ایک مماثلت تھی؟ وہ سرتاپا لرز گئی۔ پیر بابا نے وقتِ رخصت اس کے پلو میں گلاب اور گیندے کے پھول باندھے تھے۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اکیلی نہیں ہو..... کچھ لوگ ہیں تمہارے ساتھ۔ کیا اس فقرے اور ان پھولوں میں کوئی تعلق تھا؟ یا پھر..... یا پھر یہ سب کچھ واہمے کے زمرے میں آتا تھا۔

ایک نشیب سے گزرتے ہوئے پک اپ کو شدید جھٹکا لگا۔ شانی کے ٹخنے اور پنڈلی میں درد کی ٹیس اٹھی۔ اس کا ذہن ان کربناک لمحوں کی طرف منتقل ہوگیا جب وہ جڑوں کے دوشاخے میں پھنسی ہوئی تھی اور شقی القلب بابر کتے کی طرح اس پر جھپٹ رہا تھا۔ انسان اپنے نفس کے ہاتھوں کبھی کبھی کتنی پستی میں گر جاتا ہے۔ یکایک شانی کو بابر کی غیر موجودگی کا احساس ہوا..... وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جھونپڑ بستی میں ہی ہے۔ پیر بابا اور اس کے ساتھی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ وہ لوگ ایسے تو نہیں تھے کہ اسے مار ڈالتے۔ وہ زیادہ دیر اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ بابر کے والی وارث اسے تلاش کرتے ہوئے کسی بھی وقت جھونپڑ بستی میں پہنچ سکتے تھے۔ خود شانی نے بھی راجا کے سامنے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ پھر وہ اس کا کیا کرنے والے تھے؟ اگر وہ اسے چھوڑ دیتے یا وہ کسی طرح خود چھوٹ جاتا تو پیر بابا اور اس کے ساتھیوں پر مصیبت آجاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ چوہدری بشیر کا بھانڈا بھی پھوٹ جاتا۔ اس کی شریکا برادری کو پتا چل جاتا کہ چوہدری نے شانی کو ایکسی سے خود فرار کرایا ہے۔

ایکا ایکی شانی کو اپنے بالکل قریب کسی حرکت کا احساس ہوا۔ اندھیرے میں اسے لگا کہ کوئی زندہ چیز اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود ہے۔ اس نے پھولوں کو پھر سے گرہ دی اور تاریکی میں ٹٹولنے لگی، بھیگی بھیگی دریوں، قناتوں اور چادروں کے درمیان اس کا ہاتھ کسی کے سر سے ٹکرایا۔ اس کے ہونٹوں سے خوفزدہ چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کوئی یہاں موجود تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ کون ہے۔ شانی کا ہاتھ لگنے کے بعد اس نے منہ سے غوں غاں کی غصیلی آواز نکالی۔ اس کا منہ بند تھا۔ یہ بابر کے سوا اور کون ہوسکتا تھا وہ شیطان صفت اس سے صرف تین چار فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ شانی کو اس سے شدید قسم کی خوف آمیز کراہت محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت اچھی طرح بندھا ہوا ہے، اس کے باوجود وہ اضطراری طور پر اس سے دور سرک گئی۔ اس کا قرب بھی شانی کے لیے اس کے لمس کی طرح تکلیف دہ تھا۔ شانی نے سنا تھا کہ ایسے شقی القلب بھی ہوتے ہیں جو روڈ ایکسیڈنٹ میں تڑپتے ہوئے زخمیوں کی جیبوں سے قیمتی چیزیں نکالتے ہیں۔ آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسے نفس پرست کو دیکھا تھا۔ اس نے مصیبت کے شکنجے میں کسی ہوئی شانی کو اس کی آبرو سے محروم کرنا چاہا تھا۔

چند سیکنڈ تک غوں غاں کرنے اور دریوں قناتوں کے نیچے کسمسانے کے بعد وہ ساکت ہوگیا۔ شانی کو یاد آیا کہ جب وہ پیر بابا کی جھونپڑی میں تھی اس نے باہر کچھ آوازیں سنی تھیں یوں لگا تھا کہ پیر بابا کے ساتھیوں نے پک اپ پر کوئی بھاری چیز لادی ہے۔ یقیناً وہ بھاری شے یہی گٹھا ہوں کی گٹھری تھی۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ کبھی کبھی بدلیوں میں سے چاند جھانکتا تھا، ہوا سے درخت ہلتے تھے تو پک اپ کے اوپر تنے ہوئے پوشین پر قطروں کی بوچھار ہوتی تھی۔ انہوں نے تقریباً ایک گھنٹے تک درختوں کے درمیان سخت ناہموار اور نیم ہموار راستوں پر سفر کیا اور بالآخر ایک نیم پختہ سڑک پر نکل آئے۔ یہ ایک مضافاتی آبادی تھی۔ انہیں کہیں بجلی کی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ شانی کو پتا نہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ لاہور کے قریب نہیں ہے۔ جس وقت وہ ایک کشادہ مکان کے گیراج میں داخل ہوئے پو پھٹ رہی تھی۔ یہ مکان کوٹھی کی شکل کا تھا مگر لگتا تھا کہ ابھی تعمیر ہو رہا ہے۔ بس رہائش کے لیے تین چار کمرے مکمل کر لیے گئے تھے۔ پھر دیواریں ابھی پلاسٹر سے خالی تھیں۔ صحن کے بڑے حصے کا فرش لگنا باقی تھا۔

جونہی پک اپ اندر داخل ہوئی گھر کا بیرونی گیٹ بند کردیا گیا اور گیراج کی روشنی بجھا دی گئی۔ لمبے سے منہ اور بھوری آنکھوں والا ایک جوان سال شخص گھر کا مالک لگتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر بھی استری شدہ سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شانی اور ریاست کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے شانی کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ اسی دوران میں اس کا ایک ساتھی ریاست کو اگلی نشست پر سے اتار چکا تھا اور سہارا دیے کھڑا تھا۔ لمبے چہرے والے شخص نے شانی کو بڑے احترام کے ساتھ اندر ایک نوجوان عورت کے پاس پہنچا دیا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ اس کی بیوی ہوگی۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ لمبے چہرے والا جواں سال عورت کو شائلہ کہہ کر بلا رہا تھا۔ وہ کافی باتونی اور خوشامدی قسم کا شخص لگتا تھا۔ شائلہ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ وہ بڑے چلاتے چنگھاڑتے جسم کی مالک تھی۔ چال میں لہراؤ اور آنکھوں میں شوخی تھی۔ لباس بھی جسم کو نمایاں کرنے والا تھا۔ اس نے شانی کو ایک گرم شال اوڑھائی اور اس کے لیے ہیٹر آن کردیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے خود ہلکی پھلکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سویٹر پہننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ غالباً وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی بھی رہیں تو اپنے لباس کی چمک دمک دکھانے کے لیے سویٹر سے دور رہتی ہیں۔ وہ بڑی لگاوٹ سے شانی کو بیگم صاحبہ کہہ کر مخاطب کرنے لگی اور اس کے آگے پیچھے گھومنے لگی۔

شانی نے ادھ کھلے دروازے میں سے دیکھا لمبے چہرے والا شخص اپنے دو ساتھیوں کے ذریعے بابر کو ڈنڈا ڈولی کر کے کسی اندرونی کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ بابر کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور شانی نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی مشکیں کسی رسی کے بجائے بڑی جڑوں سے کسی گئی تھیں۔ بابر کی رائفل بھی ایک شخص کے کندھے پر دکھائی دے رہی تھی۔

”میرا خیال ہے بیگم صاحبہ! آپ اس بندے کی وجہ سے اتنی لیٹ ہوئی ہیں۔“ شائلہ نے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

شائلہ بولی ”چوہدری صاحب! آپ کے لیے بڑے پریشان تھے۔ پچھلے چار پانچ گھنٹے میں کوئی پچیس فون تو آچکے ہیں ان کے۔ ایک ابھی آپ کے آنے کے فوراً بعد آیا ہے، ناصر نے انہیں بتا دیا ہے کہ آپ پہنچ گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے اور موبائل سے فون کر رہے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں۔“

”یہ ناصر کون ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

وہ ذرا سی شرمائی ”میرے ہسبینڈ ہیں۔ ابھی آپ نے دیکھا تو ہے انہیں.....“

اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے گالیاں بکنے کی بلند آوازیں آنے لگیں، شاید ناصر یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بابر کے منہ سے کپڑا نکالنے کی ”جسارت“ کی تھی۔ منہ آزاد ہوتے وہ خالص دیہاتی لہجے میں ان کی ماں بہن ایک کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ بہرحال اس مرتبہ اسے اپنی دشنام طرازی کا قرار واقعی صلہ ملا، دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں اور پتا چلا کہ ناصر اور اس کے ساتھی بابر کی ٹھکائی کر رہے ہیں۔ وہ پہلے تو مار کھا کر بھی گالیاں بکتا رہا پھر اس نے تکلیف سے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ اس کی آواز ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تھی۔ شانی کانپ گئی۔ تکلیف دشمن کی بھی ہوتی تھی تو اسے دہلا دیتی تھی۔ شانی نے روہانسے لہجے میں کہا ”شائلہ اس تماشے کو روکو..... جلدی کرو..... میرا دماغ پھٹ جائے گا.....“

شانی کی آواز میں کرب کی ایک ایسی کیفیت تھی کہ شائلہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ”ڈولے..... اوڈولے جلدی آ۔“

دو سیکنڈ بعد ایک کوتاہ قد شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ بہ مشکل تین سوا تین فٹ کا ایک بونا تھا۔ اس نے غالباً لنڈے کا کوٹ اور دھاری دار پتلون پہن رکھی تھی۔ بال پیشانی پر جما رکھے تھے۔ ”جی میڈم.....“ وہ ادب سے اپنی مختصر گردن جھکا کر بولا۔

”میڈم کے بچے..... جا جلدی سے ناصر صاحب کو بلا کر لا.....“

وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد لمبے منہ والا ناصر کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ شائلہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس سے گھسر پسر کی اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد بابر کی دردناک چیخ و پکار کو بریک لگ گئے۔

شائلہ کی آنکھوں میں بہت سے سوال چمک رہے تھے۔ یقیناً وہ شانی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے اور ریاست کے

پیچھے لگ جانے والا یہ ریچھ نما شخص کون تھا۔ اسے کس نے باندھ کر پک اپ پر لوڈ کیا..... ریاست کے سر پر چوٹ کیسے لگی اور خود شانی کے ٹخنے کے ساتھ کیا ہوا؟ مگر یہ سوال شانی سے پوچھنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اسے امید تھی کہ شانی خود ہی یہ کتھا اسے سنائے گی۔ مگر اس کی یہ امید پوری نہیں ہوئی، شانی کی نگاہیں پیر بابا کے ساتھی راجا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تاہم تھوڑی دیر بعد اسے ناصر سے معلوم ہوا کہ وہ شخص پک اپ سے اترتے ہی کسی کو بتائے بغیر واپس چلا گیا تھا۔

چوہدری بشیر سے شانی کی ملاقات اگلی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ چوہدری کی آنکھیں سرخ تھیں اور بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ خاصا ''اپ سیٹ'' نظر آتا تھا۔ شانی کی خیر خیریت دریافت کرنے کے فوراً بعد وہ اس شخص کو دیکھنے چلا گیا جس کی وجہ سے کل رات کے سارے مسائل پیش آئے تھے۔ وہ ابھی تک بندھا ہوا تھا اور اسی مکان کے ایک کمرے میں موجود تھا۔

شانی کے کمرے میں چوہدری کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اسی دوران میں اسے زخمی ریاست سے کل رات کے سارے واقعات معلوم ہو چکے تھے..... اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ بابر نے ''رکھ'' کے اندر شانی پر مجرمانہ حملے کی سفاکانہ کوشش کی تھی۔ شانی کی اپنی خواہش تو یہی تھی کہ چوہدری کو اس واقعے کے بارے میں نہ پتا چلے..... مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چوہدری جان چکا تھا اور بے حد مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ہی شانی نے جان لیا کہ بابر نامی اس شخص کی بدقسمتی پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔

چوہدری نے گہری سانس لیتے ہوئے بہت گمبھیر لہجے میں کہا ''شانی! میں تم سے کوئی بات بھی چھپانا نہیں چاہتا..... تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا اور ہر قدم بہت پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ اس خبیث بابر کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ تمہیں میں نے از خود کوٹھی سے نکالا ہے۔ اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ بابر اس چار دیواری سے نہ نکل سکے۔''

چوہدری کے لہجے کی سختی نے شانی کو چونکا دیا۔ ''کیا آپ اسے..... مم..... میرا..... مطلب ہے، اسے ختم کر دیں گے؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ بات تو طے ہے کہ اگر بابر کی زبان کھل گئی تو بھڑکی ہوئی آگ اور بھڑک اٹھے گی۔ سب کچھ بس نہس ہو جائے گا۔''

''کوٹھی میں کیا صورتِ حال ہے؟'' شانی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہاں ہمیں تھوڑا سا ڈراما کرنا پڑا ہے۔ ہم نے ظاہر کیا ہے کہ تم جالاں کی ملی بھگت سے فرار ہوئی ہو۔ ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے تمہاری دوسری نوکرانی زہرا کو زخمی بھی کرنا پڑا ہے۔''

''ہائے اللہ.....'' شانی نے بے ساختہ کہا ''کیا ہوا ہے زہرا کو.....؟''

''بس تھوڑا سا زخمی ہوئی ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ اسپتال میں ہے۔ کل تک گھر آ جائے گی۔''

شانی کے چہرے پر تشویش کے گہرے سائے لہرانے لگے ''کیا آپ کے اس ڈرامے سے ''رنگ والی'' پر کوئی نئی مصیبت تو نہیں آ جائے گی؟''

''کیا مطلب.....؟''

''آپ نے ظاہر کیا ہے کہ مجھے جالاں نے انیکسی سے نکالا ہے۔ ذہن میں فوراً آتا ہے کہ اگر آپ کی پرانی نوکرانی نے اس طرح کا کام کیا ہے تو پھر اس نے کافی پیسے کھائے ہوں گے۔ اسے پیسے کھلانے والے میرے وارث ہی ہو سکتے ہیں۔ اب یہ نہ ہو کہ آپ کے بھائی بند رنگ والی پر چڑھ دوڑیں۔''

''نہیں یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ قادر اور غفور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی جلد بازی دکھائی تو لمبا چوڑا فساد ہو جائے گا۔ دونوں طرف سے بندے مریں گے اور بے شمار گرفتاریاں بھی ہوں گی۔''

اتنے میں چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ چوہدری نے عینک چڑھا کر اچھی طرح نمبر دیکھا، پھر کال کرنے والے سے بات کی۔ کال کرنے والا چوہدری کا رازدار ملازم ارشد حسین تھا۔ اس نے چوہدری کو بتایا کہ بابر کے خالی گھوڑا ڈبک نالے کے پاس ''رکھ'' میں سے مل گیا ہے۔ گھوڑا ملنے کے بعد قادرے، عنایت اور اس کے ساتھیوں نے زیادہ سرگرمی سے بابر کی تلاش شروع کر دی ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ چھوٹی چوہدرانی کے بھاگنے اور بابر کے غائب ہونے میں گہرا تعلق ہے۔ چوہدری بشیر نے ارشد حسین کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور فون بند کر دیا۔

اسی دوران میں ہٹی کٹی جالاں دروازے پر نمودار ہوئی اور اس نے چوہدری سے کہا کہ انہیں ناصر بلا رہا ہے۔ چوہدری جالاں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

جالاں کی جھلک نے شانی کی بیزاری میں اضافہ کر دیا۔

جب سے اس عورت نے انوری کے ساتھ بے دردی سے مار پیٹ کی تھی اس کی صورت سے ہی شانی کو نفرت ہو گئی تھی۔ یقیناً جالاں کے دل میں بھی شانی کے لیے کوئی اچھے جذبات موجود نہیں تھے۔ یہ جالاں کی مجبوری تھی کہ وہ شانی کے سامنے اپنا غیظ و غضب ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ شانی سمجھ گئی کہ جالاں رازداری سے یہاں پہنچائی گئی ہے اور اب وہ شانی کے ساتھ ہی اس چار دیواری میں روپوش رہے گی۔

چوہدری بشیر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مکان کے کسی اندرونی کمرے سے دبی دبی کربناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شانی سمجھ گئی کہ چوہدری بشیر، بابر کی ٹھکائی کر رہا ہے۔ بابر سے پر چوہدری کو دہرا غصہ تھا۔ ایک تو اس نے کوٹھی سے شانی کا پیچھا کیا تھا۔ دوسرے اس نے شانی کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ شانی دیکھ چکی تھی کہ یہ مکان دیگر مکانوں سے ذرا فاصلے پر ہے۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ یہاں پر ہونے والی مار پیٹ کی آوازیں اردگرد کے لوگوں تک پہنچیں گی۔

شانی کو فضا میں عجیب سی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ ایسا..... جو ناروا ہے، جو نہیں ہونا چاہیے۔

کچھ دیر بعد شانی نے کھڑکی میں سے دیکھا بھاری بھرکم جالاں، قیمہ بنانے والی ایک وزنی مشین اٹھائے ایک دروازے میں داخل ہوئی۔ شانی چونک گئی۔ چونکنے والی بات مشین میں نہیں تھی۔ اس دروازے میں تھی جس میں جالاں داخل ہوئی تھی۔ یہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ قیمہ کوٹنے والی مشین کا باتھ روم میں کیا کام تھا۔ یہ بجلی کی موٹر سے چلنے والی مشین تھی اور ایک بڑے تختے پر نصب کی گئی تھی۔ جالاں زورآور ہونے کے باوجود اسے مشکل سے اندر پہنچا سکی تھی، شانی میں عجیب طرح کا تجسس جاگ اٹھا..... کچھ دیر بعد جالاں باتھ روم سے نکلی اور اپنے بھاری کولھے مٹکاتی مکان کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔

شانی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں باتھ روم کی طرف چل دی۔ باتھ روم کافی فاصلے پر تھا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی وہاں تک پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا، مگر اسے پتا چلا کہ جالاں اسے لاک کر گئی ہے۔ وہ جاتے جاتے باتھ روم کی روشنی بھی بجھا گئی تھی۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس باتھ روم کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی ہے۔ کیا اسے دوسری طرف سے جا کر دیکھنا چاہیے؟ اس نے خود ہی سے پوچھا۔ پھر اس کے قدم دوسرے دروازے کی سمت میں بڑھے۔ ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی کہ رک گئی۔ کراہنے اور ڈکرانے کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ یقیناً یہ آوازیں بابر ہی کی تھیں اور چند کمرے چھوڑ کر عقبی صحن کے آخری کمرے سے برآمد ہو رہی تھیں۔

شانی نے اپنے سینے میں عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ اس کے قدم بے ساختہ آخری کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی وہ سات آٹھ قدم ہی چلی تھی کہ ایک جانب سے شمائلہ برآمد ہوئی اور اس نے تیزی سے شانی کا رستہ روک لیا۔ ''آ..... آپ کہاں جا رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ'' اس نے قدرے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا بات ہے.....؟''

''کک..... کچھ نہیں میرا مطلب تھا، آپ ادھر نہ جائیں۔''

''کیوں کیا؟ بات ہے.....؟''

''ادھر آئیں میرے ساتھ، میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' وہ شانی کا کندھا تھامتے ہوئے بولی۔

پہلے تو شانی کے دل میں آئی کہ اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جائے۔ لیکن پھر نجانے کیا سوچا کہ اس کے ساتھ چل دی۔ شمائلہ اسے اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ یہ مکان گو زیرِ تعمیر لگتا تھا۔ مگر اس کے جو کمرے مکینوں کے استعمال میں تھے وہ اندر سے خوب ڈیکوریٹ تھے، گھر کی آرائش سے پتا چلتا تھا کہ مکین شان و شوکت کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن شاید ان کے مالی وسائل اس شان و شوکت سے میل نہیں کھاتے۔ اس تضاد کی وجہ سے ہی غالباً یہ وسیع گھر ابھی تک نامکمل پڑا تھا۔

بیڈروم میں گیس ہیٹر کی خوشگوار حرارت تھی۔ شمائلہ نے امپورٹڈ سلک کا سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ ذرا گھونگریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کمر کی بیلٹ اس نے اس طرح باندھ رکھی تھی کہ جسمانی نشیب و فراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی اور شانی کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔

''آپ میرے پاس بیٹھیں چوہدرانی! ہم باتیں کرتے ہیں۔'' وہ پنجابی لہجے میں اردو بولتی تھی۔

''دیکھو.....! مجھے پہلیاں نہ بوجھواؤ۔ ادھر جانے سے کیوں روک رہی ہو مجھے؟''

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی ''چوہدرانی جی! دراصل ادھر گڑبڑ ہے۔''

''گڑبڑ سے کیا مطلب ہے تمہارا.....؟''

''یہ مردوں کے کام ہیں جی..... مرد ہی جانیں۔ ہم

عورتیں ایسے کاموں سے دور ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے جی..... سچی گل تو یہ ہے کہ ہم میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ ایسے تماشے دیکھ سکیں۔'' شائلہ واضح طور پر ڈری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

شانی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جس گڑبڑ کی بات کررہی ہو اس کا تعلق بابر سے تو نہیں ہے۔''

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس نے کون سا اچھا کام کیا ہے جی..... آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو آپ کو جان سے مارنا چاہتے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے بابر کے ساتھ؟'' شانی نے شائلہ سے پوچھا۔

وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی ''چوہدری صاحب نے اسے بری طرح مارا ہے۔ سائیکل کا چین مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی ہے۔ بالکل خونم خون ہو رہا ہے وہ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب تک ختم ہی ہو گیا ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بابر کو قتل کردیا ہے انہوں نے؟''

''بس کردیا ہے، یا کرنے والے ہوں گے۔''

ایک دم شانی کا دھیان قیمہ بنانے والی اس مشین کی طرف چلا گیا جو کچھ دیر پہلے جالاں نے باتھ روم میں رکھی تھی۔ شانی نے شائلہ سے اس مشین کے بارے میں پوچھا تو اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟ تم بتا کیوں نہیں رہی ہو؟ کس لیے ہے وہ مشین؟'' شانی نے زور دے کر پوچھا۔

وہ پہلے تو چپ رہی، پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں ہے چوہدرانی جی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ لاش کو غائب کرنے کا انتظام ہے۔''

شانی کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے ایک مرتبہ بھائی عادل سے سنا تھا۔ ڈی جی خان کے ایک وڈیرے نے اپنے مزارعے کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کا قیمہ بنا کر گٹر میں بہا دیا تھا بعد ازاں اس کی ہڈیوں کو بھی کوٹ پیس کر برابر کردیا تھا۔ بھائی عادل نے اسے بتایا تھا کہ لوگ لاشوں کو غائب کرنے کے لیے ایسے حربے اکثر استعمال کرتے ہیں، لاشوں کو تیزاب میں ڈال کر گلا دیتے ہیں، انہیں بھٹی میں ڈال کر ختم کردیتے ہیں یا پھر ان کے چھوٹے چھوٹے ناقابلِ شناخت ٹکڑے کرڈالتے ہیں۔ شانی جانتی تھی یہ سب کراہت انگیز کام ہیں لیکن انسان کی مٹی عجیب ہے۔ وہ کسی بھی کام کو جب دو چار بار دہرا لیتا ہے تو وہ اس کے لیے انوکھا رہتا ہے۔ نہ کراہت آمیز، نہ خوفناک لیکن بات انسان کے عادی ہوجانے کی نہیں۔ بات تو یہ ہے کہ کیا خون ناحق چھپ سکتا ہے..... تاریخ گواہ ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ خون ضرور بولتا ہے۔ جلد یا بدیر حالات کی انگلی قاتل کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے، لاش کو تو مٹی کھا جاتی ہے یا آگ نگل لیتی ہے۔ یا تیزاب گلا دیتا ہے، مگر ''جرم'' تو زندہ رہتا ہے۔ اور قانونِ فطرت کے مطابق اپنی اپنی ''سزا'' کوشش کرتا رہتا ہے۔

شانی کے جسم میں ایک بلند لہر اٹھی۔ اس کے اندر کی اخلاقی جرأت نے اسے وقتی طور پر ہر خطرے سے بے نیاز کردیا۔ وہ شائلہ کو حیران چھوڑ کر تیزی سے اٹھی۔ دروازہ کھولا اور مکان کے اس آخری کمرے کی طرف دوڑی جہاں اس کے خیال کے مطابق چوہدری بشیر ناصر اور بابر وغیرہ موجود تھے۔ جونہی وہ اس کمرے کے قریب پہنچی ایک رائفل بردار شخص نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی ''رک جائیں'' وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ شانی اسے قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ ایک دھکے سے کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے بابر پر پڑی۔ وہ لرز گئی۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ فرش پر اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک تار نہیں تھا..... بس گردن میں پھٹے ہوئے کرتے کی چند دھجیاں باقی تھیں۔ اس کا پورا جسم ایک لہو اگلتے زخم کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ بابر کے منہ میں ایک پرانی چپل اس طرح ٹھونسی گئی تھی کہ وہ شاید اس کے حلق تک پہنچ چکی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے غالباً چوہدری بشیر کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کے زخموں پر پیشاب کیا تھا، یا پھر شاید یہ اس کے اپنے ہی پیشاب کی ''بو'' تھی۔ وہ قریب المرگ نظر آرہا تھا۔

ہاں یہی شخص تھا جو تقریباً چوبیس گھنٹے پہلے پیپل کے درخت تلے درندے کی طرح اس پر جھپٹا تھا اور اسے اپنی وحشت کے نیچے روندنے کی کوشش کی تھی۔ کتنا جری، خودسر اور ''بے پناہ'' نظر آتا تھا یہ..... لیکن آج اس ٹھنڈے فرش پر وہ بے بسی، ناتوانی اور ذلت کی مثال تھا۔ ریاست کے سر پر بڑی پگ بندھی ہوئی تھی اور وہ دو دیگر افراد کے ساتھ بابر کے سر کی طرف موجود تھا۔ چوہدری بشیر کمرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہٹے کٹے شخص کے ہاتھ میں بجلی کا ایک موٹا تار تھا۔ اس تار کو دہرا کر کے اور بل دے کر اس نے اپنے

دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ اپنی دونوں ٹانگیں چوڑی کیے شخص بابر کے عین عقب میں سر کی طرف کھڑا تھا۔ اس کا یہ انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ اگلے ایک آدھ منٹ میں اس تار کے ذریعے بابر کا گلا گھونٹنے..... اور اس کے جسم سے رہی سہی زندگی نچوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شانی کو یوں اندر گھستے دیکھ کر سب افراد بری طرح چونکے۔

شانی ہٹے کٹے شخص اور بابر کے درمیان آگئی۔ ''یہ کیا کررہے ہو۔'' وہ چلائی ''کیا اسے جان سے مار دو گے؟''

وہ سب ہکا بکا کھڑے تھے۔ شانی نے ہٹے کٹے شخص کو دھکیلا۔ ''دور ہٹ جاؤ اس سے باہر چلے جاؤ۔''

ان لمحوں میں شانی کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بابر کی نگاہ سے ٹکرائی۔ ان بجھتی ہوئی نگاہوں میں امید کی ایک موہوم کرن نمودار ہوئی، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا لاچار شخص۔ آخری بار قاتل پانی کے اندر سے ابھرتا ہے..... اور کسی مددگار کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

اسی دوران میں چوہدری بشیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے عقابی نظروں سے کمرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور ایک ہی لمحے میں جیسے سب کچھ جان گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شانی کو بازو سے پکڑا۔ اس کا انداز بہ ظاہر دھیما تھا لیکن گرفت بہت سخت تھی۔ ''شانی، میرے ساتھ آؤ.....'' وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

شانی نے روتی ہوئی آواز میں کہا ''میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گی چوہدری صاحب میں یہ نہیں کرنے دوں گی۔''

''شانی! میں نے کہا ہے ناں، میرے ساتھ آؤ۔'' چوہدری کی آواز دھیمی رہی مگر لہجہ بے حد گمبھیر ہوگیا۔

شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں چوہدری نے اپنے کارندوں کو اشارہ کردیا۔ ہٹے کٹے شخص نے بابر کے عقب میں کھڑے کھڑے بجلی کا موٹا تار اس کی گردن میں ڈال دیا۔ شانی نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر چوہدری کی گرفت سے آزاد ہوگئی..... ''خدا کے لیے نہیں.....'' وہ چلائی اور اس نے ایک طرح سے خود کو بابر کے اوپر گرادیا..... اس کے ہاتھوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ بجلی کا تار بابر کے گلے سے نکال دیا۔ اب اس کا وجود بابر کے پارہ پارہ جسم پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ چوہدری کے کارندے ہکا بکا کھڑے تھے..... انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا شاید..... بابر کی حیثیت ایک ایسے بدفطرت دشمن کی تھی جس نے فقط ایک دن پہلے شانی کو بدترین اذیت اور ذلت سے دوچار کرنا چاہا تھا۔ اور آج وہ سب کچھ بھول کر اس کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر زخمی ریاست ضرور جانتا تھا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اسی طرح کی صورتِ حال پیش آچکی ہے۔ جب ریاست اور اس کے ساتھیوں نے محکمہ ٹیلیفون کے افسر قاسم برلاس کی جان لی تھی تو شانی نے اسی طرح اس کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ قاسم برلاس بھی شانی کو خون کے آنسو رلا چکا تھا۔

چوہدری بشیر بری طرح سٹپٹایا ہوا تھا۔ اس نے شانی کو بابر کے خونچکاں، برہنہ جسم سے دور ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ اس کے آگے ڈھال بن گئی تھی اور اس کے لیے رحم کی درخواست کررہی تھی۔ پھر اچانک چوہدری کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اس کا دل کچھ نرم پڑ گیا ہے۔ اس کی آواز کا آہنگ بھی کچھ بدل گیا۔ اس نے اپنے کارندوں کو باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ حکم کی تعمیل میں باہر نکل گئے۔ چوہدری نے دروازہ اندر سے بند کیا اور شانی کو بابر سے پیچھے ہٹا لیا۔ شانی نے اپنی گرم شال کندھوں سے ہٹائی اور بابر کی برہنگی چھپانے کے لیے اس کے جسم پر پھیلا دی۔ ''اسے معاف کردیں چوہدری! میری خاطر معاف کردیں'' شانی نے رقت آمیز آواز میں کہا۔

چوہدری شدید الجھن کے ساتھ شانی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ وہ کیا شے ہے پھر اسے احساس ہوا کہ شانی ننگے سر اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے اپنی گرم چادر شانی پر ڈال دی۔ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے شانی نے چوہدری بشیر سے وعدہ لیا کہ بابر کی جان نہیں لی جائے گی۔ اب شانی کو چوہدری کے لب و لہجے کی کافی شناخت ہوچکی تھی۔ وہ اس کے تاثرات سے بہت حد تک اس کی دلی کیفیت بھانپ لیتی تھی۔ وہ کمرے سے اسی وقت نکلی جب اس کے دل نے گواہی دی کہ چوہدری پوری سنجیدگی کے ساتھ وعدہ کررہا ہے۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ چوہدری بشیر نے اپنے ہاتھ اپنے ایک بھائی بند کے خون سے نہیں رنگے۔ لیکن خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ شانی مسلسل فکرمند تھی۔ صبح نو بجے کے قریب چوہدری بشیر کو واپس لاہور چلے جانا تھا۔ شانی چاہتی تھی کہ چوہدری کے جانے سے پہلے اس سے ایک ملاقات مزید کرلے، وہ بابر کی جان بخشی کے حوالے سے مزید تسلی کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ چوہدری سے منے اور ندیم کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر اس کا دل خون ہو رہا تھا کہ ماں کی موت کے بعد وہ دونوں کتنے

افسردہ ہوں گے۔

چوہدری نے ناشتا شانی کے ساتھ ہی کیا۔ وہ ناشتا کرتے ہوئے بھی عجیب نظروں سے اسے دیکھتا چلا جارہا تھا، آخر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''مجھے مردم شناسی کا دعویٰ ہے۔ بندے کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیتا ہوں، لیکن تم بالکل مختلف ہو۔ اتنا عرصہ ہوگیا ہے تمہیں دیکھتے ہوئے مگر لگتا ہے کہ ابھی تمہاری ''الف ب'' ہی نہیں جان سکا۔''

''میری ''الف ب'' بڑی سادہ ہے چوہدری صاحب'' شانی نے سر جھکائے کہا ''مم..... میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔''

''تم غلط کہتی ہو..... تم بہت سے لوگوں کو دکھی دیکھتی ہو.....''

''میں سمجھی نہیں.....'' وہ حیران ہوکر بولی۔

''میں تمہیں دکھی نظر نہیں آتا ہوں.....؟''

''جی..... وہ.....'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

وہ مسکرایا ''تمہاری ''الف ب'' اتنی سادہ نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ کسی وقت تم بہت کمزور خوفزدہ اور بھلی مانس محسوس ہوتی ہو، کسی وقت ایک دم نڈر ہوکر جھپٹتی ہو اور سامنے والے کو ہکا بکا کردیتی ہو۔ رات کو تم نے کیا کیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔''

چوہدری نے خود ہی بات چھیڑ دی تھی اس لیے شانی نے موضوع پکڑنے میں آسانی محسوس کی۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''چوہدری صاحب.....! میں نے رات کا زیادہ حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا ہے۔ بابر کی جو حالت ہوئی ہے وہ بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ اس کے کیے کی کافی سزا اسے مل گئی ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے معاف کردیں۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں اسے چھوڑ دوں۔ تاکہ وہ سیدھا نارپور پہنچے اور ہر طرف آگ لگوادے۔''

''میں نے یہ کب کہا ہے۔ میں تو بس چاہتی ہوں کہ آپ اس کا خون اپنے سر نہ لیں۔ اس کی جان بخشی کردیں۔ اوپر والا ہمیں اس کا صلہ دے گا۔ ہمارے منے اور ندیم پر سے مصیبتیں ٹلیں گی۔ میری بھابو کا سفر آسان ہوگا..... اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور اجر دیتا ہے۔''

چوہدری نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ''رات کو جو کچھ ہونے لگا تھا' وہ واقعی ضرورت سے زیادہ تھا۔ میں خود بھی محسوس کررہا ہوں کہ میں اس وقت کچھ زیادہ ہی طیش میں آگیا تھا۔ تم نے ہمت سے کام لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری ہمت کی وجہ سے بابر کی جان بچ گئی۔''

شانی نے چونک کر چوہدری کی طرف دیکھا۔ وہ جانچنے کی کوشش کررہی تھی کہ چوہدری کس حد تک درست کہہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے تھوڑی سی حیرت بھی ہورہی تھی کہ چوہدری کا لب ولہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اس میں جوش کی جگہ ہوش اور مبارزت کی جگہ مفاہمت کا تاثر تھا۔ ''اب بابر کے ساتھ کیا کریں گے آپ.....؟'' شانی نے مزید تسلی کے لیے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟''

''مجھے کیا پتا.....''

چوہدری بولا ''یہ رشتے میں میرے پھوپھڑ کا بھتیجا ہے۔ میرا پھوپھڑ لڑائی بھڑائی کے کاموں میں بہت آگے تھا۔ یہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ بالکل جنگلی بلے کی طرح ہے یہ..... ہم نے اسے باندھا ہوا ہے لیکن یہ کسی بھی وقت اپنی بندشیں تڑا سکتا ہے اور خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''اسے کہیں، محفوظ جگہ پر بند کردیں۔''

''ظاہر ہے، اب بند ہی کرنا پڑے گا۔ ادھر ایک بیسمنٹ تو موجود ہے۔ فی الحال اسے وہاں بھجوا دیتا ہوں۔ پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے اس جانور کا۔''

''کیا میں اس کی طرف سے مطمئن ہوجاؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

''کیا مجھے اسٹامپ پیپر لکھ کر دینا پڑے گا؟''

''نہیں، ایسی بات تو نہیں'' وہ جلدی سے بولی ''آپ پہلے سے کافی بدل گئے ہیں۔ آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''کافی نہیں..... بہت زیادہ بدلا ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں.....؟''

''میں بہت بدل گیا ہوں شانی..... تم نے بدلا ہے، اور بدل رہی ہو..... شاید تم میں لوگوں کو بدل دینے کی طاقت ہے۔'' وہ جیسے روانی میں کہہ گیا۔

''ایسی ہی طاقت والی ہوتی تو.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آنکھوں کے کنارے نمناک ہوگئے۔

چوہدری نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ ادھوری بات نہ کیا کرو۔ کیا کہنے والی تھیں.....؟''

وہ دانتوں سے نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی ''کچھ نہیں..... بس یونہی کسی کا خیال آگیا تھا۔''

''کس کا.....؟''

''انوری کا'' شانی نے سرد آہ بھری۔

''اوہو.....'' چوہدری سنبھل کر بولا ''میں..... سمجھا پتا نہیں کیا بات کہنے والی ہو..... تمہارا وہ کام تو ہوگیا ہے بھئی، تقریباً سارا انتظام کردیا ہے میں نے، اور بڑا پکا انتظام کیا ہے۔ اس لیے تو دیر ہوئی ہے۔ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ پھر اسی دوران میں تمہاری بھابو زیادہ بیمار ہوگئی..... بہر حال اب ایک دو روز میں انوری اپنے بچوں کے درمیان ہوگی..... بلکہ اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ ہوگا۔''

''کہاں ملیں گے وہ.....؟'' شانی نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''لاہور اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل ہے۔ وہاں تین کمروں کا ایک پورشن بک ہے ان کے لیے۔''

''آپ کا مطلب ہے، وہ وہاں رہیں گے؟''

''ہاں، لیکن عارضی طور پر۔ شاید پندرہ بیس دن۔ اس دوران میں ان کے باقی کاغذات بن جائیں گے۔''

''باقی کاغذات؟ میں سمجھی نہیں۔''

وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا ''شانی.....! یہ کام آسان نہیں تھا لیکن تم نے اتنا زور دے کر کہا کہ مجھے کرنا پڑا..... انوری اپنے بندے اور تینوں بچوں سمیت پاکستان سے باہر جارہی ہے۔''

''کک..... کہاں؟'' شانی حیرت سے بولی۔

''شاہجہ..... میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمہاری خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کے پاس واپس پہنچے۔ تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔''

شانی حیرت سے چوہدری کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے ابھی تک پوری طرح یقین نہیں ہورہا تھا۔ چوہدری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھتی ہو شانی تو وہ خوش قسمت ہے۔ اگر تم اسے کوٹھی میں نہ دیکھتیں اور اس کی سفارش نہ کرتیں تو پھر اس کا انجام بہت مختلف ہوتا۔ قادرے کی شدید خواہش تھی کہ راز رکھنے کے لیے اس عورت کو ختم کردیا جائے۔ کسی وقت میں بھی اسی انداز میں سوچنے لگتا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ جس روز تم نے مجھ سے انوری کا ذکر کیا اس روز رات کو قادرے نے مجھ سے انوری کے بارے میں فیصلہ کن مشورہ کرنا تھا۔''

شانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ وہ تشکر آمیز انداز میں چوہدری کی طرف دیکھنے لگی۔ چوہدری نے کہا ''بھئی! یہ کیسی آنکھیں ہیں تمہاری..... خوشی میں بھی روتی ہیں، دکھ میں بھی۔''

شانی نے بے ساختہ کہا ''کیا میں ایک بار انوری کو اس کے بچوں کے ساتھ دیکھ سکتی ہوں۔''

''نہیں.....'' چوہدری نے فوراً نفی میں سر ہلایا ''یہ بہت مشکل ہے۔ میں اس بارے میں کسی طرح کا رسک نہیں لے سکتا.....'' پھر ذرا توقف سے بولا ''ہاں' ایک کام ہوسکتا ہے۔''

''کیا.....؟''

''میں تمہیں انوری اور اس کے بچوں کی تصویریں دکھا سکتا ہوں..... یا پھر ان کے ملاپ کی وڈیو..... ہاں، وڈیو ٹھیک رہے گی۔ جب وہ شان ہوٹل میں ملیں گے تو ان کی وڈیو بنالی جائے گی۔''

''لیکن، کب تک؟''

''کہا ہے نا' ایک دو دن تک۔'' چوہدری نے یقین سے کہا۔

شانی، چوہدری سے رستم کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی مگر اسے حوصلہ نہیں ہورہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟'' چوہدری اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''نہیں..... میرے ذہن میں پرسوں رات کی باتیں آرہی ہیں۔ وہ باباجی میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔'' شانی نے بات بدلی۔

''ہاں' وہ سب کچھ مجھے بتایا ہے ریاست نے۔ ہر قسم کے لوگوں میں اچھے برے بندے تو ہوتے ہیں۔ ذرا حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو میں ریاست کے ساتھ وہاں جاؤں گا اور ان باباجی کا شکریہ ادا کروں گا۔''

''کک..... کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ جب آپ جائیں..... تو مجھے بھی لے جائیں۔''

چوہدری نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی ایک دو مہینے تک اس طرف جانا بالکل مناسب نہیں ہے، تمہارے ساتھ بابر کی تلاش بھی زور شور سے ہورہی ہے۔ بابر کا گھوڑا جہاں سے ملا ہے وہ جگہ رکھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی یہ خطرہ ہے کہ کہیں باباجی اور ان کے مرید بھی حالات کے لپیٹے میں نہ آجائیں۔ کچھ دن تک حالات بہتر ہوتے ہیں تو پھر اس بارے میں سوچیں گے۔''

چوہدری اور شانی کی گفتگو پندرہ بیس منٹ مزید جاری

رہی پھر چوہدری چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ روز میں چوہدری کی واپسی ہوئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملی یہاں تک کہ اس نے فون وغیرہ بھی نہیں کیا۔ دراصل وہ بے حد احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بھائی بند بڑی تندہی سے حقیقت کو کھوجنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چار دیواری کے حالات بھی آہستہ آہستہ شانی پر واضح ہو رہے تھے۔ شائلہ اور ناصر کی شادی کوئی دو سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ ناصر چوہدری بشیر کے پنڈی والے کارخانے کے مینیجر کا بھائی تھا۔ اس کے بارے میں شانی کو یہی معلوم ہوا کہ وہ کسی زرعی بینک میں ملازم ہے۔ بینک سے قرضے وغیرہ لینے میں وہ چوہدری کی مدد کرتا ہے۔ لیکن وہ آج کل زیادہ تر گھر میں ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آمد و رفت کے اوقات سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا تھا کہ وہ کہیں ملازم ہے۔ ہر وقت کلف لگے کھڑ کھڑ کرتے کپڑے اور پالش شدہ جوتے پہنے وہ گھر میں ہی دکھائی دیتا تھا۔ شائلہ بھی اپنا زیادہ وقت بننے سنورنے میں ہی صرف کرتی تھی۔ انڈین فلمیں دیکھنے کا شوق شائلہ کو جنون کی حد تک تھا..... وہ ایک کم تعلیم یافتہ لیکن بہت باتونی اور تیز طرار عورت تھی۔ جس مکان میں یہ میاں بیوی رہ رہے تھے وہ لاہور کے مضافاتی قصبے ''مرید کے'' میں واقع تھا۔

شانی زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزار رہی تھی۔ بھابو، منا اور رستم کے خیالات ہر وقت اس کے ذہن پر یورش کرتے تھے۔ کسی وقت انوری کی مصیبتوں کا خیال بھی بڑی شدت سے آتا تھا۔ قیمے کی مشین والی بات ابھی تک شانی کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ کسی وقت ان سفاک مناظر کا خیال آتا تو وہ سر تا پا کانپ جاتی۔ جالاں اس کے اردگرد دندناتی رہتی تھی اور خشمگیں نظروں سے دیکھتی رہتی تھی، جالاں اس ''نگرانی'' کا حصہ تھی جس نے شانی کو اس چار دیواری میں حصار میں لے رکھا تھا۔ باہر عرف باہر تہ خانے میں تھا۔ وہ براہ راست ریاست اور ناصر کی نگرانی میں تھا۔ اسے کھانا پہنچانے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھنے کی ذمے داری ریاست پر تھی۔ یوں تو بھری ہوئی رائفل اکثر ریاست کے پاس نظر آتی تھی لیکن جب وہ باہر کو کھانا وغیرہ پہنچانے تہ خانے میں اترتا تھا، رائفل ضرور اس کے کندھے پر ہوتی تھی۔ ایسے میں عموماً کوتاہ قد ڈولا بھی ریاست کے ساتھ ہوتا تھا۔ ڈولا ایک عجیب کردار تھا۔ شائلہ کا کہنا تھا کہ وہ مخنث ہے۔ وہ اس سے ٹانگیں دبواتی تھی۔ سر کی مالش کرواتی تھی، لیکن شانی کو پتا نہیں کیوں شائلہ کی بات پر یقین نہیں تھا۔ اسے ڈولے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آتی تھی۔

شانی کا کمرا شائلہ کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دن شام کو شائلہ کے کمرے سے میوزک کی آواز ابھر رہی تھی۔ شانی نے یونہی گزرتے گزرتے ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکا تو چونک گئی۔ شائلہ نے ٹی وی آن کر رکھا تھا اور ڈانس کرنے میں مصروف تھی۔ کسی انڈین فلم کے گانے پر وہ ہیروئن کے ساتھ ساتھ بے باکی سے رقص کر رہی تھی۔ اس کے جسم میں بلا کی لچک تھی اور قدم بھی ماہر ڈانسروں کی طرح تھرک رہے تھے۔ اسی دوران میں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی، اس کا خاوند واپس آیا تھا۔ شائلہ نے ٹی وی بند کیا اور تولیے سے پسینہ پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچھ ہی دیر بعد میاں بیوی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پورچ کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے دو ملازم تھے اور انہوں نے ایک بھاری مشین اٹھا رکھی تھی۔ یہ ایکسر سائز مشین تھی۔ انہوں نے مشین شائلہ کی وسیع خواب گاہ کے باہر رکھی اور چلے گئے۔

ناصر نے مشین کے کور وغیرہ ہٹائے..... یہ جسمانی ورزشوں کی ''ملٹی پل'' مشین تھی۔ شائلہ اشتیاق سے مشین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ''کافی مہنگی لگتی ہے۔''

''تم سے تو مہنگی نہیں ہے۔''

''باتیں بنانی تو کوئی آپ سے سیکھے۔''

''اور بندے کو بنانا کوئی تم سے سیکھے'' ناصر نے کہا پھر دائیں بائیں دیکھ کے شائلہ کی پشت پر ہاتھ مارا اور بولا ''دھیان کرو ذرا موٹی ہوتی جا رہی ہو۔''

''خدا کا خوف کریں..... یہ دیکھیں۔'' شائلہ نے کمر پر سے قمیص کو کس کر اپنی کمر کا سائز ناصر کو دکھایا۔

''ارے ہاں۔ مشین کے ساتھ ایک دو گفٹ بھی ہیں شیلا جانی۔'' ناصر نے کار کی طرف واپس جاتے ہوئے کہا۔

شیلا کا لفظ شانی کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برسا..... ''شیلا..... شیلا.....'' کہاں سنا تھا اس نے یہ نام؟ یہ غالباً شائلہ کا ''نک نیم'' تھا۔ اچانک شانی کے جسم کو برقی جھٹکا لگا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ نام اس نے کہاں سنا تھا، بھابو کی موت سے کچھ دیر پہلے شانی نے چوہدری بشیر کو موبائل فون پر کال کی تھی۔ اس کال کے نتیجے میں اتفاقاً چوہدری بشیر اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے والی ایک لڑکی کی باتیں شانی کے کانوں میں پڑی تھیں۔ اس لڑکی کا نام شیلا تھا۔ تو کیا یہ وہی شیلا تھی؟ ناصر کی منکوحہ بیوی۔ اس گھر کی

نوجوان مالکن؟ وہ سناٹے میں رہ گئی۔

میاں بیوی کی لالچی طبیعت اور آرام پرستی دیکھ کر شانی کو تھوڑا بہت شک تو پہلے بھی تھا، اب شائلہ کا تک نیم جان کریہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سناٹے کی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اسی روز شام کو چوہدری بشیر آ گیا۔

چوہدری بشیر کے پاس شانی کے لیے ایک خوشخبری تھی۔ غموں کی مسلسل یلغار میں شانی تو خوشی کا لفظ ہی بھول چکی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے لگا کہ گھٹن زدہ فضاؤں میں تازہ ہوا کا چھوٹا سا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا ہے۔

چوہدری بشیر نے انوری کو مع اہل وعیال شارجہ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے ثبوت کے طور پر اس کے پاس چند تصویریں اور وڈیو فلم بھی موجود تھی۔ تصویریں چوہدری نے خود اتاری تھیں۔ وڈیو اس کے ملازم نے بنائی تھی۔ اس نے اپنی کار میں سے ایک ہینڈی کیمرا نکالا اور اسے ٹی وی کے ساتھ اٹیچ کر کے شانی کو پندرہ بیس منٹ کی ریکارڈنگ دکھائی۔ یہ لاہور کے کسی ہوٹل کا کمرا تھا۔ سب سے پہلے انوری کی تصویر اسکرین پر نمودار ہوئی۔ وہ نئے لباس میں تھی۔ وہ چل کر کیمرے کی طرف آئی تو پتا چلا کہ اس کی ٹانگ کی تکلیف اب ٹھیک ہے۔ چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اس سے کوئی بات کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور آنسوؤں کی چمک تھی۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور انوری کے بچے اندر داخل ہوئے۔ کاکا..... گڈی اور شہباز..... وہ بھی نئے کپڑے اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔ انوری خوشی سے چلائی اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ماں بچوں کا ملاپ دیدنی تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لپٹا رہی تھی، بھینچ رہی تھی، چوم رہی تھی، بچے بھی اسے یوں چمٹ گئے تھے جیسے اس کے جسم کا حصہ ہوں۔ وہ کبھی ایک کو گود میں لیتی تھی۔ کبھی دوسرے کو۔ باؤلی سی ہو گئی تھی۔ وہ کاکا حیران پریشان تھا جبکہ دونوں بڑے بچے بھی ماں کی طرح رو رہے تھے۔ پھر انوری نے آگے بڑھ کر چوہدری کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ یہ ایک طرح سے تشکر کا غیر معمولی اظہار تھا۔ چوہدری جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس کا شانہ تھپکنے لگا۔

وہ اپنے ایک ایک بچے کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی۔ جیسے اپنی حسیات پر یقین نہ کر پا رہی ہو۔ ہاں یہی تھے وہ بچے..... یہی تھے وہ جگر کے ٹکڑے جن کے لیے وہ تاریک راتوں میں رونی چلاتی رہی تھی۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام کرنے کے باوجود اور رات کو اجنبی مردوں کے بستروں پر روندے جانے کے باوجود اور قید و بند کی ساری صعوبتیں برداشت کرنے کے باوصف، ان بچوں کی یاد ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل سے نکل نہیں پائی تھی۔ آج وہ اس کے سامنے تھے، لیکن ابھی ایک کمی تھی۔ ابھی کچھ گمشدہ تھا۔ زندگی کا ایک ٹکڑا، زندگی سے علیحدہ تھا۔ اس کا شوہر اس کے سر پر آ سائیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھا۔ چوہدری نے ہاتھ سے ملازم کو اشارہ کیا۔ دروازہ پھر کھلا اور اس مرتبہ ایک غریب صورت شخص اندر داخل ہوا۔ یہی انوری کا شوہر تھا۔ شانی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے بھی نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے، وہ ایک سادہ سا دبو..... شخص تھا، اس کے لیے یہی بہت غنیمت تھا کہ اس کی بیوی اسے مل گئی تھی۔ ہاں..... جس حال میں بھی ملی تھی لیکن مل تو گئی تھی، میاں بیوی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے آنسو بہاتے رہے۔ ان بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کریں۔ پھر انوری نے اپنے کاکے کو گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگی۔ اس کے شوہر نے گڈی کو اٹھا لیا اور چومنے لگا شاید اپنے بچوں کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انوری کی ریکارڈ شدہ مدھم آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ چوہدری سے شانی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ''چوہدری صیب! کیا میں بی بی جی کو دیکھ سکتی ہوں؟ ایک بار، صرف ایک بار؟''

''نہیں انوری.....! لیکن تجھے بتایا ہے ناں کہ وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔''

''لیکن.....''

''دیکھ انوری! تو نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ ایسی مصیبتوں میں پھنس جائے گی جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا، بس سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں سوچو۔ جن لوگوں کے پاس تم میاں بیوی رہو گے وہ تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن پاکستان میں واپس آنے کا خیال بھی کبھی دماغ میں نہ لانا اور نہ ان لوگوں کا خیال دماغ میں لانا جو یہاں رہتے ہیں، میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔''

انوری نے گھبرا کر جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے بعد چند مناظر مزید دکھانے کے بعد اسکرین تاریک ہو گئی۔

تشکر کے جیسے آنسو انوری کی آنکھوں میں تھے ویسے ہی شانی کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ نظریں جھکا کر چوہدری سے بس اتنا کہہ سکی۔ ''شکریہ۔''

''بھئی شکریہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔'' چوہدری لگاوٹ سے بولا۔

''اب انوری کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''شارجہ پہنچ چکی ہے۔ امید نہیں تھی کہ ان کے کاغذات اتنی جلدی بن جائیں گے، بہرحال اب تم اس کے بارے میں ہر طرح کی تسلی رکھو۔'' چوہدری نے شانی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تب اچانک چوہدری کو فلم ''ڈی لیٹ'' کرنے کا خیال آیا۔ اس نے شانی کے کہنے پر ایک بار پھر اسے انوری اور اس کے بچوں کی ریکارڈنگ دکھائی پھر اسے صاف کر دیا۔

چوہدری کے کہنے پر شانی نے اپنے ہاتھوں سے انڈوں کا حلوہ بنایا، ساتھ میں سبز چائے تھی۔ چوہدری کا موڈ آج کچھ اچھا نظر آ رہا تھا۔ شانی کا دل چاہا کہ اس سے رستم کے بارے میں پوچھے۔

دل کڑا کر کے اس نے کہا ''اس روز کوٹھی میں رات کو.....'' مگر اتنا کہہ کر اس کی ہمت جواب دے گئی، کوشش کے باوجود وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

چوہدری نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''پھر وہی آدھی باتیں؟ کیا کہنے لگی تھیں؟''

''وہ..... وہ دراصل، میں..... منے کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ اس روز رات کو، میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا، پھر وہ نظر نہیں آیا۔''

''وہ بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔'' چوہدری نے حلوے کا چمچ اپنے وسیع منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمحے بعد ایک طویل سانس لے کر بولا ''مجھے لگ رہا ہے جیسے تم کچھ اور پوچھنے لگی تھیں۔''

''کچھ اور..... نن..... نہیں..... مجھے کیا پوچھنا تھا؟''

چوہدری کھانسنے لگا تھا ''اوہو، میں پانی لاتی ہوں'' وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ چوہدری کی کھوجی نگاہوں کے سامنے سے اٹھ گئی تھی، اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ آخر چوہدری کے سامنے رستم کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ اس طرح تو وہ خوامخواہ خود کو مشکوک کر رہی تھی۔ منطقی بات یہی تھی کہ اسے چوہدری سے اس رات کا ذکر کرنا چاہیے تھا جب رستم کو گھیر کر مارا گیا تھا اور پھر کہیں غائب کر دیا گیا تھا۔

پانی لاتے لاتے اس نے اپنا حوصلہ جمع کیا اور ارادہ کیا کہ وہ چوہدری کے سامنے رستم کی بات ضرور کرے گی۔ کیونکہ بات کرنا..... بات نہ کرنے سے بہتر تھا..... بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی، شانی دوبارہ چوہدری کے پاس بیٹھی تو اس نے خود ہی رستم کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک لمبی ڈکار لے کر بولا ''پچھلے دنوں اوپر نیچے کتنے عجیب واقعات ہوئے ہیں۔ رستم والی بات تو یاد ہوگی تمہیں بھی، کتنی دیدہ دلیری تھی خبیث کی۔ یوں کوٹھی میں گھس آتا تھا جیسے خالہ جی کا واڑا ہو۔ بہت خطرناک بندہ تھا۔ اس رات چوکیداروں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ فائرنگ نہیں کر سکا، ورنہ دو چار بندے تو پھڑکا ہی دینے تھے اس نے۔ پھر بھی اسے قابو کرتے کرتے دانتوں پسینے آ گیا۔''

''مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھی اسے پولیس سے چھڑا کر لے گئے ہیں؟''

''ہاں سنا تو میں نے بھی یہی تھا۔'' چوہدری کے ہونٹوں پر غیر محسوس مسکراہٹ نظر آئی۔

شانی نے حوصلہ پکڑتے ہوئے کہا ''خیر آپ اتنے بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔ آپ کو تو اصل بات کا پتا ہوگا۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا..... ''نہیں..... مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے کہ اس کے ساتھی اسے چھڑا کر لے گئے تھے۔'' چوہدری کی تیز نظریں شانی کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔

وہ گڑبڑا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ چوہدری نے عینک کے شیشے صاف کیے۔ پھر سگریٹ نکال کر سلگایا اور دو تین گہرے کش لے کر بولا ''شانی.....! تم نے میرے ایک سوال کا جواب آج تک نہیں دیا۔ جس رات حویلی میں آگ لگی تم وہاں سے کسی کو بتائے بغیر نکل گئیں۔ اس واقعے کے تقریباً چار مہینے بعد جلالاں اور ریاست وغیرہ نے تمہیں لاہور میں قاسم کے گھر سے نکالا۔ تقریباً چار مہینے بعد..... ٹھیک ہے تم نے کچھ وقت ریاض عثمانی کے گھر میں گزارا، پھر کچھ دن رکشا ڈرائیور ذکریا کے گھر میں رہیں لیکن باقی دنوں کا حساب تم نے نہیں دیا۔ تمہارا کہنا ہے کہ وہ کوئی نامعلوم بندہ تھا۔ اس نے تمہیں نامعلوم جگہ پر رکھا اور پھر نامعلوم طریقے سے تم اس کے گھر سے لاہور پہنچ گئیں..... دیکھو شانی بیگم! گندگی کے ایک قطرے سے پانی کی پوری بالٹی گندی ہو جاتی ہے، جھوٹ چھوٹا سا بھی ہو تو زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ اگر تم کچھ چھپا رہی ہو تو میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو اور شاید اپنے ساتھ بھی.....''

شانی سر تا پا کانپ گئی، اس کا حلق لمحوں میں ہی لکڑی کی طرح خشک ہو گیا تھا۔ خود پر بہ مشکل قابو پا کر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی ''میں نے آپ سے اور بھابو سے کچھ بھی نہیں

چھپایا۔ شاید میں آپ سے کچھ چھپا بھی لیتی لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اللہ بخشے بھابو سے بھی کچھ چھپا سکتی تھی؟ آپ یقین کریں حویلی سے نکلنے کے بعد میں نے چند دن ایسے ہی گزارے تھے جیسے نیند میں چل پھر رہی ہوں۔ آس پاس کا ہوش نہیں تھا مجھے.....''

چوہدری خاموشی سے شانی کی وضاحت سن رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید سوال کرتا' موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی، دوسری طرف چوہدری کا کوئی کارندہ تھا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ کارندے نے چوہدری کو چوہدری کے کسی چاچا کی آمد کی اطلاع دی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس بہروپیے کا ذکر بھی کیا ہے جسے حضرت صاحب کہا جاتا تھا۔ چوہدری کی پیشانی پر بل نظر آنے لگے، اور وہ خاصا پریشان دکھائی دینے لگا۔ ''ٹھیک ہے چاچا حشام سے کہو میں آرہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔'' چوہدری نے کہا اور فون بند کر دیا، اس کا خراب موڈ مزید خراب نظر آنے لگا تھا۔

اس نے کہیں اور فون ملانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جھلا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہاری اس جلد بازی کی وجہ سے ایک اور مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔'' وہ شانی کو مخاطب کر کے لیکن اس کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑایا۔

''جی.....؟''

''وہی خبیث قدرت اللہ..... اسے بڑا دکھ چڑھا ہوا ہے کہ تم نے اس کی بیبیوں پر ہاتھ اٹھایا اور اس کے برتن وغیرہ توڑے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس برتن میں پرندوں کی ہڈیاں تھیں، وہ اس کے پاس پانچ نسلوں سے تھا اور بہت قیمتی تھا۔ اس بات کا بڑا افسانہ ڈالا ہے اس نے۔ اس کا ایک ساتھی تو تمہیں جان سے مارنے کے درپے تھا۔ اس کے کئی مرید بھی آگ بگولا ہیں۔ میرے ساتھ اس کا ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا ہے۔ اب وہ قادرے اور چاچا حشام وغیرہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ روز کوئی نیا فتنہ کھڑا کر رہا ہے۔ اسے پتا ہے کہ وہ نارپور والوں کو آسانی سے بیوقوف بنا سکتا ہے اور وہ بن رہے ہیں۔ خاص طور سے چاچا حشام اور اس کے گھر والے تو بالکل اس کے شکنجے میں ہیں۔ چاچا حشام نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ جب تک تم مل نہیں جاتی ہو، وہ اپنے گھر نہیں جائے گا۔ کپڑے نہیں بدلے گا، بستر پر نہیں سوئے گا اور پتا نہیں کیا کیا نہیں کرے گا۔ آج پھر وہ قدرت اللہ کے ایک مرید کو لے کر کوٹھی پہنچا ہوا ہے۔''

چوہدری جانے کے لیے اپنے جوتے تلاش کرنے لگا۔ وہ کھسک کر صوفے کے نیچے چلے گئے تھے۔ شانی نے جوتے نکال کر چوہدری کے سامنے رکھے۔ وہ جوتے اور واسکٹ وغیرہ پہن کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کا اتر موڈ دیکھتے ہوئے شانی نے اس سے کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ پورچ میں چوہدری نے جالاں سے کچھ کھسر پھسر کی۔ شاید شانی کے بارے میں ضروری ہدایات دی تھیں۔ یا ممکن تھا کہ کوئی اور بات ہو۔ جالاں اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری ایک چھوٹی سوزوکی کار میں پورچ سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ چھوٹی کار وہ یہاں آنے کے لیے استعمال کرتا تھا اور اس کا مقصد یقیناً ''راز داری'' ہی تھا..... چوہدری کے جانے کے بعد وہ دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے جسم میں اب بھی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کہ فون کال آگئی تھی۔ ورنہ گفتگو جس رخ پر جا رہی تھی وہ شانی کے لیے بہت تکلیف کا باعث بن سکتی تھی۔ نجانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ رستم کے ساتھ اس کے تعلق کے حوالے سے چوہدری کا شبہ مضبوط ہو رہا ہے۔ اس کی کھوجی نظریں، اس کی گفتگو کا انداز اور اس کے تاثرات، سب اشارہ کرتے تھے کہ چوہدری کے دل میں کچھ ہے، شانی پچھتانے لگی کہ اس نے چوہدری کے سامنے رستم کی بات کیوں چھیڑی۔

اگلے چوبیس گھنٹے شانی نے سخت اذیت کے عالم میں گزارے۔ رستم کا خیال کوشش کے باوجود چند لمحوں کے لیے بھی ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ کسی وقت اسے لگتا کہ بھائی عادل، چاچا مشتاق، اباجی اور بھابو کی طرح رستم بھی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہے۔ زخم زخم ہونے کے بعد منوں مٹی کے نیچے سو چکا ہے، لیکن کسی وقت یوں لگتا کہ وہ زندہ ہے۔ سانس لے رہا ہے۔ ایک چمکیلی صبح..... یا تمتماتی دوپہر، یا خوش رنگ شام میں وہ واپس آئے گا۔ پوری طاقت اور پوری توانائی کے ساتھ..... اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں ہیجانی چمک ہوگی۔ وہ اپنے گرد و پیش کو تہ و بالا کر دے گا۔ اس کی آتشیں نگاہوں سے ساری زنجیریں پگھل جائیں گی۔ اس کے فولادی بازو ہر طوفان کا رخ پھیر دیں گے۔

امکانات برابر تھے۔ وہ آسکتا تھا۔ وہ نہیں آسکتا تھا۔ وہ کبھی ایک رخ پر سوچنے لگتی تھی، کبھی دوسرے رخ پر۔

شانی کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ کسی سے نفرت کرتی۔ مگر قدرت اللہ جیسے لوگوں کے لیے وہ بھی اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں پاتی تھی۔ قدرت اللہ پہلی جھلک میں ہی شانی کو برا لگا تھا۔ بعد ازاں یہ ناپسندیدگی بڑھتی چلی گئی۔ شانی سمجھتی تھی کہ وہ شخص بھابو کا قاتل ہے اور بھابو جیسے نجانے کتنے دکھی لوگ تھے جن کے دکھ اس بہروپیے نے موت دے کر دور کیے تھے۔ شانی کو وہ لمحے یاد تھے جب وہ غم سے نڈھال اور طیش سے بے قابو ہو کر قدرت اللہ کی چیختی بیویوں پر پل پڑی تھی۔ قدرت اللہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو پتا نہیں وہ کیا کر گزرتا، خاص طور سے سب سے چھوٹی کی پٹائی تو وہ کسی طور برداشت نہ کر پاتا۔ شانی کو بعد ازاں پتا چلا تھا کہ وہ ہنگامے کے وقت بالائی منزل پر گہری نیند سو رہا تھا۔ بھابو کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے بعد ہی وہ بیدار ہوا تھا..... شانی قدرت اللہ کے بارے میں سوچتی رہی اور نت نئے اندیشے اس کے ذہن میں سر اٹھاتے رہے۔

اتنے میں بیرونی دروازے کی بیل ہوئی، جالاں جھومتی جھامتی دروازے تک گئی اور آنے والے کا نام وغیرہ پوچھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا، اب دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت آنا شروع ہوگئی تھی۔ موسم کروٹ لے رہا تھا۔ آنے والی ایک ادھیڑ عمر خوش شکل عورت تھی۔ اسے دیکھ کر شائلہ عرف شیلا تیزی سے آگے بڑھی اور پھوپھی کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ ادھیڑ عمر عورت نے اس کے سر پر پیار دیا اور ایک شاپر جس میں فروٹ تھا' اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے باتیں کرنے لگیں۔ شائلہ نے شانی کو بتایا کہ یہ اس کی مرحومہ والدہ کی پھوپھی ہیں لیکن وہ بھی بچپن سے ان کو پھوپھی ہی کہتی آئی ہے۔ پھوپھی صاحبہ اچھی عورت لگتی تھیں۔ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور نماز روزے کی باتیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر وہ سہ پہر کے بعد واپس چلی گئیں۔ شانی دیر تک سوچتی رہی۔ یہ نیک صورت عورت یقیناً نہیں جانتی کہ اس کی ''بھتیجی کی بیٹی'' کس قسم کی زندگی جی رہی ہے اور شاید اس عورت کی طرح اور بہت سے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ ازدواجی رشتے کے بعد شوہر ہی بیوی کا محافظ ہوتا ہے لیکن جب محافظ ہی ڈاکو بن جائے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ شانی کو سو فیصد یقین تھا کہ اگر شائلہ عرف شیلا چوہدری بشیر کے ساتھ ہر حد پار کر رہی ہے تو آج اس گناہ میں اس کا شوہر ناصر بھی برابر کا شریک ہے۔

شائلہ کی ''پھوپھی'' شائلہ کے لیے چھوٹے موٹے تحفے لے کر آئی تھیں، ان میں ایک نہایت خوبصورت پوسٹر ایک بچے کا بھی تھا۔ ایک شیر خوار بچہ آنکھوں میں معصوم آنسو لیے منہ بسور رہا تھا۔ یہ اتنی پیاری تصویر تھی کہ ایک ہی لمحے میں نگاہوں کو جکڑ لیتی تھی۔ پھوپھی بے چاری، یہ تصویر شاید اس لیے لائی تھیں کہ شائلہ اسے اپنے کمرے کی کسی دیوار پر آویزاں کرے گی، اور یوں اس کے اندر یہ خواہش زور پکڑے گی کہ اس کی گود میں بھی ایک قلقاریاں مارتا بچہ ہو۔ مگر شائلہ نے یہ تصویر ایک بے کار شے کی طرح ایک طرف پھینک دی تھی۔ پھوپھی بے خبر کو پتا نہیں تھا کہ جن عورتوں کو اپنے بچے کی ولدیت ہی ٹھیک سے معلوم نہ ہو سکتی ہو۔ وہ اس قسم کی تصویروں میں دلچسپی نہیں لیا کرتیں۔

اس قسم کی تصویروں میں تو شانی جیسی عورتیں دلچسپی لیتی ہیں جن کے سینے میں مامتا ہلکورے لیتی ہے اور جن کے انگ انگ میں ایک قلقاریاں مارتے وجود کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے۔ شانی نے تصویر اٹھائی اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے تصویر کے رول کو کھولا اور اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اس کے دل سے ٹیس اٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے منا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے پکار رہا ہے۔ اسے تصویر کے چہرے میں اپنے منے کا چہرہ دکھائی دیا اور وہ بے تاب ہو اٹھی۔ اس کا جی چاہا، اس کے پر ہوں، اور وہ سارے اندیشوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہوا میں اڑتی ہوئی منے کے پاس پہنچ جائے۔ اسے اپنی گود میں یوں چھپائے کہ پھر کوئی اسے جدا نہ کر سکے۔

پھر ایک دن شام کے فوراً بعد چھوٹی سوزوکی کار، مکان کے گیٹ کے سامنے آکر رکی، یقیناً چوہدری بشیر کی آمد ہوئی تھی، ناصر اور شائلہ نے چوہدری کا استقبال کیا اور اسے اندر لے آئے۔ یہ دیکھ کر شانی کی جان میں جان آئی کہ آج چوہدری اچھے موڈ میں تھا۔ وہ شانی کے پاس کمرے میں آیا تو شانی نے دیکھا، اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ''یہ کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔'' چوہدری نے مختصر جواب دیا۔

شانی کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ شاید کوئی لڑائی جھگڑے کا واقعہ ہوا تھا۔ آج کل کوٹھی میں جس قسم کے حالات تھے ایسے کسی واقعے کا ہونا عین قرین قیاس تھا۔ شانی کے ذہن میں تو یہ اندیشہ بھی بڑی شدت سے موجود تھا کہ رنگ والی میں اس کے لواحقین کا تصادم نارپور والوں سے نہ ہو جائے۔ یہ امر تو اب یقینی تھا کہ شانی کے حوالے سے ساری بات کھل چکی ہوگی۔ رنگ والی میں شانی کے سارے رشتے داروں کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ وہ اپنے سسرالیوں کی تحویل میں ہے اور اسے ہر کسی سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے

بعد ''رنگ والی'' والوں کا ردِعمل ظاہر ہونا یقینی تھا۔ بے شک اباجی نہیں تھے، چاچا مشتاق اور بھائی عادل بھی نہیں تھے۔ چاچا رئیس انگلینڈ جا چکا تھا سارا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اس کے باوجود شانی کے بہت سے رشتے دار اور بہی خواہ رنگ والی میں موجود تھے۔ ان میں تایا معصوم، پھوپھی آمنہ، چچی پروین، شانی کے دو خالو اور خالہ زاد بھائی شامل تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی موت کے بعد اس کے زندہ ہونے کی خبر نے رنگ والی اور گردونواح میں تہلکہ مچا دیا ہوگا۔ علاقے کے لوگ اپنے مرحوم چوہدری ارشاد کی بیٹی کو پھر سے دیکھنے اور ملنے کے لیے بے تاب ہو گئے ہوں گے۔ وہ تصور کی نگاہ سے ہلچل اور افراتفری کے وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ چوہدری بشیر نے ابھی تک اسے اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس کے نہ بتانے سے حقیقتِ حال بدل تو نہیں سکتی تھی۔ اور اب چوہدری بشیر کے بازو پر چوٹ نظر آ رہی تھی۔ کیا کہا جا سکتا تھا یہ چوٹ کس کے ہاتھوں آئی ہے اور اس کے پیچھے کیا واقعہ ہے۔

چوہدری نے کہا ''آج پھر تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

وہ چونک گئی..... وہ بولا ''تم تو ایسے حیران نظر آ رہی ہو جیسے تمہارے لیے اچھی خبر ہو ہی نہیں سکتی۔''

''کچھ ایسا ہی لگتا ہے مجھے'' وہ اداسی سے بولی۔

''چلو آؤ میرے ساتھ'' اس نے بے تکلفی سے شانی کا بازو پکڑا اور پورچ کی طرف چل دیا۔ برآمدے میں شمائلہ نے بہ ظاہر مسکراتی نظروں سے چوہدری اور شانی کو دیکھا، تاہم شانی نے صاف محسوس کیا کہ ان نگاہوں کے پیچھے رقابت کا دھواں ہے۔ اس سے پہلے بھی شانی دو چار دفعہ اس دھوئیں کی جھلک شمائلہ کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی۔

چوہدری شانی کو پورچ میں سوزوکی کار کے قریب لے آیا۔ شانی نے گاڑی میں جھانکا تو اس کا دل بلیوں اچھل گیا۔ وہاں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ کو اسٹریچ کیا گیا تھا اور اس پر منا سو رہا تھا۔ شانی نے تڑپ کر دروازہ کھولا اور خوابیدہ منے کو اٹھا کر گلے سے چمٹا لیا۔ وہ نیند کی حالت میں ہی اس کا منہ چومنے لگی۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے پیوست ہو گیا۔

منے کی آمد نے شانی کے دل کے بہت سے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ منے کو چھو کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بھابو کے جسم کے ایک حصے کو چھو رہی ہے۔ منا بھی نہال ہو گیا تھا۔ اس کے سینے میں جتنی بھی باتیں جمع تھیں تھوڑی ہی دیر میں اس سے کر لینا چاہتا تھا۔ چوہدری ان دونوں کو دیکھ کر کسی وقت زیرِلب مسکرا دیتا تھا۔

''بہت شکریہ.....'' شانی چوہدری کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''کس بات کا.....''

''منے کو لانے کا.....''

''بھئی! یہ میری اپنی ضرورت بھی تو ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں سمجھی نہیں.....''

''تم ان عورتوں میں سے ہو، جو بچے کے ساتھ مکمل اور زیادہ خوبصورت لگنے لگتی ہیں۔ اب تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں تو دل چاہ رہا ہے کہ ٹائٹ تم دونوں کی دو چار تصویریں اتار لوں، لیکن افسوس کہ کیمرا ساتھ نہیں لا سکا۔''

''آپ جھوٹی موٹی کی تصویر کھینچ لیں۔ یوں کر کے.....'' منے نے تصویر کھینچنے کا ایکشن بنایا۔

اس کوشش میں اس کی کہنی بڑے زور سے شانی کی ناک پر لگی۔ شانی کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ وہ چونک کر بولا ''تائی! تم رو رہی ہو۔ تم تو مجھے رونے سے منع کرتی ہو.....''

''مارتے ہو اور رونے بھی نہیں دیتے ہو۔'' شانی نے کہا۔ چوہدری چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے سمجھا تھا کہ شانی کی بات کا رخ اس کی طرف ہے۔

شانی اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے کوئی بات سوچ رہی تھی جب اچانک اسے ندیم کا خیال آیا۔ اس نے چونک کر چوہدری سے پوچھا۔ ''ہائے، ندیم کہاں ہے؟''

''وہ پرسوں ہوسٹل واپس چلا گیا ہے۔ کافی حد تک نارمل ہو چکا ہے۔''

''ایک بار اسے مجھ سے ملا دیتے۔ مدت ہو گئی ہے اسے دیکھے ہوئے۔'' شانی نے افسردگی سے کہا۔

''ابھی حالات ٹھیک ہو لینے دو..... پھر تمہارے بہت سے شکوے دور کر دوں گا۔''

رات کا کھانا تینوں نے اکٹھے کھایا۔ شانی مسلسل منے کی دلجوئی میں لگی رہی۔ وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی فارغ بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے دل میں ڈر سا بیٹھ گیا تھا کہ فارغ ہوتے ہی اس کا دھیان اپنی بچھڑ جانے والی ماں کی طرف چلا جائے گا اور وہ اس کی کوئی بات چھیڑ دے گا۔ شانی اس دردناک موضوع سے بچنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل

کے زخموں سے رسنے والے خون کو بہ مشکل بند کیا تھا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ منا شانی کے ساتھ لگ کر سو گیا۔ حالتِ نیند میں بھی اس نے شانی کی اوڑھنی کا پلو مٹھی میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کے اندر شانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ اس شدت کو محسوس کر کے شانی اندر سے ہل جاتی تھی۔ چوہدری ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ گھر کے مالک یعنی ناصر کو سرِشام ایک ضروری کام پڑ گیا تھا اور وہ اپنے ایک ملازم کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ اسے کل دوپہر واپس آنا تھا۔ شاید چوہدری کی آمد کے موقع پر اس قسم کے ''ضروری کام'' ناصر کو پڑتے ہی رہتے تھے۔ بہرحال آج صورتِ حال مختلف تھی۔ شمائلہ چوہدری کی ''دسترس'' میں تھی لیکن اس کی ''توجہ'' میں نہیں تھی۔ وہ بن ٹھن کر چوہدری کے اردگرد گھوم رہی تھی لیکن چوہدری مسلسل اپنے موبائل فون کے ساتھ مصروف تھا اور مختلف لوگوں کو کالیں کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو کا کوئی کوئی لفظ شانی کے کان میں بھی پڑ جاتا تھا۔ ان الفاظ سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری بشیر اور اس کی برادری کے درمیان چپقلش بڑھانے میں قدرت اللہ واقعی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ بھابو کی موت کی ذمے داری شانی پر ڈال رہا تھا۔ اس کے علاوہ غالباً اپنی عملیات کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں بھی مصروف تھا کہ نارپور والوں کے سر پر مزید خطرات منڈلا رہے ہیں۔

آدھ پون گھنٹا چوہدری بشیر کے اردگرد گھومنے کے بعد شمائلہ مایوس ہو کر سونے کے لیے چلی گئی۔ شانی منے کے پاس لیٹی رہی۔ اس کا دل انجانے خدشات سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی پریشانی کی آمد سے آگاہ کر رہی تھی۔ رات بارہ بجے تک چوہدری بشیر کے کمرے سے ٹی وی کی مدھم آواز آتی رہی۔ کوتاہ قد ڈولا چائے کی ٹرے لے کر اندر جاتا اور باہر آتا رہا، پھر غالباً وہ بھی سونے کے لیے چلا گیا۔ قرب و جوار میں رات کا گہرا سناٹا چھا گیا۔ شانی کو بھاری قدموں کی آواز آئی۔ چوہدری دروازے پر کھڑا تھا۔ ''منا سو گیا؟'' اس نے یونہی رسمی انداز میں پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ منا سو چکا ہے۔

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔

''آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔'' چوہدری نے متوقع سرگوشی کی۔

شانی کچھ دیر ساکت لیٹی رہی پھر اس نے منے کی طرف دیکھا، اس کی اوڑھنی ابھی تک اس کی مٹھی میں دبی تھی، جیسے وہ اسے جانے سے روکنا چاہتا ہو۔ لیکن جو بُلا رہا تھا وہ زیادہ زور آور تھا۔ شانی جانتی تھی کہ اگر وہ اوڑھنی کو مٹھی سے چھڑانے کی کوشش کرے گی تو وہ جاگ جائے گا۔ اس نے بڑے آرام سے اوڑھنی اپنے جسم سے علیحدہ کر دی۔ اب وہ ننگے سر چوہدری کے سامنے کھڑی تھی۔ چوہدری کی نگاہوں کی تپش کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے ایک دوپٹہ ڈھونڈا اور اسے اوڑھتی ہوئی چوہدری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

یہاں گیس کا ہیٹر دھیمی رفتار سے جل رہا تھا۔ شانی اور چوہدری سامنے صوفے پر بیٹھ گئے، چوہدری پہلے بھی اسی طرح اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ رات کے سناٹے میں وہ دھیمے لہجے میں دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا۔ شانی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اور نگاہیں شانی کے سراپا کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ لیکن آج شانی کو صورتِ حال کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

چوہدری نے شانی کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ان مصائب کے بارے میں بتانے لگا جو بھابو کی موت کے بعد اسے درپیش تھے۔ شانی کا یہ قیافہ درست نکلا تھا کہ نارپور کی حویلی کی آگ سے اس کے زندہ بچ نکلنے کی اطلاع دور دور تک پھیل چکی تھی۔ نارپور کے ساتھ ساتھ رنگ والی میں بھی زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ رنگ والی سے معززین کا ایک گروہ چوہدری بشیر سے ملنے کوٹھی پہنچا تھا۔ ان میں شانی کے قریبی عزیز بھی تھے۔ انہوں نے چوہدری بشیر سے شانی کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کی تھیں۔ چوہدری بشیر نے ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا (صرف یہ بات چھپائی تھی کہ شانی اب بھی اس کے پاس ہے) اس نے شروع سے آخر تک سب کچھ ان لوگوں کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اس نے موقف اختیار کیا تھا کہ شانی چونکہ نارپور اور رنگ والی کے کسی فرد کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا وہ کوٹھی میں اپنی مرضی سے پناہ گزین ہو گئی تھی۔

چوہدری بشیر سے مکمل وضاحتیں لینے کے بعد رنگ والی کے معززین واپس تو چلے گئے تھے لیکن نارپور والوں کی طرح وہ بھی پختہ شک رکھتے تھے کہ شانی اب بھی چوہدری کے پاس ہے۔ کم از کم اسے یہ پتا ضرور ہے کہ شانی کہاں ہے۔ چوہدری نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ٹھنڈی وہسکی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا ''میں دو طرف سے مصیبت میں ہوں..... ایک طرف میری برادری ہے جو ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف تمہارے میکے والے ہیں جو

راشن لے کر مجھ پر چڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں پارٹیاں آپس میں دشمن ہونے کے باوجود میرے لیے ایک جیسی خطرناک ہوگئی ہیں۔ اب تیسرا وہ الو کا پٹھا قدرت اللہ ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے پر تلا ہوا ہے۔ وہ قادرے اور چاچا حشام کے حواریوں کو تمہارے بارے میں برے برے طریقے سے بھڑکا رہا ہے۔ مجھے اس بندے پر کبھی بھی بھروسا نہیں تھا۔ صرف تمہاری بھابو کی وجہ سے میں اسے برداشت کرتا چلا آرہا تھا۔ وہ ایک نمبر کا شعبدے باز ہے مگر اس کی باتوں میں کوئی ایسا جادو ہے کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ خاص طور سے عورتیں تو بہت جلد اس کے جال میں آتی ہیں۔''

شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا ''آپ کیوں میرے لیے اتنے لوگوں سے دشمنی مول رہے ہیں؟''

''اس سوال کا جواب میں تمہیں پہلے بھی کئی بار دے چکا ہوں۔ یہ میرے دل کا معاملہ ہے۔ اور دل کے معاملوں کو سمجھانا اور بتانا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

شانی نے دل میں سوچا چوہدری.....! پتا نہیں تمہارے دل کے ایسے کتنے معاملے ہوں گے۔ یہ شیلا بھی تو ایسا ہی معاملہ ہے۔ تم اس کے خاوند کو گھر سے باہر بھیج کر اس کے ساتھ رات بسر کرتے ہو۔ اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی کوٹھی میں بلا لیتے ہو۔ یقیناً ایسی اور بھی ''شیلائیں'' تمہاری زندگی میں ہوں گی۔ کچھ کویت اور دبئی میں ہوں گی جہاں سے تم آئے ہو۔ کچھ یہاں لاہور میں ہوں گی۔ تم وہی روایتی وڈیرے ہو چوہدری بشیر! جو صدیوں سے اپنے ظلم کی نوک سے اس دھرتی کا سینہ چھید رہا ہے تم نے اپنا لباس بدل لیا ہے۔ بول چال بدل لی ہے۔ ذرا ماڈرن بن گئے ہو لیکن تمہاری فطرت تو وہی ہے۔ اوپر کو اٹھی ہوئی تمہاری پگڑی، اوپر کو اٹھی ہوئی تمہاری مونچھیں، اوپر کو اٹھی ہوئی جوتی کی نوک..... یہ سب کچھ پوری تن فن کے ساتھ تمہارے اندر موجود ہے..... تمہاری خو کا حصہ ہے۔

لیکن وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کہہ سکی۔ چوہدری سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں اور کس لیے بھابو کو قدرت اللہ جیسے بہروپے کے سپرد کیا، کیوں وہ اسے خطرناک آپریشن کے نام پر ڈراتا رہا اور قدرت اللہ کے شعبدوں کی نذر کرتا رہا۔ آج وہ قدرت اللہ کو بہروپیا تسلیم کر رہا تھا، کیا قدرت اللہ اس وقت بہروپیا نہیں تھا۔ جب چوہدری اسے فون کالز کر کر کے بھابو کے لیے کوٹھی میں بلاتا تھا۔ یہ چوہدری کا ایک ایسا دوغلا پن تھا جو شانی کے سینے میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا تھا اور جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی، ہاں فراموش کرنے اور نظر انداز کرنے میں فرق ہوتا ہے اپنی مجبوریوں کے سبب وہ چوہدری کے دوہرے پن کو نظر انداز کر رہی تھی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے اسے یہ کرنا پڑ رہا تھا۔

کھڑکیوں سے باہر نیم تاریک ٹھنڈی رات سنسناتی رہی تھی۔ لاہور کا یہ مضافاتی..... شہر نما قصبہ شاید کہیں جاگ رہا ہو لیکن زیادہ تر جگہوں پر یہ سو رہا تھا۔ ہیٹر میں آگ کی مدھم روشنی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں منا شانی کی اوڑھنی پکڑے پکی نیند سو رہا تھا۔ شانی کا دایاں ہاتھ چوہدری کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس کا بایاں بازو شانی کے کندھے پر سے گزر کر بائیں کندھے پر آ گیا۔

وہ باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ شانی سے قریب ہو رہا تھا، اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیاں شانی کے ریشمی بالوں سے الجھنے لگیں۔ آج چوہدری کے انداز میں ''پیش قدمی'' کی کیفیت تھی۔ شانی کا دل بری طرح دھڑ دھڑانے لگا۔ چوہدری نے شانی کو اپنی طرف کھینچا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ شانی کا سر اس کے کندھے سے لگ جائے لیکن..... شانی کا سر اس کے کندھے سے دور ہی رہا..... شانی ''اس سے آگے'' بڑھنے سے مجبور تھی۔

چوہدری تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا، خاموش، لیکن سوال پوچھتی ہوئی نظریں۔ یہ نظریں جیسے شانی سے کہہ رہی تھیں۔ ''دیکھو..... میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا۔ تمہیں قادرے اور چاچا حشام کی وحشتوں سے بچایا ہے۔ تمہارے لیے اپنوں پرایوں سے دشمنی مول لی ہے۔ تمہاری خوشی کے لیے خطرہ مول لیتے ہوئے، تمہاری ملازمہ اور اس کے بال بچے کو پاکستان سے باہر بھیجوا دیا ہے۔ اب تمہاری دلجوئی کے لیے..... کوسوں دور سے منے کو تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ جو کچھ تمہارے لیے کیا ہے اور جو کچھ کر رہا ہوں کیا اس کے صلے میں تم مجھے تھوڑی دیر کی راحت نہیں دے سکتی ہو۔ تھوڑی سی راحت۔ تھوڑی سی رعایت.....؟''

شانی ایک بے رحم شکنجے میں تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس گرم کمرے کی کھڑکیوں سے باہر سامنے والی تاریک گلی میں رستم کھڑا ہے۔ زخموں سے چُور، چہرے پر دنیا جہان کا کرب سمٹا ہوا۔ آنکھوں میں ایک اشکبار شکوہ..... وہ اس سے کہہ رہا ہے..... ''بی بی، میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں تھا۔ لیکن اتنا اطمینان ضرور تھا کہ آپ میری نہیں تو پرائی بھی نہیں۔ ایک

کچا سادھا گاہی سہی لیکن کوئی ناتا تو ہے ہمارے درمیان کیا آج اس دشمن کے ہاتھوں وہ ناتا بھی ٹوٹ جائے گا شانی نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا۔ وہ کیوں خام سوچوں میں الجھ رہی تھی۔ رستم؟ کہاں تھا رستم؟ وہ تو وقت کی بساط پر زندگی کی بازی ہار کر نجانے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کی زندگی سے خالی ہو جانے والا وجود بھی کہیں موجود تھا یا نہیں۔ لیکن..... لیکن رستم کے نہ ہونے سے گناہ اور نیکی کا تصور تو ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ جو کچھ چوہدری چاہ رہا تھا وہ کیسے قابلِ قبول ہو سکتا تھا۔

اچانک شانی چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ چوہدری بشیر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ وہی طیش آمیز انداز جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار بھگت چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی چوہدری تیزی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد شانی نے دیکھا کہ وہ جانے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ واسکٹ پہن لی تھی، گرم چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ اس نے سپاٹ خشک لہجے میں شانی کو آواز دی۔ منے کو جگاؤ۔ ہمیں جانا ہے۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ ایک دو منٹ تک شدید تذبذب میں رہی پھر چوہدری کے سامنے چلی گئی۔ ''کیا بات ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟''

''واپس لاہور۔''

''مم..... مگر اس وقت؟ رات کا ایک بجا ہے۔''

''یہی وقت ٹھیک ہے۔ دن کے وقت پریشانی ہوگی۔ میں نظروں میں آنا نہیں چاہتا وہاں۔''

بریف کیس چوہدری کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ وہ مکمل بے رخی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک دم شانی بے تاب ہو کر آگے بڑھی اس نے بریف کیس چوہدری کے ہاتھ سے لینے کے لیے اس کا ہینڈل تھام لیا..... ''آ..... آپ ایسا مت کریں۔ میں اس وقت آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ منا بہت روئے گا۔ آپ دیکھ ہی رہے تھے۔ وہ کس طرح صبح کے پروگرام بنا رہا تھا۔''

''میں تمہارے پروگراموں کے لیے نہیں رک سکتا۔ مجھے جانا ہے۔'' چوہدری کا لہجہ خشک تھا۔

شانی کی گرفت چرمی ہینڈل پر مضبوط ہوگئی۔ ''نہیں..... یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ نگاہ جھکائے جھکائے بولی۔

''کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں..... یہ مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے بریف کیس چھڑانے کی کوشش کی، مگر شانی نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

وہ غصے سے شانی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ خاموش لیکن مصمم ارادے کے ساتھ۔ پانچ دس سیکنڈ تک یہی کیفیت برقرار رہی۔ دونوں کھڑے رہے۔ بریف کیس کے ہینڈل پر شانی کی گرفت مضبوط رہی، چوہدری کی پُرتپش نگاہیں شانی کے چہرے پر گڑی رہیں، وہ فرش کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر شانی نے محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے چوہدری کی گرفت ہینڈل پر سے ڈھیلی پڑ گئی ہے..... دبیز پردوں والی کھڑکیوں سے باہر تاریکی تھی، گھر کے بند اور نیم وا دروازوں کے پیچھے بھی خاموشی کا راج تھا..... اچانک چوہدری نے شانی کو دبوچ لیا۔ بڑی سختی اور شدت کے ساتھ۔ اس کے دہکے ہوئے ہونٹ شانی کے چہرے پر پھسلنے لگے۔ اس کی بانہوں کی جارحانہ گرفت اس کے گرد سخت ہوتی چلی گئی۔ اس کی تند پیش قدمی کو سہارتی ہوئی شانی دیوار سے جا لگی۔ وہ ہیجانی انداز میں اسے چومنے اور لپٹانے لگا۔ شانی ایک تصویر کی طرح ساکت تھی..... اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تصویریں خوبصورت تو ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں زندگی نہیں ہوتی، حرارت نہیں ہوتی، دوپٹہ شانی کے قدموں میں پڑا تھا۔ اوڑھنی بیٹے نے مٹھی میں دبالی تھی۔ دوپٹہ باپ نے کھینچ کر اتار دیا تھا۔ اباجی نے اسے کبھی پنجابی کا ایک شعر سنایا تھا۔ اس مختصر شعر کا مفہوم تھا۔ میرا کام غم لینا اور خوشی دینا ہے۔ میں دھرتی کی طرح ہر ظلم سہتی رہی ہوں۔

ان لمحوں میں ''وہ'' بھی خود کو جلتے آسمان کے نیچے بے بس دھرتی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ کچھ بعد چوہدری پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہی، کچھ دیر تک خاموشی سے شانی کو دیکھتے رہنے کے بعد چوہدری نے ہولے سے ہاتھ بڑھایا اور اس کے بکھرے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ تاہم طوفان میں ذرا سے اتار کے آثار بھی تھے۔ شانی نے فرش سے بریف کیس اٹھایا اور اسے الماری میں رکھ دیا۔ چوہدری نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی روانگی صبح تک ملتوی کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

چوہدری نے اپنی روانگی صبح تک ملتوی کر دی تھی بلکہ اگلے روز تک ملتوی کرنے پر تیار نظر آتا تھا۔ منے کی بھی یہ شدید ضد تھی کہ وہ ابھی کوٹھی واپس نہیں جائے گا۔

صبح ان تینوں نے اکٹھے ناشتا کیا۔ پھر رات کو بنائے گئے پروگرام کے مطابق شانی، منا شائلہ اور کوتاہ قد ڈولا اوپر

گھر کی چھت پر چلے گئے، ہلکی ہلکی دھوپ میں وہ منے کے ساتھ کرکٹ کھیلتے رہے۔ اس مصروفیت کے دوران شائلہ کی تیز چبھتی ہوئی نگاہیں گاہے بگاہے شانی کی نگاہوں سے ٹکراتی رہیں۔ کسی وقت شانی کو دیکھ کر شائلہ کے ہونٹوں پر مدھم سی معنی خیز مسکراہٹ بھی ابھر آتی تھی۔ شائلہ نے ابھی تک کھلے الفاظ میں شانی کے ساتھ چوہدری کے تعلق کی بات نہیں کی تھی۔ تاہم شانی کو معلوم تھا کہ وہ اس تعلق کے بارے میں جانتی ہے۔ بھابو کی آخری رات شانی نے چوہدری اور شائلہ کی جو ٹیلیفونک گفتگو سنی تھی۔ اس میں بالواسطہ شانی کا اپنا ذکر بھی آیا تھا۔ شائلہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ چوہدری سے پوچھا تھا کہ وہ کون خوش نصیب لڑکی ہے جو آج کل آپ کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ چوہدری نے کہا تھا کہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔ بعد میں شائلہ نے ''لڑکی'' کی تصویر دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔

شائلہ اتنی معصوم نہیں تھی کہ وہ شانی سے ملنے کے بعد بھی بات کی تہ تک نہ پہنچتی۔ اس کی معنی خیز مسکراہٹیں گواہ تھیں کہ وہ سب جانتی ہے۔ منا کھیل رہا تھا۔ ڈولا اور شائلہ فیلڈنگ کر رہے تھے۔ شانی کو منے نے بالنگ پر لگایا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''تائی! ذرا تیز بال کراؤ.....''

''بھئی، مجھے تیز بال کرانی نہیں آتی۔''

شائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا ''لیکن تیز بالنگ کھیلنا تو آتی ہے۔''

''کیا مطلب.....''

''ابھی ڈولے کی اتنی تیز گیندیں کھیلی نہیں ہیں آپ نے.....'' شائلہ نے بات بدلی۔ شانی اپنے اندر ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

اتنے میں منا دوڑتا ہوا شانی کے پاس آیا۔ اس نے دوپٹہ شانی کی کمر سے ٹھوڑا سا ہٹایا ''تائی! یہ آپ کی قمیص کو کیا ہوا؟'' اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔

اس کی انگلی کا لمس شانی نے براہ راست اپنی جلد پر محسوس کیا۔ قمیص وہاں سے ادھڑی ہوئی تھی..... شاید یہ رات والے واقعے کا نتیجہ تھا۔ شانی سٹپٹا کر رہ گئی..... غالباً شائلہ کی معنی خیز مسکراہٹ کی وجہ بھی یہی تھی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ تپ گیا ہے اور کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئی ہیں۔ اس نے دوپٹہ برابر کیا۔ منا پھر بولا ''تائی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں'' شانی نے جھنجلا کر کہا۔

''بھئی! کھیل کھیل میں ہو جاتا ہے ایسا۔'' شائلہ نے منے کو سمجھایا۔ لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

شانی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ..... جو کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی..... ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

منا سارا دن بہت خوش رہا۔ وہ شانی سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کپڑے بدلنے کے لیے واش روم میں گئی تو بھی وہ دروازے پر کھڑا رہا اور بار بار آواز دیتا رہا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ کہیں ہوا بن کر اڑ جائے گی۔ شانی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ منے سے دور نہیں رہ سکتی تھی اور جب وہ پاس ہوتا تھا تو اس کی وارفتگی دیکھ کر اس کے دل پر بوجھ بھی پڑنے لگتا تھا۔

رات کو منے کے سونے کے بعد وہ ایک بار پھر ناپسندیدہ صورت حال کا شکار ہوئی..... آج وہ دونوں ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ یہ ایک طرح سے کل والے واقعے کا ایکشن ری پلے ہی تھا، چوہدری کی ہیجانی کیفیت، اس کی گرم سانسیں۔ اور شانی ایک تصویر کی طرح ساکت۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی ہوئی، کل ہی کی طرح تھوڑی دیر بعد چوہدری نے اس پر سے اپنی بانہوں کی گرفت ختم کر دی۔ اور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا ''شانی! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

الفاظ بے پناہ شدت کے ساتھ شانی کے کانوں میں گونجے..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... وہ اس فقرے کی توقع پہلے سے کر رہی تھی۔

وہ اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولا ''میں، منا اور ندیم بہت اکیلے ہو گئے ہیں شانی۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ خاص طور سے مجھے اور منے کو..... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے بغیر منے کا کیا حال ہوتا ہے۔ اور جو میرا حال ہے، وہ بھی تم دیکھ رہی ہو۔''

شانی فرش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس سے جو سوال پوچھا جا رہا تھا وہ اس کی زندگی کا کٹھن ترین سوال تھا۔ وہ اس سوال کے کروڑوں ٹن وزنی بوجھ تلے پسنے لگی۔ اس کے لب تھرتھرا رہے تھے مگر انہیں قوت گویائی نہیں تھی۔ وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر حلیمی سے بولا ''تم سوچنے کے لیے پورا وقت لو۔ مگر ساری باتوں پر خوب اچھی طرح غور کر کے جواب دینا۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا جواب میرے اور منے کے حق میں ہو گا۔''

شانی نے اپنی آواز کی لرزش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا ''آپ..... مجھے جو مقام دینا چاہتے ہیں، میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ آپ شاید یہ بات بھول رہے ہیں کہ میں دشمن کی بیٹی ہوں۔ اس سے پہلے آپ کے مرحوم بھائی نے مجھے عزت دینے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا..... دادا جی اور ساری برادری اس کی دشمن ہو گئی، اب بھی آپ کا خاندان اور برادری یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ اب تو یہ اور مشکل ہے۔ مجھے دادا جی اور درجنوں لوگوں کی قاتلہ کہا جا رہا ہے..... میں آپ کی ٹھوکروں میں ایک کنیز کی حیثیت سے مر تو سکتی ہوں۔ بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ کے لوگ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

چوہدری نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ ''دیکھو..... بگڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے خاندان سے ہمارے خاندان کی دشمنی تھی لیکن یہ 75 سال پہلے کی بات ہے۔ میں اور تم آج کی بات کر رہے ہیں، اس گھڑی کی بات کر رہے ہیں۔ تم دیکھ چکی ہو کہ تمہاری خاطر میں کہاں تک جا سکتا ہوں۔ میں اس سے بھی آگے جاؤں گا۔ مجھے نار پور کے جاہلوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ہم ایک نئی طرح کی زندگی شروع کریں گے باقی رہی کنیز بن کر رہنے والی بات تو مجھے اس پر دکھ ہوا ہے، اگر میری سوچ ایسی ہی ہوتی تو کوٹھی میں آنے کے بعد تم کب میری پہنچ سے دور تھیں۔ میں جب چاہتا ایک دشمن بن کر تمہارے سامنے آ سکتا تھا، لیکن تم جانتی ہو ایسا نہیں ہوا۔ نہ اب ایسا ہو رہا ہے..... کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں تمہیں دل کی گہرائی سے عزت دینا چاہتا ہوں۔''

''میں اپنے لیے فساد نہیں چاہتی ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''تم سے کہا ہے ناں۔ ان باتوں پر مت سوچو..... یہ میرے معاملے ہیں۔ میں انہیں بڑی آسانی سے نمٹا سکتا ہوں، اتنا دم خم ہے مجھ میں۔ ہاں اگر کوئی اور بات تمہارے ذہن میں ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں کھلے دل سے سنوں گا۔''

شانی اندر سے کانپ گئی۔ اسے ڈر لگا کہ گفتگو کا رخ کسی خاص سمت میں نہ مڑ جائے۔ اسے چوہدری سے اپنی پچھلی ملاقات یاد تھی۔ اور اس ملاقات میں جس طرح سے رشتے کا ذکر ہوا تھا وہ ابھی تک شانی کے دل میں خوف بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔

چوہدری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا ''کہیں ایسا تو نہیں کہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں تمہیں کسی طرح کی الجھن ہو.....؟''

شانی خاموش رہی۔ چوہدری نے اپنے بھاری بھرکم چہرے سے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کیے۔ ''شانی! تمہاری بھابو سے میرا رویہ جس طرح کا تھا تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہر طرح سے عزت دی..... وہ کافی عرصے سے بیمار تھی۔ میں نے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کی بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ بہرحال ایک انسان کے طور پر مجھ میں بھی کچھ خامیاں ہیں۔ میں ڈرنک کرتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد میری زندگی میں لڑکیاں آتی رہی ہیں کبھی کبھار اب بھی ایسا ہو جاتا ہے۔'' یہاں تک کہہ کر چوہدری نے چند لمحے توقف کیا اور شانی کو سراپا غور سے دیکھ کر بولا ''بہرحال، میں ایک بات کا تم سے وعدہ کرتا ہوں شانی! اگر تم میری زندگی میں آنے کا فیصلہ کرتی ہو تو پھر میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ ہاں سب کچھ..... ایک گھریلو لڑکی کی حیثیت سے شاید تمہیں اس بات کا پتا نہ ہو کہ نئی زمانہ دولت مند مردوں پر خوبصورت لڑکیاں، مکھیوں کی طرح گرتی ہیں۔ شہروں میں یہ سلسلہ اور زیادہ ہے۔ مجھ پر بھی ایسی لڑکیاں گرتی ہیں اور آیندہ بھی گریں گی۔ لیکن میرا یہ تم سے وعدہ ہے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو گی۔''

شانی کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ بار بار نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ جاتی تھی۔

چوہدری نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا ''میں تم سے فوری جواب نہیں چاہ رہا ہوں۔ تم دو تین دن تک پوری تسلی اور آزادی سے سوچ لو۔''

آزادی کا لفظ شانی کے دل پر گھونسے کی طرح لگا۔ وہ کس آزادی کی بات کر رہا تھا۔ شانی کی تو پور پور شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی..... منا..... ندیم..... بھابو کی روح اور پھر انوری، کاکا، گڈی..... اس کے علاوہ رنگ والی میں اپنے پیاروں کی سلامتی اور پتا نہیں کیا کیا تھا اس کے گلے کا طوق۔

چوہدری دھیان سے اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ شاید اس نے شانی کی دلی کیفیت بھانپ لی تھی۔ پوچھنے لگا ''کیا تم کسی طرح کی گھٹن محسوس کرتی ہو؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ سر ہلا تو آنکھوں سے دو موٹے آنسو، چمکیلے موتیوں کی طرح گر پڑے۔ سر نے نفی میں جواب دیا تھا لیکن آنسوؤں نے اثبات میں۔

چوہدری کے جبڑے بھنچ گئے اور ناک کی اوپری سلوٹ ذرا گہری ہو گئی۔ کمرے کو ایک بوجھل خاموشی نے ڈھانپ لیا۔ آخر چوہدری کی پاٹ دار آواز کمرے میں گونجی ''دیکھو شانی! اگر تم آزادی اسے سمجھتی ہو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں تو یہ آزادی ہرگز نہیں۔ یہ تو بربادی ہو گی۔

تمہارے دشمن چیل کوؤں کی طرح تم پر جھپٹ پڑیں گے۔ چند دنوں میں تمہیں نوچ کر کھا جائیں گے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا، ہرگز نہیں کرسکتا۔''

''نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں یہاں..... آپ کہیں بھی تو شاید نہ جاؤں۔'' شانی نے اس کے لہجے کی حرارت محسوس کرتے ہوئے وضاحت کی۔

چند لمحے کے توقف کے بعد چوہدری نے کہا ''ٹھیک ہے۔ صبح میں چلا جاؤں گا۔ واپسی دو تین دن بعد ہوگی۔ امید ہے اس وقت تک تم ہر پہلو پر غور کرلوگی۔''

چوہدری اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ شانی منے کے پاس آلیٹی۔ چوہدری اس کی آزادی کی بات کررہا تھا۔ شانی کی آزادی اس گھوڑے کی طرح تھی جس کا پاؤں باندھ کر چراگاہ میں چرانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے چوہدری اس سے' فیصلہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کرنا تھا۔ فیصلہ تو حالات کررہے تھے۔ وہ تو وقت کی عدالت میں مجرم کی طرح گردن ڈالے کھڑی تھی..... اور جبر کا استغاثہ اس کی آس امید کی دھجیاں اڑا رہا تھا۔ ہاں، اس نے فیصلہ کیا کرنا تھا.....؟ اس نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور منے کو گلے سے لگالیا۔ اس کے کانوں میں ایک شہنائی رونے لگی..... اور شہنائی کا تعلق ہمیشہ شادی سے ہوتا ہے۔

اس کی آنکھ رات آخری پہر ایک نامانوس شور کے سبب کھلی۔ کوئی زور زور سے بول رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، منا اس کے ساتھ جڑ کر سویا ہوا تھا، وہ کسمسا کر رہ گیا، آواز چوہدری بشیر کے کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ شانی نے پہچان لیا۔ یہ جالاں کی آواز تھی وہ پریشان لہجے میں کوتاہ قد ڈولے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ شانی نے لحاف منے پر درست کیا اپنے بال سمیٹے اور چپل پہنتی ہوئی چوہدری کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کی لائٹ آن تھی منظر چونکا دینے والا تھا چوہدری بشیر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا بایاں بازو، دائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چوہدری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پہلو بدل رہا تھا۔ جالاں تیزی سے کولہے مٹکاتی ہوئی آئی اور اس نے پلاسٹک کی ایک بڑی بالٹی چوہدری کے بستر کے پاس قالین پر رکھ دی۔ اتنے میں ڈولا ایک بڑے جگ میں ٹھنڈا پانی لیے اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا چوہدری صاحب؟'' شانی نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

چوہدری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ زبان سے جواب دے سکتا۔ اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ اگر چوہدری جیسا بندہ اتنی تکلیف محسوس کررہا تھا' تو پھر یقیناً تکلیف زیادہ تھی..... اچانک شانی کی نگاہ نے ایک چیز نوٹ کی اور اس کی حیرت بڑھ گئی۔ چوہدری کا پٹی والا بازو کہنی سے اوپر تک بالکل سرخ نظر آرہا تھا۔ ہاتھ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ کہنی اور کلائی کے درمیان کا کچھ حصہ پٹی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگہ بھی ایسے ہی غیر معمولی طور پر سرخ ہوگی۔ یہ عجیب سی سرخی تھی اس میں سوزش کے ابھار بھی شامل تھے۔ چوہدری نے بے چین ہوکر اپنا ہاتھ بالٹی کے اوپر رکھ دیا۔ جالاں نے جگ لیا اور یخ بستہ پانی کی ''دھار باندھ کر'' چوہدری کے بازو اور بازو کی پٹی پر ڈالنے لگی، چوہدری کی کیفیت سے پتا چلتا تھا کہ وہ متاثرہ بازو میں شدید جلن محسوس کررہا ہے۔ جالاں نے مزید پانی کی ضرورت محسوس کی تو ڈولے کے بجائے شانی خود فریج کی طرف لپک گئی۔ لیکن فریج میں پانی نہیں تھا۔ صرف فریزر میں برف تھی وہ بھی سرد موسم کی وجہ سے فریزر میں چپکی ہوئی تھی۔ شانی برف اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے کی طرف سے چوہدری کے کراہنے کی آواز بلند ہورہی تھی۔ شانی سناٹے کی کیفیت میں تھی۔ جب پرسوں شام اس نے چوہدری کے بازو پر پٹی دیکھی تو اس کا خیال تھا کہ یہ کوٹھی میں ہونے والے کسی لڑائی جھگڑے کی نشانی ہے، مگر یہ تو کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ چوہدری کے بازو پر چھپاکی جیسے اثرات تھے۔

شانی پانی میں برف ڈال رہی تھی جب جالاں خالی جگ کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شانی کو گھورا پھر سرسراتے لہجے میں بولی ''اب تو راجی (راضی) ہوناں چوہدرانی؟''

''م..... میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے..... صرف تمہاری وجہ سے چوہدری صاحب نے حجرت صاحب (حضرت صاحب) سے جھگڑا کیا۔ ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ان کو دھکا دیا۔ حجرت صاحب کے بڑے مرید جی نے اسی وقت کہہ دیا تھا۔ اب چوہدری صاحب کا ہاتھ سڑ کر کوئلہ بھی ہوجائے تو یہ ہمارے لیے حیرانی کی بات نہیں ہوگی..... اب دیکھ لو..... وہی کچھ ہورہا ہے تمہاری اکھیوں کے سامنے ہورہا ہے۔''

شانی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ چوہدری کی کراہیں بلند ہورہی تھیں۔

⌘⌘

ایک سراغرساں کی کوششوں کا احوال جو ہر صورت اپنی کامیابی چاہتا تھا

سزائے موت

مدیحہ شاہ

زندگی کب داغ مفارقت دے جائے، اس کا علم کسی ذی روح کو نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ نزع سے انسان کی واپسی ہوجاتی ہے۔ ایک ایسے ہی مجبور و بے بس شخص کی کتھا جس کے پاس چند گنی چنی ساعتیں رہ گئی تھیں۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کا چیف انسپکٹر بلس اس وقت اسسٹنٹ کمشنر کرنل ولفورڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ایک ایسے قیدی کے بارے میں باتیں کررہے تھے جسے عدالت موت کی سزا سنا چکی تھی۔ بس اس پر عمل درآمد ہونے کی دیر تھی۔ اس قیدی کا نام مائیکل بینز تھا۔

''سر!'' چیف انسپکٹر نے اسسٹنٹ کمشنر سے کہا ''مجھے ایک ٹائپ شدہ خط آج ہی صبح ملا ہے۔ اس پر کسی کا نام ہے اور نہ تاریخ..... مجھے شک ہے کہ یہ خط پرائیویٹ سراغ رساں رنگر نے بھیجا ہے۔''

''اچھا.....؟ تمہیں رنگر پر شک کیوں ہے؟'' ولفورڈ نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''اس خط میں انگریزی حرف ''P'' مدھم ہے۔'' بلس نے جواب دیا ''میرے علم میں یہ بات ہے کہ رنگر کے پاس ایسا ہی ٹائپ رائٹر ہے جس میں انگریزی حرف ''P'' ہلکا آتا ہے۔ یہ پرائیویٹ سراغ رساں اکثر کیسز میں ہماری مدد کرتا رہا ہے اور اس نے متعدد بے گناہوں کو جیل سے آزادی دلوائی ہے۔''

''اس خط میں کیا لکھا ہے؟'' ولفورڈ نے سوال کیا۔

''میں یہ خط پڑھ کر سناتا ہوں۔'' چیف انسپکٹر بلس نے کہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک ٹائپ شدہ خط نکالا اور

پڑھنا شروع کر دیا۔

''مائیکل بینر جو اس وقت جیل کی کال کوٹھری میں قید ہے اور اپنی سزائے موت پر عمل درآمد کا منتظر ہے، بالکل بے قصور اور بے گناہ ہے۔ اسے اس جرم کی سزا دی جا رہی ہے جو اس نے کیا ہی نہیں۔ انسپکٹر! تم اس بات سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔ تم نے اس کے خلاف عدالت میں جو ثبوت پیش کیے تھے، وہ بھی اسے مجرم ثابت نہیں کرتے۔ اس بوڑھے شخص کا قاتل مائیکل بینر نہیں بلکہ لی لیونسکی ہے۔ لی لیونسکی بوڑھے کو ہلاک کر کے بھاگنے والا تھا کہ وہاں بدقسمتی سے مائیکل آ گیا اور اس کی وجہ سے اصل قاتل جس نے رقم کی خاطر بوڑھے کو ہلاک کیا تھا..... رقم لیے بغیر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس قتل کے صرف دو روز بعد ہی لی لیونسکی کینیڈا فرار ہو گیا تھا۔ میری تم سے گزارش ہے کہ اصل مجرم کو سامنے لاؤ اور بے قصور کی جان بچاؤ۔''

''کیا خیال ہے؟ کیا واقعی مائیکل بے قصور ہے؟'' کرنل ولفورڈ نے انسپکٹر بلس سے سوال کیا۔

''میرا خیال میں رنگر کی بات صحیح ہے۔'' بلس نے جواب دیا ''مائیکل بینر نے بوڑھے ایستھول کو قتل نہیں کیا۔ دوسرے میں اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ جس وقت ایستھول کا قتل ہوا، اس وقت لی لیونسکی انگلستان میں موجود تھا۔''

مقتول بوڑھا ایستھول ایک دولت مند آدمی تھا اور اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے ہوٹل ''بلومز بری'' میں رہتا تھا۔ اکثر اس کے پاس بڑی رقم رہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے نقد رقوم رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ایک سیلف میڈ آدمی تھا جس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔

ایک سرد سی صبح، لگ بھگ چار بجے ہوٹل ''بلومز بری'' کا ایک مہمان جو رات بھر اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے سٹنگ روم میں تاش کھیلتا رہا تھا، راہداری میں آیا تو اس کی نظر مائیکل بینر پر پڑی۔ مائیکل بینر اسی ہوٹل میں ویٹر تھا اور رات کی ڈیوٹی کرتا تھا۔ مائیکل اسی وقت بوڑھے ایستھول کے کمرے سے بوکھلایا ہوا باہر نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود ہتھوڑا تھا۔ مائیکل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جب اس مہمان نے مائیکل کو آواز دی تو مائیکل اچھل پڑا۔ اس کے بعد لاکھ پوچھنے پر بھی اس کی زبان نہیں کھلی۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ چنانچہ اس مہمان نے بوڑھے ایستھول کے کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ بوڑھا ایستھول اپنے ہی خون میں نہایا پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

مائیکل کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ وہ رات کی ڈیوٹی پر تھا اور ڈیوٹی روم میں بیٹھا تھا تو اس نے بوڑھے ایستھول کے کمرے کی گھنٹی کی آواز سنی۔ چنانچہ اس نے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو کھل گیا۔ اس نے اندر قدم رکھا تو سامنے بوڑھے کی لاش نظر آئی جس کے قریب خون آلود ہتھوڑا پڑا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر وہ ہتھوڑا اٹھا لیا۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

☆☆☆

مائیکل بینر ایک نوجوان اور شادی شدہ آدمی تھا مگر مالی مشکلات کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ اس رات اس نے ہوٹل کے منیجر سے کچھ رقم ادھار مانگی تھی۔ اسی شام کو مائیکل نے ہیڈ ویٹر سے یہ بات کہی تھی ''ذرا اس بوڑھے ایستھول کو دیکھو..... اس کے پاس دولت کی کیا کمی ہے۔ اگر میرے پاس اس کی نصف دولت بھی ہوتی تو میری تمام مشکلات کا خاتمہ ہو جاتا۔''

بہرحال، مقدمہ عدالت میں گیا جہاں مائیکل بینر خود کو بے گناہ کہتا رہا، احتجاج کرتا رہا مگر اس کی نہیں سنی گئی اور عدالت نے صرف ایک روز کی کارروائی کے بعد ہی اس پر فرد جرم عائد کر دی۔

انسپکٹر بلس نے کرنل ولفورڈ سے کہا ''وہ ہتھوڑا ہوٹل کی ملکیت تھا اور جس اسٹور میں رکھا رہتا تھا وہاں تک جانا مائیکل کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اس اسٹور تک باہر کا کوئی آدمی بھی آسانی سے جا سکتا تھا جس رات یہ واردات ہوئی اس کی صبح اسٹور کی وہ کھڑکی کھلی ہوئی ملی جو ہوٹل کے عقبی لان میں کھلتی تھی۔''

''ہوں۔'' ولفورڈ نے کہا ''مائیکل بینر کے بچنے کی کوئی امید ہے یا.....؟''

''نہیں۔'' بلس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ''عدالت نے اس کی اپیل بھی مسترد کر دی ہے..... دوسری بات یہ ہے کہ ہوم سیکریٹری اسٹریپ ایک ایسا پتھر دل، سخت مزاج اور بے رحم انسان ہے جس سے رحم کی کوئی امید نہیں۔ اسی کو مائیکل بینر کے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنے ہیں اور وہی اس کی رحم کی اپیل کو آگے بڑھا سکتا ہے..... یہ اسٹریپ اتفاق سے مقتول ایستھول کا دوست بھی رہ چکا ہے۔''

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ شخص رنگر اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟'' ولفورڈ نے کہا۔

''رنگر ایک ہار نہ ماننے والا انسان ہے۔'' بلس نے کہا ''حالانکہ عدالت اپنا فیصلہ دے چکی ہے پھر بھی وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح مائیکل کو بچا لے۔ بہرحال میں اس سلسلے میں ہوم سیکریٹری اسٹریپ سے ملوں گا۔ شاید وہ میری بات سن لے۔''

☆☆☆

چیف انسپکٹر بلس اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر بتایا کہ کوئی نوجوان عورت اس سے ملنا چاہتی ہے۔ بلس نے اسے اندر بھیجنے کو کہا۔ آنے والی عورت خاصی خوش شکل اور حسین تھی مگر اس کی آنکھوں میں اداسی اور سوگواری تھی۔ وہ مائیکل کی بیوی تھی۔ بلس نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھا تو اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

''سر..... میرا..... مائیکل..... بے گناہ ہے۔ وہ قتل جیسی..... حرکت..... کر ہی نہیں سکتا..... کبھی نہیں..... میں نے ہوم سیکریٹری سے رابطہ کیا مگر انہوں نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔'' مسز مائیکل نے کہا۔

بلس کو اس کی حالت سے انداز ہو رہا تھا کہ وہ عورت کئی راتوں سے سوئی نہیں ہے۔

''مائیکل ہر وقت پیسے کے لیے پریشان رہتا تھا۔'' بلس نے کہا ''آج کل کیسے گزارہ ہو رہا ہے؟''

''ایک شخص نے کچھ پاؤنڈ بھجوائے تھے جن سے مائیکل کا سارا قرض بھی ادا ہو گیا اور میں نے گھر میں دو تین ماہ کا راشن بھی ڈلوا لیا۔ اکیلی ہی تو ہوں.....'' کہتے کہتے مسز مائیکل کی آواز بھرا گئی۔

''رقم کس نے رقم بھجوائی تھی؟'' بلس نے چونک کر پوچھا۔

''ڈاک سے آئی تھی۔ اس پر بھیجنے والے کا نام پتا نہیں لکھا تھا۔'' مسز مائیکل نے کہا ''البتہ یہ چھوٹا سا پرچہ بھی آیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹا سا مڑا تڑا کاغذ نکال کر بلس کی طرف بڑھا دیا۔ بلس نے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ اس پر صرف اتنا لکھا تھا ''امید کا دامن تھامے رکھنا۔'' یہ عبارت بھی ٹائپ شدہ تھی۔

☆☆☆

بلس نے عبارت کو غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس میں بھی ''P'' مدھم تھا۔ اس نے مسز مائیکل سے کہا ''یہ خوشی کی بات ہے کہ کم از کم کوئی تو تمہارا ہمدرد ہے مگر جہاں تک میری بات ہے..... تو میں اس ضمن میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ویسے میں کل ہوم سیکریٹری سے ملنے جا رہا ہوں مگر..... میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے آپ کو یہ ذہنی صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار رکھو۔''

یہ سنتے ہی مسز مائیکل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ لرزنے لگی تھی۔

''انسپکٹر! کیا تم بھی میرے مائیکل کو مجرم سمجھتے ہو؟'' مسز مائیکل نے پوچھا ''مائیکل نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں اس سے ہمدردی ہے اور تم اسے قاتل نہیں مانتے۔''

بلس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''تمہارے کوئی رشتے دار..... کوئی بہن بھائی ہیں؟'' جواب میں مسز مائیکل نے انکار میں اپنا سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے..... میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔'' بلس نے کہا ''مگر تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر وہ شخص جس نے تمہیں رقم بھجوائی ہے، تم سے ملنے کی کوشش کرے یا تم سے ٹیلی فون پر رابطہ کرے تو مجھے اس نمبر پر فوراً اطلاع دے دینا۔'' یہ کہہ کر بلس نے کاغذ پر ایک نمبر لکھ کر مسز مائیکل کو دے دیا۔

''اور اگر کوئی شخص اسکاٹ لینڈ یارڈ کا افسر بن کر تمہارے پاس آئے تب بھی مجھے فوراً اطلاع دینا۔ میں تمہارے شوہر کو تختۂ دار سے بچانے کی پوری کوشش کروں گا حالانکہ زیادہ امید نہیں ہے پھر بھی میری طرف سے کوشش میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

ہوم سیکریٹری اسٹریپ ایک ایسا غیر مقبول انسان تھا جس کی نہ تو سامنے تعریف کی جاتی تھی اور نہ پیٹھ پیچھے بلکہ پیچھے تو اس کی خوب برائیاں ہوتی تھیں۔ اس کے اپنے محکمے کے لوگ بھی اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ کھردرے مزاج کا تھا۔ اس کی آواز میں رعونت تھی۔ اس کا قد چھوٹا، جسم گول مٹول اور آنکھیں کسی سور کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس میں کسی کو پسند آنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ سیاسی کارٹون بنانے والوں نے اسٹریپ کے جتنے کارٹون بنائے تھے اتنے کارٹون انگلستان کی تاریخ میں کسی کے نہیں بنائے گئے تھے۔ اس کا چہرہ کارٹون بنانے والوں کے لیے آئیڈیل تھا۔

اس نامقبول ہوم سیکریٹری نے چیف انسپکٹر کو پورے آدھے گھنٹے انتظار کرایا تب کہیں جا کر اسے اپنے ''دربار'' میں حاضر ہونے کی اجازت دی۔

''بلس! یہی نام ہے نا تمہارا؟'' اسٹریپ نے بلس کو دیکھتے ہی رعونت سے کہا ''تم پولیس آفیسر ہو..... مائیکل بینر کا کیس..... اوہ ہاں..... میں نے ہی تمہیں بلوایا تھا۔'' اس نے

بے ربط جملے بولتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں نے اس کیس کے کسی جج سے ملاقات نہیں کی..... مگر میرے خیال میں عدالت نے اسے..... کیا نام ہے اس کا..... ہاں..... مائیکل کو موت کی سزا بالکل صحیح سنائی ہے۔ انصاف ہو چکا ہے۔ قاتل کی سزا موت ہی ہونی چاہیے۔ بہرحال اخبار میں یہ خبر بھی چھپی ہے..... مگر مجھے اس پر کوئی اعتبار نہیں۔''

''کونسی خبر جناب؟'' بلس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ارے..... تم نے یہ اخبار نہیں دیکھا؟'' یہ کہہ کر اسٹریپ نے بلس کی طرف اس دن کا تازہ اخبار بڑھا دیا۔ ''اپنی آنکھیں کھلی رکھا کرو۔ اخبار پڑھنا تمہاری ڈیوٹی میں شامل ہے۔ جب تک حالات سے باخبر نہیں ہو گے تو امن و امان کیسے قائم کر سکو گے؟ تمہارا کام صرف دفتر میں بیٹھ کر کرسی توڑنا نہیں ہے۔''

چیف انسپکٹر بلس نے ناگواری سے ہوم سیکریٹری کی طرف دیکھا اور اخبار پر نظریں دوڑائیں۔ ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ لکھا تھا ''ہوٹل بلومزبری میں قتل ہونے والے کروڑ پتی ایستھول کا اصل قاتل مل گیا..... قاتل نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔''

اس کے بعد تفصیلی خبر تھی جس کا متن یہ تھا ''گزشتہ رات پولیس نے فائرنگ کے تبادلے کے بعد لی لیونسکی نام کے ایک شخص کو گرفتار کر لیا جو کینیڈین بینک میں ڈاکا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں یہ بیان دیا کہ ''بلومزبری'' ہوٹل میں مسٹر ایستھول کو اسی نے ہلاک کیا تھا، ایستھول کے قتل کے الزام میں پکڑا جانے والا ویٹر مائیکل بینر بالکل بے گناہ ہے۔ لیونسکی نے بتایا کہ اس نے بہت عرصے سے ایستھول پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بوڑھے کے پاس ہر وقت بھاری رقم ہوتی ہے لہٰذا اس نے ایک ہتھوڑا لیا اور ایستھول کے کمرے کا مقفل دروازہ کھول لیا۔ وہ ہتھوڑا تالا کھولنے کے لیے ساتھ لے گیا تھا، بوڑھے کو مارنے کے لیے نہیں..... مگر جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا، ایستھول جاگ گیا۔ اس نے بوڑھے کو بے ہوش کرنے کے لیے اس کے سر پر ہتھوڑا مار دیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ زور سے پڑ گیا ہے اور اس کی وجہ سے بوڑھا مر جائے گا۔ بوڑھے کے مرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ بوڑھے کا ہاتھ گھنٹی کے بٹن پر ہے۔ شاید اس نے مرتے مرتے گھنٹی بجا دی تھی چنانچہ اس نے رقم تلاش کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور کمرے سے فرار ہونے میں ہی عافیت جانی۔''

خبر پڑھنے کے بعد انسپکٹر بلس نے ہوم سیکریٹری اسٹریپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں اس طرح کی اخباری خبروں اور بیانات سے متاثر نہیں ہوتا۔'' اسٹریپ نے خشک لہجے میں کہا ''ویسے بھی خبر کے آخر میں لکھا ہوا نوٹ نہیں پڑھا۔ یہ سنتے ہی بلس نے دوبارہ اخبار کی طرف دیکھا۔ لکھا تھا ''مگر اس سے پہلے لی لیونسکی اپنے اعترافی بیان پر دستخط کرتا، وہ مر گیا۔''

☆☆☆

''کسی بھی اخباری خبر کی کوئی اہمیت نہیں جب تک اس کی تصدیق نہ ہو۔'' اسٹریپ نے کہا ''اگر مرنے والا اعترافی بیان پر دستخط کر دیتا تو کچھ سوچا جا سکتا تھا مگر اب یہ ممکن نہیں ہے۔ مائیکل بینر کو بہرصورت موت کی سزا دی جائے گی۔''

''مگر وہ بے قصور ہے اس کا ثبوت مل چکا ہے۔'' بلس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''تم ہوم سیکریٹری کو..... یعنی مجھے قانون پڑھانے آئے ہو؟ جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟ میں تمہیں لب کشائی پر ملازمت سے نکال سکتا ہوں۔'' اسٹریپ نے غصے سے کہا ''اگر ہم اس طرح ہر ایرے غیرے پر رحم کھاتے رہے تو کرائم ہم نے انصاف..... پھر تو ہر مجرم ہی خود کو بے گناہ کہے گا۔ اس کی بیوی بچے ہمارے سامنے روئیں گے..... گڑگڑائیں گے اور ہم..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کسی قیمت پر بھی امن و امان کی صورتِ حال کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔''

''سر! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس مقدمے کی سماعت دوبارہ کی جائے اور لیونسکی کے آخری بیان کی روشنی میں ہمارے جج مائیکل کو مجرم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں۔'' بلس نے آہستگی سے کہا۔

''انسپکٹر! میں نے تم سے کوئی رائے یا مشورہ طلب نہیں کیا ہے۔'' اسٹریپ نے غصے سے کہا ''تم جا سکتے ہو۔''

چیف انسپکٹر بلس وہاں سے سیدھا اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا مگر اسسٹنٹ کمشنر کرنل ولفورڈ اسے نہیں ملا۔ وہ اپنے گھر جا چکا تھا۔ انسپکٹر بلس حالات پر غور کرنے لگا۔ اسے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ..... ہوم سیکریٹری نے اس جج کو اپنے گھر اگلے روز بلایا تھا جس نے مائیکل کے مقدمے کا فیصلہ سنایا تھا مگر اس رات وہ اپنی حویلی پر چلا گیا جو مضافات میں واقع تھی۔

☆☆☆

ہوم سیکریٹری اسٹریپ رنڈوا تھا اور اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا مگر اس کے پاس ملازموں کی پوری فوج موجود تھی۔ اس کا

خانساماں ایک فرانسیسی تھا۔ اسٹریپ اپنی لمبی سی ڈائننگ ٹیبل پر اکیلا کھانا کھاتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی جو اس کے سامنے بیٹھ جاتا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد ہوم سیکریٹری نے مطالعے کے لیے کتاب کھولی ہی تھی کہ اسے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ ملازم نے ایک کارڈ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جس پر کسی مسٹر ہیگر کا نام لکھا تھا۔ اسٹریپ نے کچھ سوچا اور آنے والے کو اندر بلا لیا۔ ویسے وہ کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کرتا تھا مگر ہیگر کے نام کے آگے گراج وڈ لکھا تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سے اسے اگلی بار انتخاب لڑنا تھا اسی لیے اس نے ہیگر نامی شخص کو بلوا لیا۔ ہیگر ایک معزز اور بارعب قارآدمی تھا۔ اس کے جسم پر عمدہ لباس تھا اور اس کی مونچھیں گھنی اور سیاہ تھیں۔

''سر! میں ہیگر ہوں..... ینگ ورکرز لیگ کا سیکریٹری.....'' آنے والے نے ادب سے کہا۔

''اچھا، اچھا.....'' ہوم سیکریٹری اسٹریپ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ یہ نوجوانوں کی ایک پارٹی تھی جس سے اسٹریپ کو انتخابات کے وقت بہت سے کام لینے تھے۔

''بیٹھو..... بیٹھو۔'' اسٹریپ نے ہیگر سے کہا ''کیا لو گے؟''

''شکریہ سر! میں کچھ نہیں لوں گا۔'' ہیگر نے کہا ''دراصل میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا ہوں..... وہ مائیکل.....'' یہ سنتے ہی ہوم سیکریٹری کا منہ بن گیا۔

''سر! گراج وڈ میں ہماری پارٹی کے بھی لوگ جمع ہوئے تھے۔'' ہیگر نے کہا ''ہم نے مائیکل بینر کے مسئلے پر غور کیا تھا۔ اس اجلاس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مائیکل بے گناہ ہے اور کسی بے گناہ کو موت کی سزا ہرگز نہیں دی جانی چاہیے۔''

''مجھے افسوس ہے!'' اسٹریپ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری بھی مجبوریاں ہیں۔ اگر میں خود ہی خلافِ قانون کام کرنے لگوں تو دوسرے کیا کہیں گے؟'' اسٹریپ نے ہیگر کو اپنی مجبوری بتائی اور قانون کے احترام اور اس کی بالادستی کے موضوع پر چھوٹا سا ایک لیکچر دیا۔ اس سے پہلے وہ اسی طرح کی باتیں پارلیمنٹ کے ارکان پر مشتمل ایک وفد سے کر چکا تھا۔ جو اس سے مائیکل کے لیے رحم کی اپیل کرنے آیا تھا۔

''بہرحال..... اس موضوع کو چھوڑو۔'' آخر ہوم سیکریٹری نے ہیگر سے کہا اور یہ بتاؤ، کیا لو گے؟ کافی یا..... ویسے تمہارا میرے پاس آنا کیسے ہوا؟ تم نے اپنے آنے کی وجہ نہیں بتائی۔''

''مجھے میری پارٹی نے بھیجا تھا۔'' ہیگر نے کہا ''یہاں مائیکل کے لیے بات کرنا تو ایک بہانہ تھا ورنہ میری دلی خواہش تھی کہ آپ کے نیاز حاصل کروں۔ آپ سے ملوں اور آپ کی اس قدیم اور منفرد حویلی کو اندر سے دیکھوں۔''

ہیگر نے جان بوجھ کر ہوم سیکریٹری کی حویلی کی تعریف کی تھی۔ وہ خوشامد پسند تھا اور اپنی چیزوں کی تعریف سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی حویلی قدیم فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ سنتے ہی گویا اسٹریپ کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی ''اس حویلی کی فنی اہمیت بھی ہے اور تاریخی اہمیت بھی۔ ایک زمانے میں یہ مشہور حکمرانوں کے لیے شکار کے موقع پر قیام گاہ کا کام بھی دیتی تھی۔ چارج پنجم نے کئی مرتبہ یہاں قیام کیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ بھی اس محل میں قیام کر چکی ہیں۔ میں نے اپنے آباؤ اجداد کی اس حویلی کی نہ صرف دیکھ بھال کی ہے بلکہ اس کی تاریخی حیثیت بھی بحال رکھی ہے۔''

اسٹریپ بڑے فخر سے ہیگر کو اپنی حویلی کا ایک ایک حصہ دکھاتا رہا اور اس کی تاریخی اہمیت بھی بیان کرتا رہا۔

''سنا ہے پرانی حویلیوں میں آسیب بھی ہوتے ہیں؟'' ہیگر نے کہا تو اسٹریپ نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ہاں..... ہر حویلی میں یہ آسیب ہوتا ہے جیسے اس حویلی میں، میں خود ہوں۔ میری اس حویلی میں ایک تہ خانہ بھی ہے۔ آؤ، میں تمہیں دکھاؤں۔''

یہ کہہ کر اسٹریپ، ہیگر کو ایک بڑے دروازے کی طرف لے گیا جو بند تھا۔ اس میں موٹا سا تالا لٹک رہا تھا۔ اس نے اپنے لبادے میں سے ایک بڑی سی چابی نکال کر اس تالے کو کھولا اور پھر دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھول دیا۔ اندر پتھر کی بنی ہوئی سیڑھیاں تھیں جو نیچے جا رہی تھیں۔ اسٹریپ نے دروازے پر لگا ہوا سوئچ آن کیا تو تہ خانہ روشن ہو گیا۔

وہ دونوں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے نیچے پہنچے۔ خاصا وسیع تہ خانہ تھا۔ اس کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا قید خانہ بھی تھا جس میں فولادی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس میں بہ مشکل دو قیدی سما سکتے تھے۔ اس قید خانے کا دروازہ خفیہ طریقے سے کھلتا تھا۔

''یہ کیسے کھلتا ہے اور بند ہوتا ہے؟'' ہیگر نے کہا تو اسٹریپ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے دیوار میں لگی ہوئی سنگی کیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ اس دروازے کی کنجیاں ہیں۔ اس میں کسی زمانے میں وہ بدقسمت قیدی رکھے

جاتے تھے جنہیں موت ہی اس جگہ سے رہائی دلاتی تھی۔''

☆☆☆

عدالت لگی ہوئی تھی۔ تمام جج موجود تھے۔ مائیکل بینر بھی کٹہرے میں کھڑا ہوا تھا مگر ہوم سیکریٹری اسٹریپ نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ اس مقدمے میں اس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ سینئر جج کی نظریں دیوار گیر کلاک پر تھیں۔ اس کی آنکھوں میں برہمی تھی۔

''کوئی بھی انسان قانون سے بالاتر نہیں ہے۔'' آخر جج نے مائیکل بینر کے کیس کی فائل غصے سے بند کرتے ہوئے اعلان کیا ''یہ عدالت ہے۔ یہاں ہر شخص برابر ہے۔ ہم کسی کا انتظار نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ ہوم سیکریٹری ہی کیوں نہ ہو..... ہمارا کام قانون کی بالادستی کو ممکن بنانا ہے، اسے بحال کرنا ہے..... ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ قانون کا محافظ اس پر عمل درآمد کرانے کا ذمے دار خود ہی اسے مذاق بنا دے۔''

''سر! ہوم سیکریٹری نے کہا تھا کہ وہ وقتِ مقررہ پر عدالت میں موجود ہوں گے۔'' ایک شخص نے کہا جس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ غالباً ہوم سیکریٹری کے محکمے کا کوئی کلرک یا سیکریٹری وغیرہ تھا۔

''انہوں نے کب آنے کو کہا تھا؟'' جج نے سوال کیا۔

''سر! ایک گھنٹا پہلے میری مسٹر اسٹریپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ گھر سے چل دیے تھے۔ میرے خیال میں وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''نہیں..... اب مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔'' سینئر جج نے مشتعل لہجے میں کہا ''میں ان سے صبح ملوں گا۔ تم مسٹر اسٹریپ کو میرا یہ پیغام دے دینا کہ میرے ذہن میں مائیکل بینر کے حوالے سے ایک الجھن ہے جس کو دور کیے بغیر اس کی سزا پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مائیکل اس الزام سے بری ہو جائے۔''

سیکریٹری نے سر ہلا کر سینئر جج کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا باس بے حد ضدی اور ہٹ دھرم ہے، وہ کبھی بھی مائیکل کو آزاد نہیں ہونے دے گا بلکہ اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر ہی دم لے گا۔

☆☆☆

سیکریٹری اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف ہوم سیکریٹری اسٹریپ کی بھاری اور کھردری آواز آئی ''مائیکل کے کیس کا کیا ہوا؟''

''سر! عدالت میں جج آپ کا انتظار کرتے رہے۔ سینئر جج آپ پر بہت برہم بھی ہو رہے تھے۔'' سیکریٹری نے کہا۔

''وہ..... چھچھوندر..... کیا نام ہے اس کا..... رنگر کل رات میرے پاس آیا تھا..... اس نے مجھے جو کچھ بتایا میں..... اس انسپکٹر..... بلس کو بتانا چاہتا ہوں لیکن ابھی فوراً پیرس جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد لوٹوں گا۔ انسپکٹر سے کہنا کہ مجھ سے آ کر مل لے..... مگر ایک ہفتے بعد۔''

''سر! سینئر جج نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو یہ بات بتا دوں کہ مائیکل کے حوالے سے ان کے ذہن میں ایک الجھن ہے..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ مائیکل بری ہو جائے۔'' سیکریٹری نے جلدی جلدی کہا تو دوسری طرف سے اسٹریپ نے سینئر جج کی شان میں نازیبا کلمات کہے۔

☆☆☆

''میں سوچ رہا تھا کہ اسٹریپ آسانی سے نہیں مانے گا۔'' بلس، کرنل رلفورڈ سے کہہ رہا تھا ''اسی لیے رنگر نے اسے اس کے تہ خانے میں بند کر دیا اور خود اس کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے اس کے سیکریٹری کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ پیرس جا رہا ہے جبکہ وہ کہیں نہیں گیا بلکہ اپنے تہ خانے میں قید تھا۔ ظاہر ہے اس بات پر سینئر جج کا برہم ہونا بجا تھا۔ ایک تو اسٹریپ وقتِ مقررہ پر عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ دوسرے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ایک ہفتے کے لیے پیرس چلا گیا۔ ایک ماہ تک اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی تو ججوں نے پارلیمنٹ کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت خود ہی اس فیصلے کی دوسری مرتبہ سماعت کی۔ اس مرتبہ تمام ثبوت مائیکل کو بے گناہ ثابت کر رہے تھے لہٰذا عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا۔''

''اوہ..... منصوبہ کس کا تھا؟'' کرنل نے سوال کیا۔

''کیونکہ رنگر یہ کام تنہا نہیں کر سکتا..... میرا خیال ہے کہ اس میں تم بھی شامل تھے۔''

جواب میں انسپکٹر بلس مبہم انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

''اب اسٹریپ کہاں ہے..... اور کس حال میں ہے؟'' کرنل ولفورڈ نے سوال کیا۔

''اپنی اسی حویلی میں..... اس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔'' بلس نے جواب دیا ''غالباً اس سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوئی۔ اس کیس کے بعد اس کی شراب نوشی بہت بڑھ چکی ہے..... اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔''

کرنل سوچ رہا تھا کہ دوسروں کے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرنے والے سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوئی تو اس نے خود کو شراب میں ڈبو دیا۔ کرنل کا خیال تھا کہ ایک دن وہ اس میں غرق ہو کر مر جائے گا۔

شگفتہ پروین

اذیت

دولت کمانے کے لئے لوگ ایسے ایسے حربے اختیار کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ایک ایسے ضمیر فروش کی کتھا جو ایک گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہو کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا۔

اچھائی اور برائی کے درمیان تفاوت کرنے والوں کا ماجرائے تحیر

''میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیوی کو قتل کر دو۔'' اس شخص نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایسی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا جیسے کوئی کتا آپ کو گوشت کھاتے ہوئے دیکھتا ہے..... اس شخص کا نام لائل نوڈ تھا۔ اس کی عمر اندازاً پینتیس سال کے قریب تھی اور قد مجھ سے بھی کچھ نکلتا ہوا یعنی چھ فٹ سے چند انچ زیادہ ہی تھا۔ اس نے جینز اور بٹن والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کی تنگ آستینوں سے اس کے مضبوط بازوؤں کے مسلز جھلک رہے تھے۔

میں نے کافی کا ایک سپ لیتے ہوئے پوچھا کہ وہ اپنی بیوی کو کیوں قتل کروانا چاہتا تھا۔''

''کیا تمہارے لیے یہ بات معلوم کرنا ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں.....'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ مجھے ایک معقول رقم ملنے کی امید ہو!''

لائل مسکرایا تو اس کے تمباکو زدہ پیلے پیلے دانت جھلکنے لگے۔ ''میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا تھا کہ تم پیسوں کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔

میں نے اپنی ناک کو رگڑا۔ میری ناک میں سوزش ہو

رہی تھی اور شاید اس سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ ''کیا تم کسی خاص طریقے سے یہ کام کروانا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کافی شاپ پر ایک نظر ڈالی۔ ملاقات کے لیے اس کافی شاپ کا انتخاب اس نے خود کیا تھا..... پھر اس نے کہنیوں کے بل میز پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''تم اچانک میرے گھر میں گھسو گے..... اور اسے گھر میں اکیلا پا کر اس پر مجرمانہ حملہ کردو گے پھر اسے قتل کردو گے۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجرمانہ حملہ؟''

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیسا شوہر تھا جو خود اپنی بیوی پر مجرمانہ حملہ کرانا چاہتا تھا!

''بیوی کی حادثاتی موت پر سب سے پہلے شک اس کے شوہر پر کیا جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن مجرمانہ حملے کے باعث پولیس کی توجہ مجھ سے ہٹ جائے گی۔''

''میرا نمبر تمہیں کس نے دیا تھا؟'' میں نے چند لمحوں کے توقف سے پوچھا۔

''یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔'' اس نے کہا۔

اگر وہ کچھ عرصہ پہلے مجھ سے ملتا تو یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا..... لیکن سچی بات یہ تھی کہ اب مجھے بھی اس بات کی زیادہ پروا نہیں رہ گئی تھی کہ اس نے میرا نمبر کہاں سے حاصل کیا یا یہ کہ وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ میں کینسر کے باعث دھیرے دھیرے مر رہا تھا۔ میرے تیزی سے گرتے بال اور صحت بھی اس بات کی گواہ تھی!

میرے پاس رقم ختم ہو رہی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اب کوکین بھی نہیں خرید سکتا تھا کہ اپنے ناقابلِ برداشت درد کے احساس کو کچھ کم کرسکوں۔

میں آدھی رقم پیشگی لوں گا اور باقی آدھی کام ہونے کے بعد.....'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا، میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو۔'' اس نے متانت سے کہا۔

ہاں..... جیسا کہ تمہاری بیوی تم پر بھروسا کرتی ہے۔ میں نے سوچا۔ اور تم اس بے چاری کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہو! لیکن اس کے بجائے میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو، میں اس کام کو کس انداز میں انجام دوں؟''

''بہت بری طرح..... پُرتشدد انداز میں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے زیادہ سے زیادہ اذیت برداشت کرنی پڑے!'' اس نے بے رحمانہ انداز میں کہا۔

''تمہیں اس بات کا تو خیال ہونا چاہیے کہ آخر وہ تمہاری بیوی ہے!'' میں نے تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم میرے کہنے کے مطابق اسے اذیت نہیں پہنچا سکتے تو ہم اس معاملے کو یہیں ختم کردیتے ہیں۔'' اس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا حالانکہ میں اس بارے میں فیصلہ کرچکا تھا.....''

میرا اندازہ تھا کہ لائل اپنی بیوی کے لائف انشورنس کی رقم حاصل کرنے کی خاطر اسے مروانا چاہتا تھا لیکن اب مجھے یہ سوچ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ کیا اس انشورنس پالیسی میں کوئی ایسی شق موجود تھی کہ مجرمانہ حملے اور تشدد کے ذریعے واقع ہونے والی موت پر زیادہ رقم ادا کی جائے گی۔

''کیا تم رقم ساتھ لے کر آئے ہو؟'' بالآخر میں نے اپنے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' لائل نے جواب دیا۔

''رقم میز کے نیچے سے مجھے پکڑا دو۔'' میں نے کہا۔

وہ ہچکچایا۔ ''مجھ پر بھروسا دونوں جانب سے قائم ہونا ہے.....''

اگر تم مجھ پر بھروسا نہ کرنا چاہو تو تمہاری مرضی!'' میں نے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ مجھے رقم کی شدید ضرورت تھی۔

لائل نے رقم کا لفافہ مجھے تھما دیا۔ میں نے لفافے کے اندر جھانک کر دیکھا اور انگلیوں سے رقم کو گنا۔ رقم مناسب تھی، میں نے سوچا کہ محض چند گھنٹوں کے کام کے بدلے سودا برا نہیں تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف کام کا تصور تھا، انسانی جان لینے کا نہیں.....!

''یہ کام مجھے کب انجام دینا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل رات، دس بجے کے بعد.....'' لائل نے کہا۔ ''میں اس وقت گھر سے باہر ہوں گا اور وہ گھر پر تنہا ہوگی۔ باہر والا دروازہ میں تمہاری لیے کھلا چھوڑ جاؤں گا۔'' اس کے بعد اس نے مجھے پتا سمجھایا اور تاکید کی کہ میں اس کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کروں۔

وہ جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا لہٰذا میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

لائل نے ایک بار پھر مجھے اپنی مسکراہٹ سے نوازا۔ ''یہ ہوئی بات!''

☆☆☆

ڈنر کے بعد میں اپنے تنگ سے اپارٹمنٹ میں واپس پہنچا اور وہاں میں نے ارل کے ساتھ پارٹی منائی.....

میں نے اپنے اس ٹیومر کا نام ''ارل'' رکھا ہوا تھا جو میرے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا۔ اپنے قاتل کو ایک نام دینے سے مجھے اس کے بارے میں بات کرنے میں آسانی رہتی تھی..... ارل ہر روز میرے جسم کا مزید کچھ حصہ کھا جاتا تھا..... میں ہر روز اسے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سلسلے میں، میں ہر ممکن علاج بھی کرواتا تھا اور منشیات اور الکحل وغیرہ کے استعمال سے بھی اسے شکست دینے کی کوشش کرتا تھا.....

لیکن جیت بہرصورت ارل ہی کی تھی!

منشیات کے استعمال کا ایک ہی فائدہ تھا کہ اس کے بعد کسی بات کی پروا نہیں رہتی تھی۔ ذہن ہر قسم کی سوچ سے مبرا ہوجاتا تھا اور ماضی کی کوئی یاد نہیں ستاتی تھی۔

محض چند ماہ پہلے میرے پاس ایک بہت اچھی جاب تھی..... ایک خوبصورت سی منگیتر تھی اور زندگی بہت خوش گوار محسوس ہوتی تھی لیکن ارل نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ اب مجھے زندگی میں کچھ بھی خوشگوار محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اب میں اس وقت تک پیتا رہتا تھا جب تک درد کا احساس زائل نہیں ہوجاتا تھا۔ جب تک زندگی کی تلخ حقیقتیں مجھ سے دور نہیں چلی جاتی تھیں اور جب تک میں ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوجاتا تھا..... سو، اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اگلی صبح، ارل نے میرے بائیں پہلو میں دانت گاڑ کر مجھے جگایا۔ میں نے بہ مشکل تمام خود کو فرش سے اٹھایا اور شاور لینے چلا آیا۔ تیز گرم پانی کھول کر میں نے جسم پر شیمپو ملنا شروع کردیا کیونکہ میرے پاس صابن ختم ہوچکا تھا۔

بیماری کے علاوہ کم خوراکی کے باعث میرا وزن اتنا کم ہوگیا تھا کہ میں اپنی پسلیاں بہ آسانی گن سکتا تھا۔ اکثر میں کھانا کھانا ہی بھول جاتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج کھانا ضرور کھاؤں گا ورنہ نوے پاؤنڈ وزن رکھنے والے شخص کو بھلا کون کام دینے پر آمادہ ہوسکتا تھا!

شاور لینے کے بعد میں نے ایک دھلی ہوئی جینز اور سفید ٹی شرٹ پہنی اور پھر تین درد کش گولیاں حلق سے اتاریں۔ اس کے بعد میں ایک پرانی ٹیلی فون بک لے کر بیٹھ گیا۔

فون بک سے میں نے واکر انشورنس کمپنی کا انتخاب کر کے اس کا نمبر ملایا.....'' میں لائف انشورنس سے متعلق چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے فون پر کہا۔

''میں آپ کی کال اپنے ایک ایجنٹ کو ٹرانسفر کردیتا ہوں، وہ آپ کو تمام معلومات فراہم کردے گا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا اور پھر چند لمحوں تک مجھے میوزک کی آواز سنائی دیتی رہی۔

''میں بریڈ بات کررہا ہوں۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' ایک آواز نے مجھ سے کہا۔

''میں اپنی بیوی کے لیے ایک لائف انشورنس پالیسی لینا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پڑوس اور اردگرد کا ماحول بہت اچھا ہے لیکن میری بیوی ایک قسم کے فوبیا کا شکار ہے..... اسے ہر وقت مجرمانہ حملے اور جان سے مار دیے جانے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا لیکن کیا آپ کے پاس ایسی پالیسی ہے جو ان سب باتوں کو کور کرسکے؟''

''ہماری پالیسی میں حادثاتی موت کے علاوہ قتل بھی شامل ہے لیکن خودکشی نہیں.....'' بریڈ نے کہا۔

''اور مجرمانہ حملہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ انڈیا اور افریقہ میں اس قسم کی انشورنس پالیسی موجود ہے لیکن یہاں امریکا میں ایسا نہیں ہوتا

جسم موٹا و چہرہ خوبصورت بنائیں
ڈائنا کلک
جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے والی پاکستان کی واحد تسلیم شدہ دوا جسکے استعمال سے ایک دفعہ بڑھنے والا وزن اور حاصل ہونے والی جسمانی خوبصورتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ "ڈائنا کلک" مصنوعی اجزاء کی بجائے خالص اجزاء سے تیار کردہ ہے۔ "ڈائنا کلک" ہر عمر کے افراد جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے کیلئے بلا خوف و خطر استعمال کرسکتے ہیں۔ "ڈائنا کلک" کے 4 ہفتوں کے استعمال سے جسم کے ہر حصے پر متناسب طریقے سے گوشت میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے کے داغ دھبے، جھائیاں جھریاں لکیریں دور کرکے گال بھرے بھرے خوبصورت شاداب بناتا ہے۔ جسمانی کمزوری خون نہ بننا خوراک بدن کو نہ لگنا، ایسے امراض کو دور کرکے جسم کو موٹا، طاقتور اور خوبصورت بناتا ہے۔ مکمل طور پر قدرتی اجزاء سے تیار کردہ گارنٹی کیساتھ معجزہ اثرات سے پاک قدرتی یونانی مرکب "ڈائنا کلک" قیمت 400 روپے (9 کیپسول) جو چار ہفتوں کی مکمل خوراک ہے۔ ایک خط لکھ کر بذریعہ V.P. منگوائیں۔ (نقل کرنیوالوں سے ہوشیار رہیں)
DIANA (UANANI) LABORATORIES
P.O. BOX 102 (SHAIGAN) ISLAMABAD

بہرحال ایک لائف انشورنس پالیسی آپ کی بیوی کو کافی حد تک مطمئن رکھ سکتی ہے۔'' انشورنس ایجنٹ بریڈ نے کہا۔

''اگر اسے انشورنس کا آئیڈیا پسند نہ ہو تو کیا میں اس کی لاعلمی میں اس کا بیمہ کروا سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت سی انشورنس پالیسیاں ایسی ہیں جن کے لیے متعلقہ شخص کے دستخط کی ضرورت پیش نہیں آتی لہٰذا آپ کسی کا بھی بیمہ کروا سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ اس سلسلے میں مزید بات چیت کے لیے ہمارے پاس آنا چاہتے ہیں؟''

میرے دل میں آیا، اس سے پوچھوں کہ اس کے پاس کینسر سے مرنے والوں کے لیے کوئی پالیسی موجود تھی..... لیکن میں نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

''میری اگلی کال شکا گو پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے تھی۔

''جیک بات کر رہی ہوں.....'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''ہائے جیک..... میں ٹراؤٹ بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم کافی دنوں سے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ کیا بات ہے؟'' جیک نے پوچھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں ایک شخص لائل ٹوڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اور میں تمہاری مدد کس لیے کروں؟''

''کیونکہ تم میری دوست ہو..... کیونکہ مجھے اس شخص سے کچھ کام ہے اور کیونکہ میں کرسمس تک بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گا!'' میں نے کہا۔

جیک سے میری واقفیت چند سال پرانی تھی کئی مرتبہ میں اس کے کام بھی آ چکا تھا۔ جس پر وہ میری احسان مند تھی۔

''چلو، دیکھتے ہیں کہ لائل ٹوڈ کے بارے میں مسٹر کمپیوٹر کیا کہتے ہیں۔'' جیک نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''اسے ایک مرتبہ ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔''

''اس کی بیوی یا بچوں کے بارے میں کچھ معلومات؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' جیک نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ شخص بچوں کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ثابت ہو چکا ہے اور پچھلے سال پیرول پر رہا ہوا ہے۔''

''اور اس کا پتا؟'' میں نے دل ہی دل میں اس پر نفرین بھیجتے ہوئے پوچھا۔

جیک نے مجھے اس کا پتا لکھوا دیا اور پھر میری فرمائش پر اس نے لائل کے بارے میں دوسری تفصیلات بھی مجھے لکھوا کر دا دیں..... مثلاً اس کی تاریخ پیدائش، اس کا سوشل سیکیورٹی نمبر وغیرہ۔ خاص بات یہ تھی کہ لائل نے مجھے کوئی اور ایڈریس بتایا تھا۔

''تم اس پیر کو آ رہے ہو؟'' جیک نے میری تحقیقات کا سلسلہ ختم ہونے پر پوچھا۔

''کوشش کروں گا۔ شکریہ جیک!'' میں نے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا ٹراؤٹ.....''

☆☆☆

میں نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے پسٹل کو تھپتھپایا۔ ماسٹر کیز کا گچھا اور ہتھکڑیوں کی ایک جوڑی کوٹ کی جیب میں رکھی اور پھر باہر نکل آیا۔

باہر موسم کچھ خنک سا تھا اور سورج دھند اور بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے ایک جگہ ایک گھنٹا گزارا اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر لائل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جو یقیناً اس کا اصل گھر تھا۔ لائل کے اپارٹمنٹ کے باہر ایک سیکیورٹی ڈور تھا جسے میں نے چوتھی کوشش پر کھول لیا۔ یہ سب چابیوں کے اس سیٹ کا کرشمہ تھا جسے میں نے ایک تالے والے کے پاس سے چوری کیا تھا۔ اس سیٹ میں ساٹھ ماسٹر کیز تھیں جو امریکا کے نوے فیصد تالوں کو کھول سکتی تھیں۔ ان چابیوں کی چوری جرائم کی دنیا میں میرا پہلا قدم تھا..... اور میری مجبوری بھی!

باہر والا دروازہ کھول کر میں نے اندر جھانکا۔ تمام ہال خالی نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ لائل کا اپارٹمنٹ تلاش کر کے میں نے دو مرتبہ دروازے پر دستک دی۔ اپنا پسٹل میں نے پیچھے چھپا رکھا تھا.....

اندر سے کوئی جواب نہ ملنے پر میں نے وہ دروازہ بھی دوسری کوشش میں کھول لیا اور اندر جانے کے بعد دروازے کی کی چین چڑھا دی تاکہ کوئی میرے پیچھے اندر نہ آ سکے۔ اس کے بعد میں نے اپنی تلاش شروع کر دی۔

لونگ روم میں چھ ڈی وی ڈی ریکارڈر موجود تھے اور وہ سب کے سب زیر استعمال لگتے تھے۔ ٹی وی کے قریب رکھے ہوئے ایک باکس میں بے شمار سی ڈیز کے کور موجود تھے اور خاصی تعداد میں خالی ریکارڈر بھی تھے۔

کمرے کے ایک گوشے میں تین ڈیجیٹل کیمرے اور ایک کمپیوٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے کمپیوٹر چلایا اور لائل کا پاس ورڈ تلاش کرنے میں دس منٹ صرف کر دیے۔ اس کے بعد میں نے کمپیوٹر بند کر دیا۔

کچن میں جا بہ جا بازار سے لائی گئی کھانے پینے کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور اس نے اتنی چینی جمع کی ہوئی تھی جو ایک ہاتھی کو بھی ذیابیطس میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔ فریج کے اوپر ایک مقناطیس کے ذریعے لائل کی ایک تصویر چپکی ہوئی تھی جس میں وہ بیئر پیتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہ تصویر اتار کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

بیڈروم میں مجھے فحش ڈی وی ڈیز کا ایک کلیکشن ملا لیکن وہ سب کی سب لیگل تھیں لائل کا غیر قانونی مواد مجھے ایک ٹرنک سے ملا۔ وہ ٹرنک بیڈروم کی الماری میں بالکل پیچھے کی جانب رکھا ہوا تھا۔ اس کا تالا ساتویں کوشش میں کھل پایا تھا۔

اس ٹرنک میں بھی فحش موویز کا ایک ذخیرہ تھا۔ بعض کی تصاویر بھی کور پر موجود تھیں جنہیں میں نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹرنک میں رقم سے بھرا ہوا ایک بیگ بھی موجود تھا.....

رقم نکال کر میں نے ٹرنک بند کر دیا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ اب میں مطمئن تھا کیونکہ میں یہ جان چکا تھا کہ میرا واسطہ کس قسم کے شخص سے تھا.....

اب مجھے رات دس بجے تک کا وقت گزارنا تھا۔ اس کے بعد میں اپنا کام ختم کر سکتا تھا۔

☆☆☆

لائل نے اپنے وعدے کے مطابق میرے لیے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا..... اندر اندھیرا اور خاموشی تھی۔ پورچ کی سیڑھیاں طے کرنے تک میرا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور سانس روک کر کسی بھی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اس وقت میں لائل کے بتائے ہوئے پتے پر موجود تھا۔

لونگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اپنے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اپارٹمنٹ میں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے..... لیکن بیڈ روم میں کوئی موجود تھا۔

ایک عورت بے لباسی کی حالت میں بیڈ سے بندھی ہوئی تھی اس کی رنگت سپید تھی اور عمر بیس سال سے کچھ زیادہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے منہ میں ایک گولا سا ٹھنسا ہوا تھا اور اس کی کلائیاں اور ٹخنے چمڑے کے تسموں سے بیڈ کے چاروں کناروں سے بندھے ہوئے تھے۔

اس کی آنکھیں دہشت کے باعث پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک چیخ ماری تھی جو اس کے سینے میں ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

اس کے سرہانے ایک پرچہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ اس کے منہ سے یہ گولا مت نکالنا ورنہ یہ پڑوسیوں کو جگا دے گی.....''

پورا کمرا غیر معمولی طور پر روشن تھا۔ چھت پر لگی ہوئی لائٹ کے علاوہ بیڈ کے چاروں جانب بھی بلب لگے ہوئے تھے۔ آئینے والی الماری کے قریب بھی ایک بلب روشن تھا اور ایک پورٹیبل قسم کی لائٹ بیڈ کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے اس عورت سے کہا۔

وہ دوبارہ چیخی.....

''شش.....'' میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔''

میں نے پیچھے کی جانب رکھی ہوئی الماری کی طرف قدم بڑھائے اور اس کے آئینے والے سلائیڈنگ دروازے کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے خالی ہاتھ سے میں نے ایک دم دروازے کا ہینڈل کھینچا اور پسٹل والا ہاتھ الماری کے اندر گھسا دیا..... میرا پسٹل لائل کے سینے پر رکھا ہوا تھا!

وہ بری طرح چونکا..... کیمرا اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اس نے بے اختیار مجھے دھکا دینے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی پسٹل کا دستہ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔

وہ آگے کی طرف گرا اور منہ سے خون تھوکنے لگا۔

میں نے اس کے سر کی پشت پر ایک چوپ رسید کیا اور وہ فرش چاٹنے لگا۔

''مجھے مت مارو..... مجھے مت مارو!'' وہ خوف زدہ انداز میں چلایا۔

میں نے اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ دیا اور مڑ کر الماری کا جائزہ لینے لگا۔ الماری بالکل خالی تھی اس کے دروازے میں لگا آئینہ ون وے تھا..... مجھے اس میں سے بیڈ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ عورت کون ہے لائل؟'' میں نے پوچھا۔

وہ جواب میں کچھ بدبدایا لیکن اس کے الفاظ قالین میں جذب ہو کر رہ گئے۔ ''میں نے اس کی گردن سے اپنے پیر کا دباؤ ذرا کم کر دیا۔

''میری پچھلے ہفتے ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔

''یعنی یہ تمہاری بیوی نہیں ہے!'' میں نے کہا۔

''نہیں..... یہ ایک عام سی جان پہچان والی لڑکی ہے۔''

''اور تم نے اسے ریپ کرنے اور قتل کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کیں تاکہ تم اس کی ویڈیو بنا سکو!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے اصل اپارٹمنٹ میں اس قسم کی دوسری فلمیں دیکھ چکا ہوں۔''

لائل نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی۔ ''اس کام میں بہت پیسا ہے..... تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ، ہم دونوں مالا مال ہو جائیں گے!'' اس نے کہا۔

''میں نے بیڈ پر بندھی ہوئی عورت پر ایک نظر ڈالی۔

''مجھے کتنا پیسا ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے آدھا ملین تو صرف ایڈوانس میں ملا ہے..... اتنی رقم میں تو ہم دونوں کی دنیا بدل جائے گی!'' اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے ترغیب دی۔

''یہ رقم تو واقعی بہت زیادہ ہے..... لیکن میں اتنا لالچی نہیں ہوں۔ مجھے اتنی رقم کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں کتنی رقم درکار ہے..... مجھے بتاؤ!'' لائل نے کہا

''میرے لیے رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

میں نے اس کی پشت پر گھٹنا رکھ کر ایک ہاتھ سے اپنی جیب سے ہتھکڑی نکالی۔ ''اپنا بایاں ہاتھ اپنی پشت پر رکھو لائل۔'' میں نے اس سے کہا۔

اس نے میرے حکم پر عمل کیا۔ میں نے اس کا بازو پیچھے کی جانب کھینچ کر اس میں ہتھکڑی ڈال دی اور پھر اسے اوپر کھینچا..... ''باتھ روم کی طرف چلو۔''

وہ اوپر اٹھنے لگا تو میں نے اس کے بازو پر کچھ زیادہ ہی زور ڈال دیا..... نتیجے میں اس کا بازو کہنی سے اتر گیا۔ لائل درد سے بری طرح چلایا۔ میں نے اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کو موڑا اور اسے چپ رہنے کو کہا۔

''باتھ روم میں، میں نے واش بیسن کے پائپ سے اس کی ہتھکڑی کی زنجیر منسلک کر کے اسے وہاں قید کر دیا اور دوبارہ بیڈ روم میں چلا آیا۔

''تم بالکل محفوظ ہو۔'' میں نے بیڈ سے بندھی ہوئی عورت کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا..... میں پولیس کو بلا رہا ہوں۔ کیا تم ان سے بات کرنے کے قابل ہو؟''

اس نے خوفزدہ سے انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا گولا نکال دیا۔

''وہ مجھے جان سے مارنے والا تھا!'' اس نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر پولیس کا نمبر ملایا اور ریسور اس عورت کے سر کے قریب رکھ دیا۔

اور جب اس نے فون پر بات شروع کی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میں اس وقت دواؤں کے نشے میں تھا جب جیک نے میرے موبائل پر مجھے فون کیا۔

''پیر کو میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔'' اس نے شکایت کی۔

''سوری، میں ذرا مصروف تھا!'' میں نے معذرت کی۔

''تمہیں وہ شخص یاد ہے جس کے بارے میں فون کر کے تم نے مجھ سے پوچھا تھا؟'' جیک نے کہا۔ ''لائل ٹوڈ..... چند روز پہلے وہ پکڑا گیا ہے۔''

''کیا یہ خبر واقعی سچ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم یہ ہوا ہے کہ مسٹر لائل ٹوڈ حقیقی مناظر پر مشتمل ایک پُرتشدد قسم کی فلم بنانے جا رہے تھے لیکن عین وقت پر کوئی مداخلت کار وہاں آ پہنچا اور اس نے ان کے شکار کو بچا کر ان کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔'' جیک نے بتایا۔

میں نے اپنی ناک سے خون صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کی قسمت اچھی تھی!''

''اس عورت کا کہنا ہے کہ اسے بچانے والا ایک گنجا آدمی تھا!'' جیک نے کہا۔

''بے چارا!'' میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''گنجا ہونا بھی گویا ایک جرم ہے.....''

''اگر وہ گنجا شخص سامنے آ کر بیان دے دے تو کیس کو حل کرنا آسان ہو جائے گا۔'' جیک نے کہا۔

''اگر وہ مجھے مل گیا تو میں تمہارا پیغام اسے پہنچا دوں گا لیکن تمہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اگر تم لائل کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لو تو تمہیں اس کے خلاف بے شمار ثبوت مل جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کام ہم پہلے ہی انجام دے چکے ہیں۔'' جیک نے کہا۔ ''اور اگر مسٹر لائل کبھی پیرول پر رہا ہو سکے تو اس وقت ان کی عمر چار سو سال سے کم نہیں ہوگی!''

''تب پھر تم نے مجھے فون کس لیے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ وہ عورت جسے خوش قسمتی سے بچا لیا گیا تھا..... اپنے ہیرو سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔'' جیک نے کہا۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن کے پردے پر لنڈا کا چہرہ ابھر آیا..... کچھ عرصہ پہلے وہ میری منگیتر تھی۔ میں نے اسے خود اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ مجھے بے بسی کے عالم میں مرتا ہوا نہ دیکھ سکے.....!

اور میں کسی اور کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اب میری زندگی میں کسی کی بھی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے جیک کو حتمی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں یہ بات اسے بتا دوں گی۔'' جیک نے آہستہ سے کہا۔ ''پیر کو پول ہال پر آ رہے ہو؟''

''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بات اور پوچھوں؟''

''ہاں۔''

''لائل کو کک کاؤنٹی کی جیل ہی میں رکھا گیا ہے؟''

''ہاں، کیوں؟''

''عام قیدیوں کے ساتھ؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''میرا خیال تو یہی ہے۔'' جیک نے کہا۔

''شکریہ جیک'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں نے باتھ روم میں جا کر اپنے چہرے پر لگا ہوا خون اور پاؤڈر دھویا، کپڑے تبدیل کیے اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

نیوز اسٹینڈ پہنچ کر میں نے اخبار خریدا اور وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھ کر اپنی مطلوبہ خبریں پڑھنے لگا۔ اپنے مطلب کی باتیں جاننے کے بعد میں نے سگریٹوں کے تین کارٹن خریدے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر کک کاؤنٹی جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیروم جانسن سے ملنے کے لیے مجھے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ وہ تقریباً بائیس سال کی عمر کا ایک سیاہ فام شخص تھا۔ جسے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور اب وہ اس کی سزا کاٹ رہا تھا۔

''تم آخر کون ہو؟'' اس نے ملاقات کے کمرے میں آنے کے بعد حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں جیروم.....'' میں نے کہا۔ ''ایک اچھی ڈیل!'' میں نے سگریٹوں کے تینوں کارٹن اس کے حوالے کیے اور مزید کہا۔ ''یہ تمہارے قیمتی وقت کے بدلے ہیں!''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارے ڈویژن میں ایک سیاہ فام لڑکا ہے..... لائل ٹوڈ، وہ ایک انتہائی سنگین مجرم ہے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے کا عادی.....'' میں نے جیروم کی بے تاثر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم جیل میں یہ بات پھیلا دو کہ جو کوئی بھی اسے ٹھکانے لگائے گا اسے سگریٹوں کے بیس کارٹن دیے جائیں گے۔ اسے پہچاننا تو بہت آسان ہے..... اس کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ رہی اس کی تصویر!''

میں نے لائل کی وہ تصویر اس کے حوالے کر دی جو میں لائل کے اپارٹمنٹ سے لایا تھا۔

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' جیروم نے سوال کیا۔

''میں تمہیں جانتا نہیں ہوں..... میں نے تمہارے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ تم اس کام کے لیے بالکل درست آدمی ہو..... میرا خیال ٹھیک ہے نا؟''

جیروم نے تصویر کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، ٹھیک ہے۔''

''ایک اور اہم بات.....'' میں نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام کل سے پہلے نہیں ہونا چاہیے، او کے؟''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں جیل سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا گھر واپس آ گیا۔ اپنی کمرے میں آ کر میں نے کوکین کا ڈوز لیا، کچھ کوڈین حلق سے اتاری اور اسی ہزار ڈالر کی لائف انشورنس پالیسی کو سامنے رکھ کر گھورنے لگا..... یہ پالیسی میں نے لائل ٹوڈ پر لی تھی جو کہ آدھی رات سے موثر ہونے والی تھی۔

اسی ہزار ڈالر سے میں اپنے درد کا درماں کافی حد تک خرید سکتا تھا..... یہ رقم مجھے اپنا آپ بھلانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔

میں شراب پینے لگا۔ یہاں تک کہ میں لائل کی موجودگی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا..... اس کے بعد میں نے تھوڑی سی مزید پی تاکہ مکمل طور پر غافل ہو جاؤں۔

پیر کا روز آنے پر میں اپنی پالیسی کیش کراؤں گا اور جیک سے ملنے پول ہال جاؤں گا اور پھر اسے اپنے ساتھ اچھا سا ڈنر کرانے لے جاؤں گا.....

جو سلوک میں نے لائل کے ساتھ کیا، میرے نزدیک وہ اس سے بھی بدتر سلوک کا مستحق تھا..... لہٰذا میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔

✻✻

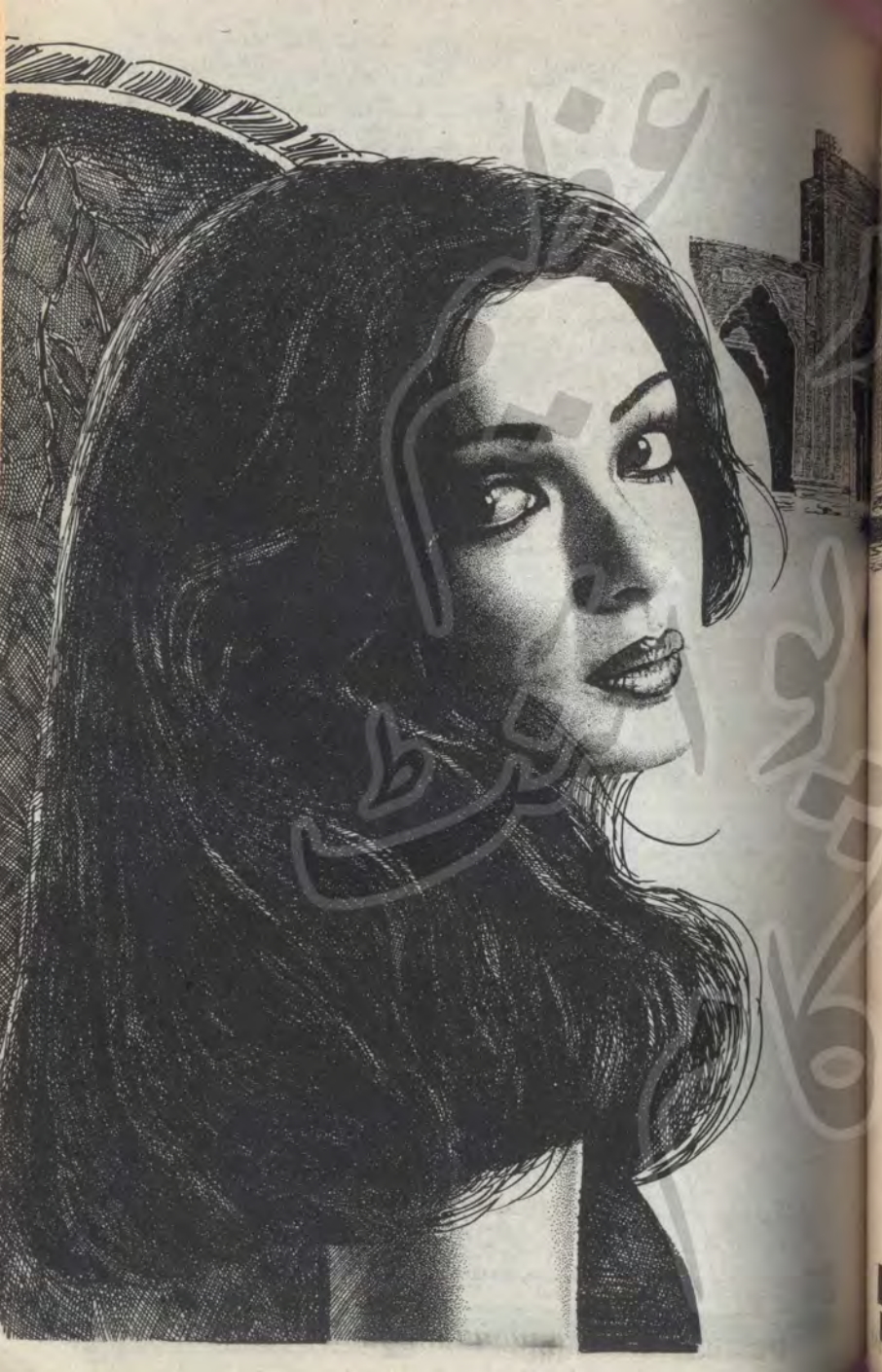

یقینی و بے یقینی کا طلسم کدہ، ستارہ شناس راؤ پرویز کی مہم جوئی

ایچ اقبال

مستقبل شناس

وہ علم الاعداد کا ماہر تھا۔ کسی کے نام کے عدد کے حاکم سیارے کی "شرارتوں" سے واقف ہونے کے باعث وہ یہ تجزیہ کرلیتا تھا کہ دوسرے کن اعداد سے اس عدد کی موانست یا معاندت ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی عدد اسے چکرا بھی دیتا تھا۔ کیونکہ تاریخ پیدائش کے عدد اور نام کے عدد میں فرق ہو تو شخصیت پر بیک وقت دو سیاروں کے اثرات پڑتے ہیں، شخصیت میں پیچیدگی آجاتی ہے۔ جو بعض اوقات ناقابل فہم ہوتی ہے۔

دست شناسی کے معاملے میں بھی اسے کارخانۂ قدرت سے محیر العقول صلاحیت ودیعت کی گئی تھی۔ انسانی ہاتھ کی لکیریں اس سے باتیں کرتی تھیں۔ وہ کسی کا ہاتھ دیکھ کر اس کے سارے راز ہائے درونِ پردہ سے واقف ہوجاتا تھا۔ لوگوں کے ماضی و مستقبل اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوجاتے تھے۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ اپنا اور ان لوگوں کا ہاتھ نہ دیکھے جو اس سے قربت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اور اپنے پیاروں کے مستقبل سے بے خبر رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مستقبل کے بارے میں جان لینے کا عذاب سہنا کبھی کبھی ناقابلِ برداشت بھی ہوجاتا ہے۔ اس کی یہ فکر کچھ دوسری پریشانیوں کا سبب بنتی رہی جس کی بنیادی وجہ ایک خوش اندام و خوش چہرہ نازنین تھی۔ اس کے گرد اسرار کے پردے تنے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اسے قتل کرنے کے لئے دنیا کا ایک ایک گوشہ چھان رہے تھے۔ اس کی شخصیت کا اسرار اس وقت اور بڑھ گیا جب پہاڑوں میں گھری ہوئی پراسرار وادی کافرستان کے ایک شخص نے انکشاف کیا کہ وہ اس کے قبیلے کی "شہزادی ثورتی" ہے۔ جس نے بہت عرصے بعد دوسرا جنم لیا ہے۔ لیکن حقیقت کیا تھی؟ یہ الف لیلوی داستان اسی سوال میں الجھی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

اسرار و حقیقت کے تانے بانے میں الجھی ہوئی داستان

عندلیب کو میرے گھر پہنچنے میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہی آئی تھی۔ اس نے فوراً عیدو بابا کی طرف توجہ دی جنہیں میں نے بے ہوشی کی حالت میں ان کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے انہیں ایک نظر دیکھتے ہی بتا دیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

عندلیب مجھے عیدو بابا کے کمرے سے باہر لے آئی اور پوچھنے لگی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟

میں کیا جواب دیتا' میں تو خود تاریکی میں تھا..... میری باخبری صرف اس حد تک تھی کہ احمر اور فرخندہ کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ وہ دونوں گھر سے غائب تھیں اور عیدو بابا بے ہوش ملے تھے۔ یہ اشارہ ان دونوں کے اغوا ہی کی طرف تھا اور اس اشارے نے مجھے شدید اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ خصوصاً احمر میرے لیے حد درجہ اہمیت اختیار کر چکی تھی۔

موبائل فون پر بات کرتے ہوئے عندلیب بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ وہ کسی کو اس واردات کی اطلاع دے رہی تھی۔ میرے خیال کے مطابق وہ مسز خان ہی ہو سکتی تھی جسے یہ اطلاع دی جاتی۔

اس وقت عندلیب کی طرف میرا دھیان بہت کم گیا۔ اذیت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں میرا وجود جیسے ایندھن بنا ہوا تھا۔ کنپٹیوں میں رہ رہ کر ایسی دھمک ہو رہی تھی جیسے وہ تیز دورانِ خون کا ہدف بنی ہوئی ہوں..... میرے دل و دماغ' صورتِ حال کے اس خارزار میں زخمی ہونے جا رہے تھے کہ احمر پر نہ جانے کیا گزری ہو۔ مجھے فرخندہ کا خیال بھی آ رہا تھا لیکن احمر کے بعد.....

''یہ اب بہت ضروری ہو گیا ہے..... مسز خان!''

عندلیب کی جھنجلائی ہوئی آواز اتنی تیز تھی کہ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے عندلیب کی چند باتیں سنیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اب اس معاملے میں پولیس کو آگے..... لانا چاہتی تھی لیکن مسز خان کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔

اسی دوران میں عیدو بابا کو ہوش آ گیا۔ ان کے بیان کے مطابق اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ انہوں نے فوراً مڑ کر دیکھنا چاہا تھا لیکن دیکھ نہیں سکے تھے، بس ایک ہلکے سے کھٹکے کی آواز انہوں نے ضرور سنی تھی اور پھر ان کے چہرے کے سامنے غبار سا چھا گیا تھا۔ جیسے پانی، بھاپ بن کر اٹھا ہو اور اس نے مرغولے کی شکل اختیار کر لی ہو۔ ایک عجیب سی بو نے ان کا دماغ پراگندہ کر دیا اور پھر انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

بے ہوش کر دینے والے کسی محلول کی بھاپ..... ایڈی عجیب سی بات تھی..... ! لیڈی ڈاکٹر بھی اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات میڈیکل چیک اپ سے ہی سامنے آ سکتی تھی کہ عیدو بابا کے اندرونی سسٹم پر اثر انداز ہونے والی کیا چیز تھی۔

لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا کہ پولیس کو احمر کے معاملات سے بے خبر نہ رکھا جاتا اور مسز خان اس کے لیے اب بھی آمادہ نہیں تھی۔

''یہ سیکیورٹی کا جو نظام قائم کیا گیا تھا میرے گھر کے اردگرد!'' میں نے عندلیب کو گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ کیا گھاس کاٹ رہے تھے.....؟''

''مسز خان کہہ رہی تھیں کہ وہ ان سے جواب طلب کریں گی۔''

''احمر کیا مل جائے گی اس جواب طلبی سے؟'' میرے لہجے کی تلخی بڑھی۔

''میں تمہارا اشتعال خوب محسوس کر رہی ہوں پرویز!'' عندلیب نے گمبھیر لہجے میں کہا ''اگر اس سلسلے میں تم کچھ کر سکتے ہو، اگر کوئی خیال آ رہا ہے تمہارے دماغ میں تو مجھے تم اپنے ساتھ سمجھو..... پولیس کو تو خیر، اس معاملے میں ملوث کرنا واقعی ٹھیک نہیں رہے گا لیکن مسز خان اور ان کی کونسل سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی..... اگر احمر اور فرخندہ کو بازیاب نہ کرایا جا سکا تو میں آنٹی زہروی سے نظریں بھی نہیں ملا سکوں گی۔''

میں نے چونک کر عندلیب کی طرف دیکھا۔

عندلیب میری طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے سے انداز میں کہتی رہی..... ''آنٹی نے کونسل سے زیادہ مجھ پر اعتماد کیا تھا!''

ایک خیال میرے دماغ میں تیزی سے گردش کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب احمر اور فرخندہ کی والدہ مادام زہروی کے لیے عندلیب نے ''آنٹی'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس طرح میرے اس شبہے کو تقویت ملی کہ احمر اور فرخندہ کسی رشتے سے عندلیب کی بہنیں تھیں اور وہ دونوں اسی لیے عندلیب کو ''باجی.....'' کہتی تھیں۔

''پرویز!'' عندلیب نے میری طرف دیکھا۔ ''اگر تم سمجھتے ہو کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جا سکتا ہے تو اس میں دیر نہ لگاؤ۔ ممکن ہے کہ ایکشن اسکواڈ نے احمر اور فرخندہ کو بھی دیبارو اور ندرتی تک نہ پہنچایا ہو.....''

''ایکشن اسکواڈ.....!'' میں تیزی سے بولا ''کیا مطلب؟''

''دیبارو اور ندرتی کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ اگر وہ احمر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے ختم کر دیں۔ اگر اس تلاش میں کوئی خطرناک مرحلہ آئے تو وہ یہ کام اپنے ایکشن اسکواڈ کے سپرد کر دیں۔''

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ایکشن اسکواڈ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ احمر کو ختم کر دے۔'' عندلیب نے مزید بتایا ''اس کا فرض ہے کہ وہ احمر کو دیبارو اور ندرتی تک پہنچا دے۔ خود ندرتی اور دیبارو تمہارے گھر میں نہیں گھسے ہوں گے۔ وہ احمر کو یہاں بھی ختم کر سکتے تھے۔ اغوا سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ کام ایکشن اسکواڈ کا ہی ہو سکتا ہے۔''

''تبریزی کے گھر میں تو ندرتی اور دیبارو خود گھسے تھے!'' جو خیال میرے دماغ میں آیا تھا' وہ تیزی سے میری زبان پر بھی آ گیا۔

''میں اندازہ نہیں لگا سکتی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ شاید اس وقت انہیں اتنی عجلت ہو کہ وہ ایکشن اسکواڈ سے رابطہ نہ کر سکے ہوں۔''

''معلوم کرو کہ ندرتی اور دیبارو اس وقت کہاں ہیں؟'' میں بہت بے چین ہو گیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ دیبارو اور ندرتی تک پہنچنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔ عندلیب کے خیال کے مطابق یہ امکان بہر حال تھا کہ ایکشن اسکواڈ ابھی احمر اور فرخندہ کو دیبارو اور ندرتی تک نہ پہنچا سکا ہو.....

عندلیب جب فون پر کسی سے بات کر رہی تھی، اسی وقت میں نے موبائل پر راجو سے رابطہ کیا۔

''ہاں' گھر پر ہی ہوں۔'' میری بات کے جواب میں راجو نے خشک لہجے میں جواب دیا ''اور تیرے اس پہاڑی کا پاگل پن دیکھ رہا ہوں۔ ٹی وی سے چپک کر رہ گیا ہے۔ وڈیو کیسٹ بار بار ریوائنڈ کر رہا ہے اور اپنی شہزادی صاحبہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ تیرے دی سی آر کا تو کباڑا کر دے گا یہ!''

''اسے پڑا رہنے دے اس چکر میں، فلیٹ میں تالا لگا کر میرے پاس آ جا! جلدی!''

''پھر کوئی کھپ پڑ گئی؟''

''تجھے میرا ساتھ دینا ہوگا!'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''او یار! پہلے بھی ہوا ہے ایسا کہ میں نے تیرا ساتھ نہ دیا ہو!''

''بس تو آ جا جلدی سے۔''

میں نے رابطہ منقطع کر کے عندلیب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی موبائل پر کسی سے بات کر چکی تھی۔

''دیبارو تو گھر پر ہی ہے۔'' اس نے بتایا ''راجو نے ایسی چوٹیں لگائی ہیں اسے کہ وہ اتنی جلدی ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔ ندرتی گیا تھا دفتر..... وہ ابھی وہاں سے نکلا ہے..... رپورٹ دینے والے نے بتایا ہے کہ وہ خاصا بے چین ہے۔''

''بے چین؟'' میں چونک سا گیا ''کیا اسے ایکشن اسکواڈ والوں سے کوئی اطلاع ملی ہوگی!''

''شاید.....''

میں نے جلدی سے موبائل پر راجو سے رابطہ کیا۔ ''نکلا گھر سے؟''

''تالا لگا رہا ہوں یارا.....!''

''اچھا میری طرف نہ آ..... سیدھا ندرتی کے گھر پہنچ۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔''

''آخر.....''

میں نے اس کا کوئی سوال سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور عندلیب سے بولا ''تم ایک کام کرو..... ندرتی اور اس کے گھر کی نگرانی ختم کروا دو.....''

''میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تم اس وقت کیا کرنے جا رہے ہو!'' عندلیب نے متفکر لہجے میں کہا ''اس وقت مجھے بھی تمہارے ساتھ ہونا چاہیے لیکن.....'' اس نے سر جھکا ''یہ گارڈز بھی تو میرے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ خیر تم چلو..... میں کوشش کروں گی، کسی طرح ان سے پیچھا چھڑا کر وہاں پہنچوں۔''

میں نے بڑی عجلت میں روانگی کی تیاری کی، اسمتھ اینڈ ولسن کا چھوٹا سا پستول بھی میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

عندلیب میرے ساتھ ہی بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ عبدو بابا ہمارے پیچھے پیچھے تھے۔ ان کے چہرے پر افسردگی اور شرمندگی کا ملا جلا تاثر تھا۔

''آپ جا کے آرام کیجیے عیدو بابا!'' میں نے ان سے کہا۔

''بہت شرمندہ ہوں بیٹے سرکار.....! وہ بچیاں.....'' ان کی آواز بھرا گئی۔ ''اور میں کچھ نہیں کر سکا۔''

''آپ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے عیدو بابا!'' عندلیب

بول پڑی ''اس میں آپ کی کوئی غلطی یا کوتاہی نہیں ہے۔ آپ جا کے آرام کریں۔''

اس وقت میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ نا معلوم لوگوں نے تو یہ کام اتنی عیاری سے کیا تھا کہ میرے گھر کے چوکی دار اور سیکیورٹی والے بھی بے خبر رہ گئے تھے۔ بے چارے عیدو بابا کیا کر لیتے!

گھر سے نکلتے وقت میں نے عندلیب سے کہا ''مجھے وہ کار یاد آ رہی ہے جس نے راجو کے گھر تک اور وہاں سے واپسی پر بھی ہمارا تعاقب کیا تھا۔''

عندلیب متفکر انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''موبائل پر رابطے میں رہنا.....'' وہ اس وقت بولی جب میں اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔

پھر جب میں نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا تو وہ اپنی کار کی طرف جا چکی تھی۔

میں تیزی سے اپنی کار حرکت میں لایا۔ پھاٹک سے نکلتے ہی میں نے رفتار میں تیزی سے اضافہ کیا۔

رات اپنی تاریکی' فضا میں گھولنے لگی تھی اور سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کی ہیڈ لائٹس جل چکی تھیں۔ میں رفتار اپنی خواہش کے مطابق نہ بڑھا سکا لیکن جو رفتار تھی، اسے بھی خطرناک کہا جا سکتا تھا۔ کسی بھی بڑے چوراہے پر موجود ٹریفک سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل میرے پیچھے دوڑا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا دھیان کسی طرف بھی نہ گیا۔ میرے رگ و پے میں جیسے چنگاریاں چیخ رہی تھیں۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر احمر کو کچھ ہو گیا تو ان لوگوں میں سے جو بھی ہاتھ لگا، اس کی بوٹیاں اڑا دوں گا۔ میرے جذبات اتنے شدید تھے جیسے کوئی لاوا ابل پڑنا چاہتا ہو۔

شکر ہے کہ مجھے ٹریفک پولیس کے کسی آدمی نے نہیں روکا ورنہ میری تعجیل، تاخیر میں بدل جاتی۔

میں نے اپنی کار دیارو اور ندرتی کے بنگلے سے کچھ فاصلے پر روکی۔

وہ دو بنگلوں کے درمیان ایک گلی تھی جہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ کار سے اتر کر میں تیزی سے اس بنگلے کی طرف بڑھا جس کا پتا مجھے کسی وقت عندلیب نے ہی بتایا تھا۔

بنگلے کی طرف بڑھتے وقت راجو مجھے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا جو میرے لیے تعجب کی بات تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے مجھ سے پہلے یہاں آ جانا چاہیے تھا۔ اگر وہ کہیں اندھیرے میں چھپا ہوا ہوتا تو میری کار دیکھ کر سامنے آ جاتا۔

موبائل پر اس سے میرا رابطہ ہو گیا۔ ''کہاں ہے؟'' میرے انداز میں جھلاہٹ تھی۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تو مجھے اچانک کسی بھاگ دوڑ میں ڈال دے گا۔'' دوسری طرف سے راجو نے کہا ''میری موٹر سائیکل میں پیٹرول کم تھا۔ دس منٹ تو ایک پیٹرول پمپ پر لگ گئے!''

''اب کہاں ہے؟''

''بس.....اب مڑا ہوں میں اس سڑک پر!''

میں نے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ دیکھی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے زیادہ گاڑیوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ میں قریب آتی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے ندرتی کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر واپس پہنچ چکا ہوگا یا نہیں! عندلیب سے یہ پوچھنے کا مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ اس کا دفتر اس کے بنگلے سے کتنی دور تھا۔

مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک کار کی ہیڈ لائٹس میں مجھے موٹر سائیکل پر آتا ہوا راجو دکھائی بھی دے گیا۔ کار کی ہیڈ لائٹس سے بچنے کے لیے میں نے خود کو ایک درخت کی آڑ میں کر لیا تھا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ راجو کی موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ مجھ پر پڑی اور اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔

میرے قریب آتے آتے راجو نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ بجھا دی۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر رکا۔

''وہ.....ادھر.....'' میں نے اشارہ کیا ''موٹر سائیکل اس گلی میں کھڑی کر آ.....میری کار بھی وہیں کھڑی ہے۔''

راجو نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ میرے قریب رک کر اس نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ موٹر سائیکل گلی میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے اس دوران میں آس پاس کے ماحول کا بھی کڑی نظروں سے جائزہ لے لیا تھا۔ مجھے اس بنگلے کی نگرانی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میری خواہش کے مطابق عندلیب نے پولیس کے لوگوں کو وہاں سے یقیناً ہٹا دیا تھا۔

گلی میں موٹر سائیکل کھڑی کر کے راجو جلد ہی میرے قریب آ گیا۔

''اب کیا کھپ ڈالنا ہے یہاں؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں ان دونوں کی بوٹیاں اڑا دینا ہوں۔'' میں نے غصے سے دانت پیسے۔ ''احمر کو اغوا کر لیا ہے ان لوگوں نے!''

''کیا.....!'' راجو چونک پڑا۔

''ہمیں اندر پہنچنا ہے۔'' میں نے کہا ''تو کس طرح گھسا تھا؟''

قریب آتی ہوئی ایک کار کی ہیڈ لائٹس سے بچنے کے لیے ہم دونوں درخت کی دوسری جانب ہو گئے۔

''وہ کیسے اغوا ہو گئی؟'' راجو نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ تفصیلات بتانے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اندر جانا ہے راجو!'' میں نے مضطرب انداز میں پہلو بدلا۔

اس وقت راجو چونکا۔

''ندرتی!'' اس کے منہ سے نکلا۔

اس کی نظریں اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف تھیں جس کی ہیڈ لائٹس سے بچنے کے لیے ہم درخت کی آڑ میں ہوئے تھے، قریب آ کر اس کار کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔

''یہ ندرتی ہے؟'' میرے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

''ہاں.....''

کار، بنگلے کے پھاٹک کے سامنے رکی۔ اس کا اور ہمارا درمیانی فاصلہ بہت کم تھا۔ کار کے اندر روشنی بھی تھی اس لیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی صاف نظر آ رہا تھا۔

اپنے دفتر سے یہ اب پہنچا ہے یہاں' میں نے سوچا۔

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ندرتی کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنی کار پھاٹک پر روکی تھی اور پھر ہارن دیا تھا۔

میری زندگی میں اس قسم کے مواقع پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے لیکن اس وقت میرے دماغ نے حیرت انگیز طور پر کام کیا۔

''جا!'' میں نے بائیں ہاتھ سے راجو کا ہاتھ پکڑا اور ندرتی کی کار کی طرف لپکا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اپنا ایکسٹینڈڈ سلنسر نکال لیا تھا۔

راجو نے یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا تو ندرتی چونکا۔ اگر دروازہ اندر سے بند ہوتا تو مجھے پستول دکھا کر ندرتی سے دروازہ کھلوانا پڑتا لیکن اس میں ایک آدھ منٹ گزر جاتا جس سے کام خراب بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے پستول کی نال ندرتی کی کمر سے لگا دی اور انگریزی میں بولا ''کوئی بھی غلط حرکت، اور تمہاری موت!''

میں بایاں ہاتھ پیچھے کر کے راجو کے لیے پچھلی نشست کے دروازے کا لاک کھولنا چاہتا تھا لیکن اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ دروازہ بھی اندر سے لاک نہیں تھا اور راجو اسے کھول کر اندر بیٹھ چکا تھا۔

ندرتی کے ہارن دینے کے بعد پھاٹک کھلنے میں شاید ایک منٹ بھی نہیں لگا ہوگا لیکن اس قلیل وقت میں صورتِ حال، میرے خیال کے مطابق میرے حق میں ہو چکی تھی۔

''کار چلاؤ ندرتی!'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں دیکھ کر چوکی دار کو اس کے سوا کوئی خیال نہیں آنا چاہیے کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ آئے ہو.....''

ندرتی نے ہونٹ بھینچ لیے!

''کار چلاؤ!''

یہ میرے لیے بڑی انوکھی صورتِ حال تھی۔ میں ندرتی سے بہت سخت لہجے میں مخاطب ہوا تھا لیکن میری کوشش یہی رہی تھی کہ میں چوکی دار کو مسکراتا ہوا نظر آؤں۔

ندرتی کار حرکت میں لایا۔

میں پھر بولا۔ ''اس طرح ہنسو جیسے میں نے تم سے کوئی مذاق کیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کمر پر پستول کی نال کا دباؤ بھی بڑھایا۔ یہ ندرتی کے لیے ایک خاموش دھمکی تھی۔

کسی گھبرائے ہوئے خوف زدہ آدمی کا ہنسنا یقیناً بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن اس وقت میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ چوکی دار اتنی توجہ سے تو اپنے مالک کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا، اور پھر بات بھی چند لمحے کی تھی۔ کار، پھاٹک سے گزر گئی۔

میں نے کن انکھیوں سے پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔ راجو مجھے نظر نہیں آیا۔ غالباً وہ بالکل میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے مجھے زیادہ سر گھمانا پڑتا جبکہ میں ندرتی کی طرف سے ایک پل کے لیے، ذرا سی بھی غفلت نہیں.... چاہتا تھا۔ یہ بات تو ممکن ہی نہ تھی کہ میں ندرتی پر گولی چلا دیتا لیکن اسے یہ تاثر دینا اشد ضروری تھا کہ میرے خلاف اس کی کوئی بھی حرکت اسے کسی بھی انجام کی طرف لے جا سکتی ہے۔

''کار اسی جگہ روکنا جہاں روکتے ہو!'' میں نے ندرتی کو حکم دیا۔

ندرتی خاموش رہا۔ کار اس نے ایک جگہ روک دی۔

''اب میں پستول جیب میں رکھ لوں گا۔'' میں نے ندرتی سے کہا ''لیکن میرا ہاتھ بھی جیب میں ہی رہے گا۔ انگلی ٹریگر پر رہے گی'' پھر میں نے جھوٹ بولا ''میں

اس پر بھی قادر ہوں کہ جیب سے ہی فائر کر کے کسی کی کھوپڑی اڑا دوں۔"

"اسے گاڑی سے تو اتارو....." میرے پیچھے بیٹھے ہوئے راجو نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ندرتی' اردو شاید بالکل ہی نہ سمجھتا ہو۔ میں نے اسے انگریزی میں کار سے اترنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "تم ہمیں اس کمرے تک لے جاؤ گے جہاں تمہارے ساتھی کو ہونا چاہیے۔" پھر میں نے ایک جھوٹ اور بولا "یہ بھی خیال رکھنا کہ ریوالور میرے ساتھی کی جیب میں بھی ہے۔"

ندرتی اب بھی کچھ نہیں بولا اور دروازہ کھول کر اترنے لگا۔ راجو بھی اسی طرف سے اترا۔ جب وہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا' اس وقت ندرتی کی نظر اس کے چہرے پر نہیں پڑی ہوگی۔ اب وہ راجو کو دیکھ کر چونکا۔

میں جب کار سے اتر کر ان دونوں کے قریب پہنچا تو راجو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ندرتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "گھبراؤ نہیں..... آج میں تمہارے دوست کی ہڈیاں گننے نہیں آیا ہوں۔ ہاں اگر میرا ساتھی ایسا کچھ کرنا چاہے تو دوسری بات ہے۔"

ندرتی نے مجھ پر نظر تو ڈالی لیکن خاموش رہا۔

"اندر چلو....." میں نے اس سے کہا۔

ندرتی کے قدم مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔

"گھر میں کوئی ملازم ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں....." میں نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ ندرتی کی آواز سنی.....

"دروازہ اندر سے بند ہوگا؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہاں....."

"تو اس کی چابی رہتی ہوگی تم دونوں کے پاس!"

"ہاں....."

"گڈ.....!"

ہم دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ندرتی سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

چابی نکالنے کے لیے ندرتی کو جیب میں ہاتھ تو ڈالنا ہی تھا۔ اس وقت راجو مجھے بہت چوکس نظر آیا۔ یہ وہ بھی جانتا تھا کہ میں اپنا پستول استعمال نہیں کروں گا۔ ندرتی اگر کوئی گڑبڑ کرنا چاہتا تو راجو اسے اس کی مہلت ہرگز نہیں دیتا۔ وہ کسی ہتھیار کے بغیر اپنے ہاتھوں سے کام لینا خوب جانتا تھا۔

ندرتی نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔

"پہلے تم اندر چلو....." میں نے اس سے کہا۔

ندرتی نے قدم بڑھائے۔ اس کے پیچھے میں اور راجو اندر داخل ہوئے۔ اس وقت راجو غالباً مجھ سے بھی زیادہ چوکس تھا۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

وہ ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔

وہاں سے ندرتی ہمیں ایک ایسے کمرے تک لے گیا جس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی لیکن کمرے کی تیز روشنی تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ ندرتی کو میں تاکید کر چکا تھا کہ وہ دبے قدموں چلے۔ خود میں اور راجو بھی اس طرح چل رہے تھے کہ قدموں کی آہٹ بالکل نہ ہو۔

کھلے ہوئے دروازے سے کچھ مدھم آوازیں باہر آ رہی تھیں۔ میں نے اب جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں دروازے کے بہت قریب جا کر وہ آوازیں سنوں۔ شاید احمر بھی اس وقت وہاں ہوتی۔ دیبارو کے ساتھ ندرتی کے علاوہ کسی کی موجودگی سے یہ نتیجہ اخذ کر رہا تھا کہ وہاں ان کے ایکشن اسکواڈ ہی کے لوگ ہو سکتے تھے۔

میرا آگے ہونا اسی صورت میں ممکن تھا جب ندرتی میرے پیچھے ہوتا لیکن میں اسے پستول کی زد میں لیے ہوئے تھا۔ اسے میں اپنے پیچھے کرتا تو وہ میرے پستول کی زد میں نہ رہتا۔ مجھے سوچنا پڑا، کیا کروں، لیکن یہ سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ ندرتی کو میں نے اپنے پیچھے کیا اور راجو کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اب وہ ندرتی کو اپنے ریوالور کی زد میں لے لے۔

راجو کے پاس اس قسم کے کسی ہتھیار کی موجودگی ممکن ہی نہیں تھی لیکن میرا مقصد تو ندرتی کو دھوکا دینا تھا۔ راجو کو میں نے اشارہ بھی اس طرح کیا تھا کہ ندرتی دیکھ لے۔

اس طرح مجھے دروازے کے بہت قریب جانے کا موقع مل سکا۔ اب ندرتی میرے پیچھے اور راجو اس کے پیچھے تھا۔

میں نے کمرے سے آتی ہوئی ایک آواز صاف سنی اور مجھے شدید مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ جو کچھ بھی کہا گیا تھا، فارسی میں کہا گیا تھا اور فارسی میں جانتا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر راجو آگے رہتا تو اچھا تھا۔ فارسی آتی تو اسے بھی نہیں تھی لیکن وہ تھوڑی بہت سمجھ سکتا تھا۔

آواز پھر آئی اور میں چونک پڑا۔ بات تو اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن بولنے والے نے اپنے جملے

میں "پرنسز احمر" کہا تھا جسے سمجھنے کے لیے میرا فارسی داں ہونا ضروری نہیں تھا۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ احمر کے بارے میں مجھ پر ایک اور سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا۔ وہ "پرنسز" تھی۔

پرنسز احمر.....!

اور اس سے پہلے، زنگولا کے بیان کے مطابق شہزادی ثورتی!

احمر.....؟ شہزادی ثورتی.....؟ یا پرنسز احمر.....؟

میں اتنا بے چین ہوا کہ خود کو کمرے میں جھانکنے سے نہیں روک سکا۔ یہ اتفاق ہے کہ جو دو آدمی مجھے دکھائی دیے، ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ ان دونوں میں سے کسی کا رخ بھی دروازے کی طرف نہیں تھا۔

میں نے دیبارو کو بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر پنسل کے ایک نشان اور سوجی ہوئی بائیں آنکھ سے میں نے سمجھ لیا کہ وہی دیبارو ہوگا۔ راجو نے اسے بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ غالباً اس کے جسم پر بھی کچھ نشان ہوں گے جو اس کے لباس میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنے بستر پر بیٹھا اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ایک پیر کرسی پر رکھے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیے نہایت سخت لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک موبائل فون بھی تھا جس پر وہ کسی سے رابطے میں تھا۔

دیبارو نے جواباً اس سے کچھ کہا۔ وہ بھی فارسی ہی بولا تھا۔ اس مرتبہ ایک اور نام میری سمجھ میں آیا جو میں پہلے ہی سے جانتا بھی تھا۔ وہ نام "مسز خان" کا تھا۔

دیبارو کے خاموش ہوتے ہی ریوالور والے نے بگڑ کر کچھ کہا اور پھر مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی ہو، یکایک اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی، اس نے موبائل میں کہا "اب میں انگریزی بولوں گا تاکہ وہ بھی سنیں تو سمجھ لیں۔" وہ انگریزی ہی بولا تھا "ان تینوں کو عزت سے کمرے میں لے آؤ۔"

پھر میں نے فوراً ہی اپنے عقب میں ایک اجنبی آواز سنی۔ "تم تینوں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ....." جملہ دھمکی آمیز مگر لہجہ نرم تھا۔

وہ دو آدمی تھے جن کے چہروں پر نقابیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے کے ہاتھ میں آٹو میٹک رائفل تھی۔

میری طرف دیکھتے ہوئے کہا گیا "اپنا یہ ننھا سا پستول اپنی جیب میں ڈال لو۔ ہم دونوں بلٹ پروف ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ راجو نے مارشل آرٹس میں ایسا نہ جانے کیا کچھ سیکھ لیا تھا کہ آتشیں ہتھیاروں سے لیس دو تین افراد بھی قریب سے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ برق سرعت سے حرکت کر کے وہ مخالفین کو خاک چٹوا دیتا تھا۔ لیکن اسی صورت میں جب وہ اکیلا ہو یہاں تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کسی طرح اپنا بچاؤ تو کر لیتا لیکن میں زخمی بھی ہو سکتا تھا اور اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتا تھا۔

میرے اور ندرتی کے ساتھ راجو کو بھی ہاتھ اٹھانا پڑے۔ وہ دونوں نقاب پوشوں کو تیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے موقع ملنے پر وہ انہیں کچا چبا جاتا۔

"کمرے میں چلو دوستو!" ہمیں حکم دیا گیا لیکن لہجے میں ایسی نرمی تھی جیسے وہ سب کچھ نہایت دوستانہ فضا میں ہو رہا ہو۔

انگریزی میں غالباً انہی کو حکم ملا تھا کہ ہمیں "عزت" سے کمرے میں لے جایا جائے.....

میں، ندرتی اور راجو تقریباً ساتھ ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہاں میں نے ایک اور آدمی بھی دیکھا۔ وہ ایک طرف دیوار سے شانہ ٹکائے کھڑا تھا۔ اس کے انداز سے میں نے فوری طور پر قیاس کر لیا کہ وہ ریوالور والے کا ساتھی ہوگا۔

"ندرتی کی تلاشی لو....." ریوالور والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

دیوار سے ہٹ کر وہ ہمارے قریب آیا اور ندرتی کی تلاشی لینے لگا۔ ندرتی کی جیب سے ایک ریوالور نکلا تھا جو اس نے کھولا اور اس میں سے بلٹس نکال کر اپنے قبضے میں کیں اور خالی ریوالور ندرتی کی جیب میں ڈال دیا۔

اب ریوالور والا پھر فارسی بولنے لگا۔ اس نے ندرتی سے کچھ کہا تھا۔ ندرتی آگے بڑھ کر دیبارو کے قریب چلا گیا۔

ریوالور والے نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بولا۔ "تم دونوں کے ساتھ ہمارا رویہ سخت نہیں ہوگا۔ ہم یہاں قانون کے محافظوں سے تصادم نہیں چاہتے۔ گو کہ تم قانون کے محافظوں میں سے نہیں ہو لیکن ایس ڈی ایم عندلیب کے دوست ہو اور یہ....." اس نے راجو کی طرف اشارہ کیا "یہ تمہارا دوست ہے..... ہاں البتہ ایک بات ہم ضرور جانتے ہیں۔ تمہاری

دوست ایس ڈی ایم ہوتے ہوئے بھی اس معاملے میں صرف ذاتی طور پر دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے کام کررہی ہے جو پرنسز احمر کو ہم سے دور رکھنے کی کوششیں کررہے ہیں۔''

میری نظر راجو کی طرف گئی۔ احمر کے نام کے ساتھ ''پرنسز'' کا لاحقہ اسے بھی چونکا گیا تھا۔

ریوالور والے نے غالباً راجو کے چہرے کا تاثر نہیں دیکھا۔ اس کی توجہ میری طرف رہی تھی۔

''لیکن.....'' وہ کہتا رہا ''جو لوگ پرنسز احمر کو ہم سے دور رکھنے کی کوششیں کررہے ہیں، انہیں جلد یا بہ دیر اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا۔ اس لیے ہم ان کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے جس سے انہیں کوئی نقصان ہو۔ ہم اپنی ہی کوششوں سے اپنی پرنسز کو تلاش کرہی لیں گے۔ وہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں اور ہمارا مقصد بھی نیک ہے لیکن یہ لوگ.....'' ریوالور والے نے بڑی نفرت سے دیبارو اور ندرتی کی طرف دیکھا ''یہ ہماری پرنسز کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اس ناپاک مقصد میں یہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ انہی لوگوں نے گرینیڈ مار کر ایس ڈی ایم عندلیب کی کار تباہ کی تھی۔ بڑا ناز ہے انہیں اپنے ایکشن اسکواڈ پر لیکن اس وقت ہمارے آدمیوں نے چوہوں کی طرح ان کے بل تک محدود کررکھا ہے۔ ہمیں اس دوران میں۔'' ریوالور والے نے ندرتی اور دیبارو کی طرف دیکھا ''ان سے آخری مرتبہ فیصلہ کن بات کرنی ہے۔''

اس وقت میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوگیا۔ ریوالور والے کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں عندلیب ''احمر کے نام نہاد بہی خواہ'' کہتی تھی۔ ان کی ان لوگوں سے شدید مخالفت چل رہی تھی جو احمر کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

ریوالور والے سے مجھے اس کا علم ہوا تھا کہ ایکشن اسکواڈ میں پانچ آدمی تھے جن کو ان لوگوں نے کسی طرح کسی خاص جگہ تک محدود کردیا تھا۔ میں اس جگہ کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوگیا تھا کیونکہ میرے خیال کے مطابق وہ احمر کو میرے گھر سے اغوا کرچکے تھے لیکن ابھی انہیں اس کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ احمر کو ندرتی اور دیبارو تک پہنچا پاتے۔

میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ریوالور والے کو احمر کے اغوا ہوجانے کے بارے میں کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔

ریوالور والا اب ندرتی اور دیبارو سے مخاطب ہوگیا۔ اب وہ فارسی بول رہا تھا۔

آٹو میٹک رائفل والا اور اس کا ساتھی مجھے اور راجو کو اپنے اپنے نشانے پر لیے چوکس نظر آرہے تھے۔

ندرتی اور دیبارو سے ریوالور والے کی گفتگو فارسی میں ہوئی جو میری سمجھ میں تو نہیں آسکی لیکن اس کا تھوڑا بہت علم مجھے بعد میں راجو سے ہوسکتا تھا۔ میں اس گفتگو کی طرف دھیان بھی نہیں دے سکا۔ میرے خیالات کا مرکز تو صرف احمر تھی جسے اس کی بہن فرخندہ کے ساتھ اغوا کیا جاچکا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کہاں ہوں گی۔

ندرتی اور دیبارو سے باتیں کرتے کرتے یکایک ریوالور والے نے ایسا منہ بنالیا جیسے وہ گفتگو اس کے لیے مایوس کن اور بے نتیجہ رہی ہو..... اس نے کچھ سوچتے ہوئے چند لمحے تک سر ہلایا' پھر ندرتی اور دیبارو سے ایک مختصر جملہ کہہ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ کہتا لیکن اس سے پہلے میں بول پڑا۔

''ایکشن اسکواڈ والوں کو تمہارے آدمیوں نے کہاں گھیر رکھا ہے؟''

ریوالور والا مسکرایا..... ''ہم یہاں سے جائیں گے تو..... میرا مطلب ہے..... یہاں سے ہمارے جاتے ہی وہ گھیراؤ ختم کردیا جائے گا۔''

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایکشن اسکواڈ کے لوگ اس وقت کہاں ہیں؟''

''نہیں دوست!'' ریوالور والے نے نفی میں سر ہلایا..... ''یہ تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب تک یہ لوگ کس طرح سوچتے رہے ہیں۔'' اس نے دیبارو اور ندرتی کی طرف اشارہ کیا ''اور یہ بھی نہیں جانتا کہ آئندہ ان کی سوچ کیا ہوگی لیکن ہمارا اصول ہے کہ ہم اپنا جھگڑا آپس میں ہی طے کریں، کسی تیسرے فریق کو بیچ میں نہ لائیں.....''

''اگر تم اپنی پرنسز کی بھلائی چاہتے ہو تو ہمارے حلیف بن جاؤ ورنہ یہ لوگ کسی وقت بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔''

''ناممکن.....'' ریوالور والے نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اس کے غیر معاندانہ رویے کے باعث مجھے اس سے بات کرنے کی ہمت ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''کسی کا یہ قول تم نے نہیں سنا کہ دنیا میں ناممکن کچھ نہیں..... البتہ میں..... کم از کم ضرور اس انداز میں سوچتا

ہوں کہ جسے ناممکن سمجھا جائے۔ اس میں برائے نام سا امکان تو بہرحال ہوتا ہے۔''

''تو پھر.....'' ریوالور والے کی آنکھوں میں چنگاریاں سی چمکیں۔ ''اگر یہ لوگ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوئے تو ان کا ایسا عبرت ناک حشر ہوگا کہ لوگ دیکھ کر تو کیا، سن کر بھی کانپ جائیں گے۔''

''ان کا انجام کتنا بھی دردناک یا عبرت ناک ہو، وہ مقصد تو پورا نہیں ہوسکے گا نا جو تم چاہتے ہو!''

''بات تمہاری بالکل غلط بھی نہیں۔'' ریوالور والے کے لہجے میں تفکر اور سنجیدگی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے راجو کی طرف دیکھا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میری ان باتوں کا اس پر کیا اثر ہورہا ہے لیکن میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ مجھے بس یہ محسوس ہوا کہ وہ بے قرار سا تھا۔ غالباً وہ ان لوگوں کے خلاف کچھ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اس کی کسی حرکت کی وجہ سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے.....

میں نے ریوالور والے سے کہا ''اگر میری بات بالکل غلط بھی نہیں تو ہمارے حلیف بن جاؤ.....''

''اس میں ہمارے لیے بہتری کی کوئی صورت نہیں بنتی۔'' ریوالور والے نے کہا ''مجھے یقین ہے، اگر تمہیں پرنسز کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہوگا تو تم ہمیں نہیں بتاؤ گے اور معلوم کرنے کے لیے ہم تم پر جبر بھی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم خود ہی کسی نہ کسی طرح اپنی پرنسز کو تلاش کرلیں گے۔ ہاں اس وقت یہ ضرور اچھا ہوا کہ تم ہمیں مل گئے۔ تم ذاتی طور پر ہمارا یہ پیغام مسز خان اور اپنی دوست ایس ڈی ایم عندلیب کو ضرور پہنچا دینا کہ پرنسز کو ہم سے دور رکھنے کی ان کی کوششیں پرنسز کے حق میں نہیں ہیں۔ انہیں ٹھنڈے دل سے ہمارے مقصد پر غور کرنا چاہیے۔''

ریوالور والے کا ساتھی شروع سے اب تک کمرے ہی میں تھا لیکن میں نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اب وہ یک بارگی ریوالور والے سے مخاطب ہوا۔ اس نے فارسی میں کچھ کہا تھا۔ اس کی بات سن کر ریوالور والے نے سر ہلایا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''تم نے نہ جانے کہاں کی باتیں چھیڑ دیں۔'' اس نے ندرتی اور دیبارو کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا ''ان سے بات ختم کرنے کے بعد میں تم سے پوچھنے ہی والا تھا کہ تم اپنے دوست کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہو؟''

میں اسے حقیقت بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ کسی ایکشن اسکواڈ کے لوگوں تک پہنچا جائے یا جب وہ لوگ احمر اور فرخندہ کو دیبارو اور ندرتی کے پاس لائیں تو میں راجو کی مدد سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔ یعنی احمر اور فرخندہ کو ان لوگوں سے چھڑا لیا جائے۔

''جواب نہیں دیا تم نے!'' ریوالور والا مجھے گھور رہا تھا۔

مجھے جواب دینے میں شدید دشواری پیش آرہی تھی۔ حقیقت چھپانے کی صورت میں بھی کچھ تو کہنا ہی پڑتا' یا بس خاموشی اختیار کرلی جاتی۔ یہ تو ریوالور والا کہہ بھی چکا تھا کہ وہ لوگ ہم پر کسی قسم کا جبر کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

ندرتی اور دیبارو کے چہروں سے پریشانی اور غور و فکر کا اظہار ہورہا تھا۔ وہ کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی مجھے یا ریوالور والے کی طرف دیکھتے تھے۔

ان دونوں پر ایک نظر ڈالتے ہی میرے دماغ میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میں نے ریوالور والے سے کہا ''ہمیں ان سے سے تبریزی اور اس کی بیوی کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ ابھی ایک رات پہلے بھی میرا یہ ساتھی یہاں آکر دیبارو کی پٹائی کرچکا ہے۔''

''اوہ.....!'' ریوالور والا دیبارو کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے ہنس پڑا..... ''تو وہ ڈاکے والی رپورٹ من گھڑت تھی!''

''قطعی.....'' میں نے کہا ''میرے ساتھی نے اس گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔ یہاں کا چپا چپا دیکھ ڈالا تھا۔ تبریزی اور اس کی بیوی کا پتا نہیں لگ سکا۔''

''تو آج تم دونوں ہی ان دونوں کی بوٹیاں ادھیڑنے آئے تھے!'' ریوالور والا پھر ہنسا۔

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا' پھر بولا ''لیکن اگر تمہیں ان دونوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو..... میرا مطلب ہے، تبریزی اور اس کی بیوی کے بارے میں!''

''معلوم تو ہمیں سب کچھ ہے۔'' ریوالور والے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ''لیکن تمہیں کم از کم ہم سے کچھ نہیں معلوم ہوسکتا۔ میں ابھی تم سے کہہ چکا ہوں۔ ہمارے کچھ اصول ہیں۔ ہمارے اپنے جھگڑے ہیں۔ کم از کم ہم ان لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے لیے کسی اور کا ساتھ نہیں دیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اس طرح کہا جیسے کسی اطمینان بخش صورتِ حال میں ہوں۔ ''شاید تم نے کہا تھا کہ

اب تمہیں یہاں سے جانا ہے!''

''ہاں ..... یقیناً ..... لیکن اس کے ساتھ ہی تم دونوں کو بھی یہاں سے جانا ہوگا۔''

''مجھے ان سے کوئی ہم دردی نہیں، لیکن یہ بات بھی ہمارے اصول کے خلاف ہوگی کہ ہماری وجہ سے یہ دونوں تمہارے رحم وکرم پر رہ جائیں۔''

''تمہاری وجہ سے کیوں .....؟ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو بھی .....''

''نہیں .....'' ریوالور والے نے میری بات کاٹی .....''اگر ہم نہ ہوتے تو صورتِ حال شاید ایسی نہ ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ندرتی کو تم نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا لیکن یہ ناممکن تو نہیں کہ دیبارو کسی وجہ سے چوکنا ہو جاتا اور پیچھے سے گولیاں چلا کر تم دونوں کو ٹھنڈا کر دیتا۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوتا!'' میں نے زور دیا۔

''جو وقت گزرنا تھا' وہ گزر چکا۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا .....''

ریوالور والے کی اس بحث نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد دیبارو اور ندرتی ہمارے قبضے میں ہوں گے۔ پھر جب احمر اور فرخندہ یہاں لائی جاتیں تو انہیں چھڑانے کے لیے میں اور راجو کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن ریوالور والا چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔

ریوالور والے کے ساتھی نے پھر اس سے فارسی میں کچھ کہا۔ میری سمجھ میں اتنا آیا کہ ریوالور والے کو ''ہمدانی'' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا لیکن یہ اس کا نام نہیں ہو سکتا تھا۔ ''ہمدان'' ایران کے ایک شہر کا نام ہے۔ اس کے ساتھی اسے غالباً اسی نسبت سے مخاطب کرتے ہوں گے۔

ہمدانی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے بولا ''تمہیں یہاں سے جانا ہی ہوگا۔'' اس نے رائفل والے اور اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرے یہ آدمی تم دونوں کو باہر تک بلکہ تمہاری کار تک چھوڑ آئیں گے۔ اس کے بعد تم پھر کسی طرح یہاں آؤ اور پھر ندرتی یا دیبارو کے ساتھ کچھ بھی کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔''

خیالات میرے دماغ میں تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ میں اور راجو یہاں سے ایک بار نکل جاتے تو پھر دیبارو اور ندرتی پر دوبارہ ہاتھ ڈالنے میں خاصی تاخیر بھی ہو سکتی تھی جو احمر اور فرخندہ کے لیے خطرناک ثابت ہوتی۔ اس صورت میں ان دونوں کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی لیکن اگر وہ دونوں ''ہمدانی گروپ'' کے قبضے میں چلی جاتیں تو کم از کم ان کی زندگی کے لیے غالباً کوئی خطرہ نہیں تھا بعد میں ان دونوں کو ''ہمدانی گروپ'' سے چھڑانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

''کیا تم نے سنا نہیں؟'' ہمدانی نے مجھ سے بہ دستور نرم لہجے میں کہا۔

''نہیں .....'' آخر میں نے فیصلہ کرلیا۔ ''ہم یہاں سے چلے گئے تو پھر تمہاری پرنسز احمر کی زندگی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکے گا۔''

ہمدانی اور اس کا ساتھی چونکا اور راجو مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا!'' ہمدانی نے تیزی سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگوں نے ان کے ایکشن اسکواڈ کو کہاں بے بس کر رکھا ہے لیکن میں ایک بات ضرور کہہ سکتا ہوں۔ جیسے ہی ان کی بے بسی ختم ہوگی، وہ تمہاری پرنسز کو ندرتی اور دیبارو کے سامنے پیش کر دیں گے۔''

ہمدانی اور اس کے ساتھی نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔

میں نے اس وقت دیبارو اور ندرتی کو کچھ مضطرب دیکھا۔

میں ہمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''جہاں تک مجھے معلوم ہے، ایکشن اسکواڈ والے از خود تمہاری پرنسز کو ختم نہیں کر سکتے۔ غالباً ان کی ہائی کمان چاہتی ہے کہ تمہاری پرنسز کی ہلاکت کی گواہی انہیں ندرتی اور دیبارو سے ملے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ہمدانی پھر تیزی سے بولا ''تمہیں کیسے معلوم کہ ایکشن اسکواڈ والوں نے پرنسز کو اغوا کرلیا ہے؟''

''میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ ہم یہاں تبریزی اور اس کی بیوی کی تلاش میں نہیں آئے تھے۔ جب تم لوگوں نے ایکشن اسکواڈ کو کسی جگہ بے بس کیا ہے، وہ اس سے پہلے تمہاری پرنسز کو اغوا کر چکے تھے۔''

''یہ سب کچھ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ہمدانی نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں تمہیں کیوں اور کیسے کا جواب نہیں دوں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا ''جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، تو وہ بھی اس لیے کہ تم اپنی پرنسز کو بچانے کا موقع مجھے نہیں دے رہے

ہو۔ تو پھر اب تم ہی کچھ کرو۔ ان لوگوں سے آزاد کراؤ اپنی پرنسز کو۔ ہاں ایک بات میں تمہیں اور بتا سکتا ہوں۔ تمہاری پرنسز کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی۔ ایکشن اسکواڈ والوں نے اسے بھی اغوا کرلیا ہے۔ میں یہاں اسی لیے آیا تھا کہ جب وہ لوگ ان دونوں کو یہاں لائیں تو انہیں چھڑانے کی کوشش کی جائے۔''

ہمدانی نے یکا یک سر گھما کر تیز نگاہوں سے ندرتی اور دیبارو کی طرف دیکھا جنہوں نے اب اپنے چہروں کو بے تاثر بنا لیا تھا۔ ہمدانی نے فارسی میں ان سے کچھ کہا۔ دیبارو نے جواب دیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ہمدانی فوراً اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ہمدانی کے ساتھی کو ''زنجانی'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اس طرح مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا ''زنجان'' بھی ایران کا ایک شہر ہے۔ اس شخص کو ایسی نسبت سے پکارا جاتا ہوگا۔

اگر مجھے ان دونوں کے اصل نام معلوم ہو جاتے تو میں اسی وقت ان کے انفرادی عدد بھی جان لیتا اور جو لوگ مجھ سے متعلق تھے، ان کے اعداد سے ان دونوں کے اعداد کی مطابقت یا مخالفت کا اندازہ لگانے میں بھی خاصی آسانی ہو سکتی تھی۔

ان دونوں کی گفتگو کے دوران میں میرے قریب کھڑا ہوا راجو میری طرف تھوڑا سا جھک کر بڑبڑایا۔ ''تیری وجہ سے ہاتھ بندھ گئے ہیں میرے ورنہ .....''

ہمدانی نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ راجو پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد وہ مجھ سے بولا ''کیا کہہ رہا ہے تمہارا ساتھی؟''

''میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے، اس سے میرے ساتھی کو اتفاق نہیں ہے۔''

ہمدانی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''مجھے نہیں معلوم کہ تم نے صحیح جواب دیا ہے یا جھوٹ بولا ہو، لیکن بات میں پھر اچھی طرح واضح کر دیتا ہوں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے لیکن اگر تمہاری ہی طرف سے کوئی شرارت ہوئی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہماری فکر کرنے کے بجائے تمہیں اپنی پرنسز کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''وہ تو ہم سوچ ہی رہے ہیں لیکن .....'' ہمدانی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور فارسی میں رائفل والے سے کچھ کہنے لگا۔ اس نے رائفل والے کو تاکید کی تھی کہ راجو کی حرکات وسکنات پر خاص طور پر کڑی نظر رکھی جائے۔

یہ بات مجھے بعد میں راجو نے بتائی تھی ..... تھوڑی بہت فارسی وہ سمجھ لیتا تھا اور اس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔

''پرنسز کے بارے میں حقیقت ہمیں ابھی معلوم ہو جائے گی۔'' ہمدانی نے مجھ سے کہتے ہوئے اپنی جیب سے ایک موبائل نکالا ''یہ دیبارو سے لے کر میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور اسے پاور آف بھی کر دیا تھا تاکہ ایکشن اسکواڈ کے لوگ اس سے رابطہ نہ کر سکیں۔''

مجھے فوراً خیال آیا کہ موبائل تو ندرتی کے پاس بھی ہوگا۔ ایکشن اسکواڈ والوں نے کیا اس سے رابطہ نہیں کیا ہوگا؟

ہمدانی نے موبائل دیبارو کو دیتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔ دیبارو کے چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہونے لگی، کچھ ایسا ہی تاثر ندرتی کے چہرے پر بھی نظر آیا۔ اسی وقت زنجانی نے دیبارو کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد سخت لہجے میں کچھ کہا۔ اس کی بات سے ایک نیا نام میرے علم میں آیا۔

کمانڈر بازرگان!

میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا' کیا یہ ایکشن اسکواڈ کے کمانڈر کا نام ہے .....؟ زنجانی نے فارسی میں اس کے لیے ''کمان دار'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

زنجانی کی کسی شدید دھمکی کے بعد دیبارو اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ قائم ہونے تک زنجانی اس سے کچھ کہتا رہا۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ دیبارو کو کچھ ہدایات دے رہا ہوگا۔ بعد میں راجو نے میرے اس قیاس کی تصدیق بھی کی تھی۔

موبائل پر رابطہ ہوا تو دوسری طرف سے ''بزر'' کی سی آواز آنے لگی۔ موبائل کا اسپیکر کھلا ہوا تھا۔ زنجانی نے دیبارو کو تاکید اسی لیے کی ہوگی کہ دوسری طرف سے کہی جانے والی باتیں بھی سنی جا سکیں۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ نتیجے کا منتظر رہا۔ ابھی سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ ہمدانی اور زنجانی اگر دیبارو کے ذریعے احمر اور فرخندہ کو یہاں بلوانے میں کامیاب ہو جاتے تو صورتِ حال کیا بنتی؟

موبائل پر دوسری طرف سے ایک آواز سنائی دی۔

پھر جو گفتگو شروع ہوئی، اس سے مجھے ایک اندازہ تو یہ ہوا کہ دوسری طرف سے بولنے والے کا نام بازرگان ہی تھا۔ اور دوسرا اندازہ میں نے یہ لگایا کہ کمانڈر بازرگان کے

لہجے میں پریشانی اور ہیجان کا اظہار ہو رہا تھا۔

زنجانی اور ہمدانی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نظر آئی لیکن چہروں پر فکر مندی کا تاثر بھی تھا۔ احمر کا اغوا ان کے لیے بھی لمحۂ فکریہ تھا.....

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ راجو پوری طرح دیبارو اور بازرگان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کی حد درجہ کوشش ہوگی کہ وہ ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ باتیں سمجھ سکے۔

دیبارو اور موبائل پر سنائی دینے والی، بازرگان کی آوازوں کے علاوہ کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ اس قسم کے سوالات نے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہی رکھیں۔

یکا یک مجھے ایسا لگا جیسے زنجانی اور ہمدانی کے چہروں پر مایوسی کا تاثر پنپنے لگا ہو۔ میں نے فوراً راجو کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے سے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔

آخر ہمدانی کے اشارے پر دیبارو نے موبائل آف کر دیا اور ہمدانی مجھے گھورتے ہوئے بولا ''یہ جھوٹ بولنے کا مقصد؟''

''کیا مطلب؟''

''پرنسز کو ان لوگوں نے اغوا نہیں کیا۔''

''دیبارو سے جھوٹ بولا گیا ہوگا۔''

''نہیں.....'' ہمدانی نے زور دے کر کہا۔ ''دیبارو نے ہماری ہدایات کے مطابق جس طرح بات کی تھی، اس سے بالکل واضح ہوگیا ہے کہ بازرگان نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

مجھے یقین ہوگیا کہ ہمدانی اور زنجانی نچا کھا گئے تھے۔ میرے لیے تو یہ بالکل سامنے کی بات تھی کہ احمر کو اغوا کروانے والے ہمدانی، زنجانی یا ان کے گروپ کے لوگ نہیں تھے۔ ایسی صورت میں ان کا اغوا دیبارو، ندرتی یا ان کے ایکشن اسکواڈ کے لوگ ہی کر سکتے تھے۔ ابھی تک ایسا کوئی تیسرا فریق سامنے نہیں آیا تھا جسے احمر کے اغوا سے دلچسپی ہو یا احمر سے کوئی پرخاش ہو.....

میں نے ہمدانی سے کہا ''اگر میں فرض کرلوں کہ تم نے دھوکا نہیں کھایا ہے تو پھر آخر تمہاری پرنسز کو کس نے اغوا کیا؟''

''تم آخر یہ اصرار کیوں کر رہے ہو کہ پرنسز کو اغوا کیا جا چکا ہے۔''

''کیوں اور کیسے کا جواب تو میں نہیں دے سکتا۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، لیکن حقیقت وہی ہے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''اس پر کیسے یقین کیا جائے؟'' زنجانی مجھے تیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''میں تم لوگوں سے یہ جھوٹ کیوں بولوں گا!'' میں نے کہا ''اور کیا میں اس لیے یہاں آیا تھا کہ تم دونوں مجھے یہاں مل جاؤ گے لہٰذا میں نے پہلے ہی سے سوچ لیا تھا کہ میں تم دونوں سے یہ جھوٹ بولوں گا۔''

میرا یہ جواب ایسا تھا کہ زنجانی اور ہمدانی متفکر انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ندرتی اور دیبارو سپاٹ چہروں کے ساتھ بیٹھے ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں ہمدانی سے بولا..... ''بہتر ہوگا کہ تم لوگ ہم دونوں کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ندرتی ہو یا دیبارو، یا ان کا کمانڈر بازرگان، یہ لوگ کم از کم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکیں گے۔''

''گویا ہم بے وقوف ہیں.....!'' ہمدانی نے مجھے گھورتے ہوئے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر زنجانی بھی بول پڑا۔ ''تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے، یہ ہم ابھی تو نہیں سمجھ سکتے لیکن سمجھ ہی لیں گے۔ فی الحال تو تم دونوں یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔''

''لیکن.....'' میں مضطرب ہوگیا۔

''بس.....!'' ہمدانی نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ ''اگر تم دونوں یہاں سے نہیں جاؤ گے تو مجبوراً ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم تمہیں بے ہوش کر کے یہاں سے لے جائیں گے اور کسی سڑک پر ڈال دیں گے۔ جب تمہیں ہوش آئے گا تو خود ہی اٹھ کر اپنے اپنے گھر چلے جاؤ گے۔''

زنجانی فارسی میں رائفل والے سے کچھ کہنے لگا۔ میں نے راجو کی طرف دیکھا تو وہ دھیمی آواز میں بولا..... ''نکل چلو.....''

میری بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ دیبارو اور کمانڈر بازرگان کی باتوں سے ہمدانی اور اس کے ساتھی دھوکا کھا گئے تھے۔ اب حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش صرف مجھ سے ہی ممکن ہوتی لیکن فی الحال ندرتی اور دیبارو ہمارے قبضے میں نہ رہتے تو بعد میں یہ معاملہ بہت الجھ جاتا۔

ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں آدمی آگے آئے۔ ان میں سے ایک ریوالور کی نال میرے سر سے لگ گئی۔ دوسرے نے اپنی رائفل کی نال راجو کی کمر سے لگا دی تھی۔

''میں اب دس تک گنوں گا۔'' زنجانی بولا۔

''ضرورت نہیں اس کی، ہم جا رہے ہیں۔'' راجو بولا اور پھر اس نے تلخ لہجے میں کہا ''میری مجبوری یہ ہے کہ میرے ساتھی کے لیے خرابی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے ورنہ میں دیکھتا کہ یہ رائفل میرا کیا بگاڑتی.....''

ہمدانی نے کچھ طنزیہ سے انداز میں ہنس کر راجو کی طرف دیکھا۔

''چل یارا!'' راجو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے دروازے کی طرف مڑا.....

رائفل والے نے بڑی ہوشیاری اور تیزی سے اپنی پوزیشن درست کی تھی اور راجو کے عقب میں ہی رہا تھا۔ جب میں مڑا تو ریوالور والا بھی میرے پیچھے آ گیا۔

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہر قدم کے ساتھ میرے ہیجان میں اضافہ ہونے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں دھیرے دھیرے احمر سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ یہاں سے جانے کے بعد میں شاید اسے پھر کبھی نہ پا سکتا۔ یہ احساس میرے لیے بڑا اذیت ناک تھا، احمر تو میرے لیے جیسے ایک روح تھی جس کے بغیر میرا یہ جسم بے کار تھا۔

کیا اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا؟ اپنے دماغ میں اس سوال کی گونج کے ساتھ میں نے کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھا جس کی رائفل راجو کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔

راجو نے غالباً میری ہیجانی کیفیت محسوس کر لی۔

''سکون.....! سکون یارا.....!'' وہ بڑبڑایا.....''تو کیا کر سکتا ہے ان کا' جب میں ہی بے بسی کا شکار ہو گیا ہوں' تیری ہی وجہ سے!''

''احمر شاید پھر کبھی نہیں مل سکے گی راجو!'' میری آواز ایسی تھی جیسے آنسو میری آنکھوں کی طرف رخ کرنے کے بجائے میرے حلق کی طرف پھسل گئے ہوں۔

''تیرے جذبات کا مجھے خوب اندازہ ہے یارا.....! لیکن آس تو اسی وقت تک بندھی رہ سکتی ہے جب انسان زندہ رہے۔'' راجو نے کہا.....

ہم اس وقت کمرے سے نکل آئے تھے۔

''زندگی تو اب بے کار ہو جائے گی میرے لیے!'' میں نے کہا۔

''دل سے مت سوچ.....! دل تو بس کھپ ڈالتا ہے۔''

میں چپ رہ گیا۔ میرا دماغ راجو کی یہ بات قبول کرنے لگا تھا کہ زندگی رہے گی تو کچھ امید، کچھ آس بندھی رہے گی۔ جذبات کے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں ڈالنے سے تو سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا، مجھے واقعی دل سے نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ یہاں سے جانے کا مطلب یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ یہ احمر کی زندگی کا خاتمہ ہو گا..... بات راجو ہی کی ٹھیک تھی کہ جب تک سانس، تب تک آس!

میں جذبات کے دھارے کی زد سے نکلنے لگا..... سوچ کی لہریں اپنا سفر دماغ کی طرف سے شروع کرنے لگیں۔

عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر نکلنے کے بعد ہمدانی کے دونوں آدمی جب ہمیں پھاٹک کی طرف لے جانے لگے تو مجھے حیرت ہوئی۔

''راجو.....'' میں آہستہ سے بولا ''کیا ان لوگوں کو چوکی دار کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہے.....؟''

''نہیں.....'' راجو نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اس عمارت میں ان کے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو ہماری نظر میں آ چکے ہیں۔''

''کیا مطلب!''

''جب ان دونوں سے.....'' راجو کا اشارہ ان آدمیوں کی طرف تھا جو رائفل اور ریوالور کے ساتھ ہمارے پیچھے تھے۔ ''میرا مطلب ہے..... جب انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ یہ ہمیں ہماری گاڑی تک لے جا کر چھوڑیں تو ان سے چوکی دار کے بارے میں بھی کچھ کہا گیا تھا۔ ہمدانی کی وہ بات ان لوگوں نے بھی سنی ہو گی جو اس کمرے میں نہیں تھے۔''

''تو پھر.....؟''

''عقل سے کام لے یارا!'' راجو کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی ''کسی بات سے کوئی اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نہیں دیکھ سکے، انہوں نے ہی چوکی دار کا کوئی ایسا بندوبست کیا ہو گا کہ وہ اس وقت کوئی رکاوٹ نہیں بن سکے۔''

''کیا مار دیا ہو گا اسے؟''

''نہیں.....'' راجو نے بڑی یقین سے کہا ''یا تو بے ہوش کر دیا ہو گا یا باندھ کر ڈال دیا ہو گا۔ یہ اس قسم کے لوگ نہیں معلوم ہوتے جن کے لیے قتل کرنا کوئی معمولی بات ہوتی ہے۔''

''لیکن جب ہم آئے تھے' اس وقت تو ندرتی کی کار کے لیے پھاٹک کھولنے والا چوکی دار تھا..... میرا مطلب ہے..... خود یہ لوگ کس طرح عمارت میں گھسے ہوں گے؟''

چوکی دار ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنا..... وہ تو شاید بے خبر ہی تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔''

''تو ایک بات بھول رہا ہے۔'' راجو نے کہا ''دیبارو کی پٹائی کرنے کے لیے میں بھی ایک رات اس عمارت میں گھس چکا ہوں اور چوکی دار قطعی بے خبر رہا ہے۔''

میرا دماغ الجھنے لگا، میں راجو سے یہ سوال بھی نہیں کر سکا کہ وہ اس عمارت میں کس طرح گھسا تھا؟

جلد ہی ہم پھاٹک سے باہر آ گئے۔ چوکی دار کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ہمارے پیچھے آنے والے دونوں آدمی خاموشی سے ہماری باتیں سنتے رہے تھے۔ غالباً وہ بھی فارسی بولنے والے لوگ ہوں گے جنہیں اردو نہیں آتی ہو گی۔

پھاٹک سے باہر نکلتے ہی رائفل والا انگریزی میں بولا ''کہاں ہے تم لوگوں کی کار.....؟''

''اس طرف گلی میں.....'' راجو نے جواب دیتے ہوئے اشارہ بھی کیا۔

''ٹھیک ہے، چلتے رہو.....''

اندھیرے اور سناٹے میں ہم گلی کی طرف بڑھنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے پیچھے لگے ہوئے یہ دونوں آدمی اس وقت واپس جائیں گے جب ہم کار اسٹارٹ کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

کیا اس وقت کچھ کیا جا سکتا ہے؟ میں نے ایک بار پھر سوچا۔

راجو تو اپنے پاس آتشیں ہتھیار رکھتا ہی نہیں تھا لیکن میرا چھوٹا سا اسمتھ اینڈ ویسن اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔

لیکن اس سے تو کچھ نہیں ہو گا' میں نے سوچا۔ میں گولیاں چلا کر دو آدمیوں کا قاتل تو بن نہیں سکتا تھا۔ بس ہوائی فائرنگ کر کے ان دونوں کو بھگایا جا سکتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا..... فائرنگ کی آواز آس پاس رہنے والوں کو جگا سکتی تھی۔ اگر کوئی خوف سے باہر نہ نکلتا تو بھی کسی کھڑکی سے جھانک تو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر ہم پھر ندرتی اور دیبارو کے گھر میں گھستے تو ہمیں دیکھا جا سکتا تھا، اور پھر شاید یہ بھی امکان نہیں تھا کہ دیبارو اور ندرتی ہمارے نشانے میں آ جائیں۔

ہمدانی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ جس طرح عمارت میں گھسے تھے، اسی طرح باہر بھی نکل گئے ہوں گے۔

ہم گلی سے کچھ ہی دور رہ گئے تھے، ہم کسی بھی لمحے ہیڈ لائٹس کی زد میں آ سکتے تھے۔

''تیزی سے چلو.....'' رائفل والا غرایا۔

ہم نے اپنی رفتار کچھ بڑھائی۔ ہیڈ لائٹس کی زد میں آنے سے پہلے ہی ہم گلی میں داخل ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت ایسا شور ہوا جیسے قریب ہی کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا ہو۔ پھر ہم تیز روشنی میں نہا گئے۔ وہ کوئی موٹر سائیکل تھی جو نہایت تیزی رفتاری سے ہماری طرف آئی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں اور راجو بہ مشکل ہی اس کی زد پر آنے سے بچ سکے اور پھر میں دو تین ہی لمحوں کے دورانیے میں بس اتنا دیکھ سکا کہ موٹر سائیکل سوار سیاہ جیکٹ اور سیاہی مائل رنگت ہی کی چست پتلون میں تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے رنگت کا اندازہ شاید میں نہ لگا سکتا لیکن اردگرد کے ماحول پر موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کا جو انعکاس ہوا تھا، اس سے مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ اس کے سر پر مجھے ہیلمٹ بھی نظر آیا تھا۔

برق رفتار موٹر سائیکل' ہم دونوں کے پیچھے آنے والوں کے درمیان سے نکلی اور موٹر سائیکل سوار نے اپنے پیر سیدھے کرتے ہوئے ان دونوں کے سینوں پر لاتیں مارنا چاہیں۔ ان میں سے ایک تو خود کو صاف بچا گیا لیکن دوسرے کا بایاں شانہ موٹر سائیکل سوار کی زد میں آ گیا۔ لانگ فل بوٹ کی وہ ضرب، موٹر سائیکل کی رفتار کے باعث بے حد شدید تھی۔ دھکا کھا کر اس نے گرتے گرتے اپنے ریوالور سے فائر کر دیا، یا شاید ٹریگر پر اس کی انگلی بے اختیار ہی دب گئی تھی۔

موٹر سائیکل بائیں جانب مڑ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن اسی وقت کسی گاڑی کے بریک لگنے کی تیز آواز اس اندھیرے میں کسی عفریت کی چیخ کے مانند سنائی دی۔

گلی کے سامنے آ کر رکنے والی گاڑی وہی تھی جس کی ہیڈ لائٹس ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے، اس کی ہیڈ لائٹس کے انعکاس میں ہی اس کی شناخت بھی ہو گئی۔ وہ پولیس موبائل تھی۔

وزنی جوتوں کی پے در پے دھمک سنائی دی۔ پولیس والے کود کود کر موبائل سے اترے تھے۔ انہی میں سے کسی نے ایک بڑی سے ٹارچ جلائی تھی جس کی تیز روشنی میں آنکھیں ایک بار پھر چندھیا گئیں۔

''مارے گئے.....'' مجھے راجو کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

ہم اگر وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے تو یہ ہماری ایک بہت بڑی حماقت ہوتی۔ میری کار اور راجو کی

موٹر سائیکل گلی ہی میں تھی۔

چار مسلح پولیس والوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

''بس یہی دونوں ہیں سر!'' ایک آواز سنائی دی۔

ٹارچ کی روشنی میں ان لوگوں کو رائفل والا اور اس کا ساتھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ گلی میں پھیلے ہوئے اندھیرے سے انہوں نے بروقت فائدہ اٹھایا تھا اور چھلاووں کی طرح چشمِ زدن میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔

چاروں سپاہیوں کے علاوہ جو پانچواں شخص ہمارے قریب آیا، اس کی وردی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی افسر تھا۔

''کون ہو تم دونوں؟'' اس نے بڑے درشت لہجے میں پوچھا۔

ایک سپاہی نے ہم دونوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

ہمارے کسی جواب سے پہلے ہی دوسرا سوال داغا گیا ''گولی کس نے چلائی تھی؟''

''ہم نے نہیں چلائی'' راجو نے بڑے اطمینان سے کہا ''جس نے چلائی تھی، وہ اور اس کا ساتھی تو غائب ہو چکے ہیں۔'' پھر راجو کا لہجہ طنزیہ ہو گیا ''پولیس شاید صرف شریف آدمیوں ہی کو گھیر سکتی ہے۔''

''شریف!'' پولیس افسر کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا، پھر اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں سپاہیوں کے لیے حکم جاری کیا کہ ہماری تلاشی لی جائے۔

دو سپاہی میری اور راجو کی تلاشی لینے لگے۔

''یقین کیجیے پولیس آفیسر!'' میں نے نرم لہجے میں کہا ''ہم دونوں دوست شریف شہری ہیں۔ میری جیب میں یونیورسٹی کا کارڈ موجود ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کارڈ میرے پرس میں ہے۔''

میری تلاشی لینے والے سپاہی نے میری جیب سے پستول نکال لیا۔

''یہ ملا ہے سر!'' اس نے پستول اپنے افسر کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے پاس اس کا لائسنس بھی ہے جناب!'' میں نے اس وقت حد درجہ نرمی سے بات کرنا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ شاید اس طرح آسانی سے جان چھوٹ جاتی۔

''کیا لائسنس کے پستول سے فائر نہیں کیا جاتا؟'' پولیس افسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یقیناً کیا جاتا ہے، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔'' میں بدستور نرم لہجے میں بولا ''آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا پستول صرف ذاتی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔ آپ کو اس میں ایک گولی بھی کم نہیں ملے گی۔''

پولیس افسر پستول کی نال سونگھ رہا تھا۔

''یقیناً آپ کو بو بھی نہیں آئی ہوگی .....'' میں نے جلدی سے کہا ''گولی تو ہم پر چلائی گئی تھی۔''

میں نے اس وقت راجو کا شانہ بھی اس طرح تھپکا تھا جیسے اسے خاموش رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بات کرنے کے انداز میں جو سرکشی ہوتی، وہ پولیس افسر کو آپے سے باہر کر دیتی۔

دوسرے سپاہی نے اپنے افسر کو بتایا کہ راجو کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لیکن میری تلاشی لینے والے سپاہی نے میرا پرس نکال کر پولیس افسر کی طرف بڑھا دیا تھا۔

پولیس افسر نے پرس میں سے میرا یونیورسٹی کا کارڈ نکالا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں تو اب ندرتی اور دیبارو تک پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا تھا۔

''راؤ پرویز!'' پولیس افسر میرے کارڈ پر نظر جمائے ہوئے اس طرح بڑبڑایا جیسے اسے کچھ یاد آ رہا ہو۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میرے نام کے حوالے سے نجیب کے قتل کے سلسلے میں میری پیش گوئی یاد آ جائے جس کی خبر اس نے کسی اخبار میں پڑھی ہوگی' اس لیے میں جلدی سے راجو کی طرف اشارہ کر کے بولا ''میرا یہ دوست مجھے بہت دن بعد ایک جگہ اچانک مل گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ گھر چلنے کے لیے کہا۔ یہ اپنی موٹر سائیکل پر تھا اس لیے میری کار کے پیچھے آ رہا تھا۔ ایک سگنل پر ہمیں رکنا پڑا تو ایک نامعلوم آدمی میری کار میں گھس آیا اور اس کا دوسرا ساتھی میرے دوست کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ان کی ہدایت پر عمل نہ کیا گیا تو وہ ہمیں گولی مار دیں گے۔ اس طرح وہ دونوں ہمیں اس گلی تک لائے۔ یہاں ہماری گاڑیاں رکوائی گئیں۔ یہاں پہنچنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ ہمیں لوٹنا چاہتے تھے، دراصل میں ایک پیٹرول پمپ پر رکا تھا جہاں ان دونوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ میرے پرس میں خاصی بڑی رقم ہے۔ غالباً انہوں نے سوچا ہو کہ میرے دوست کے پاس بھی کوئی بڑی رقم ہونی چاہیے۔ اس گلی میں وہ ہمیں لوٹ کر یقیناً یہاں سے فرار ہو جاتے مگر اسی وقت کسی طرف سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اس گلی میں داخل ہوئی۔ ہم بہ مشکل اس کی زد سے بچ سکے۔ ان دونوں میں سے ایک تو شاید اس موٹر سائیکل سے ٹکرا بھی گیا تھا اور اسی نے فائر بھی کیا تھا۔ شاید موٹر سائیکل والے ہی پر کیا ہو لیکن اس کا نشانہ یقیناً خطا گیا ہوگا۔ موٹر سائیکل والا یہاں سے نکل ہی گیا۔''

یہ کہانی اچانک ہی میرے دماغ میں ابھری تھی اور میں پولیس افسر کو سناتا چلا گیا تھا۔

''موٹر سائیکل والا تو خیر بچ کر نہیں جا سکے گا۔'' پولیس افسر کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ ''وائرلیس پر آس پاس کی سڑکوں پر پٹرولنگ کاروں کو اس کی اطلاع دے دی گئی ہے۔'' اس نے میرا کارڈ میرے پرس میں رکھ کر میری طرف بڑھایا ''لیکن ابھی میں آپ دونوں کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ اس واقعے کی پوری رپورٹ درج کرانا ہوگی۔ آپ کا پستول وہیں چل کر واپس کیا جائے گا۔ اس وقت تک شاید اس موٹر سائیکل والے کو بھی پکڑ لیا جائے۔ آپ دونوں کے بارے میں بھی میں اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔''

اس وقت میں نے لمحوں میں فیصلہ کیا کہ پولیس افسر کی بات مان لی جائے۔ بحث تکرار میں اس کا رویہ پھر بگڑ سکتا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد کسی بہانے اس پولیس افسر سے دور رہتے ہوئے موبائل پر عندلیب سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر اس سے رابطہ کرنے میں مجھے ایک اندیشہ تھا۔ ہم کچھ ایسے حالات میں پولیس کے ہاتھ لگے تھے کہ ہمیں چھڑانے کی کوشش میں عندلیب کی پوزیشن پر کوئی حرف آ سکتا تھا۔ میں نے کم از کم اس وقت اسی انداز میں سوچا اور پولیس افسر سے کہا کہ ہمیں پولیس اسٹیشن چلنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

''تو پھر پولیس موبائل میں بیٹھ جائیے!''

''لیکن .....'' میں نے اپنی کار اور راجو کی موٹر سائیکل کی طرف دیکھا۔

''گاڑیوں کی فکر نہ کیجیے۔ آپ دونوں ان کی چابیاں ہمیں دے دیں۔ میرے آدمی یہ گاڑیاں پولیس اسٹیشن لے آئیں گے۔''

میں سمجھ گیا کہ نرم پڑ جانے کے باوجود پولیس افسر ابھی ہماری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

میں نے راجو سے اس کی موٹر سائیکل کی چابی مانگی جو اس نے مجھے دے تو دی لیکن انداز ایسا تھا جیسے اسے یہ سب کچھ بہت گراں گزر رہا ہو۔

میں نے اپنی کار اور موٹر سائیکل کی چابیاں پولیس افسر کے حوالے کر دیں۔

اس دوران میں دیگر خیالات بھی میرے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔ احمر کے لیے تو میں بہت زیادہ فکرمند تھا ہی لیکن ندرتی، دیبارو، ہمدانی، زنجانی اور کمانڈر بازرگان کی شخصیتیں بھی میرے دماغ میں بہت سے سوالات کی ایک سائیکل سی بنائے ہوئے تھیں اور وہ نامعلوم موٹر سائیکل سوار تو ایک بہت بڑی الجھن تھی جو غالباً اس گلی میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہم نے گلی میں داخل ہونے کے بعد ہی اس کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ پھر اس کی رفتار بڑی تیزی سے بڑھا کر اس طرح ہمارے اوپر لایا گیا تھا جیسے اس کا مقصد ہی یہ ہو کہ چاروں افراد اس کے ٹکراؤ سے اِدھر اُدھر جا گریں۔ احتمال تھا کہ اس ٹکراؤ سے ہم خاصے زخمی ہو جاتے۔

میں اندازہ لگانے سے بھی قاصر رہا کہ یہ حرکت کون کر سکتا تھا۔ موٹر سائیکل سوار کی شخصیت میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھی۔

اس سوچ بچار میں اس طرف دھیان ہی نہیں جا سکا کہ ہم کب پولیس موبائل میں بیٹھے تھے اور وہ کب وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

میری کار اور راجو کی موٹر سائیکلیں، موبائل کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں جنہیں وہ پولیس والے چلا رہے تھے۔

پولیس افسر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھنے کے بجائے، پچھلے حصے میں ہمارے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

وہ بولا ''میں چاہتا ہوں کہ پولیس اسٹیشن پہنچنے تک آپ سے کچھ سوالات کر لوں۔''

''ضرور .....'' میں نے ماحول خوشگوار رکھنے کے لیے کہا ''یہ تو ہمارا فرض ہے کہ اس قسم کے معاملات میں قانون سے بھرپور تعاون کریں۔''

''آپ کے یہ دوست .....'' پولیس افسر نے راجو کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان کی شہرت راجو کے نام سے ہے نا .....؟''

اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں تو اس خیال سے خاصا مطمئن تھا کہ اس پولیس افسر اور دیگر پولیس والوں میں سے کسی نے راجو کو نہیں پہچانا تھا۔ اگرچہ کچھ نامعلوم پولیس والوں سے راجو کے اچھے خاصے تعلقات تھے لیکن محکمۂ پولیس کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد راجو کو نہ صرف پہچانتی تھی بلکہ اس کے بارے میں ان کے خیالات بھی اچھے نہیں تھے۔

پولیس افسر کے اس سوال سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ میری طرف سے زیادہ مطمئن کیوں نہیں تھا۔

''جی ہاں.....'' میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''مجھے اسی پر تعجب ہے کہ یونیورسٹی کا ایک طالب ایک ایسے شخص کا دوست ہے۔'' پولیس افسر نے کہا۔

''کیسے شخص کا!'' راجو تیکھے لہجے میں بول پڑا ''کیا شہر کے کسی تھانے میں میرے خلاف کوئی ایف آئی آر درج کرائی گئی ہے؟''

پولیس افسر نے اسے گھور کر دیکھا ''ایف آئی آر درج نہ ہونے کے باوجود تنگنۂ پولیس کے بعض لوگ تمہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔''

میں نے جلدی سے راجو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا لیکن وہ خاموش نہیں رہا۔

''تو ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کا علاج کرانا چاہیے۔'' راجو نے نہایت تلخ لہجے میں کہا ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں کہ لوگ مجھے شک کی نظر سے دیکھیں۔''

میں نے پولیس افسر کی پیشانی پر شکنیں پڑتی دیکھیں۔

موبائل اس وقت ایک ایسی سڑک پر دوڑ رہی تھی جہاں تیز روشنی تھی اور ٹریفک بھی رواں دواں تھا۔ میں اس روشنی میں پولیس افسر کا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ماحول خوشگوار رکھنے کی جو کوشش کی تھی اسے راجو نے چوپٹ کر دیا تھا۔

پولیس افسر اب جو کچھ بھی کہتا، نہایت تند لہجے میں کہتا لیکن اسی وقت میں نے موبائل فون کی آواز سنی۔ پولیس افسر نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا اور اسے کان سے لگاتا ہوا بولا۔

''ہیلو!'' پھر وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح الرٹ ہوگیا جیسے اچانک کوئی بڑی شخصیت اس کے سامنے آگئی ہو ''یس سر.....! میں بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر دوسری طرف کی باتیں سنتے ہوئے اس نے مجھے اور راجو کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا ''یس سر!'' وہ کچھ توقف سے بولا ''او کے سر! او..... کے۔'' اس نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اور راجو کو دیکھا۔

''کیا بات ہے آفیسر!'' میں واقعی متجسس تھا۔

پولیس افسر نے مجھے جواب دینے کے بجائے، ڈرائیونگ کرنے والے سے موبائل روکنے کے لیے کہا۔

موبائل روک دی گئی اور اس کے پیچھے میری کار اور راجو کی موٹر سائیکل بھی رک گئی۔

''اتر آیئے!'' پولیس افسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود ذرا ہی اتر گیا۔

راجو کا چہرہ مجھے اتنا سپاٹ نظر آرہا تھا جیسے صورتِ حال کی اس تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

ہم دونوں موبائل سے اتر آئے۔ پولیس افسر کے اشارے پر موٹر سائیکل چلانے والے پولیس والے نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور ہماری طرف آیا۔ اس کے پیچھے وہ پولیس والا بھی تھا جو میری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

''چابیاں.....'' پولیس افسر نے ان دونوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کار اور موٹر سائیکل کی چابیاں اسے مل گئیں۔ وہ اس نے میری طرف بڑھائیں اور بولا ''آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

میں نے اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات دیکھے اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے آفیسر! کس نے فون کیا تھا آپ کو.....؟''

''آپ نہیں جانتے.....؟'' پولیس افسر نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

غالباً اسے کسی نہ کسی حد تک یقین تھا کہ میں فون کرنے والی اس شخصیت سے واقف ہوں جس کی ہدایت پر ہمیں چھوڑا جا رہا تھا۔

''یقین کیجیے، میں واقف نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بہر حال آپ جا سکتے ہیں۔'' پولیس افسر نے کہا اور مڑ کر موبائل کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں جا بیٹھا۔

دونوں پولیس والے مجھے اور راجو کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے موبائل میں جا بیٹھے اور موبائل حرکت میں آگئی۔

''چل یارا.....!'' راجو نے ایک طویل سانس لی۔ ''اس سے تو جان چھوٹی.....''

''اسے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟'' میں راجو کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ ''وہ عندلیب تو نہیں ہو سکتی..... کسی عورت کو ''سر'' تو نہیں کہا جا سکتا۔''

''کیا اب یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ سوچنا ہے؟'' راجو نے منہ بنایا۔ اسی وقت میری جیب میں پڑا ہوا موبائل فون گنگنایا۔ موبائل کو جیب سے نکالتے ہوئے میں نے ہاتھ کی طرف بڑھا۔

موبائل پر کال کرنے والے کا جو نمبر دکھائی دیا، وہ عندلیب کا تھا۔ میں نے فوراً موبائل کان سے لگایا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، دوسری طرف سے عندلیب کی آواز سنائی دی۔

''اب یہیں کب تک کھڑے رہو گے؟''

میں نے چونک کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے حیرت سے پوچھا ''کیا تم ہمیں دیکھ رہی ہو.....؟''

''ہاں.....'' عندلیب کا جواب آیا ''فوراً اپنے گھر پہنچو۔''

''لیکن.....'' میں نے کہنا چاہا۔

عندلیب نے میری بات کاٹی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم کن حالات سے گزرے ہو۔ یقیناً تم ہیجان میں مبتلا ہوگے۔ احمر کے لیے تمہاری فکرمندی بھی قدرتی بات ہے لیکن یہ ساری باتیں فون پر نہیں کی جا سکتیں۔ فوراً اپنے گھر پہنچو، میں بھی آرہی ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

''چل.....'' میں نے موٹر سائیکل کی چابی راجو کی طرف بڑھائی۔ ''میرے گھر چل! عندلیب کا فون تھا یہ.....''

''سمجھ چکا ہوں میں۔ مجھے پہلے خیال تھا کہ پولیس والوں سے ہماری جان اسی کی وجہ سے چھوٹی ہے۔''

''مگر فون اس نے کسی اور سے کروایا تھا۔ خیر چھوڑ..... بس میرے ساتھ چل! عندلیب بھی وہیں پہنچے گی۔ اس وقت تیری موجودگی ضروری ہے۔''

راجو کچھ کہے بغیر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا اور میرے قدم بھی اٹھ گئے۔

کار ڈرائیو کرتے وقت بھی میں عندلیب کے خیال کے مطابق ہیجان میں مبتلا تھا۔ لیکن مجھے تھوڑا سا اطمینان بھی تھا کہ احمر کی طرف سے عندلیب غافل تو نہ ہوگی۔ اس کی ایک بات مجھے الجھن میں ڈالے رہی، وہ ان سب حالات سے واقف تھی جن سے میں گزرا تھا.....

راجو کی موٹر سائیکل میری کار کے پیچھے دوڑتی رہی۔

مجھے زنگولا کا بھی خیال آیا۔ راجو کی واپسی میں اتنی تاخیر اسے گھبراہٹ کا شکار کر سکتی تھی لیکن یہ بہر حال اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ مقفل فلیٹ سے باہر نکل جاتا۔

جب میری کار اپنے بنگلے کے پھاٹک کے سامنے رکی تو میرے پیچھے راجو نے بھی اپنی موٹر سائیکل روکی۔ میں نے پھاٹک کھلوانے کے لیے ہارن دیا اور اسی وقت مجھے کسی موٹر سائیکل کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی اور چونک پڑا۔ تیز رفتاری سے قریب آتی ہوئی موٹر سائیکل سوار کی وضع قطع میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ یقیناً وہی تھا جس نے ندرتی کے گھر کی قریبی گلی میں ایک خطرناک تماشا دکھایا تھا۔

میرا ہاتھ فوراً جیب میں گیا لیکن جلد ہی خطرے کا احساس اس وقت زائل ہوگیا جب موٹر سائیکل میری کار کے برابر میں آکر اسی طرف رکی جدھر میری ڈرائیونگ سیٹ تھی۔ عندلیب کا چہرہ مجھے اس وقت دکھائی دیا جب اس نے اپنے ہیلمٹ کی پلاسٹک شیڈ سرکائی۔

''مائی گاڈ!'' میں ساختہ چیخ اٹھا۔ ''یہ تم ہو؟''

عندلیب نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا چہرہ پھر پلاسٹک شیڈ میں چھپا لیا۔

راجو بھی اسے دیکھ کر چونکا تو ہوگا لیکن اس نے میری چیختی ہوئی آواز بھی سن لی ہوگی۔ اس کے بعد خطرے کا احساس اس کے دل و دماغ سے بھی دور ہوگیا ہوگا۔

پھاٹک کھل گیا تو میں نے اپنی کار آگے بڑھائی۔ عندلیب موٹر سائیکل میری کار کے پیچھے لائی۔ راجو اس کے پیچھے تھا۔

میں نے عیدو بابا کو دیکھا جو بے چینی سے باہر ہی ٹہل رہے تھے۔

میری کار کے قریب دونوں موٹر سائیکل رکیں اور ان کے انجن بند کر دیے گئے۔ میں بھی انجن بند کر چکا تھا۔

''اندر چل کر باتیں کریں گے۔'' عندلیب نے تیزی سے قدم بڑھائے۔

میں اس کے ساتھ اور راجو ہم سے دو قدم پیچھے تھا۔

عیدو بابا نے الجھی ہوئی نظروں سے عندلیب کی طرف دیکھا اور پھر بے تاب لہجے میں مجھ سے پوچھا ''کچھ پتا چلا بیٹے سرکار؟''

احمر اور فرخندہ کے لیے وہ بھی بہت فکرمند تھے۔

''آپ ذرا چائے وغیرہ کا بندوبست کیجیے۔'' عندلیب نے ان سے کہا تو وہ اس کی آواز پہچان کر چونکے۔ عندلیب کا چہرہ ابھی ہیلمٹ کی پلاسٹک شیڈ میں ہی تھا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر عندلیب نے اپنا ہیلمٹ اتارا اور اپنے بال جھٹکے جو اس کے شانوں پر بکھر گئے..... رومال نکال کر اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ جنز، جیکٹ اور فل بوٹ میں وہ اس وقت مجھے کسی دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہی تھی، چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''بہت الجھن میں ہو تم!'' وہ ٹہلتے ہوئے بولی ''پہلے میں تمہاری ایک الجھن تو رفع کر دوں۔''

اس نے بتانا شروع کیا۔ احمر اور فرخندہ کے لیے وہ مجھ سے کچھ کم فکر مند نہیں تھی۔ جب میں راجو کے ساتھ دیبارو اور ندرتی کے گھر کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو وہ بھی ہم دونوں کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن مسئلہ اس کے لیے اس کے گارڈز تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے پہلے اپنے گھر کا رخ کیا تھا۔ گارڈز سے اس نے کہہ دیا تھا کہ فی الحال اسے اپنے گھر سے کہیں نہیں جانا چنانچہ گارڈز اپنے خیمے میں چلے گئے تھے جو بنگلے کے باہر پھاٹک کے قریب ہی لگا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ بڑی عجلت میں تیار ہو کر اس وضع قطع میں اپنے گھر سے نکلی تھی جیسی وہ اس وقت میرے سامنے تھی۔

موبائل پر اس نے اپنے چیف گارڈ سے کہہ دیا تھا کہ اس کا کوئی عزیز اس کے گھر آیا ہوا تھا جو اب اپنی موٹر سائیکل پر واپس جا رہا ہے، اس کی غیر معمولی وضع قطع کے باعث اسے روک کر پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

عندلیب کے بقول وہ اپنی موٹر سائیکل بہت خاص مواقع پر استعمال کرتی تھی اور اس کے گارڈز اس موٹر سائیکل کا نمبر بھی نہیں جانتے تھے۔

موٹر سائیکل پر عندلیب نہایت برق رفتاری سے دیبارو اور ندرتی کے گھر پہنچی۔

کسی گھر میں چوری چھپے گھسنے کے کیا طریقے ہوتے ہیں، یہ میں نہیں جانتا تھا اور عندلیب نے اس وقت اختصار کے باعث بتایا بھی نہیں کہ وہ گھر میں کس طرح گھسی تھی۔ وہ بس کسی نہ کسی طرح اس کمرے تک پہنچ گئی جہاں میں اور راجو ہمدانی وغیرہ کے ساتھ تھے۔

عندلیب نے وہاں ان لوگوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو کمرے کے باہر موجود تھے۔ اس نے خود کو ان سے بھی پوشیدہ رکھا تھا اور ایک کھڑکی کے پاس کھڑی اس کمرے میں ہونے والی باتیں بھی سنتی رہی تھی اور دیکھتی بھی رہی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔

وہ وہاں اس وقت پہنچی تھی جب میں ہمدانی کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ موبائل فون پر دیبارو اور کمانڈر بازرگان کی باتوں سے وہ دھوکا کھا گیا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ ان لوگوں کے ایکشن اسکواڈ نے احمر کو اغوا کر لیا ہے۔

عندلیب نے وہ ساری باتیں سنی تھیں اور جب مجھے راجو کے ساتھ وہاں سے جانے پر مجبور کیا گیا تو وہ بنگلے سے نکل کر اس گلی میں پہنچی جہاں راجو کی موٹر سائیکل اور میری کار کھڑی تھی۔

بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے ہی عندلیب نے وہ گلی دیکھ لی تھی اور اپنی موٹر سائیکل میری کار کے قریب ہی کھڑی کی تھی۔

''اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ تم دیکھ ہی چکے ہو.....'' عندلیب نے کہا۔

''تم نے تو ہمیں مار ڈالنے کی کوشش کروائی تھی۔'' میں بول پڑا۔

''یہ محض گمان ہے تمہارا'' عندلیب نے کہا ''مجھے یقین تھا کہ تم دونوں خود ہی موٹر سائیکل کی زد سے نکل جاؤ گے اور مجھے ان دونوں کو نکر مارنے کا موقع مل جائے گا۔ صورت حال ایسی نہیں تھی کہ اس بنگلے میں موجود سبھی افراد پر گرفت کی جا سکتی اس لیے میں چاہتی تھی کہ وہی دونوں ہاتھ لگ جائیں لیکن بدقسمتی سے اسی وقت وہاں ایک پولیس موبائل آ گئی۔ اس وقت میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں پولیس والوں کی نظر میں نہیں آنا چاہتی تھی۔''

''پولیس والوں سے ہماری جان کس طرح چھوٹی؟'' میں نے پوچھا ''مجھے یقین ہے کہ پولیس آفیسر کو فون کرنے والی تم نہیں تھیں۔''

''بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا۔ وہ صورت حال ایسی تھی کہ پولیس آفیسر سے میرا خود بات کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ میں نے ہوم سیکرٹری سے بات کی تھی اور انہوں نے ہی پولیس آفیسر کو فون کیا تھا۔''

''ہوم سیکرٹری سے تم نے کیا کہا تھا؟''

''ان باتوں میں تم دلچسپی نہ لو..... احمر اور فرخندہ کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گئی ہوں۔ نہ جانے کس کس سے کیا کیا جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے؟''

''لیکن اب کیا ہوگا!'' میں نے بے تابی سے کہا۔

عندلیب نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور ٹہلے جا رہی تھی۔ مجھے اس کی پریشانی کا اندازہ بہ خوبی ہو رہا تھا۔

راجو اس دوران میں بالکل چپ بیٹھا رہا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ عندلیب کی موجودگی میں از خود کچھ نہیں بولتا تھا۔

عبدو بابا چائے اور کافی لا کر رکھ گئے، راجو خاموشی سے پیالیاں سیدھی کرنے لگا۔

''عندلیب..... میں بہت پریشان ہوں۔'' میری آواز کچھ بھرا سی گئی۔ ''اندازہ مجھے تمہاری پریشانی کا بھی ہے لیکن کیا ہم اسی طرح بیٹھے بس باتیں کرتے رہیں؟''

''میں بہت کچھ اقدامات کر چکی ہوں پرویز!'' عندلیب نے کہا ''اور ان اقدامات کے نتیجے کا انتظار ہے مجھے۔'' اس نے اس طرح اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے موبائل فون کی طرف دیکھا جیسے وہ کسی کال کی منتظر ہو..... پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''تم جب ندرتی اور دیبارو کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تھے تو میں نے تمہارے ہی کہنے سے وہاں کی نگرانی ختم کروا دی تھی لیکن جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے دوبارہ نگرانی شروع کرانے کا حکم پھر دے دیا تھا۔ نگرانی بھی اس مرتبہ بہت کڑی ہوگی۔ چڑیا کا بچہ بھی میرے آدمیوں کی نظر میں آئے بغیر ان دونوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

راجو اس وقت چینی گھولنے کے لیے پیالیوں میں چمچہ چلا رہا تھا۔ وہ اچانک میری طرف دیکھ کر بولا ''کسی اور امکان پر بھی غور کر لیا جائے تو اچھا ہے۔''

''کیا مطلب!'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں پوری طرح تو فارسی نہیں سمجھتا لیکن جب زیادہ سنی ہوں تو کچھ اندازہ تو لگا ہی سکتا ہوں۔ ہمدانی نے فون پر دیبارو اور کمانڈر بازرگان کی جو بات کرائی تھی، اس سے عندلیب نے شاید ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔''

''یعنی..... وہ.....'' میں پریشانی میں ٹھیک سے بول نہیں سکا ''تیرا مطلب ہے..... اس اغوا میں ان لوگوں کے ایکشن اسکواڈ کا ہاتھ نہیں؟''

''ہاں.....'' راجو نے کہا ''فون پر ان کی بات کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ اگر اس اغوا میں ان لوگوں کا ہاتھ ہوتا تو باہر ہو جاتا.....''

''مگر ان لوگوں کے علاوہ اس اغوا میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے!'' میری پریشانی میں اضافہ ہوا۔

''یہ اندازہ تو میں نہیں لگا سکتا۔'' راجو نے جواب دیا ''میں بس یہ جانتا ہوں کہ وہ کمانڈر بازرگان تو دیبارو سے اپنی ہی پریشانی روتا رہا تھا.....''

''کیسی پریشانی.....؟''

اب عندلیب بھی غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''چائے تو اٹھا لے اپنی.....'' راجو نے کہا۔

میں نے اٹھ کر اپنی کافی کی پیالی اٹھائی اور چائے کی پیالی اٹھا کر عندلیب کو دی۔

''بازرگان اور اس کے ساتھی اپنے گھر میں قید سے رہا ہو گئے تھے۔'' راجو نے بتایا۔

''یہ تو ہمدانی نے بھی کہا تھا کہ وہ کسی جگہ شاید محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔'' میں نے کہا ''لیکن کیسے؟''

''ان میں سے جب بھی کوئی گھر سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا' کسی طرف سے چلائی جانے والی گولی اس کے قریب سے نکل جاتی تھی۔ انہیں فون پر دھمکایا بھی جا چکا تھا کہ اگر کوئی باہر نکلے گا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ان لوگوں نے مختلف راستوں سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے۔''

''تو پھر کئی گولیاں چلی ہوں گی!'' میں جلدی سے بولا۔

''ظاہر ہے۔''

''اتنی فائرنگ کی وجہ سے تو اس علاقے میں ہنگامہ ہو جانا چاہیے۔''

''ہاں..... ہونا تو چاہیے۔''

اس دوران میں عندلیب نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔

''سنو!'' اس نے فون پر کسی سے کہا ''معلوم کرو کہ گزشتہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر شہر کے کسی علاقے میں گولیاں چلنے کی آوازیں تو نہیں سنی گئیں.....! ہاں..... مجھے جلد از جلد پتا چلنا چاہیے۔''

عندلیب نے موبائل بند کر دیا۔

''تجھے زیادہ فارسی نہیں آتی.....'' میں نے راجو سے کہا ''تجھے اتنا یقین کیوں ہے کہ اس اغوا میں ان لوگوں کا ہاتھ نہیں.....''

''ہمدانی کو تو آتی ہے۔'' راجو نے کہا ''اس جیسے لوگ آسانی سے کسی بات پر یقین کیسے کر سکتے ہیں؟''

''ایک وجہ ہو سکتی ہے ہمدانی کے یقین کی!'' عندلیب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دیبارو' بازرگان سے گفتگو شروع کرتے ہی کسی خاص لفظ کا استعمال کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی..... کوڈ ورڈ..... جس سے بازرگان کو خطرے کا سگنل مل جائے۔ یعنی وہ سمجھ لے کہ اس وقت دیبارو جو باتیں کر رہا ہے' وہ کسی کے دباؤ میں کر رہا ہے۔''

''یہی ہو سکتا ہے۔'' میں نے پُرجوش انداز میں عندلیب کے خیال کی تائید کی ''اس اغوا میں کسی اور کو تو دلچسپی

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہو ہی نہیں سکتی۔"

راجو کچھ سوچتا ہوا چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

"مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" کچھ توقف سے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ پہاڑی" اس کا اشارہ زنگولا کی طرف تھا۔ "کسی وقت بھی سنک سکتا ہے وہ.....! خاصی دیر ہو چکی ہے مجھے۔ اگر اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ توڑنے کی کوشش کی تو آس پاس کے لوگ جمع ہو جائیں گے۔"

"مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں۔" عندلیب بولی "احمر کی وڈیو دیکھنے کے بعد اس کا دماغ اب گھومنا تو نہیں چاہیے۔"

اسی وقت میں بول پڑا "لیکن میرا دماغ اس خیال سے گھوما ہوا ہے کہ زنگولا کے خیال میں تو احمر، شہزادی ثورتی ہے لیکن یہ ہمدانی وغیرہ اسے کہاں کی پرنسز کہہ رہے ہیں.....!" یہ کہتے ہوئے میں اس انداز میں عندلیب کی طرف دیکھنے لگا جیسے میری دانست میں وہ اس بارے میں کچھ بتا سکتی تھی۔

میری اس بات پر راجو بھی عندلیب کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہوں....." عندلیب نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا "وہ لوگ اسے پرنسز کہتے ہیں تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

عندلیب نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ وہ اب بھی احمر کے بارے میں بتانے سے گریزاں تھی۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، پھر بولا "اور دیبارو وغیرہ ان کی پرنسز کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ آخر وہ....." میں نے راجو کی طرف دیکھا "میرا مطلب ہے ہمدانی نے آخر ایکشن اسکواڈ کے لوگوں کو کسی گھر میں بے بس کیوں کیا تھا؟ ان کی باتوں سے تجھے کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا۔"

"وہ نہیں چاہتا تھا کہ ندرتی اور دیبارو سے اس گفتگو کے موقع پر ایکشن اسکواڈ کے لوگ وہاں پہنچ سکیں۔"

"ندرتی کیا وہاں اتفاقاً پہنچ گیا تھا اس وقت.....؟"

"نہیں....." راجو نے جواب دیا "ہمدانی نے اسے بھی دیبارو سے فون کر کے بلایا تھا۔"

"ابھی ایک خیال آیا ہے مجھے۔" میں نے جلدی سے عندلیب کی طرف دیکھا "دیبارو کا فون تو ہمدانی نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا لیکن کمانڈر بازرگان ندرتی سے تو رابطہ کر سکتا تھا!"

"ندرتی کا موبائل فون ٹوٹ گیا تھا۔" عندلیب نے بتایا۔

"تمہیں کیسے معلوم.....؟"

"جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ ندرتی بڑی بے چینی کے عالم میں اپنے دفتر سے نکلا ہے، اس وقت رپورٹ دینے والے نے مجھے یہ بات بھی بتائی تھی۔ ندرتی جب تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا تو ایک آدمی اس سے ٹکرا گیا تھا۔ اس تصادم میں موبائل فون ندرتی کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ دور جا گرا تھا اور ٹوٹ گیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ حرکت دانستہ کی گئی تھی۔ ندرتی سے ٹکرانے والا ہمدانی ہی کا کوئی آدمی ہوگا لیکن جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی، اس وقت مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ ندرتی کو موبائل سے محروم کرنے کی کوشش دانستہ کی گئی ہوگی۔"

"گویا باقاعدہ منصوبہ بندی!"

"ظاہر ہے۔"

"مگر کیوں؟ دیبارو اور ندرتی سے ہمدانی کیا خاص بات کرنا چاہتا تھا" میں نے راجو کی طرف دیکھا "ان کی باتوں سے اس کا بھی کچھ اندازہ لگایا تو نے.....؟ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ دیبارو سے گفتگو کے بعد ہمدانی کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر ابھرا تھا جیسے وہ اس گفتگو سے اپنا مقصد حاصل نہ کر سکا ہو....."

"ہاں....." راجو نے کہا "ہمدانی دراصل یہ نہیں چاہتا کہ احمر کی وجہ سے ان دونوں گروپوں میں خوں ریز تصادم ہونے لگے۔ وہ چاہتا ہے کہ دیبارو وغیرہ یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں لیکن دیبارو نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنی جان دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔"

"مقصد کیا.....؟"

"احمر کی ہلاکت....."

"اوہ....." میں نے متفکر انداز میں راجو کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا "ہمدانی وغیرہ خوں ریزی سے کیوں بچنا چاہتے ہیں؟"

"یہ میں نہیں سمجھ سکا۔"

"اس کا ایک سبب ہو سکتا ہے۔" عندلیب نے کہا "اگر جگہ جگہ ایرانیوں کی لاشیں ملنے لگیں گی تو یہاں کی ایرانی سفارت خانہ بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے گا اور ہماری حکومت بھی اس پر خصوصی توجہ دیے بغیر نہیں رہ

سکے گی۔ شہر میں رہنے والے سبھی ایرانیوں کو شک کی نظر دیکھا جانے لگے گا جس سے ہمدانی گروپ کے لیے بھی کوئی پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے۔"

میں نے عندلیب کی باتوں پر سر ہلایا، پھر بولا "ابھی ایک بات اور یاد آئی مجھے..... ہمدانی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کا ایک پیغام تمہیں اور مسز خان کو پہنچا دوں۔"

عندلیب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "ہمدانی کے خیال میں احمر کو ان لوگوں سے دور رکھنے کی کوششیں احمر کے حق میں نہیں ہیں لہٰذا تمہیں اور مسز خان کو اس معاملے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔"

"دماغ خراب ہے ان لوگوں کا۔" عندلیب نے منہ بنایا۔

"کیا وہ لوگ فرخندہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟"

"یہ تو شاید انہیں معلوم ہے کہ احمر کی کوئی بہن اپنی ماں کے ساتھ جنوبی امریکا میں کہیں رہتی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ یہاں آ چکی ہے۔"

راجو اپنی چائے ختم کر کے پیالی رکھتے ہوئے اٹھا..... "اب میں چلتا ہوں۔ چلتے چلتے ایک بات بتا جاؤں۔ تو نے ایک رات مجھے تبریزی کے گھر بھیجا تھا، احمر اس وقت انہی کے گھر میں تھی۔ دو آدمی اس گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ دونوں آدمی یہی تھے۔"

"یہی؟" میں چونکا "ہمدانی اور زنجانی؟"

"ہاں....." راجو نے جواب دیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا "اگر میری ضرورت ہو تو فون کر دینا۔"

وہ چلا گیا۔

"مجھے بھی اب جانا چاہیے۔" عندلیب نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا "اگر کچھ معلوم ہوا تو میں تمہیں فوراً اطلاع دوں گی۔"

"میں بے چینی سے منتظر رہوں گا" میں نے عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اطلاع دینے میں دیر نہ لگانا.....!" میرا لہجہ اور انداز، التجائیہ ہو گیا۔

عندلیب نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ذرا سا ٹہلتا رہا، پھر باتھ روم میں جا گھسا۔ میں نے سوچا تھا کہ غسل لینے سے میں کچھ ہلکا پھلکا ہو جاؤں گا لیکن اس سے بس اتنا ہوا کہ میں نے خود کو صرف جسمانی طور پر کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ذہنی دباؤ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے گھریلو لباس پہننے کے بجائے ایسا لباس پہنا تھا کہ مجھے گھر سے روانگی میں ذرا بھی تاخیر نہ ہو۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ جلد ہی احمر کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور ملنی چاہیے۔

چند منٹ گزرے تھے کہ میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ فون عندلیب کا ہوگا لیکن دوسری طرف سے راجو کی آواز آئی۔

"سویا تو نہیں تھا ابھی؟"

"ان حالات میں نیند آ سکتی ہے مجھے.....!" میں جھنجلا سا گیا۔

"میں ابھی زنگولا سے باتیں کر رہا تھا۔" راجو نے بتایا "بس یوں ہی ایک خیال آیا تھا میرے ذہن میں کہ شاید اسے ان لوگوں کے ایکشن اسکواڈ کے بارے میں کچھ معلوم ہو!"

"پھر.....؟" میں بے چینی سے بولا۔

"وہ ایکشن اسکواڈ کے بارے میں تو قطعی بے خبر ہے لیکن بازرگان نام کے ایک آدمی کو جانتا ہے۔ شاید وہی کمانڈر بازرگان ہو۔"

"زنگولا اس نام کے آدمی کو کیسے جانتا ہے!" میری بے صبری میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"یہاں آنے سے پہلے اس نے بازرگان کو ندرتی اور دیبارو کے ساتھ کئی مرتبہ دیکھا تھا۔"

"دیکھا ہوگا، اس سے ہمیں کیا فائدہ!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اصل بات جو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں، وہ تو ابھی سنی نہیں تو نے؟"

"اصل بات؟"

"ہاں....." راجو نے جواب دیا "یہاں آنے کے بعد زنگولا نے آوارگی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اسے احمر کی تلاش تھی۔ ایک مرتبہ اتفاقاً اس نے بازرگان کو دیکھ لیا۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس وقت بازرگان کی کار ایک بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔ ممکن ہے وہ اسی بنگلے میں رہتا ہو!"

"کہاں ہے وہ بنگلا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"زنگولا اس کا پتا نہیں بتا سکتا لیکن ہمیں اس بنگلے تک پہنچا سکتا ہے" راجو نے بتایا۔

"تو پھر ہمیں دیر نہیں لگانی چاہیے راجو.....! تو اسے لے کر میرے پاس آ جا....."

''اچھا! میں آتا ہوں.....''

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں ریسیور رکھ کر کمرے سے نکلا، موبائل فون اور اسمتھ اینڈ ولسن جیب میں رکھنے کا میں نے خاص طور سے خیال رکھا تھا۔ میرے قدم تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں برآمدے ہی میں کھڑا ہو کر راجو کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

کسی طرف سے عیدو بابا میرے قریب آئے۔ ''کیا پھر کہیں جانا ہے بیٹے سرکار؟''

''ہاں عیدو بابا!''

''کچھ کھا پی لیں۔ آپ نے تو.....''

''نہیں عیدو بابا!'' میں نے ان کی بات کاٹی۔ ''ابھی کچھ جی نہیں چاہ رہا ہے۔''

عیدو بابا چپ رہ گئے۔ میں برآمدے میں نکل آیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، راجو کا فون آئے ابھی صرف دو منٹ گزرے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ آدھے گھنٹے میں بھی نہیں آیا۔ میں نے بے چین ہو کر اس کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔

''بہت دیر لگا دی تو نے!'' میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

''ایک کام بہت اچھا ہو گیا یار!'' راجو نے جواب دیا ''میں سیدھا تیری ہی طرف آتا لیکن راستے میں زنگولا نے مجھ سے ایک طرف مڑنے کے لیے کہا۔ اسے خیال آیا تھا کہ بازرگان کا بنگلا ادھر ہی کسی جگہ ہے۔ میں نے سوچا، تیرے پاس آنے سے پہلے ہی وہ بنگلا دیکھ لوں لیکن اس میں دیر لگ گئی۔ زنگولا کچھ بھٹک گیا تھا لیکن خیر، بنگلا دیکھ لیا ہے میں نے..... روانہ ہو گیا ہوں اب یہاں سے، تیری ہی طرف آ رہا ہوں۔ یہ بتا کہ اب کرنا کیا ہے۔ کچھ سوچا ہے تو نے؟''

''سوچا تو ہے۔ اچھا ایسا کر، زنگولا کو اپنے گھر چھوڑ آ۔ وہ ہمارے ساتھ نہ ہو تو اچھا ہے۔ وہ پریشان تو نہیں ہو گا تیرے پھر غائب ہو جانے سے؟''

''اب میں نے اسے بہت اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ میری اس وقت کی بھاگ دوڑ اس کی شہزادی ہی کے سلسلے میں ہے۔''

''گڈ.....!'' میں نے کہا اور برآمدے سے اترتے ہوئے بولا ''تو اسے اپنے گھر چھوڑ کر نیچے ہی آ جا۔ میں خود آ رہا ہوں تیری طرف۔ میرے ساتھ چلنا ہو گا تجھے۔ اب بازرگان ہی کی خبر لینا ہو گی احمر کے سلسلے میں۔''

''ٹھیک ہے۔'' راجو نے جواب دیا ''میں انتظار کروں گا تیرا۔''

میں اتنی دیر میں اپنی کار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ موبائل بند کر کے میں نے اپنی جیب میں ڈالا اور کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

کار سڑک پر رواں دواں تھی۔ تو میں اس الجھن میں پڑا ہوا تھا کہ عندلیب کو اس بارے میں اطلاع دوں یا نہ دوں.....؟ ابھی تک اس نے تو مجھے فون کیا نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

میرے دل میں اب کچھ اس قسم کے جذبات تھے کہ میں اپنے معاملات میں عندلیب پر کیوں انحصار کرتا رہوں۔

میری یہ سوچ عجیب ہی تھی۔ احمر تو عندلیب ہی کے ذریعے میرے گھر تک آئی تھی۔ ہم دونوں کو ملانے والی درمیانی کڑی وہی تھی لیکن اب احمر کے لیے میرے جو جذبات تھے، ان کی وجہ سے یہ مجھے اپنی ذاتی ذمے داری محسوس ہونے لگی تھی کہ احمر کو ہر قسم کے خطرات سے جلد از جلد باہر نکال لاؤں۔ احمر کے لیے میں اپنی جان کی بازی بھی لگانے کے لیے تیار تھا جبکہ عندلیب کچھ پابندیوں کے حصار میں تھی۔ ایس ڈی ایم ہوتے ہوئے بھی اسے اس معاملے سے پولیس کو دور رکھنا تھا۔ دوسری طرف..... میرے خیال کے مطابق وہ مسز خان کی کونسل کے دباؤ میں بھی تھی۔ اس نے احمر کے سلسلے میں کوئی حلف بھی اٹھا رکھا تھا اور میں قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس حلف کی وجہ سے وہ خود پر کس قسم کا دباؤ محسوس کرتی ہو گی؟

ان تمام خیالات کے باوجود میں جس وقت راجو کے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا، مجھے یہ کچھ نامناسب معلوم ہوا کہ عندلیب کو اس صورتِ حال سے بے خبر رکھوں۔ میں نے اسے غالباً دوستی کے تقاضوں کے خلاف سمجھا تھا۔ اس سے مجھے کسی قسم کی مدد لینے کی خواہش نہیں تھی لیکن میں اسے بتا تو سکتا تھا کہ میرے ارادے کیا ہیں۔

میں نے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ابھی سوئے نہیں ہو گے۔'' دوسری طرف سے عندلیب نے کہا۔

''مجھے شاید اس وقت تک نیند نہیں آئے گی جب تک احمر اور فرخندہ بازیاب نہ ہو جائیں، تم کہہ کر گئی تھیں کہ مجھے فون کرو گی!''

''ہاں.....'' عندلیب نے طویل سانس لی۔ ''ابھی تک کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔ مجھے خیال تھا کہ شہر میں کسی جگہ

گولیاں چلنے کی آوازیں سنی گئی ہوں گی تو مجھے اس کی اطلاع ضرور ملے گی۔"

"رائفلوں میں شاید سائیلنسر لگائے گئے ہوں۔"

"اب تو یہی سوچنا پڑے گا۔"

"خیر، اس وقت تو میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں اب کمانڈر بازرگان پر جھپٹنے جا رہا ہوں۔"

"کیا!" عندلیب چونکی "کیا مطلب.....؟ کیسے.....؟"

اس وقت میں نے اپنی کار کی رفتار کم کر دی تھی کیونکہ ہیڈ لائٹس میں راجو اپنی بلڈنگ کے نیچے کھڑا نظر آ گیا تھا۔

میں نے عندلیب کو جواب دیا "مجھے ایک بنگلے کا پتا چلا ہے اور امکان ہے کہ شاید وہی کمانڈر بازرگان کی قیام گاہ ہو۔"

میں نے بریک لگا کر راجو کے قریب کار روکی۔

عندلیب کی متحیر آواز سنائی دی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

راجو کار کا دروازہ کھول کر میرے برابر میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے کار حرکت میں لاتے ہوئے موبائل کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر راجو سے کہا "اشارے سے مجھے راستے کے بارے میں بتاتا جا!"

"واپس موڑ لے۔" راجو نے کہا۔

میں نے عندلیب کی مضطربانہ آواز سنی "ہیلو!"

میں نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا۔ "ہاں.....! وہ میں راجو سے کچھ کہنے لگا تھا۔ ہم دونوں کمانڈر بازرگان کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔"

راجو نے غور سے میری طرف دیکھا۔ میں عندلیب کو بتانے لگا تھا کہ مجھے اس بنگلے کا پتا کیسے چلا جو میرے شبہے کے مطابق کمانڈر بازرگان کی قیام گاہ ہو سکتا تھا۔

سب کچھ سننے کے بعد عندلیب بے چینی سے بولی "مجھے اس بنگلے کا پتا بتاؤ۔"

میں نے یوٹرن لینے کے بعد کار کی رفتار خاصی تیز کر دی تھی۔

"پتا تو مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے عندلیب کو جواب دیا "راجو میری رہنمائی کر رہا ہے۔"

"راجو سے پوچھو....."

میرے بولنے سے پہلے ہی راجو نے کہا "پتا تو میں بھی نہیں بتا سکتا۔ زنگولا سے میں نے کہا تھا کہ وہ مجھے بنگلے کے قریب نہ لے جائے، دور سے ہی دکھا دے..... بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ گرومندر کے علاقے میں ہے۔"

عندلیب نے غالباً راجو کی آواز سن لی تھی۔ وہ بولی "اچھا تو جب تم اس بنگلے کے قریب پہنچ جاؤ تو مجھے اس کا نمبر بتا دینا۔ ویسے تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"جب بازرگان سے سامنا ہو جائے گا تو جو صورت حال بنے گی، اسی کے مطابق قدم اٹھانا ہوگا۔ پہلے سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ جب تم وہاں پہنچو تو مجھے اس بنگلے کا نمبر وغیرہ بتا دینا۔"

"کیا تم بھی وہاں آنا چاہتی ہو؟"

"ہاں....."

"تم نہ آؤ..... میں اب اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو..... اس قسم کے معاملات میں ابھی تم اناڑی ہو۔"

"راجو تو ہے میرے ساتھ..... اچھا خیر.....! جب میں وہاں پہنچوں گا تو تمہیں فون کر دوں گا۔"

"میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"ارادہ کیا ہے تیرا؟" راجو نے وہی سوال کیا جو عندلیب کر چکی تھی۔

"کسی طرح بھی احمر اور فرخندہ کا پتا لگانا ہے۔" میں نے جواب دیا، پھر بولا "زنگولا سے بازرگان کا حلیہ معلوم کیا تھا تو نے؟"

"ہاں....." راجو نے جواب دیتے ہوئے کار ایک طرف موڑنے کا اشارہ کیا۔ "اسے بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ سرخ و سفید رنگت کا آدمی ہے۔ بال بڑے بڑے ہیں۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی اور گھنی مونچھیں ہیں، مونچھیں کیا۔ گل مچھے ہیں۔ چہرہ بھی خاصا بھاری ہے۔"

"پھر تو اسے پہچاننا مشکل نہیں ہوگا۔" میں بڑبڑایا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اگر دونوں لڑکیاں انہی کے قبضے میں ہیں تو انہیں اب تک دیبارو اور ندرتی تک کیوں نہیں پہنچایا گیا!"

"عندلیب نے اب دونوں کے گھر کی نگرانی بہت سخت کروا دی ہے اور غالباً بازرگان کو اس کا پتا چل گیا ہے۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کو محتاط تو ہو جانا چاہیے اور ہمیں ان کی اسی احتیاط سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ جلد از جلد ان لوگوں کو گرفت میں لے لیا جائے تو احمر اور فرخندہ انہی کے پاس مل

جائیں گی۔"

"ہوں....." راجو کچھ سوچنے لگا۔

میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر کار دوڑاتے ہوئے اس اتفاق پر غور کر رہا تھا کہ "دو" کا عدد بار بار میری مخالفت میں آ رہا ہے۔ کاشف کرمانی سے تو میری ایک معاندانہ ملاقات ہو چکی تھی اور اب بازرگان مدِمقابل آنے کو تھا۔ اس کا نام بھی "دو" ہی ہے۔

اچانک راجو نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا "سوال یہ ہے کہ اس بنگلے میں گھسا کیسے جائے؟"

"یہ سوچنے کے لیے تو میں تجھے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

"میں تو خیر کسی نہ کسی طرح داخل ہو سکتا ہوں لیکن تیرے لیے مشکل ہوگی۔"

"یہ مشکل بھی تجھے ہی آسان کرنی ہے۔"

راجو خاموش ہو کر پھر کچھ سوچنے لگا۔

"اب کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"قریب پہنچ گئے ہیں۔" راجو نے جواب دیا، پھر بولا "میں سوچ رہا تھا کہ اگر بازرگان کے موبائل فون پر رابطہ کیا جائے تو اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟"

میں نے چونک کر راجو کی طرف دیکھا۔ "اس کا نمبر معلوم ہے تجھے؟"

"کچھ اندازہ ہے مجھے" راجو نے جواب دیا "زنجانی کی دھمکی پر جب دیبارو نے بازرگان سے رابطہ کرنے کے لیے موبائل کے نمبر دبائے تھے تو میری نظریں اس کی انگلی پر تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس نے کیا نمبر دبائے تھے۔ ممکن ہے مجھ سے ایک آدھ ہندسہ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو لیکن زیادہ سے زیادہ دو تین کوششوں میں اس سے رابطہ ممکن ہے۔"

"لیکن اگر اس سے رابطہ ہو بھی گیا تو اس سے کیا بات کہا جا سکتی ہے؟"

"ابھی تو میں سوچ رہا ہوں۔" راجو نے جواب دیا، پھر اطمینان سے بولا "بس اس طرف گاڑی روک دے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "کار اس بنگلے کے قریب لے جانا خطرناک رہے گا۔"

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق کار ایک جگہ روک لی۔

"یہاں سے بس سو قدم کا فاصلہ ہوگا۔" راجو نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا اور کار سے اتر گیا۔

میں نے اتر کر کار، لاک کی اور راجو کے ساتھ ایک طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا "بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے عندلیب کو بھی پتا بتانا ہے۔"

راجو نے منہ بنایا۔ "اپنی اس ایس ڈی ایم کے بغیر کیا تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتا؟ جب میں تیرے ساتھ ہوں تو....."

"بات کچھ اور ہے راجو.....!" میں نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ "اس سارے معاملے میں تو بھی میرے ساتھ ہے۔ اگر میں تجھے کسی خاص موقع پر بے خبر رکھوں تو تجھے کیا برا نہیں لگے گا؟"

راجو دوسری طرف دیکھنے لگا، جیسے اپنے چہرے کے اس وقت کے تاثرات مجھ سے چھپانا چاہتا ہو۔

سناٹے میں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس رہائشی علاقے میں زیادہ تر گھر پرانی طرز کے ہیں۔ ہم جس سڑک پر تھے۔ وہاں تو ساری عمارتیں پرانی طرز کی تھیں۔ کافی فاصلے سے لگے ہوئے الیکٹرک پولز کی روشنی ایسی تھی جیسے اس پر مردنی چھائی ہوئی ہو۔

راجو ایک جگہ رک گیا۔ "یہ گھر ہے۔"

میں نے قدیم طرز سے بنے ہوئے اس بنگلے کا نمبر دیکھا۔ وہ علاقہ بہرحال میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں نے راجو سے عمارت میں داخل ہونے کی تدبیر سوچنے کے لیے کہا اور موبائل پر عندلیب سے رابطہ کرنے لگا۔

عندلیب تو جیسے بے چینی سے منتظر تھی۔ میں نے اس سے بہت مختصر بات کی۔ پتا بتایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ راجو اس دوران میں اس یک منزلہ عمارت اور اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

"پچھلی سمت چلتے ہیں۔" راجو نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔

"پھاٹک بہت زیادہ اونچا تو نہیں ہے۔"

"اندر چوکی دار تو ہوگا۔ اس نے آہٹ سن لی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"مگر پیچھے تو....."

"آ تو سہی!" راجو نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف بڑھنے لگا۔

عمارتوں کی اس رو کی پچھلی گلی میں پہنچنے کے لیے ہمیں ایک لمبا چکر کاٹنا پڑا پھر راجو ایک جگہ رک گیا۔

"اس کے سہارے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔" راجو نے گندے پانی کے ایک پائپ پر ہاتھ رکھا۔

''یہی عمارت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' راجو نے جواب دیا ''میں عمارتیں گنتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔''

''اس پائپ کے سہارے اوپر چڑھنا تو میرے لیے مشکل ہوگا۔'' میں پریشان ہوگیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔'' راجو نے طویل سانس لی ''اچھا ایسا کر۔ میں چھت پر جاتا ہوں۔ وہاں کوئی زینہ تو بہرحال ہوگا۔ میں نیچے اتر کر بیرونی دروازے سے ہوتا ہوا گیٹ تک پہنچوں گا۔ تجھے پھاٹک کھلا ہوا ملے گا۔ واپس وہیں پہنچ.....!''

''اور چوکی دار.....؟''

''اس کا کچھ بندوبست کر ہی دوں گا۔''

''چل ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تو اوپر تو چڑھ! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ پائپ کے سہارے تو کیسے چڑھے گا۔ میں نے تو ایسے منظر بس فلموں میں دیکھے ہیں یا ناولوں میں پڑھے ہیں۔''

راجو مجھ سے کچھ کہے بغیر جھکا اور اپنے جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔ پھر اس نے جوتے اتارے، فیتوں سے انہیں آپس میں باندھا اور انہیں اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اب ایک جوتا اس کے سینے پر دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب لٹک رہا تھا۔ ہم ایک غیر معمولی صورتِ حال میں تھے لیکن راجو کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے اپنی مسکراہٹ پر قابو نہیں رہا۔ البتہ یہ میں سمجھ گیا تھا کہ پائپ کے ذریعے اوپر جاتے وقت راجو اپنے جوتے ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا اور وہ اس نے اتارے اس لیے تھے کہ ننگے پیروں سے ہی پائپ پر آسانی سے چڑھا جاسکتا تھا۔

راجو نے پائپ ٹٹولتے ہوئے مجھ سے کہا ''تیری خاطر مجھے ایسی حرکتیں کرنا پڑ رہی ہیں جو قانون کی زد میں آتی ہیں۔ میں نے پہلے کبھی یہ سب کچھ نہیں کیا۔''

''پہلے یہ سب کچھ نہیں کیا تو مہارت کیسے حاصل کرلی۔''

راجو نے اس بات کا کوئی جواب دیے بغیر پائپ پر چڑھنا شروع کردیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ بندر جیسی پھرتی کے ساتھ اوپر چڑھ رہا تھا۔

عمارت ایک منزلہ تھی۔ میں نے جلد ہی اسے اوپر کی منزل کی چھت پر دیکھا۔ وہیں سے اس نے جھانک کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا میں عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچوں۔

میں تیزی سے پلٹا۔ خاصا لمبا چکر ایک بار پھر لگانا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی رفتار خاصی تیز رکھی۔ ایک ہلکی سی دوڑ کہا جاسکتا تھا اسے.....!

جیسے ہی میں اس عمارت کے پھاٹک کے قریب پہنچا، مجھے سامنے سے ایک موٹر سائیکل آتی دکھائی دی۔ میں نے الیکٹرک پولز کی دھندلی روشنی میں اسے پہچان لیا۔ عندلیب اپنے اسی مخصوص حلیے میں تھی۔

میرے قریب آکر اس نے موٹر سائیکل روکتے ہی انجن بند کردیا۔ پھر اس نے ہیلمٹ کی سلائیڈنگ پلاسٹک اوپر کرکے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن میں حیرت سے بول پڑا۔ ''تم اتنی جلدی کیسے پہنچ گئیں؟''

''جب تم نے پہلی مرتبہ مجھے اطلاع دی تھی، میں اسی وقت گھر سے چل پڑی تھی۔ یہاں پہنچ کر جب تم نے مجھے فون کیا تھا تو میں یہاں سے سات آٹھ منٹ کے فاصلے پر تھی۔'' عندلیب نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ''راجو کہاں ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ راجو نے عمارت میں داخل ہونے کے لیے کیا ترکیب سوچی ہے۔

''ہوں'' عندلیب نے منہ بنایا ''اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ وہ کبھی غلط حرکتوں میں ملوث نہیں ہوا۔''

''ہاں'' میں نے زور دے کر کہا ''میرا اصرار اب بھی یہی ہے۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ صرف میری خاطر ایسی حرکتیں کررہا ہے اور اس نے یہ بھی سوچ لیا ہوگا کہ جب تم یہاں پہنچوگی تو اس کے بارے میں اسی طرح سوچوگی۔''

عندلیب نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔

''میں اپنی موٹر سائیکل اس گلی میں کھڑی کردیتی ہوں۔'' اس نے کہا اور موٹر سائیکل دھکیلتی ہوئی گلی کی طرف لے جانے لگی۔

گلی قریب ہی تھی۔ عندلیب اپنی موٹر سائیکل کھڑی کرکے واپس آئی۔

''تم نے اپنی کار زیادہ دور کھڑی کی ہے۔'' وہ بولی۔

''یہ راجو کی تجویز تھی۔''

عندلیب عمارت کا جائزہ لینے لگی جس کی اوپری منزل کی دو کھڑکیوں میں روشنی نظر آرہی تھی۔

اسی طرح آس پاس کی دوسری عمارتیں بھی اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کسی عمارت کی بھی زیادہ کھڑکیوں میں روشنی نہیں تھی۔

''کتنا وقت لگے گا راجو کو.....!'' عندلیب اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں.....! لیکن ہمیں اس کا انتظار تو کرنا ہی ہے۔'' عندلیب سر ہلا کر رہ گئی۔

میرے خیال میں تو یہ انتظار پندرہ بیس منٹ پر بھی محیط ہوسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پندرہ منٹ سے کچھ کم وقت میں پھاٹک کھلتا نظر آیا اور راجو نے جھانک کر باہر دیکھا۔

میں اور عندلیب تیزی سے آگے بڑھے۔

جب ہم اندر داخل ہوگئے تو راجو نے آہستگی سے پھاٹک بند کردیا۔

''کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''دشواری کیا ہوتی!'' راجو بولا ''عمارت میں جو لوگ بھی ہیں، وہ اس وقت گہری نیند میں ہیں۔ میں نے کسی کی آواز نہیں سنی۔ میں سیدھا پھاٹک کی طرف آیا تھا۔'' راجو نے پھاٹک کے قریب کے ایک کیبن کی طرف اشارہ کیا ''وہاں میں نے چوکی دار کو باندھ کر ڈال دیا ہے اور اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا ہے۔''

عندلیب نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

''ہمیں دیر نہیں لگانی چاہیے۔'' میں بول پڑا۔

''آؤ!'' راجو کہتا ہوا ایک طرف بڑھا۔

میں اور عندلیب اس کے ساتھ ساتھ مرکزی دروازے تک پہنچے اور اندر داخل ہوگئے۔ راجو نے دروازہ بند کرلیا تاکہ وہاں کی روشنی باہر نہ جاسکے۔

عندلیب کا چہرہ بہ دستور ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی کی ''تمہارے پاس رومال تو ہوگا؟''

''ہاں، کیوں؟''

''بہتر ہوگا کہ تم دونوں بھی اپنے چہرے چھپالو..... رومال باندھ لو چہروں پر.....!''

عندلیب نے جو احتیاط ضروری سمجھی تھی، اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرے ساتھ راجو نے بھی اپنی جیب سے رومال نکال کر چہرے پر اس طرح باندھ لیا کہ آنکھوں کے نیچے کا حصہ چھپا رہا۔

ہم نے دبے قدموں چلتے ہوئے گراؤنڈ فلور کے سب کمرے دیکھ ڈالے۔ کہا جاسکتا ہے کہ چپا چپا دیکھ لیا مگر کوئی کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ اس کے بعد ہم نے اوپر منزل کا رخ کیا، گراؤنڈ فلور کی طرح ہمیں وہاں بھی زیادہ تر کمروں کے دروازے کھلے ہوئے ملے لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ البتہ ایک کمرا مقفل تھا۔ اس دروازے کے برابر میں سلائیڈنگ شیشوں کی ایک کھڑکی تھی۔ دوسری طرف پڑے ہوئے پردوں کی وجہ سے اندر دیکھا نہیں جاسکتا تھا لیکن دوسری طرف روشنی بہرحال تھی۔

''کوئی لڑکی سو رہی ہے۔'' راجو نے سرگوشی کی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا تو میں نے وہاں سے جھانکا۔ اس جگہ پردہ تھوڑا سا ایک طرف سرک گیا تھا اور وہاں سے وہ لڑکی بستر پر سوتی نظر آرہی تھی، اس کا سارا بستر تو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اوپری نصف جسم اور سرہانے رکھا ہوا تیز روشنی کا لیمپ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

ایک کتاب اس لڑکی کے سینے پر اس طرح کھلی رکھی تھی کہ گرد پوش اوپر کی جانب تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی نے کتاب پڑھتے پڑھتے غنودگی کے عالم میں کتاب اپنے سینے پر رکھی تھی اور پھر اسے نیند آگئی تھی۔

اچھے نقش و نگار کی مالک اس لڑکی کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔

میرے بعد اسے عندلیب نے بھی دیکھا۔ میں اس وقت بازرگان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس عمارت میں ہمیں کوئی مرد تو دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔

''اتنی بڑی عمارت میں صرف یہ..... ایک اکیلی لڑکی۔'' عندلیب نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی ''اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ بازرگان کی قیام گاہ نہیں ہے اور وہ یہاں کسی سے ملنے آیا تھا تو پھر یہی وہ لڑکی ہوسکتی ہے جس سے وہ ملنے آیا ہو۔''

''ایسی صورت میں تو یہ لڑکی ضرور کسی اہمیت کی حامل ہوگی۔'' میں نے کہا ''لیکن..... اگر ہم نے دروازے پر دستک دی تو کیا وہ دروازہ کھولے گی؟''

''اتنی رات گئے دروازے پر دستک ہو تو کوئی بھی یہ جانے بغیر دروازہ نہیں کھولتا کہ دستک دینے والا کون ہے۔''

عندلیب کا خیال بالکل درست تھا۔

مجھے یہ الجھن لاحق تھی کہ بازرگان کے ہاتھ نہ لگنے کی صورت میں کیا اس لڑکی سے کسی قسم کی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں؟

''کھڑکی کھولی جائے؟'' راجو نے سرگوشی کی۔

''یہ اندر سے لاک ہوگی۔'' عندلیب نے خیال ظاہر کیا۔

''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے.....! ممکن ہے وہ لاک کرنا بھول گئی ہو۔''

''اس کوشش کی وجہ سے آواز تو ہوگی اور آواز سے اس لڑکی کی آنکھ کھل تو سکتی ہے۔''

''تو اندر جھانکتا رہ۔'' راجو نے مجھ سے کہا ''اگر لڑکی کی آنکھ کھلے تو مجھے کہنی مار دینا.....''

میں نے سوالیہ انداز میں عندلیب کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔'' عندلیب نے میرا مطلب سمجھ لیا ''کوشش کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں.....''

میں نے کھڑکی کے اس حصے سے آنکھ لگا دی جہاں پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔

لڑکی بہ دستور سوتی دکھائی دی۔ راجو نے سلائیڈنگ شیشہ ایک طرف سرکانے کی کوشش کی تو ہلکی سی آواز ہوئی۔ راجو نے رک کر میری طرف دیکھا لیکن میں نے اسے کہنی نہیں ماری۔ اس کی ضرورت مجھے اس لیے محسوس نہیں ہوئی تھی کہ لڑکی کی گہری نیند میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

راجو نے ایک مرتبہ پھر زور لگایا اور پھر رک گیا حالانکہ میں نے اب بھی اسے کہنی نہیں ماری تھی۔

''اندر سے لاک تو نہیں ہے۔'' راجو نے سرگوشی کی ''کھڑکی کھل جائے گی۔''

''تو کھولو!'' عندلیب کچھ مضطرب محسوس ہوئی تھی۔

میری طرح غالباً عندلیب نے بھی سوچا تھا کہ بازرگان اس لڑکی سے ملنے آیا تھا تو یقیناً اس کی کوئی اہمیت ہوگی لہٰذا اس سے کسی قسم کی معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اگرچہ وہ از خود تو کچھ نہیں بتاتی لیکن اسے کسی طرح بولنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔

راجو آہستہ آہستہ سلائیڈنگ شیشہ سرکانے لگا۔ اس کی حد درجہ کوشش تھی کہ کم سے کم آواز ہو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ آواز بالکل نہ ہوتی۔ میں سر کے ہوئے پردے کی جگہ آنکھ لگائے رہا۔ لڑکی ایک مرتبہ تھوڑی سی کسمسائی تو تھی لیکن اس کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں اس لیے میں نے راجو کو کہنی بھی نہیں ماری۔

شیشہ آدھے سے زیادہ سرک چکا تھا جب عندلیب نے سرگوشی کی۔ ''بس' کافی ہے۔ ہم ایک ایک کر کے اندر داخل ہوسکتے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہمارے اندر داخل ہونے سے پہلے اس کی آنکھ نہ کھلے۔''

راجو رک گیا۔

''پہلے میں اندر جاتی ہوں۔'' عندلیب نے کہا..... ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھی اور اتنی ہی آہستگی سے دوسری طرف اتر گئی۔

اس کے بعد میں اور راجو بھی اندر پہنچ گئے۔ لڑکی بہ دستور گہری نیند میں رہی۔

عندلیب نے اپنے ہاتھوں سے کھڑکی کا پردہ اس طرح برابر کیا کہ اب کوئی وہاں سے جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔

میں راجو اور عندلیب سے پہلے ہی دبے قدموں آگے بڑھ کر لڑکی کے بستر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اتفاقاً میری نظر لڑکی کے سینے پر کھلی کتاب پر پڑی۔

کچھ لوگوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی کتب کے گرد پوش کے کسی کونے میں اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ اس کتاب کے گرد پوش پر لکھا ہوا نام ''سامعہ بازرگان'' تھا۔

میں چونک گیا۔ اگر یہ کتاب اسی لڑکی کی تھی تو وہ بازرگان کی بیوی یا بیٹی ہوسکتی تھی۔ راجو سے میں نے بازرگان کی عمر نہیں پوچھی تھی ورنہ یہ اندازہ لگانے میں بھی آسانی ہوجاتی کہ وہ بازرگان کی بیوی ہوگی یا بیٹی!

اس کے علاوہ سامعہ کے نام نے میرے ذہن میں کچھ اور خلش بھی پیدا کی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے حال ہی میں یہ نام کہیں سن چکا ہوں لیکن مجھے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آسکا۔

عندلیب، اس لڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ ریوالور بہ دستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی ''اب میں اسے جگاؤں گی، تم اس کے قریب ہوجاؤ۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے چیخ نہیں نکلنی چاہیے۔ تم منہ دبا دینا اس کا.....''

میں تیزی سے اس لڑکی کے اور قریب ہوگیا۔ عندلیب کی وہ دھیمی آواز اس کی آنکھ کھلنے کا سبب نہیں بنی تھی۔

راجو ایک طرف خاموش کھڑا یہ سب کارروائی دیکھتا رہا۔

عندلیب نے لڑکی کے پیر پکڑ کر ہلائے تو اس نے کسمسا کے کروٹ لینا چاہی۔ عندلیب نے اس کے پیر زیادہ زور سے ہلائے تو یکایک اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر گھبرائے ہوئے انداز میں اٹھ بیٹھی۔ اس کے سینے پر رکھی ہوئی کتاب ایک طرف گر گئی۔

''شور نہ مچانا'' عندلیب نے دھیمی آواز میں دھمکی دی۔

لڑکی کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھرے۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ ریوالور اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی خوف سے کچھ پھیل گئی تھیں۔

عندلیب فوراً ہی پھر بولی ''اگر تم نے شور مچایا تو یہ ریوالور بالکل شور نہیں مچائے گا۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ اس میں سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ اس سے گولی تو چلے گی لیکن دھماکا نہیں

ہوگا۔''

لڑکی نے اس دوران میں مجھے اور راجو کو بھی دیکھ لیا تھا۔ لیکن پھر اس کی نظریں عندلیب پر ہی جمی رہیں۔

''ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہمیں تم سے بس کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔''

اب اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کا کھلا ہوا منہ بند ہوگیا تھا اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں بھی معمول پر آگئی تھیں چہرے پر خوف کے جو تاثرات ابھرے تھے ان میں تیزی سے کمی آتی جارہی تھی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ بڑے سکون سے بولی۔

وہ یکایک ہی گھبرائی تھی، خوف زدہ ہوئی تھی اور اب پرسکون لہجے میں بولی تھی۔ اس پر ممکن ہے راجو اور عندلیب کو کچھ تعجب ہوا ہو لیکن مجھے نہیں ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ جو کتاب پڑھتے پڑھتے یہ سوئی تھی' وہ اسی کی ہوگی۔ سامعہ اسی کا نام ہوگا۔

''تمہارا نام سامعہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' وہ مجھے گھورتی رہی۔

اس کے سوال سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس کا نام سامعہ ہی تھا۔ اپنے اندازے کی درستی پر میں نے غیر ارادی طور پر آہستگی سے سر ہلایا۔

سامعہ کے نام کا عدد پانچ ہے اور مجھے اس میں وہ خصوصیت نظر آگئی تھی جو اس عدد کے حامل افراد میں عموماً پائی جاتی ہے۔ ایسے لوگ غیر جذباتی اور خود کو وقت کے مطابق ڈھالنے میں بڑی سرعت سے کام لیتے ہیں۔

''بازرگان سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

راجو اور عندلیب کی نظریں میری طرف اٹھیں۔ انہیں مجھ سے یہ توقع نہیں ہوگی کہ میں سامعہ اور بازرگان میں کوئی رشتہ تلاش کروں گا۔ دراصل انہوں نے کتاب کے گرد پوش پر لکھا ہوا نام دیکھا ہی نہیں تھا۔

''میں پوچھ رہی ہوں، آخر تم لوگ ہو کون؟''

''بے وقوفی کے سوالات نہ کرو لڑکی!'' عندلیب سخت لہجے میں بولی۔ ''اگر ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتانا ہوتا تو ہم اپنے چہرے چھپائے ہوئے نہیں ہوتے۔ تمہیں ہمارے سوالات کا صرف جواب دینا ہے۔''

''اگر میں جواب نہ دوں تو تم کیا کرو گی؟'' سامعہ عندلیب کو گھورنے لگی ''مجھے یقین ہے کہ تم مجھے گولی نہیں مارو گی۔ یہ ریوالور صرف دھمکانے کے لیے ہے۔''

''سنو لڑکی!'' راجو غرایا ''اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو گولی بھی چل سکتی ہے لیکن یہ تمہیں پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہمیں تم سے بس کچھ معلوم کرنا ہے۔ ہاں اگر تم نے ہمارے سوالوں کے جواب نہ دیے تو ایسا ہوسکتا ہے کہ تمہاری زبان کھلوانے کے لیے ہمیں تمہاری ہڈیاں پسلیاں توڑنا پڑیں۔''

''مجھے اپنی ہڈیوں پسلیوں سے بہت محبت ہے لہٰذا۔'' یکایک اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ''پوچھو' کیا پوچھنا ہے؟''

اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میں بھی خفیف سا مسکرا دیا۔ عدد پانچ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگ خاصے بذلہ سنج ہوتے ہیں اور یہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں ایسے لوگ حالات و واقعات کے مطابق خود کو بہت تیزی سے ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔

''بازرگان سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''وہ میرے ڈیڈی ہیں۔''

مجھے اسی قسم کے جواب کی توقع بھی تھی۔

سامعہ نے جواب دیتے ہوئے اس طرح حرکت کی تھی جیسے بستر سے اترنا چاہتی ہو۔

''کہیں.....'' عندلیب نے ڈپٹ پڑنے کے انداز میں کہا ''تم اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گی جب تک میں تلاشی نہ لے لوں۔''

عندلیب اس کے قریب گئی۔ اس نے تکیے الٹ کر دیکھے اور پھر سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولنے لگی۔

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔'' سامعہ منہ بنا کر بولی ''لیکن میں ڈرپوک بھی نہیں ہوں۔ اتنے بڑے گھر میں تمہیں کوئی ملازم بھی نہیں ملے گا۔ پھاٹک پر صرف ایک چوکی دار ہے۔ ڈیڈی چند دن سے کہیں گئے ہوئے ہیں لیکن مجھے تنہا رہتے ہوئے بالکل ڈر نہیں لگتا۔''

عندلیب تلاشی لینے کے بعد مطمئن ہوچکی تھی۔

''اب تم کھڑی ہوسکتی ہو.....!'' وہ بولی۔

''ہمیں دراصل تمہارے ڈیڈی ہی سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتی، وہ کہاں گئے ہیں۔'' سامعہ اب بستر پر ایک جانب ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ ''آخر تمہیں ان سے ایسا کیا کام ہے کہ مجرموں کی طرح میرے گھر میں گھسے

ہو.....!''

''یہ تو ہم تمہارے ڈیڈی ہی کو بتا سکتے ہیں۔'' میں بولا۔

''لیکن وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ میں ابھی بتا چکی ہوں کہ وہ چند دن سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔''

''جھوٹ بول رہی ہو تم.....!'' عندلیب نے پھر ڈپٹ کر کہا۔

''تو سارے گھر کی تلاشی لے لو.....'' سامعہ نے منہ بنایا۔

میں نے عندلیب کے قریب جا کر آہستہ سے کہا ''یہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا ہے۔''

راجو ہم دونوں کے قریب آ گیا اور میری طرح دھیمی آواز میں بولا ''یہ صورتِ حال تو ہمارے حق میں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ لڑکی بازرگان کی بیٹی ہے۔'' راجو نے کہا ''اسے یرغمال بنا کر بازرگان سے سودا کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے احمر اور فرخندہ سے زیادہ اپنی بیٹی سے دلچسپی ہونا چاہیے۔''

''لیکن بازرگان سے رابطہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میں اندازہ لگا چکا ہوں، اور پھر اس لڑکی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ اگر اس نے غلط جواب دیا تو میں سمجھ جاؤں گا۔ میرے اندازے میں بس ایک آدھ فیگر کا فرق ہو سکتا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' عندلیب نے راجو سے پوچھا۔

راجو نے اسے وہی سب کچھ بتا دیا جو مجھے بتا چکا تھا۔

سامعہ اس دوران میں بستر پر بیٹھی خاموشی سے ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ وہ ہمارا ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر اب سوچ بچار کا تاثر بھی تھا اور یہ قدرتی بات تھی۔ اس کے دماغ میں اس قسم کے سوالات تو ہوں گے کہ ہم لوگ کون ہیں اور اس کے باپ سے کیا چاہتے ہیں۔ اس کا امکان بہر حال تھا کہ وہ اپنے باپ کی پسِ پردہ سرگرمیوں سے ناواقف ہو، بلکہ میرے خیال میں تو یقیناً ایسا ہی تھا ورنہ ہم لوگوں سے اس کا رویہ کچھ اور ہوتا۔

''میں پوچھتا ہوں اس سے!'' میں نے کہا اور پھر سامعہ کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں بولا ''تمہارے والد کا موبائل نمبر کیا ہے۔''

''یہ تو میں تم لوگوں کو، ان سے بات کر کے ہی بتا سکوں گی۔'' سامعہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''خوب.....!'' راجو تلخی سے بولا ''گویا پہلے انہیں بتاؤ گی کہ تین نقاب پوش تمہارے سر پر مسلط ہیں؟''

''انہیں یہ تو بتانا ہی پڑے گا کہ ان کا نمبر مجھ سے کون معلوم کرنا چاہتا ہے۔'' سامعہ نے جواب دیا۔

راجو کا یہ قیاس غلط ثابت ہوا تھا کہ بازرگان کا موبائل نمبر لڑکی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ یہ غالباً اسی صورت میں ممکن تھا کہ سامعہ پر کسی قسم کا جبر کیا جاتا۔

عندلیب نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا ''بازرگان سے اس لڑکی کی بات تو کرانا ہی پڑے گی۔ اسے اسی طرح یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اب اس کی لڑکی ہمارے قبضے میں ہے لیکن یہاں.....اسی گھر میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔''

''تو پھر؟''

''اسے یہاں سے کہیں اور لے جانا ہوگا۔''

''اغوا!'' میں چونکا۔

''ہاں'' عندلیب نے جواب دیا ''اسے اغوا کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔''

''اسے کہاں لے جانا ہوگا۔''

''تمہارے ہی گھر لے جانا زیادہ بہتر ہوگا، لیکن پہلے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنا ضروری ہے۔ تمہارے گھر میں پہنچنے کے بعد اسے یہ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کہاں ہے۔''

''کیا یہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے گی؟''

''خوشی سے تو ظاہر ہے کہ نہیں جائے گی۔''

''اسے اپنے قریب بلا.....!'' راجو نے.....مجھ سے کہا ''میں اس کے پیچھے کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں دبا دوں گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کنپٹیوں پر کسی جگہ کتنا دباؤ ڈالنے سے آدمی کو کتنی دیر کے لیے بے ہوش کیا جا سکتا ہے۔ میں اسے آدھے گھنٹے کے لیے بے ہوش کر دوں گا۔''

عندلیب نے گہری نظر سے راجو کی طرف اور پھر معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کے دماغ میں کیا خیال آیا تھا۔ بار بار اس کے سامنے ایسی باتیں آ رہی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ راجو یقینی طور پر ایک جرائم پیشہ فرد ہے اور میں اب تک عندلیب کو یہی یقین دلاتا رہا تھا کہ راجو کا جرائم کی دنیا سے کوئی عملی تعلق نہیں۔

اس وقت میں نے عندلیب سے راجو کے بارے میں کچھ کہنا، وقت ضائع کرنے کے مترادف سمجھا اور بولا ''ٹھیک ہے۔ میں اسے قریب بلاتا ہوں۔'' میں نے سامعہ کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا ''کیا تم ہماری گفتگو میں شامل ہونا پسند کرو گی؟''

''کیا مطلب؟''

''یہاں آؤ.....''

''کیا چاہتے ہو؟'' اس کی آنکھوں سے شبہ جھانکنے لگا۔

راجو بڑبڑایا۔ ''اس معاملے میں تو زبردستی کرنی ہی پڑے گی۔''

''چلو ٹھیک ہے، ہم خود تمہارے قریب آ جاتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔

میرے ساتھ عندلیب اور راجو کے قدم بھی اٹھے تھے۔ یکایک سامعہ کسی ایسی ہرنی کی طرح وحشت زدہ نظر آنے لگی جیسے اس نے شکاریوں کی آہٹ سن لی ہو۔

''اب کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' وہ تیزی سے کہتی ہوئی بستر سے فرش پر کھڑی ہو گئی۔ ''پہلے تو تم نے کہا تھا کہ مجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔''

''ہم اب بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔'' عندلیب نے نرم لہجے میں کہا ''ہمارے کچھ معاملات بس تمہارے والد سے وابستہ ہیں۔''

''تم لوگ اب میرے قریب کیوں آنا چاہتے ہو.....!'' وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اس کے تنفس کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اب بھی عندلیب ہی بولی۔

سامعہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تھی۔ ہم تینوں اس کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے کہ وہ دروازے کی طرف نہیں بھاگ سکتی تھی لیکن اس نے دو ایک مرتبہ دروازے کی طرف دیکھا ضرور تھا۔

''تم نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کمرے میں کیسے آئے!'' عندلیب بولی۔

''دروازے تو لاک ہیں۔ تم لوگ کھڑکی سے آئے ہو گے۔ شاید میں اسے لاک کرنا بھول گئی تھی۔'' جواب دیتے ہوئے سامعہ کے لہجے میں لکنت بھی نہیں تھی لیکن وہ وحشت زدہ نظروں سے ہم تینوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔

پھر یکایک ایسا لگا جیسے وہ جھکائی دیتے ہوئے ہم تینوں کے نرغے سے نکل کر شاید دروازے کی طرف بھاگنا چاہتی ہو لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ عندلیب نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے اپنے قریب کر لیا تھا۔

''کوئی حماقت نہیں لڑکی!'' عندلیب نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں کس لیا۔

سامعہ نے دونوں ہاتھ عندلیب کے ہیلمٹ پر مارے اور اسی وقت راجو نے پیچھے سے اس کی کنپٹیوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر ایسا دباؤ ڈالا کہ میں نے سامعہ کی دونوں آنکھیں چڑھتی ہوئی دیکھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ عندلیب کی بانہوں میں اس طرح جھول رہی تھی جیسے اس کا جسم بے جان ہو گیا ہو۔

''اب اسے کم از کم آدھے گھنٹے میں ہوش آئے گا۔'' راجو نے اطمینان سے کہا۔

عندلیب نے سامعہ کو گھسیٹ کر اس کے بستر پر ڈال دیا۔

''اسے یہاں سے لے جائیں گے کس طرح؟'' میں نے متفکر نگاہوں سے عندلیب کی طرف دیکھا۔

''تمہاری کار جو ہے.....''

''کار تک کس طرح لے جائیں گے!''

''کیا تم ایک لڑکی کو بھی اپنے کندھے پر نہیں اٹھا سکتے؟''

''لڑکی.....'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں عندلیب.....! ہاں اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو اسے اپنے کندھے پر اٹھاتے ہوئے مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔''

عندلیب نے ایک طویل سانس لی اور کچھ سوچنے لگی۔

''اس کے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے برآمدے تک لے چلتے ہیں۔'' راجو بولا ''میں پھاٹک کھول دوں گا۔'' اس نے میری طرف دیکھا ''تو گلی سے اپنی کار اندر لے آ۔ پھر اسے کسی طرح کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیں گے۔''

سامعہ کو گھسیٹ کر لے جانا بھی میری دانست میں ایک بے دردانہ اقدام ہوتا لیکن اس کے سوا کوئی طریقہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

''چوکی دار کو تم نے اچھی طرح باندھ دیا تھا نا.....؟'' عندلیب نے راجو سے پوچھا۔

''پہلے جھوٹ بولا تھا میں نے'' راجو نے اطمینان سے کہا ''وہ بھی بے ہوش ہی پڑا ہوگا۔ اسے میں نے اس طرح بے ہوش کیا تھا کہ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہ آ سکے۔

ہمیں اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"عین وقت پر کہیں بازرگان نہ آجائے .....!" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"چند دن سے وہ کہیں غائب ہے۔" راجو بولا "اب آج عین اس وقت کہاں سے آجائے گا!"

"ایسے اتفاق ہوتے تو ہیں۔" عندلیب نے کہا "لیکن ہمیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ بس احتیاط ضروری ہے۔ پوری طرح چوکنا رہنا ہوگا۔"

"چل آجا .....!" راجو نے میری طرف دیکھا اور بستر پر بے حس وحرکت پڑی سامعہ کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا واضح اشارہ تھا کہ میں سامعہ کا دوسرا ہاتھ پکڑوں اور ہم دونوں اسے گھسیٹتے ہوئے برآمدے تک لے جائیں۔

پھر اچانک راجو کو جانے کیا خیال آیا کہ وہ سامعہ کے بستر کی سائڈ ٹیبل کی طرف جھپٹا، اور بات اس وقت میری سمجھ میں آئی جب راجو نے سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کی آڑ سے ایک موبائل اٹھایا۔ وہ موبائل یقیناً سامعہ ہی کا ہوگا جس پر میری نظر نہیں پڑ سکی تھی اور غالباً وہ عندلیب نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے راجو پھر سامعہ کے قریب پہنچتے ہوئے مجھ سے بولا "اس لڑکی کا موبائل بہت کام آسکتا ہے یارا .....! بازرگان کا موبائل نمبر اس کی میموری میں ضرور ہوگا۔"

"وہ ٹھیک ہے لیکن ....." میں اب بھی ہچکچا رہا تھا۔

راجو نے پھر سامعہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"لیکن کیا؟" عندلیب بولی۔

"اگر اسے گھسیٹ کر لے جایا گیا تو اس کا جسم کہیں کہیں سے چھل سکتا ہے۔ کسی لڑکی کے ساتھ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔"

عندلیب سے پہلے راجو منہ بناتے ہوئے بول پڑا۔ "یہ تجھے لڑکیوں سے اتنی ہمدردی کب سے ہونے لگی!"

"پہلے کبھی ایسی کوئی صورتِ حال سامنے آئی ہی نہیں۔"

"تو پھر میں اٹھا لیتا ہوں اسے" راجو نے سامعہ کا ہاتھ اپنے شانے پر رکھ کر دوسرا ہاتھ اس طرح سامعہ کی کمر میں ڈالا جیسے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لینا چاہتا ہو۔

اسی وقت کسی کار کے ہارن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کوئی آ ہی گیا۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ضروری نہیں ہے کہ وہ یہیں آیا ہو۔" عندلیب نے کہا۔ "آواز سے یہ اندازہ تو نہیں ہوا کہ وہ گاڑی اسی عمارت کے پھاٹک پر آکر رکی ہے۔"

ہارن کی آواز پھر سنائی دی لیکن اب بھی یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ ہارن دینے والی گاڑی اس عمارت کے پھاٹک پر آکر رکی ہوگی۔

"اب؟" راجو نے سوالیہ نظروں سے عندلیب کی طرف دیکھا۔

"ہمیں باہر نکلتے ہوئے محتاط رہنا ہوگا۔" عندلیب متفکر تھی۔

اسی وقت ہارن کی آواز تیسری مرتبہ سنائی دی۔

راجو، سامعہ کو اپنے کندھے پر ڈالے کھڑا تھا۔ وہ بولا "اس طرح تو میں یہیں کھڑے کھڑے تھک جاؤں گا۔"

اس مرتبہ پے در پے کئی مرتبہ ہارن دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھاٹک پر گاڑی والا جھنجلا گیا ہو۔

"ایک صورت اور ہوسکتی ہے۔" راجو بولا "جب میں یہاں آیا تھا تو ....."

وہ ایک دم چپ ہوگیا۔ اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل نے مترنم شور مچایا۔

میں سمجھ گیا کہ کال سامعہ کے موبائل پر آئی تھی۔ راجو کے موبائل کی آواز اس سے مختلف تھی۔

راجو نے جلدی سے سامعہ کو بستر پر ڈال کر جیب سے اس کا موبائل نکالا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا "یہ بازرگان ہی کی کال ہوسکتی ہے۔ میں نے جن نمبروں کا اندازہ لگایا تھا، وہی نمبر آیا ہے موبائل پر .....!"

"اس کا مطلب ہے ..... ہارن دینے والا بازرگان ہی ہے۔" میں نے عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے عندلیب! وہ خود ہی ہمارے جال میں آرہا ہے۔"

ہارن کی آواز پھر آئی۔ سامعہ کا موبائل... برابر مچلتا رہا تھا۔

عندلیب مجھ سے بولی "اسے اتنا آسان نہ سمجھو۔ ابھی وہ ہماری دسترس میں نہیں ہے، لیکن ....." وہ سوچتے ہوئے بولی "ایک تدبیر کی جاسکتی ہے۔ موبائل مجھے دو....."

عندلیب نے راجو کی طرف ہاتھ بڑھایا ..... راجو نے موبائل اسے دے دیا۔

عندلیب نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے اپنی آواز سامعہ کی آواز سے ملانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہیلو .....!"

نقل اتارنے میں عندلیب زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن بازرگان اس لیے دھوکا کھا سکتا تھا کہ سامعہ اس وقت سوتے سے اٹھ کر کال ریسیو کرتی۔ اسی مناسبت سے عندلیب بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہوگیا ہے .....؟ اور یہ چوکی دار کہاں جامرا ہے۔ اتنی دیر سے ہارن دے رہا ہوں" بازرگان غصے سے اتنی زور سے بولا تھا کہ اس کی آواز مجھے بھی سنائی دی۔ میں عندلیب کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔

"میں ابھی فون کی آواز سے جاگی ہوں نا ڈیڈی ....." عندلیب نے کہا "میں ابھی باہر نکل کر دیکھتی ہوں چوکی دار کو!"

"تم ہو کون؟" اس مرتبہ بازرگان کا لہجہ بڑا درشت تھا۔

عندلیب اسے دھوکا دینے میں ناکام رہی تھی۔

"میں سامعہ ہوں ڈیڈی .....!" عندلیب نے کوشش جاری رکھی۔

دوسری طرف سے فوراً رابطہ منقطع کردیا گیا۔

"بات نہیں بنی۔" عندلیب نے مایوسانہ انداز میں سامعہ کا موبائل اپنے کان سے ہٹالیا۔ "میں نے سوچا تھا کہ پھاٹک کھولنے کے بہانے اگر میں اس کی کار کے قریب پہنچ گئی تو اسے اپنے ریوالور کی نال پر رکھ لوں گی۔"

"اب کیا کیا جائے .....!" میں خاصا پریشان ہوگیا تھا۔

"غالباً اسے یہ شبہ بھی ہوگیا ہوگا کہ ہم عمارت کے اندر ہی ہیں۔ وہ ضرور اپنے اسکواڈ کے آدمیوں کو فون کررہا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت بھی اکیلا نہ ہو۔ ہم اس سے مقابلہ کیے بغیر باہر نہیں نکل سکتے اور گولیاں چلنے کی آوازیں کسی نہ کسی پولیس موبائل کو اس طرف لاسکتی ہیں۔"

"بس اب نکلنا چاہیے یہاں سے" راجو نے بڑی بےصبری سے سامعہ کو پھر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

"مگر ....." عندلیب کچھ سوچ رہی تھی۔

"ہم پچھلے دروازے سے نکلیں گے۔" راجو نے کہا "جب میں چھت سے نیچے اترا تھا تو بیرونی دروازے تک پہنچنے کی کوشش میں بھٹک کر پچھلے دروازے کی طرف چلا گیا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "تجھے میں نے پھاٹک کی طرف بھیج دیا تھا ورنہ اسی دروازے سے اندر بلا لیتا۔"

"گڈ!" میں نے کہا "اس طرح تو ہم بڑی خاموشی سے نکل جانے میں کامیاب رہیں گے۔"

"تم بھول رہے ہو کہ تم نے اپنی کار سڑک پر ہی کھڑی کی ہے۔" عندلیب نے مجھ سے کہا "بازرگان اسے شبے کی نظر سے دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے تو اپنی موٹر سائیکل قریبی گلی میں کھڑی کی تھی۔ وہ شاید بازرگان کی نظر میں نہ آئی ہو۔"

"اس کے بارے میں سوچ لیا ہے میں نے .....!" راجو بولا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

عندلیب نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کا لاک کھولتے ہوئے دروازے سے اس طرح کان لگائے جیسے باہر کی سُن گُن لینا چاہتی ہو۔ پھر غالباً وہ مطمئن ہوگئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا سوچ لیا ہے تو نے؟" میں نے راجو کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

عندلیب ہم سے پہلے ہی باہر نکل گئی تھی اور ریوالور ہاتھ میں سنبھالے اردگرد کے ماحول کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھی۔

"تجھے پچھلے دروازے پر رکنا ہوگا۔" راجو نے کہا "اس لڑکی کو میں دیوار سے ٹکا دوں گا۔" اس نے عندلیب کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اسے سنبھالے رہیں گی۔ میں تجھ سے کار کی چابی لے کر باہر جاؤں گا۔ بازرگان مجھے تو پہچان نہیں سکتا۔ میں تیری کار لے کر سیدھا نکل جاؤں گا اور چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے اس گلی میں آؤں گا۔"

"میں نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا تھا۔" عندلیب بولی۔

راجو کی ہمراہی میں ہم ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ سامعہ، راجو کے کندھے پر بے حس وحرکت پڑی تھی۔

ہارن کی آواز پھر نہیں سنائی دی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال چکرانے لگا کہ بازرگان اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا، کیا کر رہا ہوگا؟

"ایک امکان پر تم نے شاید غور نہیں کیا" میں نے عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر اس کے ساتھ ایک آدھ آدمی بھی ہوا تو وہ اسے پچھلے دروازے کی طرف ضرور بھیجے گا۔"

"میں اس پر سوچ چکا ہوں یارا!" راجو بول پڑا "باہر

کیا ماحول ہے، اس کا پتا مجھے ابھی چل جائے گا۔"

"کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دروازے تک پہنچنے کے بعد بتاؤں گا۔" راجو نے کہا۔

عندلیب اس کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ خود میں بھی الجھن کا شکار تھا کہ راجو کو باہر کے ماحول کا پتا کیسے چل جائے گا۔

آخر راجو ایک جگہ رکا "یہ ہے دروازہ" اس نے اشارے سے بتایا اور سامعہ کو اپنے کندھے سے اتار کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ عندلیب نے اسے سہارا دیا ورنہ وہ کسی طرف بھی لڑھک سکتی تھی۔

راجو نے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔ سامعہ کا موبائل بہ دستور عندلیب کے پاس تھا۔

راجو نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ میں اور عندلیب اب بھی اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں....." رابطہ قائم ہو جانے پر راجو نے کہا "کیا پوزیشن ہے باہر کی؟"

پھر وہ دوسری طرف کی آواز سنتے ہوئے بس "ہوں..... ہوں" کرتا رہا۔ اب عندلیب مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بس ٹھیک ہے۔" آخر راجو نے کہا۔

رابطہ منقطع کر کے اس نے مجھے اور عندلیب کو دیکھتے ہوئے کہا "جو شخص کار میں آیا ہے، اس کا حلیہ بتایا ہے مجھے کسی نے۔ وہ باز رگان ہی ہے اور اکیلا ہے، ہارن پر ہارن دینے کے بعد اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا تھا۔ دو تین جملوں کی بات کی تھی اس نے.....!"

عندلیب بولی "وہ وہی کال ہوگی جو میں نے ریسیو کی تھی۔"

"غالباً....." راجو نے جواب دیا "اس کے بعد وہ کار سے اتر کر اس طرف کھڑا ہو گیا تھا کہ عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے خود کو آڑ میں رکھے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے موبائل پر کئی کالیں کی تھیں۔ اس کے بعد سے وہ بس کھڑا ہوا ہے اپنی کار کے قریب، ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔"

"اس نے ضرور اپنے اسکواڈ کے لوگوں کو طلب کیا ہوگا۔" میں نے پُرجوش انداز میں کہا "اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ آئیں، ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔"

"چابی دے اپنی گاڑی کی" راجو نے مجھ سے کہا۔

میں نے چابی اسے دی اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"اب کیا کہو گے؟" عندلیب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "تم مجھے یقین دلاتے رہے ہو کہ راجو جرائم پیشہ نہیں ہے لیکن اب کیا سامنے آیا ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنے کسی جرائم پیشہ ساتھی کو یہاں پہلے ہی بلا لیا تھا۔ وہی کسی جگہ سے اس عمارت کی نگرانی کر رہا ہے۔ راجو نے موبائل پر اسی سے بات کی ہوگی لیکن راجو نے تمہیں بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ راجو نے یہ سب کچھ احتیاطاً کیا ہوگا اور اس آدمی کو ہدایت بھی کر دی ہوگی کہ وہ موبائل پر اس سے رابطہ نہ کرے۔ راجو یہ بات چھپانا چاہتا تھا کہ باہر اس کا کوئی آدمی موجود ہے۔ اب راجو کو مجبوراً ہی اس سے بات کرنا پڑی۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم!" میں نے آہستہ سے کہا "میں اس وقت راجو کی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اس کے یہ سارے اقدامات مجرمانہ ہیں تو یہ سب کچھ وہ صرف میری خاطر کر رہا ہے اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ کیا غیر مجرمانہ ہے؟ تم ایس ڈی ایم ہوتے ہوئے بھی کیا اس وقت غیر قانونی اقدامات نہیں کر رہی ہو؟"

عندلیب مجھے جواب دینے کے بجائے سامعہ کی طرف دیکھنے لگی۔ میری بات کا کوئی معقول جواب اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے جواب کے لیے اصرار نہیں کیا اور بات بدل دی۔ "تمہاری موٹر سائیکل کا کیا ہوگا؟"

"سامعہ کو لے کر تم دونوں نکل جاؤ" عندلیب نے کہا "میں کسی نہ کسی طرح آ جاؤں گی۔"

"اکیلی کسی خطرے میں نہ پڑ جاؤ!" میرے لہجے میں تشویش تھی۔

"خطروں سے کھیلنے کا شوق ہے مجھے، ورنہ میں یہ پیشہ اختیار نہ کرتی۔"

عندلیب نے جو کچھ کہا، اس پر مجھے کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ اس کے نام کے عدد 4 کی خصوصیات میں یہ ہے کہ ان میں بے پناہ خود اعتمادی ہوتی ہے جس کے باعث الجھنیں اور پریشانیاں ان کی مستقل مزاجی کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتیں۔ اس عدد کے حامل افراد نہایت عملی بھی ہوتے ہیں۔ حصولِ مقصد کے لیے یہ قواعد وضوابط کی پابندی ضروری خیال نہیں کرتے، اسی لیے عندلیب وہ سب کچھ کر

رہی تھی جو ایس ڈی ایم کے منصب پر فائز ہونے کے باعث اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ایک بات مجھے شروع ہی میں کہہ دینی چاہیے تھی لیکن میں کہانی کی رو میں بہتا رہا اور یہ بتانا بھول گیا کہ چار کے عدد کے حامل افراد آسانی سے کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ عملیت پسندی اس میں رکاوٹ بنتی رہتی ہے۔ ایک اچھے گھرانے کا نوجوان یا سراس سے شادی کا خواہش مند تھا اور عندلیب بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن اس سے شادی کے معاملے کو وہ خاصے عرصے سے ٹالے ہوئے تھی۔

یہ سب باتیں برسبیلِ تذکرہ آ گئیں جبکہ میں اور عندلیب اس وقت ایک نازک پوزیشن میں تھے۔ بہ ظاہر تو عقبی دروازے سے نکلنے کی صورت میں خطرے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا لیکن حالات کس وقت کیا کروٹ لے بیٹھیں، انسان کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ جب ہم سامعہ کے کمرے میں تھے تو ہمیں یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ کئی دن تک گھر سے غائب رہنے والا باز رگان اس وقت اچانک وہاں پہنچ جائے گا لہٰذا اب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جب ہم اس عمارت سے باہر نکلتے تو کیا ہوتا۔

راجو کا انتظار میں نے اور عندلیب نے بڑی بے چینی سے کیا۔ ہمیں کوئی پندرہ منٹ بعد دروازے کے باہر کار رکنے کی آواز آئی۔ میں نے آواز سے سمجھ لیا کہ وہ میری ہی کار تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ راجو کار روکتے ہی اس سے اترا تھا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، وہ جھپٹ کر اندر آ گیا۔

"جلدی کرو" اس نے سامعہ کو اپنے کندھے پر اٹھاتے ہوئے کہا "ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک کار باز رگان کی کار کے قریب آ کر رکی ہے۔ غالباً اس کے اسکواڈ کا کوئی آدمی آ گیا ہے۔"

میرے یا عندلیب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ سامعہ کو کندھے پر ڈالے، دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے میں نکلا۔

"خدا حافظ! میں جلد ہی پہنچوں گی تمہارے گھر۔" عندلیب نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

باہر نکلتے نکلتے میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سامعہ کا موبائل فون عندلیب نے میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ یہ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

راجو نے سامعہ کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا اور کار کی چابی میری طرف بڑھا دی۔ "تو چلا گاڑی۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ سامعہ کو اب دس بارہ منٹ میں ہوش آ سکتا ہے۔ میں اسے دوبارہ بے ہوش کر دوں گا۔"

میں بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اور راجو نے بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

"تیری دوست کیوں نہیں آئی؟" راجو نے چونک کر پوچھا۔

"وہ خود ہی آ جائے گی کسی طرح....." میں جواب دیتے ہوئے کار حرکت میں لے آیا۔ راجو نے انجن اسٹارٹ ہی چھوڑ دیا تھا۔

کار حرکت میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز کار کی باڈی سے ٹکراتی ہوئی گزری تھی۔

"تیز چلا!" راجو کا انداز چیخ پڑنے کا سا تھا۔

عقبی آئینے میں مجھے ایک آدمی نظر آ گیا تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ غالباً اسی پستول سے چلائی ہوئی گولی کار کی باڈی سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری تھی لیکن پستول میں لگے ہوئے سائیلنسر کی وجہ سے دھماکا نہیں ہوا تھا۔

وہ یقیناً ایکشن اسکواڈ کا آدمی ہوگا جسے باز رگان نے پچھلے دروازے کی طرف بھیجا تھا۔

میں نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے دوسرا گیئر ڈالا۔

"دوسری بار اس کا نشانہ بالکل خطا گیا ہے۔" میں نے راجو کی آواز سنی "میرا خیال ہے اس نے ٹائر کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔"

میں نے رفتار تیزی سے بڑھاتے ہوئے کار تیسرے گیئر میں ڈالی۔

"اب وہ پے در پے گولیاں چلا رہا ہے۔" راجو نے بتایا "لیکن اب ہماری کار اس کی رینج سے نکل چکی ہے۔ بائیں جانب ایک موڑ آ رہا ہے۔ اسی طرف موڑ لے گاڑی۔"

موڑ لینے کے لیے مجھے بریک لگانا پڑے۔ رفتار کافی تیز تھی۔ بریکوں کی "چیخوں" کے ساتھ میں نے وہ خطرناک موڑ کاٹا اور رفتار پھر بڑھائی۔

"وہ ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔" راجو بولا "جو بھی موڑ آئے، مڑتا رہ.....! اسی طرح انہیں ڈاج دیا جا سکتا ہے۔"

"پروا مت کر!" میں نے کہا "اب ہم نکل جائیں گے۔"

مجھے اس وقت عندلیب کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔

اس کی خود اعتمادی اور صلاحیتوں پر مجھے بھی اعتماد تھا۔ وہاں سے وہ کسی نہ کسی طرح نکل ہی آتی۔ میرے لیے اس وقت سب سے اہم یہ تھا کہ ہم سامعہ کو نکال لے جائیں۔ یہ ایسی یرغمال تھی جس کی بنیاد پر ہمیں احمر اور فرخندہ یقیناً واپس مل جاتیں۔

راجو چپ رہا۔ میں نے عقب نما آئینے کا زاویہ اس طرح تبدیل کیا کہ پچھلی نشست کا جائزہ لے سکوں۔ نشست کا تین چوتھائی حصہ سامعہ کے بے حس و حرکت جسم نے گھیر رکھا تھا۔ باقی حصے میں راجو اس طرح بیٹھا تھا کہ سامعہ کا سر اس کی گود میں تھا۔

راجو سمجھ گیا کہ میں پچھلی نشست کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اس نے عقب نما آئینے میں میرے چہرے کے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میں نے اس کا سر اپنی گود میں اس لیے رکھا ہے کہ جیسے ہی اسے ہوش آئے، میں اسے بے ہوش کر دوں۔''

راجو کی اس ''صفائی'' کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے خود بھی اندازہ تھا کہ سامعہ کا سر اس نے اپنی گود میں اس لیے ہرگز نہیں رکھا ہوگا کہ وہ ایک لڑکی کا سر تھا۔ لڑکیوں سے راجو کو قطعاً کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کئی اچھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی اسے پسند کرتی تھیں اور ان میں سے ایک تو راجو کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش بھی کر چکی تھی لیکن راجو نے تب بھی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ میں اس معاملے میں اسے ''سفاک'' سمجھتا تھا۔

کار میں نے کئی سمتوں میں موڑی تاکہ تعاقب کرنے والا ہم تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر اب بھی کوئی میری کار تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ایک عجیب ہی اتفاق ہوتا۔

کار کی رفتار بھی میں نے اس حد تک کم کر دی تھی کہ اگر کہیں کوئی پولیس موبائل مل جائے تو وہ ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرے اور اسے ہم پر شبہ بھی نہ ہو۔ میری یہ احتیاط کام بھی آئی۔ ایک سڑک پر ایک پولیس موبائل سے سامنا ہو گیا تھا لیکن وہ ہمیں نظر انداز کر کے گزرتی چلی گئی تھی۔ بازرگان کے گھر سے روانگی کے بعد میں نے اور راجو نے اپنے چہروں سے رومال ہٹا لیے تھے۔

راجو اور سامعہ کو دیکھنے کے بعد عقب نما آئینے کا زاویہ میں نے پھر درست کر دیا تھا تاکہ اگر پیچھے کوئی گاڑی آئے تو مجھے دکھائی دے جائے۔

''اسے ہوش آنے لگا تھا۔'' میں نے راجو کی آواز سنی ''میں نے اسے پھر بے ہوش کر دیا ہے۔''

یقیناً راجو نے وہی کنپٹیاں دبانے والا حربہ استعمال کیا ہوگا۔ اس بارے میں راجو سے کچھ کہنے کی مجھے مہلت نہیں ملی۔ میری جیب میں پڑا موبائل کھٹکنے لگا تھا۔ اس کی آواز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ سامعہ کا موبائل نہیں تھا جو عندلیب نے میری جیب میں ڈال دیا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر اپنا موبائل فون نکالا۔ کال کرنے والی عندلیب تھی۔ میں نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا ''کیا تم وہاں سے نکل آئیں؟''

''ہاں.....'' عندلیب نے جواب دیا ''تم لوگوں کے پیچھے تو کوئی نہیں ہے؟''

''روانگی کے وقت کسی نے کار پر فائرنگ کی تھی لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ممکن ہے بازرگان نے اس شخص کو ہمارے تعاقب میں دوڑایا ہو لیکن میں نے اتنے راستے تبدیل کیے ہیں کہ وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکا۔ یا شاید بازرگان بھی تعاقب میں دوڑا ہو لیکن.....''

''نہیں'' عندلیب نے میری بات کاٹی ''بازرگان تو کسی طرح گھر میں آ گیا تھا۔ شاید وہ پھاٹک پر چڑھ کر اندر کودا تھا۔ وہ سیدھا سامعہ کے بیڈروم میں پہنچا تھا۔ میں کسی جگہ چھپی ہوئی تھی۔ وہ بہت غصے میں سامعہ کے کمرے سے نکل کر گھر میں اِدھر اُدھر چکراتا رہا تھا۔ اس نے سامعہ کو آوازیں بھی دی تھیں۔ مایوس ہو کر وہ بہت تیزی سے باہر چلا گیا۔ شاید وہ چوکیدار کو دیکھنے گیا ہو لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ میں بھی پچھلے ہی دروازے سے نکل کر اپنی موٹر سائیکل تک پہنچی تھی۔''

''شکر یہ کہ وہاں تمہارا کوئی تصادم نہیں ہوا.....''

''تم ابھی اپنے گھر کے راستے ہی میں ہو گے نا.....؟''

''ظاہر ہے۔ اتنی جلدی گھر کیسے پہنچ جاؤں گا۔''

''تمہیں اب اپنے گھر جانا بھی نہیں ہے۔''

''کیوں.....؟''

''تم نے کار جہاں کھڑی کی تھی، اس پر بازرگان کی نظر تو پڑی ہوگی پھر اس کے اسکواڈ کا آدمی بھی تم لوگوں کو اسی کار میں فرار ہوتے دیکھ چکا ہے۔ بازرگان بڑی آسانی سے پتا لگا لے گا کہ یہ تمہاری کار ہے۔ پتا لگانے کے بعد وہ تمہارے گھر پر دھاوا ضرور بولے گا۔''

''تو پھر؟'' میرے لہجے میں تشویش پیدا ہو گئی۔

''ابھی فون پر مسز خان سے فون پر میری بات ہو چکی ہے۔ اس سے ملنا ہوگا تمہیں!''

''کہاں.....؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

میں نے اسے بتایا کہ اس وقت میری کار کس سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

عندلیب بولی ''گویا تم اب کے ایف سی کے قریب ہو؟''

''ہاں۔''

''تم کے ایف سی سے ذرا آگے نکل کر گاڑی روک دینا۔ میں ابھی فون کر کے مسز خان کو بتا دیتی ہوں۔ جلد ہی ان کی کار تمہاری کار کے قریب پہنچے گی۔ تم مسز خان کو پہچان ہی لو گے۔ جب تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لو گے تو وہ اپنی کار آگے نکال لے جائے گی۔ تم اس کی کار اس کے پیچھے لگا دینا۔''

''وہ ہمیں کہاں لے جائے گی۔''

''ایک بنگلے میں سوشل ورکرز یونین کا دفتر ہے لیکن دراصل اس کا تعلق مسز خان کی کونسل سے ہے۔ فی الحال وہی تمہارے لیے ایک محفوظ جگہ ہوگی۔''

میں نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا ''میں اب کے ایف سی کے بالکل قریب پہنچ چکا ہوں۔''

''بس ذرا سا آگے نکل کر رک جانا۔ میں مسز خان سے بات کر کے تمہیں دوبارہ رنگ کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ راجو اس بارے میں استفسار کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ عندلیب سے کیا بات ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ راجو اس بارے میں کوئی تبصرہ کرتا، میری جیب میں پڑے ہوئے سامعہ کے موبائل فون کی آواز آئی۔ اس وقت میں کے ایف سی سے ذرا آگے نکل کر گاڑی روک چکا تھا۔

میں نے جلدی سے سامعہ کا موبائل فون نکالا۔

''یہ کال بازرگان ہی کی ہوگی۔'' راجو بولا ''پھر فوراً ہی اس نے پوچھا ''کیا بات کرے گا اس سے!''

''تو ابھی خود سن لے گا۔'' میں نے کہا اور موبائل آن کرتے ہوئے کان سے لگایا۔ ''ہیلو!''

''کون بول رہا ہے؟'' دوسری طرف سے غراتے ہوئے اردو ہی میں کہا گیا لیکن اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بولنے والے کی مادری زبان نہیں تھی۔

''تم میرا نام ایکس، وائی، زیڈ، کچھ بھی سمجھ سکتے ہو.....''

''تمہارے پاس سامعہ کا فون ہے!''

''یقیناً''

''سامعہ کہاں ہے؟'' وہ اس طرح بول رہا تھا کہ اگر میں اس کے سامنے ہوتا تو وہ مجھے پھاڑ کھاتا۔

''وہ ہمارے قبضے میں ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''وہ عورت کہاں ہے جس نے سامعہ کی آواز بنانے کی کوشش کر کے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔''

''اس سے تمہیں کیا مطلب؟''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان معاملات میں ''کی مین'' کون ہے؟''

''مجھے ہی سمجھ لو.....''

''سامعہ کے اغوا کا مقصد؟'' وہ یقیناً بازرگان ہی تھا۔

''احمر اور فرخندہ کو تم ہمارے حوالے کر دو۔ سامعہ تمہیں واپس مل جائے گی۔''

''فرخندہ؟'' لہجے میں حیرت تھی۔ یہ کون ہے.....؟ اور یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ احمر میرے پاس ہے۔''

میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ اس نے احمر کے نام کے ساتھ پرنسز کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

''احمر کو تم نے یا تمہارے ایکشن اسکواڈ نے ہی اغوا کیا ہے بازرگان! اور اس کے ساتھ فرخندہ کو بھی۔''

''فرخندہ نام کی کسی لڑکی کو تو میں جانتا بھی نہیں ہوں اور احمر کو ہم یقیناً اغوا کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ابھی تک ہمارے ہاتھ نہیں لگی ہے۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم!''

''کیا تم زنجانی کے ساتھیوں میں سے ہو.....؟''

''ہم کالے چور کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے تو ہمارا مطالبہ پورا کر دو۔''

اسی وقت جیب میں پڑے ہوئے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے فون نکال کر اسے آن کرتے ہوئے ہاتھ پیچھے کر کے فون راجو کی طرف بڑھایا اور اسے اشارہ کیا کہ بات کر لے۔ میں دیکھ چکا تھا کہ کال کرنے والی عندلیب ہی تھی۔

''تمہارا فون آیا ہے۔'' دوسری طرف سے بازرگان بولا ''میں نے گھنٹی کی آواز سنی ہے۔ شاید ندرتی نے فون کیا ہوگا!''

''میں نے فون بند کردیا ہے۔ تم مجھ سے بات جاری رکھ سکتے ہو۔''

راجو اس وقت بہت دھیمی آواز میں عندلیب سے بات کررہا تھا۔ اس کی آواز مجھ تک بھی بہ مشکل پہنچ رہی تھی۔ اس کے الفاظ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لہٰذا یہ اندیشہ نہیں تھا کہ بازرگان اس کی آواز سن لیتا۔

''سامعہ کو اغوا کر کے تم لوگوں نے حماقت کی ہے۔ اگر احمر کو واقعی اغوا کرلیا گیا ہے تو ایسا کرنے والا کوئی اور ہوگا۔''

''کسی اور کو احمر سے اتنی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔''

''یقین کرو کہ.....''

''سودے کی بات کرو بازرگان! ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے ذرا سا سر گھما کر کن انکھیوں سے دیکھا کہ راجو نے عندلیب سے بات کرنے کے بعد فون بند کردیا تھا۔

''تم جس چیز کا سودا کرنا چاہتے ہو، وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو پھر سامعہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔''

میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں بازرگان پر ذہنی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے بہت فکرمند ہوگا۔ وہ یقیناً مجھ سے پھر رابطہ کرتا اور میں اس پر دباؤ ڈالتا کہ وہ صرف ''اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے'' کی بات کرے۔

''ہاں'' میں راجو کی طرف متوجہ ہوا ''وہ کیا کہہ رہی تھی۔''

''مسز خان کو یہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' راجو نے جواب دیا' پھر پوچھا ''بازرگان کیا کہہ رہا ہے؟''

''وہ انکار کررہا ہے کہ اس نے احمر کو اغوا کیا ہے یا کروایا ہے۔ اس نے یہ ڈراما بھی کیا تھا جیسے فرشتہ کو جانتا ہی نہ ہو۔'' میں نے راجو کو بتایا، پھر کہا ''لیکن اسے جھکنا تو پڑے گا۔ ابھی پھر آنا چاہیے اس کا فون! یہ تو نے بڑا اچھا کیا کہ سامعہ کا موبائل فون اٹھا لایا۔ اب ہمیں اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی سامعہ کے موبائل سے رابطہ کرتا رہے گا اور اس سے میری بات چیت ہوتی رہے گی۔''

اسی وقت میرے ہاتھ میں دبے ہوئے سامعہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور میں نے دھیرے سے ہنس کر راجو سے کہا ''دیکھا.....! وہ خود ہی بہت بے قرار ہوگا۔ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اسے اپنے بڑوں سے غداری کرنا ہی پڑے گی۔''

میں نے موبائل آن کرتے ہوئے کان سے لگایا ''ہاں بازرگان.....! کیا تم سودا کرنے کے لیے تیار ہوگئے ہو؟''

''سامعہ سے بات کراؤ میری!''

''تم کیا سمجھ رہے ہو؟ کیا وہ ہمارے قبضے میں نہیں ہے؟''

''میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کردی جائے گی لیکن فی الحال سامعہ کو ہم نے بے ہوش کر رکھا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد اس سے بھی تمہاری بات کرادی جائے گی لیکن یہ فیصلہ تو کرو کہ سودا کرنا چاہتے ہو یا نہیں.....!''

''سامعہ کو بے ہوش کیوں کیا ہے تم نے.....؟''

''وہ ہوش میں ہوتی تو آسانی سے ہمارے ساتھ نہیں چلتی۔ مجبوراً اسے بے ہوش کرنا پڑا۔ ہم اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے بازرگان! تم بس سودے کی بات کرو۔''

''تم لوگ کس کے لیے کام کررہے ہو؟''

''تم نے پھر فضول باتیں چھیڑ دیں۔ میں صرف سودے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم ایک ایسا مطالبہ کررہے ہو جو میں پورا کر ہی نہیں سکتا۔''

''تو پھر ہماری بات چیت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔''

میں نے پھر رابطہ منقطع کردیا۔ میری دانست میں بازرگان پر ذہنی دباؤ اسی طرح بڑھایا جاسکتا تھا۔

میں نے مسکرا کر پھر راجو کی طرف دیکھا ''ابھی اس کا فون پھر آئے گا۔ وہ مجبور ہے یہ سودا کرنے کے لیے۔''

راجو نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ غالباً وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مسز خان کے آنے میں اب کتنی دیر تھی۔

''یہ لڑکی.....'' میں نے سامعہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس کے نام نے مجھے الجھن میں ڈال

رکھا ہے۔ مجھے شروع ہی سے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے یہ نام پہلے بھی کہیں سنا ہے۔''

''تیری یونیورسٹی میں تو نہیں ہے اس نام کی کوئی لڑکی؟''

''یونیورسٹی میں تو..... اوہ!'' میں کہتے کہتے چونکا ''اب یاد آگیا۔ مجھے اس کے بارے میں نجیب نے بتایا تھا۔''

''وہ جو قتل ہوگیا؟''

''ہاں.....'' میں نے کہا ''قتل سے پہلے جب میں نے اس سے بات کی تھی تو اس نے ایک ایرانی لڑکی کا ذکر کیا تھا جو کچھ معلومات حاصل کرنے یونیورسٹی آئی تھی۔ اس لڑکی کے کہنے کے مطابق وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی تھی اور اس لڑکی کا نام نجیب نے سامعہ بتایا تھا۔''

''شہر میں اس نام کی صرف یہی ایک لڑکی تو نہیں ہوگی!''

''میں نے ابھی بتایا نا کہ یونیورسٹی میں آنے والی وہ لڑکی بھی ایرانی تھی اور یہ تو میرے خیال میں بڑا غیر معمولی اتفاق ہوگا کہ ہمارے شہر میں دو ایرانی لڑکیاں ایک ہی نام کی ہوں.....''

''اگر یہی سامعہ تیری یونیورسٹی گئی تھی تو ممکن ہے اس کا مقصد واقعی یہ ہو کہ وہ داخلے کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آئی ہو'' راجو نے کہا ''کیا تو یہ بات کسی اور نظر سے دیکھ رہا ہے؟''

''ہاں.....'' میں نے کہا ''کیونکہ یہ بازرگان کی لڑکی ہے اور مجھے نجیب کے قتل کے معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی جاچکی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یونیورسٹی جانا معنی خیز بھی ہوسکتا ہے۔''

''یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب بازرگان کو پہلے ہی سے کچھ دشمنی ہو تجھ سے'' راجو نے کہا ''اسی صورت میں وہ تجھے کسی سنگین معاملے میں پھنسانے کی کوشش کرسکتا ہے لیکن اس صورت میں بھی سامعہ کا یونیورسٹی جانا کیوں ضروری تھا.....؟ اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت بازرگان تجھے جانتا بھی نہیں ہوگا۔ احمر کا معاملہ تو بعد میں کھڑا ہوا ہے۔''

''میں الجھن کا شکار ہوگیا ہوں۔ دلیلیں تو غلط نہیں ہیں تیری۔'' میں نے کہتے ہوئے متفکر نگاہوں سے سامعہ کی طرف دیکھا' پھر پوچھا ''دوبارہ تو نے اسے کتنی دیر کے لیے بے ہوش کیا ہے؟''

''وہی.....ایک آدھ گھنٹے کے لیے.....''

''مسز خان کے آنے تک بیس منٹ تو گزر ہی چکے ہوں گے۔''

''اب یہ تو معلوم نہیں کہ مسز خان ہمیں کہاں لے جائے گی۔ اگر راستہ دس منٹ سے زیادہ کا ہوا تو میں اسے ایک بار پھر بے ہوش کردوں گا۔''

''یہ حیرت انگیز فن تو نے سیکھا کہاں سے کہ جتنی دیر کے لیے کسی کو بے ہوش کرنا چاہے، اتنی ہی دیر کے لیے بے ہوش کردے۔''

''وہ آکوپنکچر کا ایک چینی ماہر تھا۔''

اسی وقت میری نظر اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے سامعہ کے موبائل پر پڑی، میرے اندازے کے مطابق اتنی دیر میں بازرگان کا فون پھر آجانا چاہیے تھا۔ مجھے تھوڑی سی الجھن ہوگئی۔ بازرگان کی بے تابی ختم ہوجانا میرے لیے تعجب خیز تھا۔

پھر اتنا وقت گزر گیا کہ پیچھے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی لیکن اس کا رخ ہماری کار کی طرف ہی تھا۔

''یہ مسز خان ہی ہوسکتی ہے۔'' راجو بڑبڑایا۔

اسی وقت سامعہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فوراً کال ریسیو کی ''ہاں بازرگان!'' میں نے ماؤتھ پیس میں کہا ''غالباً تم نے سمجھ لیا ہے کہ سودا کرنا تمہاری مجبوری ہے۔''

''میں پہلے سامعہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میرا منہ بن گیا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔''

''ابھی تک بے ہوش ہے؟''

اسی وقت پیچھے سے آنے والی کار میری کار کے برابر سے بہت دھیمی رفتار سے گزری، میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی مسز خان کو پہچان لیا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر مسز خان نے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی۔

میں نے جلدی سے ماؤتھ پیس میں کہا ''اب تم فیصلہ کیے بغیر میرا وقت برباد نہ کرنا۔''

میں نے رابطہ منقطع کرکے انجن اسٹارٹ کیا۔ عندلیب کی ہدایت کے مطابق مجھے اپنی کار مسز خان کے پیچھے رکھنا تھی۔

''راجو!'' میں آہستہ سے بولا ''کیا یہ میرا وہم تھا؟''

''کیا.....؟'' راجو نے پوچھا۔

''میری طرف دیکھتے ہوئے مسز خان کے چہرے پر ایسے تاثرات نہیں تھے جیسے وہ ہماری اس کامیابی سے..... میرا مطلب ہے..... سامعہ کے اغوا سے خوش ہو.....''

''میں نے بس یہ محسوس کیا کہ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔''

''اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا راجو.....! عندلیب نے اسے پہلے تو احمر کے اغوا کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن بات جب یہاں تک پہنچ چکی ہے تو عندلیب نے مسز خان کو یقیناً سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ ایسی صورت میں مسز خان کو کیا یہ سوچ کر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ اب ہم سامعہ کے بدلے میں احمر کو آزاد کرا سکتے ہیں!''

''شاید وہ اس پر کچھ ناراض ہو کہ احمر کے اغوا کی بات اس سے چھپا کر رکھی گئی۔''

''ہوں.....'' میں چپ ہو گیا..... پھر اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے راجو سے پوچھا ''عندلیب نے بتایا تو ہوگا! وہ بھی پہنچ رہی ہے نا وہاں.....؟''

''ہاں، کہا تو یہی تھا۔'' راجو نے جواب دیا ''اس کے الفاظ تو یہی تھے کہ وہ شاید دو چار منٹ کی تاخیر سے پہنچے۔''

''اس سے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے بس پہنچنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سارے معاملے کو مسز خان اپنے کنٹرول میں لینے کی کوشش کرے۔ احمر کے لیے میں اب کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ مسز خان نے دخل اندازی کی تو میں سخت رویہ اختیار کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا اور اس طرح بات خراب ہو جائے گی۔ عندلیب وہاں ہوگی تو معاملے کو سنبھال لے گی۔''

''تو اتنا زیادہ کیوں سوچ رہا ہے؟ مسز خان سارا معاملہ پوری طرح اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کیوں کرے گی۔''

''اس کے چہرے پر میں نے ایسا ہی تاثر دیکھا تھا جیسے احمر کے اغوا ہو جانے کی اطلاع نے اس کا موڈ خراب کر دیا ہو۔''

''پہلے سے اتنا زیادہ سوچ لینا بے وقوفی ہے۔'' راجو نے کہا ''مسز خان کوئی جاہل عورت تو نہیں ہوگی نا.....! وہ یہ کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے کہ احمر اور فرخندہ کی بازیابی کے لیے تو نے بازرگان کی بیٹی کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لیا ہے۔''

''تیری باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن جانے کیوں، مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔''

''وہم ہے تیرا.....''

میں چپ ہو گیا۔

میری کار مسز خان کی کار کے پیچھے دوڑتی رہی۔

''اب تو اس لڑکی کے ہوش میں آنے کا وقت ہو گیا ہے۔'' راجو کچھ دیر بعد بولا ''یہ کسمسانے لگی ہے۔''

''پھر کام دکھا دے اپنا'' میں اسی سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ مسز خان سے میری کچھ نہ کچھ ہو سکتی ہے۔

دو تین منٹ اور گزر گئے۔ اب ہماری گاڑیاں ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو چکی تھیں۔ مسز خان کی کار کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔

''شاید وہ بنگلا قریب آ گیا ہے۔'' راجو بولا۔

اسی وقت میرے موبائل فون نے گنگنانا شروع کیا۔ موبائل راجو کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے موبائل فون لیا اور کان سے لگایا۔ میں نے کال کرنے والے کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ عندلیب ہی کی کال ہو سکتی تھی لیکن دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر میں ذرا سا چونک گیا۔ مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ مسز خان مجھے کال کرے گی۔

''مسز خان بول رہی ہوں۔ میری آواز تو پہچان گئے ہو گے!''

''ہوں.....!'' میں نے طویل سانس لی۔

''جلد ہی میری کار ایک بنگلے کے سامنے رکے گی۔ میں ہارن دوں گی تو پھاٹک کھل جائے گا، اس وقت میں اپنی کار پیچھے کر لوں گی۔ تم اپنی کار اندر لے جانا..... میں تمہارے پیچھے آؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ جب ہماری کاریں اندر کھڑی ہوں تو تمہاری کار میری کار کی آڑ میں چھپ جائے۔ پھاٹک سے کوئی تمہاری کار نہ دیکھ سکے۔''

''اب اس وقت تو شاید اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں'' میں نے کہا۔

''میں ضروری سمجھ رہی ہوں۔''

میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہا ''اچھا ٹھیک ہے۔''

میں نے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ ''یہ مسز خان تھی۔'' میں نے راجو کو یہ بھی بتایا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی، پھر بولا ''ابھی سے اس کا انداز حاکمانہ ہو گیا ہے۔''

''او تجھے کیا ہو گیا ہے یار! کیوں اس طرح سوچے جا رہا ہے۔ ارے یہ اس کی یونین کے دفتر کا بنگلا ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی محتاط رہنا چاہتی ہوگی۔''

اس وقت مسز خان کی کار تھوڑی سی ترچھی ہو کر ایک بنگلے کے پھاٹک پر رکی تو مجھے بھی اپنی کار روکنا پڑی، مسز خان نے ہارن دیا۔

بنگلے کے چوکی دار کو، یا بنگلے میں جو کوئی بھی تھا، اسے غالباً پہلے ہی سے فون پر ہدایت کی جا چکی تھی کہ ہارن کی آواز کے بعد پھاٹک کھلنے میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔

پھاٹک کھلتا نظر آیا اور مسز خان نے اپنی کار پیچھے ہٹائی۔ اس نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اشارہ کیا تھا کہ میں کار آگے بڑھاؤں اور بنگلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہو جاؤں۔

اسی وقت سامعہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کال بازرگان ہی کی تھی، میں نے کار آہستگی سے حرکت میں لاتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو!''

''کیا..... میرا مطلب ہے..... اب تو سامعہ کو ہوش آ گیا ہوگا!''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ پہلے صرف سودے کی بات ہوگی۔'' میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے مجھے غصہ آ گیا ہو۔

رابطہ منقطع کرتے ہوئے میں کار پھاٹک سے اندر لے گیا۔

میں اب یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی۔ گیند اب بازرگان کے کورٹ میں تھی۔ اپنی بیٹی کی خاطر وہ مجبور تھا کہ احمر اور فرخندہ کو واپس لوٹا دیتا۔

احاطے میں مکمل تاریکی رکھی گئی تھی۔ ایک جگہ کھڑے ہوئے پختہ عمر کے ایک شخص نے مجھے کار روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کے قریب کار روکتے ہوئے ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور انجن بھی بند کیا۔

''لڑکی کو لے کر جلدی سے اتر آئیں۔'' اجنبی نے تیزی سے انگریزی میں کہا۔

راجو اس سے پہلے ہی کار کا دروازہ کھول چکا تھا۔

جب میں نے اتر کر کار کا دروازہ بند کیا تو راجو پچھلی نشست پر پڑی ہوئی سامعہ کو باہر کھینچ رہا تھا۔

پھاٹک سے مسز خان کی کار اندر آ رہی تھی۔ اس نے پہلے ہی سے ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔

راجو نے سامعہ کو کار سے نکال کر پھرتی سے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔

''میرے ساتھ آیئے!'' اجنبی پھر جلدی سے بولا۔

مسز خان کی کار ہماری کار کے عین پیچھے رکی۔

اجنبی کی بے حد عجلت کے احساس کی وجہ سے میں نے مسز خان کا انتظار کیے بغیر اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ میرے ساتھ راجو بھی تھا۔

اندھیرے ہی میں اجنبی نے مرکزی دروازہ کھولا اور ہم اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ اجنبی نے اب ٹارچ روشن کر لی تھی۔ کچھ آگے بڑھ کر ہم ایک اور دروازے سے گزرے۔ وہاں کے ساز و سامان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کانفرنس روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ وہاں روشنی بھی تھی۔

اجنبی آگے بڑھتا رہا اس لیے میں اور راجو بھی اس کے پیچھے قدم بڑھاتے رہے۔ آخر وہ ہمیں لیے ہوئے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا۔

''لڑکی کو بستر پر ڈال دیجیے!'' اجنبی بولا ''میں اسی کمرے میں رہتا ہوں تاکہ بنگلا رات کو بالکل خالی نہ رہے۔ باقی کمروں کو دفاتر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔''

راجو نے سامعہ کو بستر پر ڈال دیا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مسز خان ابھی نہیں آئی تھی۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں'' اجنبی نے کہا ''میڈم پھاٹک بند کروا کے آ ہی رہی ہوں گی۔''

''بیٹھنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے سامعہ کے موبائل فون پر نظر ڈالی، میں بے چین تھا کہ بازرگان مجھ سے پھر رابطہ کرے اور اس سے سودے کی بات ہو جائے۔

کمرے کے باہر اونچی ایڑیوں کی سینڈل کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ میں سوچنے لگا کہ مسز خان سے کس انداز میں بات کی جائے۔

راجو بے پروائی کے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

ہمارے اجنبی ''میزبان'' کی بے چین نظریں دروازے کی طرف بھی تھیں۔ اس سے پہلے وہ متفکر نگاہوں سے بستر پر ساکت پڑی سامعہ کی طرف بھی دیکھتا رہا تھا۔

مسز خان کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر میں نے وہی پہلے جیسے تاثرات دیکھے جن کی وجہ سے سوچتا رہا تھا کہ اس سے میری جھڑپ نہ ہو جائے۔ عندلیب وہاں جلد از جلد پہنچ جاتی تو اچھا تھا۔

مسز خان کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی بھی اندر آیا اور میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ اس آدمی کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کا رخ مسز خان کی طرف تھا۔

پھر فوراً ہی دو اور آدمی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک یقیناً بازرگان تھا۔ ایک ریوالور مجھے اس کے ہاتھ میں بھی نظر آیا۔

''خبردار!'' وہ مجھے گھورتا ہوا بولا ''کوئی بھی غلط حرکت کی تو میں گولی چلانے میں بالکل دیر نہیں لگاؤں گا۔''

وہ راجو کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا اور ہمارے اجنبی میزبان کی طرف سے بھی!

اچانک بدل جانے والی اس پچویشن سے میں بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

''اب کرو تم مجھ سے سودا!'' بازرگان نے میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس نے سامعہ کا موبائل میرے ہاتھ میں دیکھ کر سمجھ لیا ہوگا کہ اب تک وہ موبائل فون پر مجھ سے ہی گفتگو کرتا رہا تھا۔

میں جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا لیکن وہ پھر بھی بڑی تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''بازرگان سے ٹکرانا شاید تم لوگوں نے بچوں کا کھیل سمجھ لیا تھا..... کیوں؟''

میں اب بھی خاموش رہا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ ہمارا اجنبی میزبان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا تھا۔

''تم دونوں اپنے ساتھی کے قریب ہو جاؤ!'' بازرگان نے تحکمانہ لہجے میں کہتے ہوئے راجو کی طرف دیکھا اور پھر ہمارے میزبان کی طرف!

راجو ٹہلنے کے سے انداز میں چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

''مسز خان کے تاثرات کی وجہ اب تو تیرے سمجھ میں آ گئی ہوگی۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''آپس میں باتیں نہ کرو۔'' بازرگان ڈپٹ کر بولا۔

راجو بے پروائی کے انداز میں شانے اچکا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس پچویشن سے ذرا بھی خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

بازرگان نے مسز خان کی طرف دیکھا۔ ''تم بھی ان دونوں کے قریب چلی جاؤ!''

مسز خان کو بھی اس کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

میں سمجھ گیا کہ بازرگان نے ہم تینوں کو یک جا کیوں کیا تھا۔ اس طرح اسے ہم تینوں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے میں آسانی ہوتی۔ اس نے اپنے اس آدمی سے پستول بھی لے لیا جو وہ مسز خان کی طرف تانے ہوئے تھا۔

''یہ خیال تم لوگوں کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ میں بائیں ہاتھ سے بھی بہ آسانی گولی چلا سکتا ہوں۔'' بازرگان نے ہم تینوں کو گھورتے ہوئے کہا، پھر اسی آدمی سے مخاطب ہوا جس سے پستول لیا تھا۔ ''تم بے بی کو اٹھاؤ اور یہاں سے لے جاؤ۔ فوراً''

وہ آدمی بستر پر پڑی سامعہ کی طرف بڑھا۔

جو آدمی بازرگان کے ساتھ آیا تھا، وہ اب تک خاموش ہی رہا تھا اور گہری نظروں سے ہم تینوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''تم اس بنگلے کی تلاشی لو.....'' بازرگان نے اس سے کہا ''احمر کو ان لوگوں نے شاید اسی بنگلے میں رکھا ہو.....''

میں چونک پڑا.....

''کیوں!'' بازرگان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''کیا تمہیں اب یقین آیا ہے کہ احمر ہمارے پاس نہیں۔''

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ احمر اور فرخندہ، زنجانی وغیرہ کے ہاتھ نہیں لگی تھیں اور اب یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ بازرگان کو بہ دستور احمر کی تلاش تھی۔

بازرگان کا حکم ملتے ہی وہ آدمی کمرے سے چلا گیا، دوسرے آدمی نے سامعہ کو اپنے اوپر لاد لیا تھا۔

''جلدی نکلو یہاں سے!'' بازرگان نے اس سے کہا ''بے بی کو گھر پہنچانے کے بعد مجھ سے فوراً موبائل پر رابطہ کرنا۔''

سامعہ کو اٹھائے وہ آدمی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ساری محنت خاک میں ملتی نظر آ رہی تھی۔

لیکن کیا واقعی؟ میں نے سوچا۔ جب احمر اور فرخندہ، بازرگان کے ہاتھ نہیں لگی تھیں تو سامعہ کو اغوا کر کے میں نے حماقت ہی کی تھی۔ بازرگان مجھ سے وہ سودا کر ہی نہیں سکتا تھا جو میں اس سے کرنا چاہتا تھا۔

تو پھر وہ دونوں کہاں چلی گئیں؟

یہ سوال نہایت پریشان کن تھا۔

''اب تم مجھے بتاؤ!'' بازرگان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''تم لوگوں نے میری بیٹی کو کیوں اغوا کیا تھا؟ یہ تو بکواس ہے کہ تم مجھ سے احمر کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ وہ میرے پاس ہے ہی نہیں۔'' پھر اس نے مسز خان کو گھورتے

ہوئے کہا ''غالباً تم زیادہ بہتر بتا سکتی ہو کہ احمر کو کہاں چھپایا گیا ہے۔ ہاں اگر وہ اسی بنگلے میں ہے تو میرا آدمی اسے تلاش کر لے گا۔''

''مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔'' مسز خان نے مضبوط لہجے میں کہا۔ راجو کی طرح وہ بھی اس پچویشن سے خوف زدہ نہیں تھی لیکن پریشان ضرور تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر آنے والے پریشانی ہی کے تاثرات کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ اپنی کار میں بھی وہ پستول کی نال پر ہو گی۔

''علم تو تمہیں یقیناً ہوگا۔'' بازرگان نے مسز خان کو گھورتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں بازرگان کا آدمی سامعہ کو لے کر کمرے سے جا چکا تھا اور دوسرا اس بنگلے کی تلاشی لینے چلا گیا تھا۔ اب ہم چار افراد بازرگان کے رحم و کرم پر تھے جس کے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں پستول تھا.....

''فضول باتیں نہ بناؤ مسز خان!'' بازرگان نے کہا ''تم موبائل فون پر اپنی ایس ڈی ایم سے جو باتیں کر چکی ہو، وہ میرے علم میں ہیں۔ تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ یہاں آ کر تم لوگوں کو بچا لے گی، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میرا ایک اور آدمی بنگلے کے باہر موجود ہے۔ جیسے ہی ایس ڈی ایم کی گاڑی بنگلے کے سامنے آ کر رکے گی، میرا آدمی اسے سنبھال لے گا۔ پہلے تو ہم نے اس کی کار دھماکے سے اڑا کر اسے صرف تنبیہ کی تھی لیکن اب محسوس ہو چکا ہے کہ وہ باز نہیں آئے گی لہٰذا اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔ میں نے اپنے آدمی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس کی کھوپڑی میں گولی اتارنے سے بھی دریغ نہ کرے۔''

''وہ ایسی موم کی بنی ہوئی نہیں ہے۔'' مسز خان نے اطمینان سے کہا۔

بازرگان اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا، پھر بولا ''اگر احمر اسی بنگلے میں ہے تو میرا آدمی اسے تلاش کر لے گا اور اگر وہ یہاں نہ ملی تو پھر مجھے دیکھنا پڑے گا کہ تم موم کی بنی ہوئی ہو یا نہیں..... اب تک ہم لوگ اپنے طور پر احمر کو تلاش کرتے رہے ہیں لیکن آج تم سے سامنا ہو ہی گیا ہے تو اب کسی طرح تمہاری زبان کھلوانا ہی پڑے گی۔''

اس وقت ہمارا اجنبی میزبان خاصا خوف زدہ نظر آ رہا تھا لیکن مسز خان بازرگان کی ان باتوں سے بھی خوف زدہ نہیں ہوئی اور راجو کے بارے میں تو میرا خیال تھا کہ وہ خوف زدہ ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔

''خیر!'' بازرگان نے مسز خان کو گھورتے ہوئے کہا ''تم اس وقت تک ضرور چپ رہ سکتی ہو جب تک میرا آدمی واپس نہیں آ جاتا۔ ہاں اگر اسے احمر اس بنگلے میں نہ ملی تو پھر میں دیکھوں گا کہ چپ رہنا تمہارے لیے کتنا آسان ہے۔''

''حقیقت یہی ہے کہ احمر کو اغوا کیا جا چکا ہے۔'' میں بولا ''تم اس بنگلے میں اس کی تلاشی کا صرف ڈراما کر رہے ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ احمر تمہارے قبضے میں نہ ہو۔''

''بے وقوف آدمی معلوم ہوتے ہو تم!'' بازرگان نے منہ بنایا ''مجھے اب یہ ڈراما کرنے کی ضرورت کیا ہے.....! میری بیٹی یہاں سے نکل چکی ہے۔ وہ اب راستے میں ہوگی۔ مجھے کوئی ڈر نہیں رہا ہے کہ میں جھوٹ بولوں.....''

بازرگان کی دلیل یقیناً مضبوط تھی۔

میں عندلیب کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دو چار منٹ کی تاخیر سے یہاں پہنچ جائے گی لیکن وقت تو اس سے زیادہ گزر چکا تھا۔

یکا یک کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ گولیاں چلنے کے دو دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ بازرگان کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کچھ دور جا گرے تھے۔ پھر تیسری گولی فرش سے ٹکرائی۔ یہ فائر غالباً بازرگان کی ٹانگ پر کیا گیا تھا جو غالباً اس لیے خطا گیا کہ بازرگان نے پل بھر پہلے ہی دروازے کی طرف جست لگا دی تھی۔

''اسے دیکھو راجو!'' عندلیب کی چیختی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''یہ بھاگنے نہ پائے۔''

لیکن راجو سے پل بھر پہلے میں ہی بازرگان کی طرف جھپٹ پڑا تھا جبکہ اس قسم کی حرکتوں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری طرف سے جھپٹ پڑنے والا راجو خود کو میری ٹکر سے نہ بچا سکا۔ میں بس اتنا دیکھ سکا کہ وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ میں اس لیے نہیں دیکھ سکا میں خود اس تصادم کے بعد دیوار سے اس طرح ٹکرایا تھا کہ میرے سر میں جیسے کئی دھماکے ہو گئے تھے۔

میری آنکھوں کے آگے پھیلتے ہوئے اندھیرے کی دبازت اتنی بڑھی کہ پھر مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا.....

جاری ہے

برا اداکار

محمد ابراہیم جمالی

اداکاری کرنا نہ صرف ایک مشکل فن ہے بلکہ اداکاری کروانے کے لیے بھی کہنہ مشق ہونا ضروری ہے۔ ایک اکیڈمی کے گرد گھومتی کہانی جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو رموزِ اداکاری سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

ایک ایسے فنکار کی عکاسی کرتی تحریر جس نے اپنے آپ کو ایک برا اداکار ثابت کر دیا تھا

''ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی'' میں داخلے کے خواہش مند امیدواروں کا ایک ہجوم تھا، ان میں لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لڑکیاں بھی تھیں مگر ان کی تعداد کم تھی۔ ان سب کے چہروں پر مستقبل کے بارے علی اور صائمہ بننے کی خواہشیں دور ہی سے جھلکتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ قالین پر چہل قدمی کر رہے تھے، میں ان نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا کاؤنٹر پر پہنچا جہاں ایک خوش لباس اور خوش شکل لڑکی بیٹھی تھی۔

''میرا نام فتح علی ہے'' میں نے کاؤنٹر والی لڑکی کو اپنا فرضی نام بتاتے ہوئے کہا ''میں اس ایکٹنگ اکیڈمی میں داخلہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

لڑکی نے میری طرف دیکھے بغیر شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''فارم لے لیں، اسے پُر کر کے سامنے جمع کرا دیں۔ آپ کا انٹرویو ہوگا اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔''

میں نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فارم کی گڈی میں سے ایک فارم لے لیا اور اسے بھرنے کے لیے اس بڑی میز پر پہنچ گیا جہاں اداکاری کے شوقین کئی سڑک چھاپ قسم کے نوجوان اپنے فارم بھرنے میں مصروف تھے۔ ان کی تعلیم کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے نام کی اسپیلنگ تک نہیں لکھ پا رہے

تھے۔ نوجوانوں کے اس ہجوم میں، میں خود کو سو برس کا بوڑھا محسوس کر رہا تھا۔ مگر یہاں میں اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں آیا تھا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی نے مجھے یہ ڈراما کرنے پر مجبور کیا تھا۔

یہ کل ہی کی بات ہے کہ میں چوہدری امین کی فرمائش پر اس سے ملنے اس کے گھر گیا تھا۔ وہ گلستان جوہر میں اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی بیوی کا نام عالیہ امین ہے اور بیٹی کا صدف۔

جب میں گلستان جوہر میں چوہدری امین کے بنگلے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گھنٹی کے جواب میں خود چوہدری امین نے گیٹ کھولا۔ حالانکہ اس کے بنگلے پر چوکیدار یا گارڈ ہونا چاہیے تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک دولت مند شخص تھا۔ میری معلومات کے مطابق کراچی میں اس کا خاصا وسیع کاروبار تھا۔ اس کی کاروباری شاخیں لاہور، پشاور اور فیصل آباد میں بھی تھیں اسی لیے وہ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔ ایسے میں اس کے بنگلے پر کسی محافظ کا نہ ہونا میرے لیے تعجب خیز تھا۔ چوہدری امین کے جسم پر قیمتی شلوار قمیص کا سوٹ تھا۔ اس نے سنہری کمانیوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور فکر مندی کے واضح آثار تھے۔

''چوہدری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میرا تعلق اسپیشل پولیس سے ہے۔ آپ نے کسی کی معرفت بلایا تھا مجھے!''

''اوہ فردین خان! آؤ آؤ.....'' چوہدری امین نے گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''دراصل معاملہ ایسا تھا کہ میں اس سلسلے میں عام پولیس سے کوئی مدد نہیں لے سکتا تھا۔ میرے دوست ایس پی صاحب نے مجھے تمہارا نام بتایا کہ تم اسپیشل پولیس میں ہوتے ہو اور سادہ لباس میں خفیہ طریقے سے، مختلف کام انجام دیتے ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی معرفت سے رابطہ قائم کرلیا۔'' وہ بولتا رہا اور ہم دونوں اندر چلے آئے۔

''چوہدری صاحب! آپ کا مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے بیٹھتے ہی فوراً سوال کردیا۔

''میں تم سے ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی کی چھان بین کرانا چاہتا ہوں۔'' چوہدری امین نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری بیوی عالیہ امین اور میری بیٹی صدف امین دونوں اداکاری کے اس فراڈ ادارے میں داخل ہو چکی ہیں اور وہاں اداکاری کی تربیت حاصل کر رہی ہیں۔'' چوہدری امین نے کہا ''مگر مجھے ان دونوں کا وہاں جانا پسند نہیں۔''

''وہ کیوں چوہدری صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔'' چوہدری امین نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ایک ماہ پہلے میری بیٹی صدف نے اپنے کالج کے ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اس کے چند روز بعد ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی سے ایک آدمی ہمارے گھر آیا۔ اس نے صدف کی اداکاری کی تعریف کی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فوراً ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی میں داخلہ لے لے، اس کے بعد اس کی اداکاری کے جوہر مزید کھلیں گے اور اس کا ٹیلنٹ ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس آدمی کے جانے کے بعد میری بیوی عالیہ اور بیٹی صدف دونوں ہی ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی جانے کو تیار ہوگئیں، میں نے اس فیصلے کی بہت مخالفت کی مگر ان دونوں نے میری ایک نہ سنی.....'' چوہدری امین نے کہا ''اس آدمی نے صرف میری بیٹی کو ہی نہیں، میری بیوی کو بھی نہ جانے کس طرح شیشے میں اتار لیا تھا۔''

''اکیڈمی میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا.....؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں دونوں کو فوراً داخلہ مل گیا'' چوہدری امین نے زہر خند لہجے میں کہا ''ان احمق خواتین کو ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی والوں نے یہ پٹی پڑھا دی تھی کہ ان دونوں میں اداکاری کی زبردست قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں، بہت جلد ان دونوں کو فلموں میں کام مل جائے گا۔ اور وہ ملک میں دھوم مچا دیں گی.....''

''چوہدری صاحب! اگر آپ کے خیال میں ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی والے فراڈ ہیں تو اس کی اطلاع پولیس کو دیں، وہ ان کے خلاف کارروائی کرے گی۔'' میں نے ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور اسے جلانے کے لیے لائٹر اٹھایا ہی تھا کہ رک گیا۔ میری نظریں ایش ٹرے ڈھونڈ رہی تھیں۔

''ایک منٹ ایک منٹ!'' چوہدری امین نے اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے کہا ''میں ابھی لایا'' یہ کہہ کر وہ اندر گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کے نیچے رکھنے والی سا سر تھی میں حیران تھا کہ چوہدری امین جیسے شخص کے ہاں ایش ٹرے نہیں ہے۔

''دراصل عالیہ اور صدف شروع ہی سے میری سگریٹ نوشی کے خلاف ہیں'' چوہدری امین نے کہا ''وہ طویل عرصے سے مجھے سگریٹ چھوڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ آخر میں نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور سگریٹ چھوڑ دی۔ اس کے بعد ان دونوں نے تمام ایش ٹریز اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں۔ فی الحال تم اس پلیٹ سے کام چلاؤ۔''

''کوئی بات نہیں.....'' میں نے کہا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر اپنے سامنے میز پر رکھ لی۔

''فردین خان.....! میں نے پولیس کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھا۔'' چوہدری امین نے کہا ''میں نے اپنے ایس پی دوست سے بات کی تھی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا۔ پولیس کی مدد حاصل کر کے شاید فائدے سے زیادہ نقصان ہوتا۔ بہر حال یہ سمجھ لو کہ میرے لیے عالیہ اور صدف ہی سب کچھ ہیں۔ میں ان دونوں کو اس فراڈ ادارے سے بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ وہ لوگ لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں کے بچوں کو اس طرح پھانستے ہیں۔ ممکن ہے بعد میں بلیک میل بھی کرتے ہوں۔ میں اس انداز سے کام کرنا چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میری بیوی اور بیٹی دونوں نے اس ادارے سے بڑی امیدیں وابستہ کرلی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کی امیدیں ٹوٹیں اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر نہ ملنے پر صدمے سے نفسیاتی مریض بن جائیں۔'' کہتے کہتے چوہدری امین کی نظر اس فریم شدہ تصویر پر ٹک گئی جس میں ایک بڑی عمر کی عورت نظر آ رہی تھی اور ایک نوجوان لڑکی۔ یقیناً وہ عالیہ اور صدف تھیں۔ دونوں ہی خاصی حسین تھیں مگر بہر حال غیر معمولی خوبصورت نہیں تھیں۔

''چوہدری صاحب! آپ کو یہ شک کیوں ہوا کہ یہ اکیڈمی فراڈ ہے؟'' میں نے راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''میرا دل کہہ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں ان دونوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ نہ تو وہ غیر معمولی حسین ہیں اور نہ ان میں اداکاری کے جراثیم ہیں۔ اس کے باوجود ان کو یہ یقین دلانا کہ وہ فلموں میں کام کر سکتی ہیں، دھوکا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ فراڈ کیا جا رہا ہے اور ان کو ان اکیڈمی میں داخلہ کسی اور مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ تمہیں اسی کا پتا چلانا ہے۔ ویسے بھی ہم جیسے معزز گھرانوں کی عورتوں کا..... فلموں میں کام کرنا کوئی فخر کی بات تو نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں یہ کام ضرور کروں گا۔'' میں نے چوہدری امین سے کہا اور واپس چلا آیا۔

اب میں اس معاملے کی چھان بین کے لیے ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی میں داخلہ لینے آیا تھا۔ میں نے فارم بھر کر دے دیا تھا۔ اور انٹرویو کے لیے بلائے جانے کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا فرضی نام پکارا گیا ''فتح علی!'' مگر میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب دوسری تیسری مرتبہ یہ نام پکارا گیا تو مجھے یاد آیا کہ یہ تو میرا فرضی نام ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس گیا۔ اس نے مجھے ہدایت دی کہ میں دوسرے کمرے میں مسز خان سے مل لوں۔

مسز خان ایک خوش شکل مگر خاصی بھاری بھرکم اور چوڑی چکلی خاتون تھیں۔ ان کی شکل سے رعونت ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ پھر میرے فارم پر نظر ڈالی۔

''تمہارا نام فتح علی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی میڈم!'' میں نے جواب دیا۔

''تم اس عمر میں اداکار بننا چاہتے ہو؟ میرا خیال ہے تم نے کافی دیر کردی ہے۔'' مسز خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میڈم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کسی نوجوان لڑکے کے سے انداز میں کہا ''واقعی مجھے اس طرف آنے میں دیر ہوگئی مگر کیا کروں..... میرے اندر کا اداکار مجھے چین سے نہیں رہنے دیتا۔ وہ ابھرنے اور باہر نکلنے کو بے تاب ہے۔ آپ دیکھ لیں، اگر میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا تو واپس اس کام کی طرف چلا جاؤں گا جس کے لیے میرے والد ضد کر رہے ہیں..... وہ اپنا ایک بینک کھولنا چاہتے ہیں اور مجھے اس بینک کا صدر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ میرے سامنے آفر موجود ہیں۔'' میں نے بڑے فراٹے سے لمبی چھوڑی۔

''کیا.....؟ بینک کا صدر.....؟ اچھا؟'' مسز خان کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے حقارت سے دیکھ رہی تھیں اب ان کے انداز میں احترام بھی آگیا تھا اور خوشامد بھی۔

''کیا تمہارے والد بہت دولت مند ہیں؟'' مسز خان نے پوچھا۔

''ہاں..... بیشک وہ پرانے بینکار ہیں۔ دبئی، شارجہ امارات برطانیہ، بیلجیم نہ جانے کہاں کہاں انہوں نے بینکاری کے شعبے کے لیے خدمات انجام دی ہیں اور ا

کے بہت بڑے بڑے دولت مندوں سے تعلقات بھی ہیں۔ اب وہ پاکستان میں اپنا بینک کھولنا چاہتے ہیں اور مجھے اس کی ذمے داری سونپنا چاہتے ہیں مگر میں اپنے اندر کے ٹیلنٹ کا کیا کروں، وہ ہر وقت باہر آنے کو تیار رہتا ہے۔"

"اوہ..... فتح علی.....! میں نے تمہیں اب غور سے دیکھا ہے؟" مسز خان نے چابلوسی سے کہا "تم واقعی فتح علی ہو..... ٹیپو سلطان کا اصل نام فتح علی ہی تو تھا۔ میں تمہارے اندر ایک نیا ٹیپو سلطان دیکھ رہی ہوں۔ تم تاریخی ڈراموں، فلموں میں کسی بھی بادشاہ یا فوجی جرنیل کا کردار کرنے کے لیے بالکل آئیڈیل ہو۔ آج کل ایسے اداکار مشکل سے ملتے ہیں جن میں شاہی کردار کرنے کا قدرتی ٹیلنٹ ہو مگر میری نظر تم میں وہ سب دیکھ رہی ہے۔ تمہارا گفتگو کا انداز بھی اچھا ہے اور تمہاری پرسنیلٹی بھی شاندار ہے۔"

میں ان بڑی بی کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ بینک والی کہانی سنتے ہی انہیں میرے اندر کتنی خوبیاں نظر آنے لگی ہیں ورنہ اس سے پہلے وہ کسی قدر اکتاہٹ اور بیزاری کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"اچھا اب تم میرے ساتھ آؤ۔" مسز خان نے اٹھتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری کچھ تصویریں بنوانی ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنے جھوٹ کی معافی مانگی اور ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے ساتھ چلا گیا۔

"مسز خان! میری تصاویر کا آپ کیا کریں گی؟" چلتے چلتے میں نے ان سے سوال کیا۔

"لو بھئی..... کیا مستقبل کے ایک زبردست اداکار کو میڈیا سے متعارف نہیں کرانا ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہاری یہ تصاویر تمام اخبارات رسائل اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو بھیجوں گی۔ پھر دیکھنا..... ہر اخبار ہر رسالے میں تمہاری تصویر نمایاں طور پر شائع ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ تمہارا چہرہ کیمرے کے لیے کتنا اچھا ہے..... اور پھر یہ تو ہمارے پروسیجر کا حصہ بھی ہے۔" میں ان کی بات سن کر مسکرا دیا۔

مسز خان ہال میں سے گزرتی ہوئی ایک کمرے میں پہنچیں جہاں سرخ بالوں والا ایک موٹا تازہ سا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے یا تو اپنے بالوں میں مہندی لگائی تھی یا انہیں ڈائی کرایا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا..... اس کے سامنے میز پر فوٹوگرافی کا سامان بکھرا ہوا تھا۔

"یہ ہمارے چیف فوٹوگرافر ہیں..... لیاقت سموں!" مسز خان نے سرخ و سفید موٹے سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ تمہاری تصویریں بنائیں گے۔ ان کے ساتھ فرقطعی بور نہیں ہوگے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

"بیٹھ جاؤ....." لیاقت سموں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ بدستور سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی ایش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے جمع تھے۔ وہ سگریٹ کا بے حد شوقین بلکہ عادی لگ رہا تھا۔ میں اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا اور پہلے والے سگریٹ کو مسل کر ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اب ایش ٹرے اوپر تک بھر چکی تھی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بھی بڑھایا مگر میں نے معذرت کر لی۔

"مسٹر فتح علی! تمہاری ناک صحیح نہیں ہے۔" لیاقت سموں نے کہا "بہر حال میں اپنے کیمرے کے زاویے سے درست کر لوں گا۔ یہی میرا فن ہے۔ خرابیوں کو خوبیوں میں بدل دینا....." اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

"میری ناک جیسی بھی ہے، بہر حال میری اپنی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ادھر آجاؤ۔ اس پردے کے سامنے بیٹھ جاؤ....." لیاقت سموں نے کہا تو میں اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور وہ کیمرا سنبھال کر میری طرف بڑھا۔

"مسٹر لیاقت سموں!" میں نے کہا "کیا کبھی تم نے اداکاری بھی کی ہے؟ مجھے تمہارا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"ہاں..... ایک زمانے میں ٹی وی پر مزاحیہ سیریز آتی تھی "ہم ہیں یہاں" میں نے اس میں کام کیا تھا۔ اس میں میرا کردار ایک باورچی کا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا اب بھی اداکاری کرتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، اب میں نے کیمرے کے سامنے آنا چھوڑ دیا ہے البتہ کیمرے کے پیچھے ابھی تک موجود ہوں۔" یہ کہہ کر لیاقت سموں نے میرے چہرے کو ذرا سا اوپر کیا اور پھر میرا سائیڈ پوز لینے لگا وہ مجھے گھما پھرا کر ہر زاویے سے میری تصویریں کھینچتا رہا۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔

"تم خاصے معقول اور سمجھ دار آدمی لگتے ہو۔" آخر لیاقت سموں نے کہا "پھر اس لائن میں کیوں آرہے ہو؟"

"بس..... شوق..... شوق کا تو کوئی مول نہیں ہوتا نا؟"

"ہاں مگر میں تمہیں ایک بات بتا دوں....." ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک اسمارٹ سا نوجوان ہنستا مسکراتا اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ہزار ہزار واٹ کے بلب جل رہے تھے۔

"تم فتح علی ہو.....؟" اس نے آتے ہی کہا۔ "میرا نام ارسلان ہے۔ ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی کا ڈائریکٹر ہوں میں۔" پھر وہ لیاقت سموں سے بولا "تمہارا کام مکمل ہو گیا؟"

"ابھی شروع ہی کیا تھا....." اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو، بعد میں کر لینا....." ارسلان نے بے پروائی سے کہا۔ "دراصل مسز خان نے ان صاحب فتح علی کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا اس کی وجہ سے مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آؤ فتح علی! میرے ساتھ آؤ۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لیاقت سموں کے کمرے سے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ لیاقت کے چہرے پر برہمی تھی مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں ارسلان کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچا جہاں ہر طرف نئے اداکاروں، اداکاراؤں اور ماڈلز کی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ گویا پکچر روم تھا۔ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہی ارسلان نے ایک فارم میری طرف بڑھا دیا میں نے اس فارم پر نظر دوڑائی۔

"یہ ہمارا معاہدے کا فارم ہے۔" ارسلان نے کہا۔ "ہم اپنے باصلاحیت لوگوں کو ٹی وی اور فلموں میں کام دلواتے ہیں۔ اس طرح کے معاہدے اس کام میں بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اس معاہدے کی وجہ سے تمہیں فلم یا ٹی وی پر کہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"میں سمجھا نہیں....."

"میرا مطلب ہے کہ تمہیں کہیں بھی آسانی سے کام نہیں مل سکتا کیونکہ ہمارا ایک گروپ ہے جس نے شوبزنس میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ہماری مرضی کے بغیر نہ فلم والے کسی کو کام دے سکتے ہیں اور نہ ٹی وی والے۔" یہ کہہ کر ارسلان اٹھا۔ اس نے ایک فائلنگ کیبنٹ کھولی۔ اس میں سے ایک فائل نکال کر واپس اپنی سیٹ پر آن بیٹھا اور فائل میرے سامنے کھولتے ہوئے بولا "یہ ان لوگوں کی تصویریں ہیں جنہوں نے میرے ادارے سے تربیت حاصل کی تھی اور آج مقبولیت کی بلندیوں پر ہیں۔"

میں نے ان تصویروں پر سرسری نظر ڈالی اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"اگر تم اس معاہدے پر دستخط کر دو تو آج سے ہی تم کلاسز میں شرکت کر سکتے ہو۔" ارسلان نے اپنی گولڈ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"فی الحال میں اس معاہدے کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ رات کو میں اسے اچھی طرح پڑھوں گا اور پھر اس پر دستخط کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کروں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن اس پر دستخط کیے بغیر تم کسی بھی کلاس میں نہیں جا سکتے۔" ارسلان نے آنکھیں ذرا سکیڑتے ہوئے کہا۔ "بہر حال تمہاری خاطر میں یہ اصول توڑ دوں گا۔ دراصل میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم ہماری اکیڈمی سے اداکاری کی تربیت حاصل کرو اور ایک زبردست ایکٹر بن کر نکلو....."

"میں تمہارا ممنون ہوں....." میں نے کہا تو ارسلان نے گھنٹی بجائی اور مسز خان کسی طوفان کی طرح اندر آگئیں۔

"دیسے تو ابھی وقفہ ہونے والا ہے....." ارسلان نے کہا "مگر مسز خان تمہیں ایک کلاس میں شریک کرا دیں گی۔ اس کلاس میں کیمرے کے سامنے مکالمے بولنے کی تربیت دی جاتی ہے۔"

میں مسز خان کے ساتھ کلاس میں پہنچا۔ وہاں تمام شرکاء قالین پر بیٹھے تھے۔ وہ تعداد میں بیس بائیس تھے۔ ایک نوجوان شخص ان لوگوں کو مکالموں کی ادائیگی پر لیکچر دے رہا تھا۔ میں نے اس کلاس میں عالیہ اور صدف کو تلاش کر لیا وہ دونوں آگے بیٹھی تھیں اور بڑی توجہ سے لیکچر سن رہی تھیں۔ دونوں نے نوعمر لڑکیوں والے لباس پہن رکھے تھے۔ یہ لباس صدف پر تو صحیح لگ رہا تھا مگر عالیہ اس میں نہایت بھونڈی لگ رہی تھی۔ میں کھسک کھسک کر ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ میں اس لیکچر کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر المیہ یہ تھا کہ مکالموں کی درست ادائیگی پر لیکچر دینے والا وہ نوجوان استاد خود ہکلا تھا، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

میں نے آہستگی سے عالیہ کو مخاطب کیا۔ "اس بے چارے کو پہلے خود بولنا سیکھنا چاہیے۔"

جواب میں عالیہ نے مجھے سخت نظروں سے گھورا اور بولی "وہ ہمارا استاد ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

میں خاموش ہو کر اونگھنے لگا۔ چند منٹ بعد کلاس ختم

ہوگئی۔ سب لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے ..... کچھ اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔ میں نے عالیہ امین کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو وہ نظر آگئی مگر اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ وہ ایک کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس میں اس کی بیٹی صدف، اس ادارے کے سربراہ ارسلان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

عالیہ کا یہ ردِعمل میری سمجھ میں نہیں آیا۔ صدف اپنے ادارے کے سربراہ سے بات کررہی تھی۔ اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے تھی مگر وہ ..... اس کا چہرہ تک سفید پڑ گیا تھا۔ پھر ارسلان کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے اس طرح چلے آنے پر صدف کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غالباً اس نے اپنی بے عزتی محسوس کی تھی۔

''فتح علی! بیس منٹ بعد اگلی کلاس ہوگی۔'' ارسلان نے کہا ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس ٹریننگ میں بہت مزہ آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ارسلان اپنے بہت سے اسٹوڈنٹس کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اس کے آفس کا رخ کیا۔ میں وہاں کام کی کوئی چیز تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے آفس کی طرف جاتے ہوئے میں نے لیاقت سموں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ سرخ بالوں والی ایک حسینہ سے کسی بحث میں الجھا ہوا تھا۔

آخر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں خاموشی سے ارسلان کے آفس میں داخل ہوگیا۔ اس کی میز بالکل صاف تھی۔ صرف ایش ٹرے میں بجھا ہوا سگار تھا۔ میں فائلنگ کیبنٹ کی طرف بڑھا اور اس کی درازیں کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ ساری درازیں خالی تھیں۔ سوائے اس دراز کے، جو اس نے میرے سامنے کھولی تھی۔ میں نے وہی دراز کھولی۔ اس میں بھی میرے کام کی کوئی چیز نہ تھی۔

میں نے الماری کھولی۔ اس میں صرف کتابیں تھیں لیکن اسی وقت میری نظر ایک فولڈر پر پڑ گئی۔ میں نے تیزی سے اسے کھولا۔ اس میں ارسلان کے مالی معاملات سے متعلق دستاویزات لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس پر نظر دوڑائی ہی تھی کہ مجھے باہر لوگوں کے آنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پھرتی سے الماری بند کی اور باہر نکل آیا، میں کلاس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ میں نے ارسلان کو دیکھ لیا۔ میں خوش خلقی سے مسکرا دیا۔ وہ بھی جواباً مسکرایا۔ مگر اس کے انداز میں اب پہلے والی گرمجوشی نہیں تھی۔

پروگرام کے مطابق اگلی کلاس میں ہمیں چلنے کے انداز اور آداب بتائے جانے والے تھے۔ میں اندر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک چپراسی نے آکر مجھ سے کہا کہ ارسلان صاحب بلا رہے ہیں۔ میں اس چپراسی کے ساتھ ارسلان کے آفس کی طرف چل دیا۔

''ادھر نہیں، ادھر .....'' چپراسی نے کہا اور عقبی حصے میں واقع ایک کمرے کی طرف اشارہ کردیا۔ میں اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ گھونسوں، لاتوں اور مکوں سے میری تواضع شروع ہوگئی۔ میں اس قدر پریشان ہوگیا تھا کہ اپنے حملہ آور کو بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ سر اٹھانے اور اوپر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے فولادی گھونسے میرے سر، کندھوں، پشت اور جسم کے دوسرے حصوں پر برس رہے تھے۔

میں فرش پر لمبا لمبا ہوگیا۔ سامنے کھڑے ہوئے اس وحشی نے پھر بھی مجھ پر رحم نہیں کھایا ..... اس کی لاتیں میرے چہرے اور پیٹ کو نشانہ بنا رہی تھیں۔ اب میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ پرنس تھا۔ اس کا اصل نام تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا مگر اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ارسلان کا خاص محافظ اور باڈی گارڈ تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ارسلان کے ایک اشارے پر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے لال نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کررہی تھیں۔ کمرے میں اس دیو کے سوا اور کوئی نہ تھا جو ملک الموت بنا میرے سر پر کھڑا تھا۔

''ارسلان صاحب نے کہا ہے کہ ان کی جاسوسی کرنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو، سن لیا؟'' اس دیوزاد نے کہا جس کا نام پرنس تھا مگر وہ مجسم قہر لگ رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس مردود کے طاقتور گھونسے نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ میرے حلق سے کراہ نکلی تو اس کا اگلا ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا۔ کمبخت کا ہاتھ تھا یا ہتھوڑا.....! اس نے میرے چہرے کو سن کر دیا تھا۔

''مسٹر فردین خان عرف فتح علی!'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا ''یہ ادارہ آرٹ اور فن سیکھنے والوں کے لیے ہے، جاسوسوں کے لیے نہیں۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے میری دوبارہ مرمت شروع کردی۔ میں کچھ سوچ سمجھ نہیں پا رہا تھا اور نہ ہی بول پا رہا تھا۔ مجھے اس کے آخری الفاظ یاد رہ گئے جو اس نے مجھ سے کہے تھے۔

''مسٹر ہیرو.....! آئندہ ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ زندہ سلامت واپس نہیں جاسکو

گے۔ سن لیا؟''

پھر میرے سر پر ایک اور گھونسا پڑا تھا۔ جس کے بعد میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک سڑک کے کنارے پڑے پایا۔ میرے کانوں میں سمندر کی لہروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں سمندر کے قریب ہوں، میں بڑی مشکل سے اٹھا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں سینڈز پٹ والی سڑک پر ہوں۔ دور دور تک نہ کوئی انسان نظر آرہا تھا اور نہ ٹریفک، میرا جسم چوٹوں سے بری طرح دکھ رہا تھا مگر ہڈیاں سلامت تھیں۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ میرا بٹوا اور گھڑی موجود تھی۔ البتہ جیب میں رکھا ہوا ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی کا وہ معاہدے والا فارم غائب تھا جو ارسلان نے مجھے دیا تھا۔ میں چند قدم ہی چلا تھا کہ سامنے اپنی پرانی فوکسی کھڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے گاڑ کا دروازہ کھولا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے یقیناً انہوں نے اس میں میری گاڑی کی رجسٹریشن بک اور ڈرائیونگ لائسنس دیکھ کر میرا اصل نام وغیرہ جانا ہوگا۔ اور اس کی سزا مجھے بھگتنی پڑی تھی۔

میں نے فوکسی کا انجن اسٹارٹ کیا اور کراہتا ہوا بڑی مشکل سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسرے روز میں نے روزنامہ ''رنگین دنیا'' کے اپنے دوست رپورٹر مگسی کو فون کیا۔ یہ روزنامہ علمی پرچہ تھا اور مگسی اس کا خاص رپورٹر تھا۔ میں نے اس سے ارسلان اکیڈمی کے حوالے سے گفتگو کی تو اس نے کہا ''اس شخص کا نہ ٹی وی پر کوئی اثر رسوخ ہے اور نہ فلموں میں ..... یہ خود ساختہ قسم کا اسٹرکٹر ٹائپ شخص ہے جس نے شوبز انڈسٹری کو کبھی کوئی چپراسی تک فراہم نہیں کیا ..... یہ فراڈ ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنی تجوری بھرتا ہے۔ یہ شخص عورتوں کو ورغلا کر ان کی نامناسب تصویریں بھی اتروالیتا ہے۔ پھر انہیں بلیک میل کرتا ہے اور منہ مانگی رقمیں وصول کرتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے ہاتھ لمبے ہیں.....''

''ٹھیک ہے .....'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کرنے کے بعد سوچنے لگا کہ کراچی جیسے شہر میں یہ کام کھلم کھلا ہو رہا ہے اور کوئی ان لوگوں کو نہ پکڑتا ہے اور نہ سزا دیتا ہے مگسی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس شخص ارسلان نے کئی بینکوں سے قرض لے رکھا ہے اور اب تک ادائیگی نہیں کی۔ جب کبھی بینک والے زور ڈالتے ہیں تو کبھی کسی وزیر کی سفارش لے جاتا ہے اور کبھی کسی بڑے افسر کی۔ اس کے پاس بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے لڑکیاں تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔

میں نے رات کو درد دور کرنے والی دوائیں استعمال کیں جن سے درد کم تو ہوگیا مگر مکمل ختم نہیں ہوا تھا۔ اب مجھے ارسلان کے خلاف سخت کارروائی کرنی تھی۔ ساتھ ہی اس کے اس فراڈ سے اوپر والوں ..... خاص طور پر اپنے افسران کو آگاہ کرنا تھا۔ میرے پاس اس کے خلاف خاصی معلومات تو ہو چکی تھی مگر ابھی ٹھوس ثبوت ..... بلکہ ثبوتوں کی ضرورت تھی ..... مجھے انہی کی تلاش تھی۔ اس کے بعد میرا کام آسان ہوجاتا۔

رات کو میں اپنے گھر سے نکلا۔ میرا رخ ارسلان کے گھر کی طرف تھا وہ ڈیفنس فیز II میں رہتا تھا۔ اس کا دو ہزار گز کا بنگلا نہایت شاندار تھا۔ اس میں بہت سے کمرے سوئمنگ پول، باغیچہ، چھوٹا سا چڑیا گھر اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ پہلے تو اسے مشورہ دوں گا کہ چوہدری امین کی بیوی اور بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے، اس کے بعد اس سے اپنے زخموں چوٹوں کے بارے میں بات کروں گا۔ رات دس بجے ہی اس علاقے میں سناٹا چھا چکا تھا۔

میں نے ارسلان کے بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر ایک نیلی ڈاٹسن کے پیچھے اپنی فوکسی روک دی۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے ارسلان کے بنگلے تک پیدل جاؤں گا۔ میں فوکسی سے باہر نکلا اور ٹہلنے کے سے انداز میں ارسلان کے بنگلے کی طرف چل دیا۔ ابھی میں اس کے بنگلے سے کچھ دور تھا کہ میں نے بنگلے کا گیٹ کھلتے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا اس میں سے ایک عورت دیوانہ وار بھاگتی ہوئی باہر آگئی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا تو لمحے بھر کو رکی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہو۔

''ارے .....! بیگم عالیہ امین! آپ ..... اور یہاں .....؟'' میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ چوہدری امین کی بیوی تھی۔

میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ سراسیمہ ہوگئی اور میرے برابر میں سے نکل کر آگے کی طرف بھاگی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو اس نے میرے سر پر ماری تھی۔ غالباً وہ کوئی ہار تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ

لڑکھڑاتی ہوئی اس نیلی ڈاٹسن کے پاس پہنچی جس کے پیچھے ہی میں نے اپنی نوکسی پارک کی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈاٹسن کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور ڈاٹسن ادھر ادھر لہراتی ہوئی روانہ ہوگئی۔ اس نے اس تیزی سے موڑ کاٹا تھا کہ سڑک پر کار کے ٹائروں کے رگڑنے زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں خالی خالی نظروں سے نیلی ڈاٹسن کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

پھر میں ارسلان کے بنگلے کی طرف بڑھا۔ اس کا گیٹ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ وہاں نہ کوئی گارڈ تھا اور نہ چوکیدار میرا دل کہہ رہا تھا کہ اندر میرے سامنے کوئی خوشگوار منظر نہیں ہوگا..... اور وہی ہوا۔

درمیانی ہال میں ایک شاندار کرسی پر ارسلان ڈھلکے ہوئے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں گولی کا نشان تھا اور سرخ خون کا دھبا اس کی سفید قمیص پر دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ ارسلان کا سر یوں جھکا ہوا تھا جیسے وہ گولی کے نشان کو دیکھ رہا ہو۔ اس کا ایک ہاتھ کرسی کے ہتھے پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں بجھا ہوا سگار شاید پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک خوبصورت لائٹر رکھا تھا اور ایک ایش ٹرے بھی تھی مگر اس وقت ایش ٹرے بالکل صاف تھی۔ انگریزی کا ایک اخبار بھی میز پر رکھا تھا۔

میں نے ایک نظر ارسلان کی لاش کو دیکھا اور پھر سامنے رکھے فون پر چوہدری امین کا نمبر ملایا اور اس سے کہا ''اپنے وکیل کو فوری طور پر گھر بلالو۔ آج رات تمہیں اس کی ضرورت پڑسکتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور پولیس کا نمبر ڈائل کرکے اسے اس واقعے کی اطلاع دیدی۔

ڈیفنس پولیس اسٹیشن سے انسپکٹر عثمانی اور ایس آئی الیاس گل جائے واردات پر پہنچے تو میں نے ان دونوں کو تفصیل سے سارے حالات بتائے۔ انہوں نے مزید عملہ طلب کیا اور ارسلان کی لاش وہاں سے اسپتال بھجوانے کے بعد میرے ساتھ چوہدری امین کے گھر روانہ ہوگئے۔

جب ہم گلستان جوہر میں چوہدری امین کے بنگلے پر پہنچے تو وہاں ان کا وکیل پہلے سے موجود تھا۔ وہ خاصا نامور وکیل تھا۔ اس نے عالیہ اور صدف کو سمجھا دیا تھا کہ وہ پولیس افسران کی کن کن باتوں کا جواب دیں گی اور کن کن باتوں پر خاموشی اختیار کریں گی، دونوں ماں بیٹی خاصی خوفزدہ نظر آرہی تھیں۔ صدف کو ابھی ابھی بلوایا گیا تھا۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں تقریب میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے اسے پارٹی چھوڑ کر بلوایا گیا تھا۔

عالیہ امین نے اقرار کیا کہ وہ ارسلان کے بنگلے پر گئی تھی..... مگر کیوں؟ اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے بتایا تھا کہ جس وقت وہ ارسلان کے بنگلے پر پہنچی تو ارسلان مر چکا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر اور بھی پریشان ہوگئی۔

انسپکٹر عثمانی کے سوال کے جواب میں چوہدری امین نے بتایا ''مجھے پتا نہیں تھا کہ میری بیوی ارسلان کے گھر گئی ہے۔ یہ تو مجھ سے کہہ کر گئی تھی کہ اسے کسی کام کے سلسلے میں اپنی سہیلی سے ملنے جانا ہے۔''

انسپکٹر عثمانی کے پوچھنے پر چوہدری امین نے مزید بتایا کہ اس نے وہ شام ٹی وی دیکھتے ہوئے گزاری تھی، انسپکٹر عثمانی ان لوگوں سے باتیں کررہا تھا جبکہ اس کا اسسٹنٹ ایس آئی الیاس گل باہر عالیہ کی نیلی ڈاٹسن چیک کرنے گیا تھا۔ واپس آکر اس نے عثمانی کے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں کھسر پسر کرتے رہے۔ پھر الیاس گل نے کوئی چیز عثمانی کو دی۔ عثمانی نے وہ چیز عالیہ کے سامنے کردی اور کہا ''یہ ایک ہار ہے۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

جواب دینے سے پہلے عالیہ نے اپنے وکیل کی طرف دیکھا تو وکیل نے انکار سے سر ہلایا۔

''انسپکٹر فردین خان!'' عثمانی نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''عالیہ امین جب ارسلان کے بنگلے سے باہر نکلی تو اس نے تمہارے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ یہ وہی چیز تو نہیں ہے؟'' اس نے ہار میرے سامنے کردیا۔

''ممکن ہے یہ وہی ہو.....'' میں نے جواب دیا ''مگر انہوں نے میرے سر پر کوئی چیز ماری ضرور تھی۔''

''مسز عالیہ امین! یہ ہار تمہاری کار کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے ملا ہے۔'' انسپکٹر عثمانی نے عالیہ سے کہا ''بتا سکتی ہو کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''مجھے کچھ نہیں معلوم.....'' عالیہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''ممی! اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' اچانک صدف نے کہا۔ ''جلد یا کچھ دیر کے بعد انہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔''

پھر وہ انسپکٹر عثمانی سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''یہ میرا ہار ہے میں ارسلان کے بنگلے پر گئی تھی۔ سہیلی کے ہاں پارٹی میں جانے کا میں نے بہانہ بنایا تھا۔ میں اپنی سہیلی کے ہاں گئی اور وہاں سے ارسلان کے پاس چلی گئی۔ مجھے شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں ارسلان کے ساتھ تھی۔ کیا کروں..... اس کی محبت نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ بہرحال میں اس کے ساتھ تھی کہ کوئی اس کے بنگلے پر آیا تو ارسلان نے مجھے اندر والے کمرے میں چھپا دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آنے والا مجھے اس کے ساتھ دیکھے۔ ارسلان دروازے پر گیا تو میں اس قدر گھبرا گئی تھی کہ وہاں سے بھاگ نکلی اور اس کے پچھلے گیٹ سے باہر آگئی، شاید اسی بھاگا دوڑی میں میرا یہ ہار وہاں گر گیا تھا۔''

''تم نے آنے والے کو دیکھا تھا؟'' انسپکٹر عثمانی نے سوال کیا۔ ''وہ کون تھا؟''

''نہیں، میں نے آنے والے کو نہیں دیکھا۔ میں تو ارسلان کے دروازے کی طرف جاتے ہی بھاگ نکلی تھی۔ چونکہ پچھلے راستے سے آئی تھی اس لیے مجھے اس شخص کو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔'' صدف نے جواب دیا۔

''وہ میں نہیں تھی۔'' اچانک عالیہ نے کہا..... اس کے وکیل نے اسے بولنے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رکی ''دراصل میں خود ارسلان کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔''

عالیہ نے چوہدری امین سے نظریں چراتے ہوئے کہا ''مگر جب مجھے پتا چلا کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ بھی فلرٹ کررہا ہے تو میں اسے ذلیل اور شرمندہ کرنے اس کے گھر گئی مگر اس وقت تک وہ مر چکا تھا میں اس کے بنگلے سے واپس پلٹی تو مجھے اپنی بیٹی صدف کا ہار ارسلان کی لاش کے قریب فرش پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس وقت میں یہ سمجھی کہ صدف نے ارسلان کو ہلاک کیا ہے لہٰذا میں نے اسے بچانے کے لیے وہ ہار اٹھالیا اور جب باہر آرہی تھی تو وہی بار غلطی سے فردین خان کے سر پر لگ گیا تھا۔ میں بہت گھبراہٹ میں تھی۔''

یہ کہہ کر عالیہ خاموش ہوگئی۔ چوہدری امین صوفے پر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل چکی ہے، کمرے کی صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ایک طرف شرمندہ ماں تھی۔ دوسری طرف پشیمان بیٹی اور تیسری طرف محبت کا مارا باپ تھا جس کی کوئی خطا نہیں تھی پھر بھی اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی تھی۔ لوگوں کے سامنے اس کا سر جھک گیا تھا۔ میرا دل برا ہونے لگا تو میں باہر آگیا۔

اب مجھے ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی کے خلاف شواہد جمع کرنے تھے۔ ارسلان مر چکا تھا مگر اس کا ادارہ باقی تھا۔ برائی کا گڑھ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے کام کو مکمل کرنا تھا۔ اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد بھی میں تمام حالات و واقعات پر غور کرتا رہا اور آخر ایک نتیجہ میرے سامنے آگیا۔ اس کے بعد میں مطمئن ہوکر سو گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز صبح بیدار ہوتے ہی میں پہلے اپنے آفس گیا۔ وہاں اپنے افسر کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے ان ایس پی صاحب کو فون کیا جو چوہدری امین کے دوست تھے اور جن کی سفارش پر میں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا تھا۔ ان کو پوری صورتِ حال بتانے کے بعد میں نے آئندہ کے اقدام کے بارے میں بھی انہیں مطلع کردیا۔ انہوں نے اجازت دے دی کہ میں اس کیس کو حل کرنے کے لیے آخری حد تک جاسکتا ہوں۔

اب میں سیدھا ''ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی'' پہنچا جہاں معمول کے مطابق گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ ادارے کے مالک کی موت کا کوئی اثر وہاں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں استقبالیہ سے سیدھا آفس کی طرف گیا۔ راستے میں، میں نے مسز خان کو دیکھا وہ پریشانی کے عالم میں پہلے انسٹرکٹر سے باتیں کررہی تھیں۔ اچانک پرنس میرے سامنے آگیا۔ یہ وہی دیوزاد تھا جس نے گزشتہ روز میری خوب پٹائی کی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا تو میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... اس کے منہ، پیٹ اور سینے پر خوب گھونسے برسائے۔ کل تو میں بے خبری میں مار کھا گیا تھا ورنہ وہ موٹا اتنی آسانی سے مجھے زیر نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت میں تیار ہوکر آیا تھا اس لیے اس سے خوب بدلے لیے۔ جب میں نے پرنس کو خاک چٹا دی تو آگے بڑھ گیا۔

میں ارسلان کے آفس میں داخل ہوا تو سامنے ارسلان کی سیٹ پر لیاقت سموں بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں حسبِ معمول سگریٹ تھا۔

''اوہ تم! فتح علی..... تمہیں کسی کی تلاش ہے؟'' اس نے اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

''میں فتح علی نہیں، فردین خان ہوں۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا ''میرا تعلق اسپیشل پولیس فورس سے ہے۔''

''کیا ارسلان کے قتل کے سلسلے میں آئے ہو؟'' لیاقت سموں نے سوال کیا۔

''ہاں..... تمہیں اس واقعے کے بارے میں کیا معلوم ہے؟''

''مجھے صرف وہی معلوم ہے جو اخبار میں چھپا ہے۔'' لیاقت سموں نے کہا ''صبح اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہی میں سیدھا یہاں پہنچا۔ یہاں کے معاملات بھی تو دیکھنے تھے۔''

''کیا تمہارے نزدیک سب سے اہم کام یہ تھا کہ اس ادارے کا پرانا نام ''سموں اسکول آف ایکٹنگ'' دوبارہ بحال کر دیا جائے؟'' میں نے کہا تو لیاقت سموں چونک اٹھا۔

''تم یہ کیسے جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے ارسلان کے کچھ ذاتی کاغذات دیکھے تھے، شاید اس نے تمہارے ادارے پر قبضہ کر کے اس کا نام بدلا تھا۔'' میں نے کہا۔

''دراصل ارسلان دولت کمانے کے فن سے واقف تھا جبکہ میں اس معاملے میں اناڑی تھا۔'' لیاقت سموں نے کہا ''لہٰذا ہم دونوں نے مل کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ ''سموں اسکول آف ایکٹنگ'' کا نام بدل کر ''ارسلان ٹیلنٹ اکیڈمی'' رکھ دیا جائے۔''

''اس کا آئندہ پروگرام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ تمہیں اس اسکول سے بالکل ہی بے دخل کرنا چاہتا تھا؟''

''اب ان باتوں سے کیا حاصل؟'' اس نے کہا ''وہ اور میں اس اسکول میں پارٹنر تھے۔ اب اس کی موت کے بعد مجھے ہی اس ادارے کو سنبھالنا ہے۔''

اچانک میں اٹھا اور گھوم کر اس کی کرسی کے پاس پہنچا۔ وہ ہکا بکا سا مجھے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے اس کی میز کی دراز سے پستول نکال لیا۔ لیاقت سموں ذرا سی دیر میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔

''میرا ارسلان کو مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔'' میرے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی سموں نے سر جھکا کر کہا۔ ''لیکن اس نے تو فرعونیت کی انتہا کر دی تھی۔ مجھے میرے ہی اسکول سے بے دخل کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا وہ اس بات کو بھول گیا تھا کہ یہ ادارہ میں نے قائم کیا ہے۔ پھر اس نے اچھے اور باصلاحیت نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ انہیں سنہرے مگر جھوٹے خواب دکھاتا تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی لڑکیوں کی عزتوں کو پامال کیا تھا۔ وہ ہر لڑکی سے وعدہ کرتا کہ وہ اسے ہیروئن بنا دے گا۔ ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے مگر وہ ہر حد پار کر گیا تھا۔ میرے سمجھانے بجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

پھر میری طرف مڑ کر بولا ''لیکن تم اس حقیقت تک کیسے پہنچے کہ میں نے ہی ارسلان کو.....؟''

''تم نے ارسلان کو گولی ماری اور اس کے بعد بعض ایسی غلطیاں کر گئے جن سے اس کے قاتل کی شناخت ہو گئی۔''

''یعنی.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جب ارسلان کو گولی ماری گئی اس وقت وہ سگار پی رہا تھا۔ تھوڑا سا سگار باقی بچا تھا جبکہ اس کے سامنے رکھی ہوئی ایش ٹرے بالکل صاف تھی۔ یہ غلطی قاتل کی تھی۔ جس نے اس ایش ٹرے کو صاف کیا تھا۔ تم بہت سگریٹ پیتے ہو۔ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہو۔ ظاہر ہے وہ ایش ٹرے تم نے استعمال کی تھی۔ اپنے سگریٹوں کی راکھ ڈالنے کے لیے..... اور جاتے جاتے اسے صاف بھی کر گئے۔ یہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ارسلان کے قاتل تم ہی ہو سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ تمہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ آلۂ قتل میرے پاس یہاں اس دفتر میں موجود ہے..... ہے نا؟'' لیاقت سموں نے کہا۔

''ہاں..... مگر مجھے اندازہ تھا کہ تم سیدھے یہیں آئے ہو گے۔ تمہارے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ شیو بنانے کے لیے اپنے گھر چلے جاتے.....'' میں نے کہا۔

''تو گویا تم نے ایکٹنگ کا شوقین بن کر مجھے دھوکا دیا؟'' لیاقت سموں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''میں نے کبھی تمہارے بارے میں پڑھا تھا کہ تم اصل اور حقیقی تاثرات دیتے ہو۔ تمہارے چہرے پر مصنوعی پن نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا ''آج اس کا عملی مظاہرہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

''اوہ میرے خدا!'' یہ کہہ کر لیاقت سموں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

''اب چلنے کی تیاری کرو.....'' میں نے اس کو حکم دیا تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔

''میں واقعی بہت برا ایکٹر ہوں۔'' وہ بڑبڑایا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

❀ ❀

جب نک ویلوٹ نے گلوریا کو یہ بتایا کہ وہ اس سے پہلے کبھی کسی کاؤنٹی کے میلے میں نہیں گیا ہے تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے بے یقینی سے نک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی کاؤنٹی میلے میں نہیں گئے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے تم کبھی کسی سرکس میں نہ گئے ہو یا تم نے کسی ٹرین میں سواری نہ کی ہو جب کہ ہر شخص ہی کاؤنٹی فیئر میں جاتا ہے۔''

وہ دونوں اس وقت کار میں شمالی نیوجرسی کے پار جا رہے تھے۔ وہ جیکسن کاؤنٹی کے میلے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ یہ کاؤنٹی پنسلوانیا کی سرحد پر واقع تھی وہ اگست کی ایک گرم دوپہر تھی۔ آسمان پر اکا دکا بادل نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی گویا دوڑے چلے جا رہے تھے۔

''میرے خیال میں مین ہٹن کی کسی کاؤنٹی میں میلے نہیں ہوتے!'' نک ویلوٹ نے گلوریا سے کہا۔ ''کم از کم میں نے ایسے کسی میلے کے بارے میں نہیں سنا۔ یاد رہے کہ میری پرورش گرین وچ گاؤں میں ہوئی ہے۔''

''پھر بھی۔'' گلوریا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ پر پہلو بدل کر کہا۔ ''کیا تمہاری کوئی آنٹی یا انکل بھی نہیں تھے جو تمہیں موسم گرما میں اپنے پاس اپنے فارم پر بلا لیتے ہوں؟ میرے خیال میں ایسا تو ضرور ہوگا۔''

''ایک بار مجھے گرمیوں کے موسم میں لڑکوں کے ایک

پائی کی چوری

مرزا ظفر بیگ

معمولی نوعیت کی چیزیں چرانے کے ماہر نک ویلوٹ کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کے متعدد کارنامے آپ کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ اس دفعہ بھی انہیں جو ٹارگٹ ملا ہے، اس نے ان کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔

ایک پائی کی چوری کا ماجرا، دسترس میں ہونے کے باوجود اس کا حصول ناممکن تھا

کیمپ بھیجا گیا تھا۔'' نک نے کہا۔ ''مگر مجھے وہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ دراصل میں ایک شہر کا لڑکا تھا اور گاؤں مجھے پسند نہیں آیا تھا۔''

''بہرحال آج ہم جیکسن کاؤنٹی فیئر میں جا رہے ہیں'' گلوریا نے کہا۔ ''یہ کس سلسلے میں ہے؟''

''اس میلے میں ایپل پائی یعنی سیب سے تیار کردہ مٹھائی تیار کرنے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔'' نک نے کہا۔ ''اس میں جو ایپل پائی پہلا انعام..... یعنی بلو ربن حاصل کرے گی مجھے اسے چرانا ہے اور اس کام کے لیے مائیلو مارکس نے مجھے منہ مانگا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ مقابلہ کل صبح ہوگا۔''

مائیلو مارکس ایک معروف آرٹسٹ تھا۔ اسے پاپ کلچر کے آرٹ کے نمونے اور نوادرات خریدنے کا شوق تھا۔ جتنی رقم وہ اس میلے سے ایک بلو ربن پائی چرانے کے عوض دے رہا تھا اتنی رقم میں وہ دس ہزار ایپل پائیز خرید سکتا تھا مگر نک کو اپنے کلائنٹ کے مقصد سے کوئی غرض، کوئی مطلب نہیں تھا، وہ ہمیشہ سے نہایت معمولی چیزیں چرانے کا کام کرتا تھا اور اس کے بدلے بھاری معاوضہ حاصل کرتا تھا۔ وہ مائیلو کے گھر صرف ایک بار گیا تھا۔ اس کا گھر کیا تھا پورا عجائب گھر تھا۔ اس عجائب گھر میں موجود اشیا اور نوادرات کو دیکھنے کے بعد نک سمجھ گیا کہ جب تک اس ذخیرے میں جیکسن کاؤنٹی میلے کی بلو ربن پائی شامل نہیں ہوگی مائیلو کو چین نہیں آئے گا۔

''مائیلو کا گھر طرح طرح کی نادر اشیا سے بھرا ہوا تھا۔'' نک نے گلوریا کو بتایا۔ ''کتابیں، سلائی کی باسکٹس، اسٹارفش، استری کرنے والے بورڈ..... غرض ہر طرح کی عجیب و غریب چیزیں تھیں۔ ہر چیز کا ڈیزائن اور بناوٹ منفرد تھی۔ اس نے دنیا بھر کی نادر اشیا کا ڈھیر جمع کر رکھا ہے۔ وہ ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ان پر اسپرے کرتا ہے اور ان کی پلاسٹک کوٹنگ کراتا ہے۔ وہ آرٹسٹ ہے آرٹ کا قدردان ہے اور اسے اپنے ذخیرے کے لیے وہ بلو ربن پائی بہرصورت درکار ہے۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ جیکسن کاؤنٹی کے میلے میں پیش کی جانے والی پائیز آرٹ کا شاہکار ہوتی ہیں۔ بس تبھی سے اس پر یہ دھن سوار ہوگئی اس نے گزشتہ سال کی فاتح بلو ربن پائی خریدنے کی کوشش کی تھی مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ ان کا اصول ہے کہ مقابلے میں حصہ لینے والی ایپل پائیز صرف مقامی افراد ہی خرید سکتے ہیں۔''

نک نے بتایا کہ اس نے مائیلو سے کہا کہ وہ دو تین شریر بچوں کی خدمات حاصل کر لے۔ وہ صرف سو سکوں کے عوض اسے بلو ربن پائی چرا کر دے دیں گے جب کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہے۔ اس پر مائیلو نے کہا تھا۔ ''یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ جتنا بہ ظاہر دکھائی دے رہا ہے۔ اس میلے میں ڈھیروں لوگ ہوں گے۔ ان کی موجودگی میں اگر کسی بچے نے ایپل پائی چرانے کی کوشش کی تو اس سے وہ گر بھی سکتی ہے اور خراب بھی ہو سکتی ہے۔ جب کہ مجھے بلو ربن پائی بالکل اصل حالت میں درکار ہے۔ اس کا حسن اور خوبصورتی خراب ہوئی تو سب بیکار ہو جائے گا۔''

روٹ نمبر 78 کے ذریعے نک اور گلوریا بدھ کی صبح روانہ ہو گئے تھے۔ وہ جرسی سے مڈل ٹاؤن، پنسلوانیا آئے پھر شمال کی طرف گھوم گئے۔ یہ راستہ سیدھا جیکسن کاؤنٹی جاتا تھا۔

یہ پوکونوس کے کنارے پر ایک دیہی علاقہ تھا۔ راستے میں وہ چند ڈیری فارمز سے گزرے جن کے ساتھ اناج وغیرہ کے کھیت بھی تھے۔ جیکسن کاؤنٹی کا صدر مقام کلائیڈز ٹاؤن تھا۔ یہ میلہ وہیں لگایا گیا تھا۔ کلائیڈز ٹاؤن میں صاف ستھرے مگر سادہ مکان تھے۔ چند ایک بڑی عمارتیں بھی تھیں چرچ تھے جن کے بنچوں بیچ ایک چھوٹا سا سرسبز پارک تھا۔

''نک! یہ تو بڑی خوبصورت جگہ ہے۔'' گلوریا نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آج بھی اس طرح کے خوبصورت مقامات موجود ہیں۔''

نک نے کار کی رفتار کم کر دی۔ سامنے ایک سائن بورڈ نظر آ رہا تھا جس پر تیر کا نشان بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا۔

''جیکسن کاؤنٹی فیئر۔ اگست 6 تا 13.....''

''اوہ نک! ہم اس کا ابتدائی حصہ نہیں دیکھ سکے۔ یہ میلہ تو 6 اگست سے شروع ہو چکا ہے جب کہ آج.....'' گلوریا نے کہا۔

نک نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم اس کا آخری حصہ بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمارے نصیب میں درمیانی مدت ہی تھی۔ دراصل ہمیں کل صبح یہاں سے جیتنے والی ایپل پائی چرا کر فرار ہو جانا ہے۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم میلے میں جاؤ گے۔ منتظمین سے ایپل پائی طلب کرو گے۔ وہ تمہیں دے دیں گے اور تم واپس روانہ ہو جاؤ گے۔'' گلوریا نے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہو۔'' نک نے کہا۔

☆☆☆

انہوں نے اپنی کار اس وسیع میدان میں کھڑی کی جو اس وقت پارکنگ لاٹ بنا ہوا تھا۔ اس میں بے شمار کاریں، پک اپ، ٹرک حتیٰ کہ گھوڑا گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان گھوڑا گاڑیوں میں مویشیوں کو لایا گیا تھا۔

نک اور گلوریا میلے میں داخل ہوئے تو ایک سیاہ فام اور بھاری بھرکم عورت نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے سر پر بید کے تنکوں والا ہیٹ تھا جس میں پھول بھی لگے ہوئے تھے۔

''آؤ..... آؤ..... میں تمہیں اس میلے میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ کیا تم دونوں اسکرینٹن سے آئے ہو؟'' عورت نے کہا۔

''ارے..... تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟'' نک نے مسکراتے ہوئے کہا تو سیاہ فام عورت کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

''میں لوگوں کے چہرے دیکھ کر بتا دیتی ہوں کہ ان کا تعلق شہر سے ہے یا گاؤں سے۔'' عورت نے کہا۔ ''میرا نام بیتھ بکلے ہے۔ میں اس میلے کی منتظمہ کمیٹی کی چیئرمین ہوں اگر تم جونیئر فیئر ہارس شو دیکھنا چاہتے ہو تو وہ آدھے گھنٹے بعد شروع ہونے والا ہے۔''

''ہماری دلچسپی ایپل پائی تیار کرنے کے مقابلے میں ہے۔''

گلوریا نے کہا تو نک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس نے جلدی سے بات سنبھالی۔ ''دراصل ہماری ایک کزن اس مقابلے میں حصہ لینے کی خواہش مند تھی اسی لیے.....''

''اچھا..... کون ہے وہ؟ ممکن ہے میں جانتی ہوں۔'' بیتھ نے پوچھا۔

''نہیں، وہ اس علاقے میں نئی آئی ہے۔'' نک نے کہا۔

''بہرحال تم لوگ ایک روز پہلے آ گئے ہو۔'' بیتھ نے کہا۔ ''ایپل پائی تیار کرنے کا مقابلہ تو کل ہوگا اور اس کا انعقاد فائن آرٹس کی مشہور عمارت میں ہوگا۔ وہ عمارت دوسری طرف ہے۔''

''تمہارا شکریہ بیتھ۔'' گلوریا نے کہا۔

''اس مقابلے کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟'' نک نے بیتھ سے سوال کیا۔ ''کیا اس کے لیے ججوں کا کوئی پینل ہے؟''

''نہیں..... اگر ہم ججوں کا پینل بلاتے تو وہ تمام پائیز خود ہی کھا جاتے۔'' بیتھ نے کہا۔ ''پھر ہمارے پاس نیلام کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچتا۔ ہمارے پاس صرف ایک جج ہے اور ایک مقامی بیکر ہے۔ اس کا نام لیونارڈ فالکن ہے۔ یونین روڈ پر اس کی بیکری بھی ہے۔ اس بیکری کی تیار کردہ پیسٹریاں واقعی عمدہ ہوتی ہیں۔''

''اچھا؟ پھر تو وہ پیسٹریاں ہم ضرور کھائیں گے۔'' نک نے کہا مگر وہ اس مقابلے کا فیصلہ کیسے کرتا ہے؟''

''حیران کن!'' بیتھ نے کہا۔ ''وہ اسٹیج پر ایک میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ میز پر مقابلے میں حصہ لینے والی تمام ایپل پائیز رکھ دی جاتی ہیں جو عام طور سے چھ یا آٹھ ہوتی ہیں۔ ہر ایک میں سے ایک ٹکڑا کاٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیونارڈ فائن ہر پائی کا بغور جائزہ لیتا ہے۔ اس کی تہوں کو چھوتا ہے پھر وہ کٹے ہوئے ٹکڑے کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے پاس کچھ لکھتا بھی جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ کسی پائی کو دوسری مرتبہ بھی چکھتا ہے۔ اس دوران اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہوتا ہے۔ کوئی بھی اس کے احساسات کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ظاہر ہے اسے بتا نہیں ہوتا کہ کونسی پائی کس نے جمع کرائی ہے کیونکہ ان پر امیدواروں کے نام نہیں لکھے ہوتے جب کہ ان پائیز کو تیار کرنے والی خواتین سامنے ہی بیٹھی ہوتی ہیں۔ ان کا تجسس سے برا حال ہو جاتا ہے۔ کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ کون فاتح ہوگی آخر لیونارڈ فائن فاتح کے نمبر کا اعلان کرتا ہے اور اس کی تیار کردہ پائی کی تعریف میں چند ایک جملے بھی بولتا ہے۔ چنانچہ اس پائی کو تیار کرنے والی عورت اپنا بلو ربن حاصل کرنے آگے بڑھ جاتی ہے۔''

''ارے اتنی محنت کے بعد اس بے چاری کو صرف ایک نیلا ربن ملتا ہے!'' گلوریا نے حیرت سے کہا۔

''یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔'' بیتھ نے کہا۔

''کیا اس مقابلے میں مرد بھی حصہ لیتے ہیں؟'' نک نے سوال کیا۔

''چند سال پہلے ایک مرد نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔'' بیتھ نے بتایا۔ ''اس نے دوسرا انعام یعنی سرخ ربن حاصل کیا تھا مگر اس نے محض تفریحاً ہی اس میں شرکت کی تھی۔ اس کے بعد کسی مرد نے اس مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد اچھی پائی تیار نہیں کر سکتے۔ اس کی زندہ مثال لیونارڈ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض کاؤنٹیز کے میلوں میں مرد بھی پائی تیار کرنے کے مقابلوں میں شرکت کرتے ہیں مگر ہمارے ہاں مرد اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔''

''تم نے ابھی کہا تھا کہ مقابلے میں شریک پائیز کا نیلام بھی ہوتا ہے!'' نک ویلوٹ نے بیتھ سے سوال کیا۔

''ہاں..... ہم تمام پائیز کو نیلام کرتے ہیں۔'' بیتھ نے کہا۔ ''اس لیے جج ان کا صرف ذرا سا ٹکڑا ہی چکھتے ہیں۔ ایپل پائیز کو پلاسٹک کے ڈبوں میں رکھا جاتا ہے اور انہی میں نیلام کر کے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ بولی بلو ربن پائیز کی لگتی ہے۔ گزشتہ سال بلو ربن پائی کی بولی 9.5 ڈالر تک

گئی تھی۔"

"اچھا!" گلوریا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، اب میں چلتی ہوں۔" بیتھ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے دوسرے پروگرام کے انتظامات کرنے ہیں۔ تم دونوں سے کل پائی کے مقابلے میں ملاقات ہوگی۔"

"یہاں کے لوگ تو بڑے ملنسار ہیں۔" بیتھ کے جانے کے بعد نک ویلوٹ نے گلوریا سے کہا۔

"نک! میرے خیال میں تمہیں اس بلو ربن پائی کو چرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" گلوریا نے کہا۔ "پہلا انعام حاصل کرنے والی پائی پر سب سے زیادہ بولی لگا دو۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمہیں سوڈا ٹرک میں مل جائے گی۔"

"مگر یہاں کے رواج کے مطابق یہ بولی صرف مقامی لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔" نک نے کہا۔ "گزشتہ سال مائیلو نے کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔"

☆☆☆

وہ دونوں اپنی گاڑی میں یونین روڈ پر واقع لیونارڈ کی بیکری پہنچے۔ واقعی وہاں کے شوکیسوں میں رکھی ہوئی پائیز، پیسٹریاں اور ڈبل روٹی نہایت عمدہ تھیں۔ گلوریا نے وہاں سے ایک کیک خریدا جب کہ نک نے سیلز مین سے لیونارڈ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اندر ہے۔ اسی وقت سفید ایپرن لگائے ایک آدمی اندرونی حصے سے باہر آیا۔

"میرا نام لیونارڈ فائن ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

نک نے اپنی جیب سے ایک بزنس کارڈ نکالا جو وہ کبھی کبھار استعمال کرتا تھا اور لیونارڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام نکولس ہے، ہم دونوں سنڈے میگزین کے لیے کاؤنٹی کے میلوں پر ایک فیچر تیار کر رہے ہیں تم غالباً کل صبح ایپل پائی کے مقابلے کے جج ہوگے، ہے نا؟"

"ہاں..... میں ہر سال ہی اس مقابلے کا جج ہوتا ہوں۔" لیونارڈ فائن نے جواب دیا۔ "ویسے تو میں کیکس کا جج بھی ہوتا ہوں مگر اس سال میں صرف ایپل پائیز کے فیصلے کروں گا۔"

نک نے جلدی سے ایک نوٹ پیڈ اور قلم نکالا اور کسی صحافی کی نقالی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں ایک اچھی ایپل پائی میں کون کون سے عنصر اہم ہوتے ہیں؟"

"سب سے پہلی چیز سیب کا ذائقہ اور اس کی خوشبو ہے۔"

لیونارڈ نے جواب دیا۔ "میں اس کی پیشکش اور ڈیزائن پر پورے نمبر دیتا ہوں۔ پھر پائی کی تہ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ میں اس تہ کو پسند کرتا ہوں جو آسانی سے جھڑ نہ سکے۔ اس قصبے میں ایک عورت ہے جس نے گزشتہ سال بھی یہ مقابلہ جیت کر بلو ربن حاصل کیا تھا۔ وہ پائی تیار کرنے میں ماہر ہے اور اپنی ترکیب میں انڈے اور سرکے کا خوبی سے استعمال کرتی ہے۔ وہ اس پائی کی ڈیزائننگ بھی بڑی مہارت اور سلیقے سے کرتی ہے اور بڑی نفیس اور نازک جالیاں سی بناتی ہے۔ میں نے ایسی پائیز آج تک نہیں دیکھیں۔ ممکن ہے اس سال بھی وہ میدان مار لے۔"

"اچھا! اس کا نام کیا ہے؟" نک نے کہا۔ "ممکن ہے میں اس کا انٹرویو ہی کر ڈالوں۔"

"ضرور! اس کا نام میگی اوٹس ہے۔" لیونارڈ نے کہا۔ "قریب ہی رہتی ہے۔ اخبار میں اپنے انٹرویو کا سن کر بہت خوش ہوگی۔ میں اسے فون کر دیتا ہوں۔"

"ضرور..... اگر وہ اس بار بھی جیت گئی تو اس کا انٹرویو ہمارے لیے مددگار ثابت ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ دونوں چل دیے۔

نک نے اپنی کار ایک دو منزلہ مکان کے سامنے روک دی جس کے آگے وسیع اور سرسبز لان تھا۔ میگی اوٹس تیس سال کے پیٹے میں تھی اور خاصی ملنسار اور خوش مزاج تھی۔ اس نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا اور کہا۔

"مجھے لیونارڈ نے تمہارے بارے میں فون کر کے بتا دیا تھا۔"

نک نے اپنا اور گلوریا کا تعارف کرایا اور گلوریا کو اپنی فوٹو گرافر بتایا۔ یہ سنتے ہی گلوریا نے اپنا چھوٹا سا نفیس ڈیجیٹل کیمرا نکال لیا۔

"تم دونوں اندر آ جاؤ۔" میگی نے کہا۔ "میرا شوہر ابھی گھر پر نہیں ہے۔ وہ آنے والا ہی ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ان دونوں کو اندر کچن میں لے آئی۔ کچن میں کئی پائیز کے ٹن ایک قطار میں رکھے تھے۔ سامنے میز پر ایک تازہ پائی رکھی تھی جس کے چھ ٹکڑے کاٹے گئے تھے۔ ان میں سے دو ٹکڑے غائب تھے۔ میگی نے ان کی طرف معذرت خواہانہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل اکیلے کام کرتی ہوں اور آج کل بہت مصروف ہوں اس لیے یہ کچن کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔"

"کیا یہ پائی تم نے کل کے مقابلے کے لیے تیار کی ہے؟" نک نے سامنے رکھی پائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ نمونہ ہے۔ اصل پائی تو اوون میں ہے۔ دونوں کا ذائقہ ایک ہی ہے مگر میں جو پائی مقابلے میں رکھوں گی اس کی تہ زیادہ نفیس ہوگی، کھلاؤں؟"

"ضرور۔" گلوریا نے جلدی سے کہا..... ورنہ نک اسے منع کر دیتا۔

"تم لوگ میرے ساتھ ڈائننگ روم میں آ جاؤ۔ یہاں تو خاصی بے ترتیبی ہے۔" میگی نے کہا تو وہ دونوں اس کے ساتھ اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ وہ پائی کے باقی بچے ہوئے ٹکڑے دو پلیٹوں میں رکھ کر لے آئی جس کے ساتھ کانٹے بھی تھے۔ میگی نے ایک ایک پیس کاٹ کر نک اور گلوریا کو دیا اور تیسرا خود لے لیا اور ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تیسری بار کھا رہی ہوں۔ مجھے اپنے ہاتھ کی تیار کردہ ایپل پائی بہت پسند ہے۔"

"واقعی بہت مزے دار ہے۔" گلوریا نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ نک بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"میں موسم خزاں میں اور فصل کی کٹائی کے موقع پر انگور کی پائی بھی تیار کرتی ہوں اور انہیں یہیں فروخت کرتی ہوں۔ اس طرح میرا اچھا سا کاروبار چل رہا ہے۔" میگی نے بتایا۔

"میرا شوہر وین بھی میرے اس بزنس سے خوش ہے۔" اسی لمحے باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی تو میگی نے کہا۔ "وہ وین ہی ہے۔"

میگی کا شوہر کسی زمانے میں اچھا کھلاڑی رہا ہوگا مگر اب اس کا کسرتی بدن تھیلا بن گیا تھا۔ موٹی سی توند نے اس کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ جب وین کو پتا چلا کہ میگزین والے اس کی بیوی کا انٹرویو کرنے آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ نک سوچ رہا تھا۔ اس بے چارے کو اس وقت کتنا افسوس ہوگا جب میگی کی تصویر یا انٹرویو کسی بھی میگزین میں کبھی شائع نہیں ہوگی۔ اسٹوو پر رکھے اوون سے ایک آواز نکلی جو اس بات کا اعلان تھا کہ ایپل پائی تیار ہو گئی۔

میگی جلدی سے اسٹوو کی طرف لپکی، وہ کہہ رہی تھی "تھوڑی دیر میں اسے ٹھنڈا ہونے دوں گی پھر ایک بکس میں رکھ دوں گی۔"

وین کے ساتھ نک اور گلوریا نے بھی اس ایپل پائی کی تعریف کی مگر جیسا کہ نک کو بتایا گیا تھا اس پائی کو جالی کے کام سے سجایا نہیں گیا تھا۔ اس کی اوپری تہ مضبوط تھی البتہ اس کے سوراخوں کے ذریعے اس کے اوپر ایک سیب کی آؤٹ لائن بڑی مہارت سے بنائی گئی تھی۔

"تم نے یہ کام کس سے سیکھا تھا؟" نک نے میگی سے پوچھا۔

"اپنی ممی سے۔" میگی نے جواب دیا۔ "جس طرح سبھی بیٹیاں اپنی ماؤں سے سیکھتی ہیں۔ ویسے فران آلیوراس کاؤنٹی میں بہترین کیک اور پائیز تیار کرتی ہے۔ مجھ سے بھی اچھی..... میں اسے کبھی شکست نہیں دے سکی۔ اس نے چار مرتبہ بلو ربن جیتے ہیں جب کہ میں ابھی تک صرف ایک جیت سکی ہوں۔"

"تم دوسرا بھی حاصل کر لو گی۔" وین نے اپنی بیوی کا ہاتھ دباتے ہوئے..... محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں۔" میگی نے آہستہ سے کہا۔ "میرا مقابلہ جینی سے ہے۔ اس نے گزشتہ سال بھی مجھ سے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اس بار بھی....."

"گلوریا! جیکسن کاؤنٹی کے ایپل پائی کے مقابلے نے بے شمار لوگوں کی توجہ حاصل کر لی ہے۔" ڈائننگ روم سے آتے ہوئے نک نے گلوریا سے کہا پھر اس نے میگی سے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ گزشتہ سال کسی آرٹ کے دلدادہ نے ایک بلو ربن پائی خریدنے کی کوشش کی تھی۔"

"ہاں..... وہ مائیلو....." وین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس نے انعام یافتہ پائی کے بدلے ہزاروں ڈالر کی پیش کش کی تھی مگر بیتھ نے انکار کر دیا تھا۔ یہاں کے رواج کے مطابق صرف مقامی لوگ ہی نیلامی میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بیتھ کا کہنا تھا کہ پائی کھانے کے لیے ہوتی ہے..... عجائب گھر میں سجانے کے لیے نہیں ہوتی پھر مائیلو نے میگی سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے انعام یافتہ پائی جیسی ایک پائی اور تیار کر دے تاکہ وہ اپنے آرٹ کے ذخیرے میں اس کا اضافہ کر لے مگر میگی نے اسے منع کر دیا۔"

"حالانکہ مائیلو نے ہزاروں ڈالر کی پیشکش کر ڈالی تھی مگر میں نے انکار کر دیا۔" میگی نے فخر سے کہا۔ "کیونکہ یہ ہمارے قصبے کی عزت کا معاملہ تھا۔ قصبے والے چاہتے تھے کہ وہ پائی یہیں رہے اور میں نے ان کی خواہش پوری کی۔"

"ارے بھئی..... میرے لیے بھی پائی کا کوئی ٹکڑا بچا ہے یا....." یہ کہہ کر وین اپنی بیوی کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں..... ہاں..... یہ ہے۔" یہ کہہ کر میگی نے اس کی طرف پلیٹ بڑھائی تو وین نے کہا۔ "میں کچن سے چاقو لے آؤں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا مگر فوراً ہی واپس آ گیا اور بولا۔ "میں خواہ مخواہ ہی چاقو لینے گیا تھا جب کہ صرف ایک ہی ٹکڑا بچا ہے۔"

جب اس نے پائی کھالی تو میگی کچن میں گئی اس نے فائنل پائی کو پلاسٹک کے ایک بکس میں رکھا اوپر سے اس پر شیپ

چپکا دیا پھر اس نے بکس پر ایک ٹیگ لگا دیا جس پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ نک ویلوٹ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میگی نے کہا۔ ''اب میں یہ بکس صبح دس بجے بیتھ کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ اس پر سے میرے نام کا لیبل ہٹا کر اس کی جگہ نمبر لکھ دے گی۔ اس کے بعد اس بکس کو جج کی میز پر پہنچا دیا جائے گا۔''

''فیصلے میں کتنا وقت لگے گا؟'' نک نے میگی سے کہا۔

''بیتھ ہر پائی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر کاغذ کی ایک پلیٹ پر رکھ دیتی ہے اور یہ پلیٹ جج کی میز پر پہنچا دی جاتی ہے۔''

''یہ ٹکڑے لیونارڈ کے لیے ہوتے ہیں جو اس مقابلے کا جج ہے۔'' وین نے نک اور گلوریا کو بتا دیا۔

''ویسے تمہیں بڑا عجیب لگے گا کہ تمہاری بیوی دوسری مرتبہ بلور بن جیتے گی۔'' نک نے وین سے کہا۔ ''تم آؤ گے؟''

''نہیں..... میں ڈیوٹی پر جاؤں گا۔ چھٹی نہیں کر سکتا۔'' وین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں کاؤنٹی کے اسپتال میں سیکوریٹی گارڈ ہوں..... وہاں اسٹاف کی ہمیشہ کمی رہتی ہے۔ بہرحال تم لوگ میری میگی کی تصویریں ضرور کھینچنا..... اگر یہ جیتے تو.....''

''ضرور ضرور!'' نک نے وعدہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

قصبے کے باہر ایک موٹیل میں انہیں ایک کمرا مل گیا۔ ڈنر کرتے ہوئے گلوریا نے کہا۔ ''تم چاہتے تو اس کے کچن سے وہ پائی چوری کر سکتے تھے پھر یہاں سے رفو چکر ہو جاتے۔''

''تم بھول رہی ہو کہ اس پائی کا بلور بن جیتنا ضروری ہے۔'' نک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جج کے فیصلے کا انتظار کرنا ہوگا اگر میگی گزشتہ سال جیتی تھی تو ضروری نہیں کہ وہ اس سال بھی جیت جائے۔'' یہ کہہ کر نک خاموش ہو گیا۔

''سوال یہ ہے کہ تم اس پائی کو کیسے چراؤ گے؟''

''دیکھتی رہو.....'' نک ویلوٹ نے آنکھیں بند کر کہا۔

.....مگر ان کا کام آسان ہوتا چلا گیا۔ وہ دونوں ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد جب واپس اپنے موٹیل پہنچے تو ایک ادھیڑ عمر عورت کو اپنا منتظر پایا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

''کیا تم ہی مسٹر نکولس ہو؟ وہ صحافی؟''

''ہاں..... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' نک نے پوچھا۔

''میرا نام ریٹا ہے۔'' ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔ ''میگی نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس کی پائیز کے بارے میں کوئی فیچر لکھ رہے ہو۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اس میں تم مجھے بھی شامل کر لو۔ اس سال بلور بن میں جیتوں گی۔''

''ضرور، تم اندر آؤ۔'' نک نے ریٹا سے کہا اور اس کے لیے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ''ہم تمہارا نام اس فیچر میں ضرور شامل کریں گے۔''

ریٹا اندر آئی تو نک نے اسے بیٹھنے کو کہا پھر اس سے سوال کیا۔ ''تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیا تم کلائیڈ ٹاؤن میں رہتی ہو؟''

وہ صوفے کے کنارے پر عجیب سے انداز میں ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اس نے نک سے کہا۔ ''میں اسی علاقے میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی ہوں۔ پوسٹ روڈ پر ہمارا ڈیری فارم ہے جہاں میرا شوہر اور میرے دو بیٹے کام کرتے ہیں۔ ایپل پائی کے مقابلے میں، میں اور میگی کئی سال سے ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ میں نے دو سال پہلے بلو ربن حاصل کیا تھا اور میگی نے گزشتہ سال حاصل کیا ہے مگر اس بار میں ایک بار پھر یہ چیمپئن شپ جیتوں گی۔ آج رات میں نے اسے فون کیا تو اس نے اپنے انٹرویو کے بارے میں بتایا اور تم دونوں کا تعارف بھی کرایا۔ میں مختلف موٹیلز چیک کرتی کرتی یہاں تک آ گئی۔''

''واہ تم نے تو بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔'' گلوریا نے ریٹا کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''دو سال پہلے میں نے جب انعام جیتا تھا اس وقت کی تصویریں میں ساتھ لائی ہوں۔'' ریٹا نے کہا۔ ''یہ دیکھو۔'' یہ کہہ کر اس نے لفافہ کھولا اور چند رنگین تصویریں نکال کر نک کی طرف بڑھا دیں۔

''بہت خوب!'' نک نے ان تصویروں کو دیکھا اور گلوریا کی طرف بڑھا دیا۔ گلوریا بھی تصویریں دیکھنے لگی۔

''اس مقابلے میں اگر پائیز کی شکل و صورت، اس کی بناوٹ کو دیکھا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کے ذائقے کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جاتی ہے۔'' ریٹا نے بتایا۔ ''میرے خیال میں مقابلے میں حصہ لینے والی کی پیشکش اہم ہے..... ظاہر ہے اس کا جج لیونارڈ ہے جو خود ایک اچھا اور ماہر بیکر ہے۔''

''میرے خیال میں تو یہ فیصلہ تکے سے ہوتا ہے۔'' نک نے کہا۔

''ہاں، مگر ہر شخص میگی کے خصوصی ذائقے اور اس کی تہوں کو پہچانتا ہے، میں پائی کی تہ کے ڈیزائن کو خصوصی اہمیت دیتی ہوں۔ مگر میگی پھر بھی مجھ سے آگے نکل جاتی ہے جیسا کہ

گزشتہ سال ہوا۔"

"گویا تمہیں لیونارڈ کے فیصلے سے اختلاف ہے؟"

"اس قصبے کی سبھی عورتیں اسے پسند کرتی ہیں۔" ریٹا نے کندھے جھٹک کر کہا "اور سوچتی ہیں کہ ان کے شوہر بھی لیونارڈ فائن جیسے ماہر بیکر ہوتے۔"

"اگر تم نے یہ مقابلہ جیتا تو ہم تمہاری اچھی کوریج کریں گے۔" ٹک نے ریٹا کی طرف دیکھتے ہوئے اسے یقین دہانی کرائی۔

"تم یہ تصویریں اپنے پاس رکھ لو۔" ریٹا نے کہا تو ٹک نے ہچکچاتے ہوئے اس میں سے صرف ایک تصویر لی باقی ریٹا کو واپس کر دیں۔ "کل تم مقابلے میں آؤ گے نا؟" ریٹا نے کہا تو ٹک نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس نے ریٹا کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اگلے روز صبح انہوں نے جلدی جلدی ناشتا کیا۔ نیویارک کا ایک اخبار لیا اور میلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دس بجے سے پہلے وہاں پہنچ گئے تاکہ پائیز کی ڈیلوری خود دیکھ سکیں۔ بیتھ تمام امیدواروں سے ایپل پائیز وصول کر رہی تھی جو پلاسٹک کے ڈبوں میں رکھی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس نے انہیں ہیلو کہا اور بولی۔ "سنا ہے تم لوگ ہمارے قصبے میں گھومتے پھرتے رہے ہو۔ تم نے ہمارے بیکرز جج اور چند خواتین سے بھی باتیں کی ہیں؟"

"ہاں..... واقعی..... یہاں کے لوگ بڑے باصلاحیت ہیں۔" ٹک نے جواب دیا۔ "گزشتہ رات گلوریا نے لیونارڈ کی بیکری سے ایک کیک بھی خریدا تھا۔"

بیتھ کے سامنے پہلے سے ایپل پائیز کے تین پلاسٹک کے ڈبے رکھے تھے۔ اسی دوران میگی اوٹس بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک بکس تھا جس میں اس کی تیار کردہ پائی رکھی تھی۔ بیتھ نے اس کا بکس لیا۔ اس پر سے اس کے نام کا لیبل اتار کر لیبل پر ایک نمبر لکھ دیا اور وہی نمبر اس کے بکس پر بھی ڈال دیا پھر اس نے میگی سے کہا۔ "ٹھیک ہے..... میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔" بیتھ اور میگی دونوں مسکرا دیں۔

"اور کتنی پائیز آئی ہیں اس مقابلے میں؟" میگی نے پوچھا۔

"تمہارا نمبر چوتھا ہے۔" بیتھ نے کہا۔ "میرے خیال میں ریٹا بھی اپنی پائی کے ساتھ آنے والی ہوگی۔"

"وہ آ گئی۔" گلوریا نے کہا۔ سامنے سے ریٹا چلی آ رہی تھی۔

"چلو، اب پانچ ہو گئیں۔" بیتھ نے کہا۔ ریٹا نے اسے اپنی پائی والا بکس دیا تو بیتھ نے اسے بھی "گڈ لک" کہا۔

"آؤ میگی..... ہم ساتھ بیٹھتے ہیں۔" ریٹا نے کہا۔ "اس سے کم از کم لوگوں کو یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ ہم سہیلیاں ہیں۔"

میگی، ریٹا کے ساتھ اندر چلی گئی مگر اس کے انداز میں تذبذب تھا۔ اس کے جانے کے بعد بیتھ نے کہا۔ "یہ دونوں ایک دوسرے کی دوست نہیں ہیں..... ہو بھی نہیں سکتیں خاص طور سے اس موقع پر..... گزشتہ سال تو ان دونوں کے درمیان سنگل کرسٹ پائی اور ڈبل کرسٹ پائی کے موضوع پر تکرار بھی ہو گئی تھی۔"

ٹک اور گلوریا نے میلے میں گھومنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔ میلے میں بچے جھولے پر نظر آ رہے تھے اور نوجوان اپنے مویشیوں کے ساتھ..... ایک لڑکی اونٹ نما جانور لیے جا رہی تھی۔

گلوریا نے کہا۔ "ہمارے زمانے میں پہلے بکریاں اور سٹور اس مقابلے میں شریک ہوا کرتے تھے۔"

"ہاں..... اب تو فارم ہاؤسز میں بھی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔" ٹک نے کہا۔ "بعض چیزیں ابھی تک نہیں بدلیں مثلاً دودھ دوہنے کا مقابلہ۔"

وہ بروقت واپس پہنچے کیونکہ پائی کے مقابلے کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بیتھ اسٹیج پر تھی اور ہر پائی سے ایک ٹکڑا کاٹ کر کاغذ کی پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔ پائیز اپنے باکسز میں بھی کھلی رکھی تھیں تاکہ جج ان کی ظاہری شکل و صورت اور ڈیزائن دیکھ سکیں۔ تماشائی اور مقابلے میں حصہ لینے والے امیدوار اسٹیج کے سامنے تھے۔ سب کی نظریں ان پائیز پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے اپنے اندازے لگا رہے تھے کہ کون سی پائی کس کی ہو سکتی ہے ابھی تک صرف پانچ پائیز ہی لائن میں تھیں۔ جب ٹک نے پوچھا کہ کیا صرف اتنی ہی پائیز ہیں.....؟ تو بیتھ نے کہا۔ "دراصل اصل مقابلہ ریٹا اور میگی کے درمیان ہے اور ان دونوں نے ہی دیگر لوگوں کو اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ انہوں نے اس مقابلے میں حصہ لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بہرحال یہ پائیز بھی اچھی ہیں۔"

"ہاں..... اور کھانے میں بھی یقیناً اچھی ہوں گی۔" گلوریا نے کہا۔

لیونارڈ فائن اندر داخل ہوا اور اسٹیج پر چڑھ گیا۔ ٹک اور

گلوریا کو تیسری لائن میں جگہ ملی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک رجسٹر بھی دبا ہوا تھا۔ وہ شاید اس میں پائیز کے نتائج لکھتا تھا..... اس نے سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ سرخ شرٹ پہن رکھی تھی جس پر اس کے سنہرے بالوں کی چوٹیاں لہرا رہی تھیں۔

"صبح بخیر خواتین و حضرات! اس نے دلچسپی سے وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایپل پائی کے اس مقابلے میں تم سب کی دلچسپی قابلِ تعریف ہے۔ امید ہے کہ یہ دلچسپی پائیز کی نیلامی کے وقت تک برقرار رہے گی تم سب لوگ جانتے ہو کہ میں پائی کے ذائقے پر بھی نمبر دیتا ہوں اور اس کی پیشکش کے انداز پر بھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس بار ہمارے درمیان دو بلوربن فاتح موجود ہیں لہٰذا میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔"

لیونارڈ کرسی پر بیٹھ گیا اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی پائیز قریب کر لیں اور پاس رکھے کانٹے سے ایک پائی کے ٹکڑے میں سے تھوڑا سا کاٹ کر منہ میں رکھ لیا پھر اس نے باری باری باقی چاروں ٹکڑوں میں سے بھی تھوڑا تھوڑا سا چکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی تھی۔ دو مرتبہ اس نے دوسرے نمبر پر رکھی ہوئی پائی کو چکھا۔ مقابلے میں حصہ لینے والے امیدواروں کے چہروں پر تناؤ تھا۔

اچانک ہی لیونارڈ کے تاثرات بدل گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ اس نے جلدی سے پانی کا گلاس اٹھایا اور اسے منہ سے لگا کر ایک گھونٹ بھرا تو اسے سکون ملا۔ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"بلوربن کی فاتح پائی..... نمبر چار ہے۔" یہ کہتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اپنا سینہ تھام کر بری طرح کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے کرسی پر گرا اور لڑھک کر نیچے گر گیا۔ بیتھ اور چند دوسرے لوگ گھبرا کر اس کی طرف بھاگے حاضرین بھی بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"ٹکی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کہیں یہ تمہارا کام تو نہیں ہے۔" گلوریا نے ویلوٹ سے سرگوشی میں سوال کیا۔

"نہیں..... میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" ٹک نے جواب دیا۔ "ویسے میرا خیال ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔"

☆☆☆

ایمبولینس آتے آتے لیونارڈ فائن مر گیا اس جگہ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ دو عورتیں بے ہوش ہو گئیں اور لوگ اپنی اپنی بولی بولنے لگے بیتھ اسٹیج پر چڑھ کر لوگوں سے "پرسکون رہنے کی اپیل کر رہی تھی تک بھی بیتھ کی مدد کر رہا تھا۔ وہ لوگوں سے اپیل کر رہا تھا کہ آرام سے باہر جائیں اور پرسکون رہیں ٹک کو یقین تھا کہ وہاں رکھی ہوئی پائیز میں سے کسی ایک میں زہر تھا اور اسی زہر نے لیونارڈ کی جان لی تھی۔ ٹک آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا وہ بیتھ کی مدد کرنے کے بہانے ایک مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران وہ میز کے پاس پہنچا اور اس نے بے سوچے سمجھے بغیر لیونارڈ کا وہ رجسٹر اٹھا لیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا پھر وہ گلوریا کے ساتھ باہر آ گیا۔

"یہ ساری بھاگ دوڑ تو بے کار ہی گئی۔" گلوریا نے کہا۔

"ہاں..... لیونارڈ کو صرف اتنی زندگی مل سکی کہ اس نے نمبر چار کی جیت کا اعلان کر دیا اور چار نمبر والی پائی میگی اوٹس کی تھی۔"

"ہاں..... مگر پولیس تو ان پانچوں پائیز کو ساتھ لے جائے گی۔"

گلوریا نے کہا۔ "اس کے بعد تم انہیں دیکھ بھی نہیں سکو گے۔"

لیونارڈ کی لاش وہاں سے ہٹا دی گئی تھی۔ کاؤنٹی شیرف بیتھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ان تماشائیوں سے بھی سوال کیے جو اسٹیج کے قریب تھے سب کا یہی کہنا تھا کہ لیونارڈ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے بڑی عمدگی سے باتیں کی تھیں اور ان پائیز کو چکھنے کے بعد بلوربن کے فاتح کا اعلان بھی کیا تھا جو نمبر چار تھا مگر پائیز چکھتے ہوئے ہی اس کی حالت خراب ہوئی۔ شیرف نے بیتھ سے پوچھا کہ لیونارڈ نے کچھ اور تو نہیں کھایا تھا؟ بیتھ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اسی لمحے رتھ نامی خاتون نے کہا۔ "ہاں..... اس نے پانی کا ایک گھونٹ پیا تھا۔"

شیرف نے پانی کے گلاس کی طرف دیکھا جو آدھا خالی تھا اس نے کہا۔ "ہم اس گلاس اور پانی کو بھی ٹیسٹ کے لیے لے جائیں گے۔"

جب سب چلے گئے تو گلوریا اور ٹک اپنی کار کی طرف چلے گئے۔ ٹک نے اپنی قمیص کے اندر سے وہ رجسٹر نکالا جو اس نے میز سے اٹھایا تھا۔ گلوریا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو ٹک نے کہا۔ "یہ لیونارڈ کا وہ رجسٹر ہے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے یونہی اٹھا لیا کہ شاید اس سے ہمیں کوئی معلومات مل سکے۔ ممکن ہے اس میں لیونارڈ نے اپنے فیصلے کے حوالے سے کچھ لکھا ہو مگر اس میں اس کا ذاتی شیڈول ہے اور یہ لکھا ہے کہ اسے کس سے کب ملنا ہے۔"

"پھر تو یہ بے کار ہے۔" گلوریا نے مایوسی سے کہا تو ٹک نے اس کے صفحات پلٹنے شروع کیے اور کہا "مگر اس رجسٹر میں

ہر ہفتے دس دن کے بعد لکھا ہے..... ایم اداو۔"

"یہ کسی گائے کا نام ہوگا۔" گلوریا نے کہا۔

"ہاں ..... یا پھر کسی ڈیری فارم کی اصطلاح ہوگی۔" نک نے خیال ظاہر کیا۔

وہ واپس اپنے موٹیل پہنچے جہاں نک کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ گلوریا صحیح کہہ رہی تھی۔ میگی کی انعام یافتہ پائی اس کی دسترس سے بہت دور ہو چکی تھی اور جب پولیس ان پائیز کے ٹیسٹ کروا چکی ہوگی تو انعام یافتہ پائی اس قابل نہیں ہوگی کہ مائیلو اسے اپنے نوادر کے ذخیرے میں شامل کر سکے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ میگی سے درخواست کرے گا کہ وہ اس کے لیے ایسی ہی ڈپلیکیٹ پائی تیار کر دے۔

سہ پہر کو وہ اوٹس کے گھر گئے۔ اس کا شوہر وین اپنے کام پر گیا ہوا تھا۔ میگی نے اسے فون کر کے ساری صورتِ حال بتا دی تھی لہٰذا وہ جلدی واپس آ گیا تھا۔ وین نے نک اور گلوریا کو بتایا "میگی بے حد اداس ہے وہ تم لوگوں سے مل نہیں سکے گی۔"

مگر میگی نے ان کی آواز سن لی تھی۔ وہ فوراً باہر آ گئی۔ "یہ ایک سانحہ تھا" اس نے سوگواری سے کہا "نہ جانے اس قدر عمدہ انسان کی جان کس نے لی ہے۔ وہ تو دوستوں کا دوست تھا۔ میں نے پولیس کو بتا دیا ہے کہ میری پائی میں زہر کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اگر اسے زہر دیا گیا ہے تو وہ کسی اور پائی میں ہوگا۔ تمہاری پائی میں نہیں۔" نک نے کہا۔ ابھی نک کی بات پوری ہوئی تھی کہ شیرف کی کار وہاں آ گئی۔ اس کے ساتھ پولیس کی کار بھی تھی۔

شیرف اپنی کار سے اتر کر ان لوگوں کی طرف بڑھا اور سخت لہجے میں بولا "تم لوگوں کو دوبارہ زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔" پھر اس نے میگی کی طرف گھوم کر کہا "تمہیں ایک بار پھر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ ہمیں تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"وہ..... کیوں؟" میگی نے پریشانی سے کہا۔

"لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا ہے کہ زہر تمہاری تیار کردہ پائی میں تھا" شیرف پائیگ نے جواب دیا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ....." کہتے کہتے میگی رونے لگی "جب میں نے وہ پائی تیار کی تو گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ پھر میں نے اسے پلاسٹک بکس میں رکھ کر اوپر سے ٹیپ لگا دیا تھا اور اسے بیتھ نے اسی وقت کھولا تھا جب اسے اس کے سلائس کاٹنے تھے..... اور یہ کام متعدد افراد کے سامنے کیا گیا تھا....." یہ کہہ کر میگی بے چارگی سے شیرف کو دیکھنے لگی۔

"یہ کوئی نہیں کہہ رہا کہ تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا" شیرف نے اسے تسلی دی "ممکن ہے کہ اتفاقی طور پر کسی وجہ سے یہ زہر تمہاری پائی میں شامل ہو گیا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم سیوریج کی نالیاں وغیرہ کھولنے والا کیمیکل نالی میں ڈال رہی ہو اور اس کی کچھ چھینٹیں تمہاری تیار کردہ پائی پر آ گری ہوں۔"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا" میگی نے کہا "اور میں اس پیارے انسان کو کیوں ماروں گی؟ جبکہ اس نے مجھے پچھلے سال بھی بلور بن دیا تھا اور اس سال بھی....."

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ کہیں لیونارڈ اس بار بلور بن ریٹا کو نہ دے دے؟" شیرف نے کہا۔

اس لمحے میگی کے شوہر وین اوٹس نے مداخلت کی اور کہا۔ "شیرف! اگر تم میگی کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گا۔ میں اس کے ساتھ حوالات میں رہوں گا۔"

"پولیس کو تم سے کچھ ضروری سوال کرنے ہیں۔" شیرف نے میگی سے کہا "تم ہمارے ساتھ چلو۔"

میگی شیرف اور دیگر پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھی۔ ان کے پیچھے وین بھی سر جھکائے چل رہا تھا۔

"نک! اب تو تمہارا میگی سے ڈپلیکیٹ پائی بنوانے کا چانس بھی گیا۔ اب کیا ہوگا؟" گلوریا نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح یہ اعلان ہوا کہ میگی کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی اور اب مزید کارروائی کے لیے یہ کیس گرانڈ جیوری کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ نک کا اس قصبے میں اب کوئی کام نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مہم میں ناکام ہوا تھا۔ انعام یافتہ پائی کا لیبارٹری میں حشر ہو چکا تھا جبکہ اس کی ڈپلیکیٹ تیار کرنے والی واحد شخصیت سلاخوں کے پیچھے تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گلوریا اور نک نے موٹیل کا حساب صاف کیا اور واپس روانہ ہو گئے۔

"اتنے دل گرفتہ مت ہو....." گلوریا نے نک کو تسلی دی۔ "جو کچھ ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔"

وہ اب قصبے سے باہر آ چکے تھے۔ دور سے بڑا سا جھولا نظر آ رہا تھا اور میلے کے شامیانے بھی دکھائی دے رہے تھے

اچانک ان کے سامنے ایک ٹرک آ گیا جس میں دو انعام یافتہ گائیں تھیں۔ ان کے گلوں میں بلور بن بندھے ہوئے تھے۔ یکایک نک کے منہ سے نکلا "کاؤز، نکی، ایم اداو"

اس کی بات سن کر گلوریا نے اسے گھور کر دیکھا "کیا کہہ رہے ہو، کیا مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"مجھے لیونارڈ کے رجسٹر کے وہ الفاظ یاد آ گئے تھے جو اس نے اپنے اپارٹمنٹ والے خانوں میں لکھے ہوئے تھے۔" نک نے کہا اور ایک جھٹکے سے یوٹرن لیتے ہوئے اپنی کار واپس موڑ لی۔

"کہاں جا رہے ہو نک؟" گلوریا نے پریشانی سے سوال کیا۔

"شیرف کے دفتر....." نک نے مختصر جواب دیا۔

لمحوں میں یہ دونوں شیرف کے آفس میں تھے، اندر داخل ہونے سے پہلے گلوریا نے نک سے کہا "مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر تمہارے ذہن میں کیا ہے جو تم اس طرح عجلت میں واپس آئے ہو؟"

"میں مائیلو کو انعام یافتہ پائی ضرور دوں گا اور اس کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ میں میگی اوٹس کو جیل سے رہا کراؤں۔" نک نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا؟ تم جیل کا تالا توڑ کر میگی کو رہا کراؤ گے؟" گلوریا نے کہا۔

"نہیں ..... میں شیرف کو یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ لیونارڈ کو زہر میگی نے نہیں دیا۔" نک نے جواب دیا۔

انتظار گاہ میں ریٹا بھی تھی اور بیتھ بھی۔ بیتھ نے انہیں بتایا کہ شیرف اور سرکاری وکیل ہر ایک کے بیان لے رہے ہیں اس وقت میگی کے شوہر وین کا بیان ہو رہا ہے۔

نک نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو اندر سے شیرف کی غصیلی آواز آئی "کون ہے؟" پھر اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "میں نے کہا تھا کہ ہمیں ڈسٹرب نہ کیا جائے....." مگر نک پر نظر پڑتے ہی اس نے چونک کر کہا۔ "مسٹر نکولس! تم؟ کیا بات ہے؟"

"شیرف! میرے پاس لیونارڈ کی موت کے حوالے سے ایک اہم اطلاع ہے۔" نک ویلوٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے ..... فی الحال انتظار کرو۔ میں مسٹر وین اوٹس کا بیان لے لوں..... اس کے بعد....."

"لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا۔" نک نے کہا اور زبردستی اندر گھس گیا۔ سرکاری وکیل اسے اس طرح اندر آتے دیکھ کر غصے سے کھڑا ہو گیا۔ وین بھی نک کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

نک نے لیونارڈ کا رجسٹر شیرف کی میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لیونارڈ کا رجسٹر ہے جو میں نے اپنے کاغذات اٹھاتے ہوئے اتفاق سے اٹھا لیا تھا۔ اس وقت تک لیونارڈ مر چکا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میرا نہیں ہے بلکہ میں غلطی سے اٹھا لایا ہوں تو میں نے اسے واپس کرنے کا ارادہ کیا۔"

"اوہ..... تو تم نے یہ رجسٹر غلطی سے اٹھا لیا تھا۔" سرکاری وکیل نے طنزیہ لہجے میں کہا مگر نک نے اس کے طنز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے اس رجسٹر کے صفحات کھولے اور روزانہ کے اپائنٹمنٹ والے شعبے میں گیا جہاں متعدد مقامات پر کسی شخص یا ادارے کے نام کے بجائے صرف ایم اداو لکھا ہوا تھا۔

نک نے وہ رجسٹر وین کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"مسٹر وین اوٹس! کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ حروف کس نام کا مخفف ہیں؟" وہ غور سے وین کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں، مجھے نہیں معلوم" وین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اوہ ..... کتنی حیرت کی بات ہے۔" نک نے کہا۔

"حالانکہ یہ حروف تمہارے بیوی کے نام کا مخفف ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں کا نام آلیورا تھا۔ وہ خود میگی ہے لہٰذا اس کا پورا نام بنا میگی آلیورا اوٹس ایم اداو۔"

یہ سنتے ہی شیرف اور سرکاری وکیل دونوں ہی اپنی سیٹوں سے اٹھ گئے۔ ان دونوں نے رجسٹر پر نظر ڈالی۔

"مسٹر وین اوٹس! یہ سب کیا چکر ہے؟" شیرف نے میگی کے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم کیا چکر ہے۔" وین نے اکڑ کر کہا۔

"میں بتاتا ہوں....." نک نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بیوی میگی اور لیونارڈ فائن ہر ہفتہ دس دن میں ایک آدھ بار ملا کرتے تھے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان ملاقاتوں کا مقصد کیا تھا؟"

"نہیں....." وین نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... ! تو تمہیں ان ملاقاتوں کا پتا نہیں تھا؟" نک نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خفیہ ملاقاتیں تھیں۔ وہ دونوں سب سے چھپ کر ملتے تھے۔"

یہ سنتے ہی وین آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "اگر تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ لیونارڈ اور میری بیوی آپس میں..... تو تم غلطی پر ہو۔ ان کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔" وین نے جان بوجھ کر درمیان میں "لورز" کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا ورنہ اس کا مطلب یہی تھا۔

"تم ٹھیک سمجھے..... وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔" نک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جس کا تمہیں بعد میں پتا چل گیا تھا" نک بھی غصے میں تھا۔

شیرف ان دونوں کے درمیان آگیا اور اس نے کہا۔ "آرام سے بات کرو..... زیادہ اشتعال پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاؤ اگر میگی اور لیونارڈ کے درمیان خفیہ تعلقات استوار تھے تو ممکن ہے کہ وہ ختم ہو گئے ہوں اور میگی نے غصے میں آکر اپنے خفیہ محبوب کو زہر دے دیا ہو۔"

"شیرف! یہ نہیں ہو سکتا۔" نک نے کہا "اگر وہ اپنی ہی پائی کو زہر آلود کرتی ہے تو اس سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں اس پر سب سے پہلے شک کیا جاتا ..... اور اگر واقعی ان دونوں کے تعلقات کا خاتمہ ہو چکا تھا تو اس صورت میں لیونارڈ دنیا سے جاتے جاتے میگی کو فاتح قرار نہ دیتا۔ اس نے تو اپنی آخری سانسیں بھی اپنی محبوبہ سے وفاداری میں استعمال کی ہیں۔ اس نے آخری وقت میں بھی میگی کو ورثہ قرار دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے درمیان حسبِ سابق اچھے تعلقات قائم تھے۔"

شیرف پائیک نے زور زور سے سر ہلایا اور کہا "تو پھر مسٹر نکولس! تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس پائی میں زہر کس نے ملایا ہوگا؟ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ میگی نے بتایا ہے اور کچھ ایسی شہادتیں بھی مل رہی ہیں کہ جب اس نے یہ پائی بیک کی اس وقت وہ اپنے کچن میں تنہا تھی۔ اور جیسے ہی وہ پائی ٹھنڈی ہوئی میگی نے اسے پلاسٹک بکس میں سیل کر دیا تھا۔ بعد میں دوسرے روز اس نے وہ بکس بیتھ کو دیا جس نے تمام پائیز کے بکس کھولے اور ان میں سے سلائس کاٹ کر پلیٹ میں سجا دیے تاکہ لیونارڈ انہیں چکھ کر فاتح کا فیصلہ کر سکے۔ یہ تمام کام بہت سے لوگوں اور تماشائیوں کے سامنے کیا گیا تھا ایسے میں میگی اور کسی اور کے پاس موقع نہیں تھا کہ وہ اس پائی میں زہر ملاتا۔" یہ کہہ کر شیرف خاموش ہو گیا۔

"شیرف! تم اس معاملے میں مقصد کو بھول رہے ہو۔" نک نے کہا "اگر واقعی میگی اور لیونارڈ کے درمیان کوئی افیئر چل رہا تھا تو اس سے ایک تیسرا شخص جیلس ہو سکتا تھا اور وہی لیونارڈ کو قتل کر سکتا تھا۔ اور یہ وہ شخص ہے جسے میگی کی پروا بھی نہیں ہوگی کہ اگر وہ لیونارڈ کو زہر دینے کے الزام میں جیل جاتی ہے تو جائے..... اس کی بلا سے۔"

"میری بات سنو" یہ کہتے ہوئے وین اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔

اس نے کہا۔

"میں نے لیونارڈ کو قتل نہیں کیا۔ اور میرے پاس ایسا کوئی موقع بھی نہیں تھا کہ میں اس پائی کو زہر آلود کرتا۔"

"اوہ! تم ہی تو وہ شخص ہو جس نے اس پائی کو زہر آلود کیا تھا" نک نے سکون سے کہا "جب کچن میں پائی ٹھنڈی ہو رہی تھی تو تم اندر کچن سے چاقو لینے گئے تھے تاکہ ٹیسٹ پائی میں سے ایک سلائس کاٹ کر چکھ سکو حالانکہ اس وقت بھی وہاں ایک ٹکڑا پہلے سے کٹا ہوا رکھا تھا۔ پھر تم اندر گئے جہاں تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ ایسے میں اس میں زہر ڈالنا کونسا مشکل کام تھا؟"

"کیسے؟ کیسے؟ مجھے بتاؤ کہ میں یہ کام کیسے کر سکتا تھا؟" وین نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا "کیونکہ پائی پہلے ہی بیک ہو چکی تھی۔ اس کی اوپری تہ بھی جم چکی تھی اور مضبوطی سے قائم تھی۔"

"تم نے انجکشن والی سوئی کے ذریعے پائی کے اندر زہر پہنچایا تھا۔" نک نے کہا "تم بھی دیکھ چکے تھے اور میں بھی..... کہ میگی نے اس پائی کی اوپری تہ پر چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے تھے تاکہ ان کے ذریعے ہوا اندر جا سکے۔ تم ایک اسپتال میں سیکیورٹی گارڈ ہو۔ لہٰذا تمہارے لیے مہلک ترین زہر کا حصول بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تم نے زہر بھی حاصل کر لیا تھا اور انجکشن والی سوئی بھی، ہے نا؟" یہ کہہ کر نک خاموش ہو گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ہر نظر وین پر تھی۔

اس طرح اس ڈرامے کا اختتام ہوا۔ شروع میں تو وین اکڑتا رہا اور اپنے جرم سے انکار کرتا رہا مگر شام ہونے سے پہلے پہلے اس نے اعترافِ جرم کر ہی لیا۔ اس کے بعد میگی کو رہا کر دیا گیا۔ نک اور گلوریا باہر میگی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ باہر نکلی تو وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔

"میں تم لوگوں کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں....." میگی نے جذبات سے بھرائی آواز میں کہا "تم نے میری زندگی بچائی ہے۔ حالانکہ وین نے میری پائی میں زہر ملا دیا تھا۔ اس کے باوجود بیتھ مجھے پہلا انعام بلور بن دے رہی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم لوگوں کی کیا خدمت کروں؟ شاید میں تمہارے اس احسان کا بدلہ اتار سکوں۔" یہ کہہ کر وہ ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں..... ہمیں تم سے ایک کام ہے۔" نک نے مسکراتے ہوئے میگی سے کہا "ہمارے لیے انعام یافتہ پائی جیسی ایک اور پائی تیار کر دو۔"

❋❋

فرق

ثمر عباس

زندگی میں کبھی کبھی ایک نیکی بھی بعض اوقات کام آجاتی ہے..... مگر کچھ لوگوں کی زندگی کا خانہ مثبت کاموں سے خالی رہتا ہے۔

کچھ ایسے کرداروں پر مشتمل کہانی جن کی زندگی میں تاریکیوں کا راج تھا

ٹارسن کو دنیا میں تین انسانوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک اس کا باپ' دوسرا لیفٹیننٹ روڈ مائیک' جو پستہ قد فربہ اور بھدی شکل کا قابلِ نفرت شخص تھا۔ تیسری شخصیت وہ تھی جس کے باعث ٹارسن باقی دو افراد سے نفرت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ یہ اس کی سوتیلی ماں مارگریٹ تھی۔ وہ عمر میں اس سے تین برس چھوٹی تھی۔ وہ مارگریٹ کو پسند کرتا تھا لیکن اس نے ٹارسن کے بجائے اس کے دولت مند باپ ولبر گرین سے شادی کرنا پسند کیا تھا۔

اگر عام حالات ہوتے تو شاید وہ اس صورتِ حال کو برداشت کر لیتا لیکن بدقسمتی سے مارگریٹ خود اس کی

دریافت تھی۔ ان دونوں کے رومان کی ابتدا بڑی شاندار تھی۔ ٹارسن' مارگریٹ کی رفاقت میں بہت مسرور تھا۔ وہ سنجیدگی سے اس عارضی رفاقت کو مستقل بنیاد پر استوار کرنا چاہتا تھا یعنی وہ اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ مارگریٹ بھی ایک دولت مند اور صاحبِ حیثیت کاروباری شخص کے اکلوتے وارث کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

.....لیکن جب ایک تقریب میں مارگریٹ کی ملاقات خود اس دولت مند اور صاحبِ حیثیت بزنس مین سے ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ ان تلوں میں کافی تیل ہے۔ چنانچہ اب ''صاحبزادے'' کی ضرورت نہیں تھی۔ ''صاحب'' خود اس کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ٹارسن کی سابق محبوبہ اس کی سوتیلی ماں بن گئی۔ مارگریٹ نے واضح طور پر دولت کی خاطر اس کی محبت کو ٹھکرا کر اپنی عمر سے دگنی عمر..... بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عمر کے شخص سے شادی کرلی تھی۔

نفرت کی ابتدا کا واضح جواز موجود تھا۔

اس پوری صورتِ حال کا علم کچھ دن کے بعد دلبر گرین کو بھی ہوگیا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ مارگریٹ نے اپنی اداؤں سے دلبر گرین کو اپنا اسیر کرلیا تھا۔ نتیجے میں باپ اور بیٹے کے درمیان رقابت کا نیا رشتہ قائم ہوگیا۔ اس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر دلبر گرین نے اپنے بیٹے کے لیے ایک علیحدہ مکان کا انتظام کرلیا اور وہ دولت جو مستقبل میں ٹارسن کے لیے تھی' مارگریٹ کے تصرف میں آگئی۔ اس کے اخراجات محدود کردیے گئے۔ دلبر گرین پہلے بیٹے کے سلسلے میں اتنا سخت نہیں تھا لیکن رقابت کا نیا رشتہ قائم ہونے کے بعد وہ ٹارسن پر کڑی نگاہ رکھنے لگا۔

نفرت کے رشتے گہرے ہوتے گئے' یہاں تک کہ ٹارسن نے مارگریٹ کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلے میں وہ نت نئی ترکیبیں سوچنے لگا۔ آخر کار کافی سوچ بچار کے بعد وہ اپنی دانست میں ایک بہترین منصوبہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس منصوبے کے تحت کوئی اس پر شبہ نہیں کرسکے گا۔

ٹارسن نے ایک رات اپنے گھر پر دوستوں کی محفل منعقد کی اور عین اس وقت جب محفل شباب پر تھی' وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ اسے علم تھا کہ اس کا باپ ایک کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ ایک خفیہ راستے سے باپ کے مکان میں داخل ہوگیا اور اس نے مارگریٹ کو قتل کردیا پھر ایک تیز دھار آلے سے اس کی گردن الگ کردی۔ دونوں بازو کاٹ دیے' ٹانگیں گھٹنوں سے علیحدہ کیں اور ان تمام بریدہ اعضا کو مکان کے مختلف حصوں میں بکھیر دیا۔ اس طرح اس نے یہ تاثر دیا کہ قتل کسی جنونی نے کیا ہے۔

جب قتل کی تفتیش ہوئی تو دلبر گرین نے بڑے وثوق سے ٹارسن کا نام لے دیا۔ ٹارسن نے بظاہر کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس کسی جنونی قاتل کی تلاش میں لگ جائے گی اور یقیناً ایسا ہی ہوتا..... لیکن دلبر گرین کے انکشاف نے کیس کا رخ ہی تبدیل کردیا۔ ٹارسن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو پھانسی کے تختے پر پہنچانا چاہے گا۔ پستہ قد' فربہ اندام اور بھدی شکل کے پولیس آفیسر روڈ مائیک نے اسے عدالت میں اپنی سوتیلی ماں کا قاتل ثابت کردیا۔

ٹارسن کو اس مقدمے کے دوران' ان دونوں انسانوں سے سخت نفرت ہوگئی۔ پولیس آفیسر روڈ مائیک نے اتنی باریک بینی سے اس کے خلاف ثبوت عدالت کو مہیا کیے تھے کہ ٹارسن کا وکیل ان کی تردید نہ کرسکا۔ تاہم اس نے گزشتہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ ثابت کردیا کہ یہ قتل ٹارسن کے شدید ذہنی ہیجان کا نتیجہ تھا اور حالات نے اس کا ذہنی توازن خراب کردیا تھا۔

اس طرح سزائے موت' عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔ اسے جیل بھیج دیا گیا۔

جیل میں رہ کر ٹارسن نے بہت کچھ سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ پیشہ ور قاتلوں' جعل سازوں' نقب زن اور دیگر جرائم پیشہ افراد سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ ان کے تجربات سے استفادہ کرتا رہا۔ ان میں سے زیادہ تر افراد فرار کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ٹارسن بھی اس منصوبہ بندی میں شامل رہتا لیکن ابھی تک کوئی منصوبہ عمل کے مراحل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اچانک ایک دن ٹارسن کو موقع مل گیا۔

جون کی تپتی دوپہر میں قیدیوں اور محافظوں میں تصادم ہوگیا۔ یہ تصادم رفتہ رفتہ شدت اختیار کرگیا۔ بہت سے قیدی زخمی اور دو ہلاک ہوگئے۔ ایک محافظ بھی مارا گیا اور جیل کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ قیدی جوش و خروش سے جنگ میں مصروف تھے۔ ٹارسن نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور چالاکی سے جیل سے نکل آنے میں کامیاب ہوگیا۔

فرار کے مختلف منصوبے بناتے وقت اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ منتخب کرلیا تھا۔ چنانچہ جیل سے نکلنے کے بعد اس نے ایک گھنٹے کے اندر ریڈی میڈ ملبوسات کی ایک دکان میں ڈاکا ڈالا اور لباس اور کچھ رقم لوٹ کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ اس کے بعد پہلا کام شہر چھوڑ دینا تھا۔ چنانچہ وہ مختلف گاڑیوں میں لفٹ لیتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

لوٹی ہوئی رقم گو کہ بہت زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی فوری ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ایک شہر کے عمدہ سے ہوٹل میں کمرا حاصل کرکے وہیں ٹھہر گیا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس اس کے فرار سے آگاہ ہوچکی ہوگی۔ اس کی تلاش شدت سے شروع ہوچکی ہوگی۔ پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے کوئی قدم اٹھانا ضروری تھا۔ اس کے لیے ایک نئی ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔

جیل کی ایک سالہ زندگی نے اس کی صحت پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا بلکہ وہ پہلے کی نسبت خاصا صحت مند ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے ہوٹل میں رہ کر ڈائیٹنگ شروع کردی۔ وہ مسلسل فاقے کرتا رہا اور اس کی صحت گرتی چلی گئی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک جنون تھا..... پہلے وہ اپنے خود غرض باپ کو قتل کرے گا اور اس کے بعد اسے پولیس آفیسر روڈ مائیک کو اس کے پورے خاندان سمیت ٹھکانے لگانا تھا لیکن اس کے لیے تحمل اور صبر کی ضرورت تھی۔ جب اس کے خلاف پولیس کی سرگرمیاں کسی قدر سست پڑ جاتیں تب یہ کارروائی مناسب تھی۔

جیل کے استادوں نے ٹارسن کو دولت کمانے کے کئی گُر سکھا دیے تھے۔ اب اسے بہت سے طریقے آگئے تھے لیکن سب تدبیروں میں سے عمدہ طریقہ' نہایت کم وقت میں رقم حاصل کرنے کا یہی تھا کہ کسی کو راہ چلتے کسی سنسان جگہ پر پکڑو اور اس کی جیب خالی کرکے بھاگ جاؤ۔

دکان سے لوٹی ہوئی رقم جب ختم ہونے لگی تو ٹارسن ایک رات ہوٹل سے نکلا اور اس نے شہر کی تین مختلف سڑکوں پر وارداتیں کیں۔ ان وارداتوں میں اس نے چاقو استعمال کیا تھا۔ اسے خاصی رقم ہاتھ آئی تھی۔ البتہ ایک شخص نے پولیس کو اس کا حلیہ بتا دیا تھا۔ جس کا علم اسے اگلے دن کے اخبار کے ذریعے سے ہوا۔ پولیس ایک بار پھر اس کی تلاش میں چاروں طرف پھیل گئی۔ اب ٹارسن کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ وہ یہ شہر بھی چھوڑ دے کیونکہ اسے یہ خدشہ ستانے لگا تھا کہ ممکن ہے اس کا حلیہ شائع ہونے کے بعد جیل کی انتظامیہ کو اندازہ ہوجائے کہ وہ جیل سے مفرور ہونے والا ٹارسن ہے۔ یہ شہر چھوڑنے میں اس کے خیال کے مطابق دُہرا فائدہ ہوتا۔ ایک تو پولیس اسے یہیں تلاش کرتی پھرے گی' دوسرا وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام مکمل کرسکتا تھا لیکن کسی مخصوص ذریعۂ سفر کو اختیار کرنا خطرناک تھا۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ جس

خوش ذوق خواتین کا خوب صورت انتخاب

ماہنامہ دلکش کراچی

جون 2006ء کے شمارے کی جھلکیاں

انجم انصار، زاہدہ پروین اور پروین زبیر

کے سلسلے وار ناول، ناولٹ پڑھیے۔

اس کے علاوہ

فرحانہ ملک، ناہید فاطمہ حسین، شمعونہ نقوی

کی پراثر اور دلکش تحریریں

افسانہ، ناولٹ اور مکمل ناول

دلکش رنگ میں خوب صورت آواز و انداز کی مالک

"امبر واجد"

سے ایک دلکش ملاقات

مستقل عنوانات

★خوشبو کا در کھلا★ قانونی راہ نمائی★ آرایش و زیبایش ★اپنے نام سے خود کو پہچانیے★ دارالصحت★ دلکش ذائقے ★ستارۂ سخن★ تسکین ذوق★

یہ سب آپ کی پزیرائی کا منتظر ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

طرح اس شہر تک آیا تھا اسی طرح یہاں سے نکل جائے۔

یہی سوچ کر وہ شاہراہ پر آ گیا۔ ایک بوڑھے شخص نے اسے قریبی شہر تک لفٹ دی۔ نئے شہر تک پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی چنانچہ یہاں قیام کے لیے اس نے ایک ہوٹل منتخب کیا۔ درمیانے درجے کے اس ہوٹل میں رات کی تفریحات شروع ہو چکی تھیں۔ لباس وغیرہ تبدیل کر کے وہ ہال میں آ گیا اور ایک میز پر بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ انتقام کے مختلف منصوبے اس کے ذہن پر ہر وقت بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایسا جامع منصوبہ بنانا چاہتا تھا جو کسی طور ناکام نہ ہو۔

چشم تصور میں اس نے اپنے خود غرض باپ ولبر گرین کے متعدد ٹکڑے دیکھے تھے۔ اس شخص نے ایک عورت کی خاطر اپنے بیٹے کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہیں کی تھی۔ اپنے اکلوتے لخت جگر کا ذرا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ ایسے انسان کے ساتھ کسی قسم کی بھی رعایت نہیں برتی جا سکتی تھی۔

''اطمینان رکھو مسٹر ولبر گرین! تمہارے شاندار قتل کے چرچے عرصہ دراز تک اخبارات کی زینت بنے رہیں گے۔'' نارسن نے نفرت سے سوچا۔

وہ انہی خیالات میں گم تھا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ تیسری میز پر بیٹھا ہوا ایک شخص اسے گہری نظروں سے گھور رہا ہے۔ اس اجنبی کو اپنی طرف نگراں پا کر نارسن لمحے بھر کے لیے بوکھلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گیا۔ اس نے اجنبی شخص کے خدوخال پر غور کیا تو وہاں اسے اپنی ہی تصویر نظر آئی۔ اس کے نقوش حیرت انگیز طور پر اجنبی سے ملتے تھے۔ اجنبی کے چہرے پر صرف مونچھوں کا اضافہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ترشی ہوئی مونچھیں نہ ہوتیں تو دونوں کے چہرے یکساں ہوتے۔ اجنبی شخص بھی شاید اس کے خدوخال کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

نارسن کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی مسکراہٹ گویا اجنبی کے لیے دعوت بن گئی۔ وہ اٹھ کر اس کی میز پر چلا آیا ''میرا نام رچرڈ ہے..... رچرڈ لنکن! میں نے اپنی میز پر بیٹھے آپ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اتنی مشابہت یقیناً بہت حیران کن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مجھے دیکھ کر اتنی حیرت نہ ہوئی ہوگی جتنی مجھے..... اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ مونچھیں رکھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چند ماہ قبل میں بھی آپ کی طرح کلین شیو تھا۔''

''مجھے مارٹن کہتے ہیں۔'' نارسن نے اپنا فرضی نام بتایا۔ تعارف کے بعد رچرڈ نے بتایا کہ وہ پلاسٹک کے کھلونے بنانے والی ایک کمپنی میں فیلڈ آفیسر تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ نارسن کے شہر کا رہنے والا تھا۔ شہر کے ایک گنجان آبادی والے علاقے میں اس کی رہائش تھی۔ دنیا میں اس کا نینی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نینی اس کی منگیتر تھی اور دو ماہ بعد ان کی شادی ہونے والی تھی۔

رچرڈ کی کہانی سننے کے دوران نارسن کی عجیب کیفیت تھی۔ اضطراری انداز میں اس کی مٹھیاں بھنچتی اور کھلتی رہی تھیں۔ اس کا ذہن ایک خاص انداز میں تیزی سے سوچنے لگا تھا۔ وہ تنقیدی نگاہ سے رچرڈ کی مونچھوں کو گھورتا رہا..... اس نے سوچا کہ اگر ایسی ہی مونچھیں اس کی ناک کے نیچے آ جائیں تو بہت سے مسئلے حل ہو سکتے تھے۔

''یہاں مزید کتنے دن قیام کا ارادہ ہے؟'' نارسن نے رچرڈ سے پوچھا۔

''بس آج رات۔'' اس نے جواب دیا ''کل صبح میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ دراصل میری ذمے داریاں اسی نوعیت کی ہیں۔''

''اوہ..... میں بھی کل ہی یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔ اتفاق سے ہماری منزل بھی ایک ہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے دو افراد ایک ہی کار میں سفر کر رہے ہوں جن کی شکلوں میں صرف مونچھوں کا فرق ہو تو دیکھنے والے ضرور حیران ہوں گے۔'' نارسن نے ہنستے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

رچرڈ بھی اس تصور سے دیر تک ہنستا رہا۔ وہ نارسن کو اپنے ساتھ کار میں لے جانے پر بلا تامل تیار ہو گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر نارسن دیر تک ٹہلتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ وہ اپنے منصوبے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ولبر گرین اور پولیس آفیسر روڈ مائیک کے قتل کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک ہی رات میں دونوں کا کام تمام کر دیا جائے ورنہ پولیس کے ذہین لوگ کسی ایک قتل سے ہوشیار ہو جائیں گے اور اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح ممکن تھا دوسرا حفاظتی تدابیر کر لیتا اور زندہ رہ جاتا۔

اس نے سوچا کہ پہلے اپنے باپ ولبر گرین کو نشانہ بنائے۔ ممکن ہے ان دنوں وہ اپنے مستقبل کے لیے کسی نئی اور حسین ساتھی کی تلاش میں ہو۔ عیش و عشرت کی خواہش مند کوئی نئی مارگریٹ' جو کسی نارسن کو ٹھکرا کر اس کے مستقبل کی ساتھی ہو جائے۔ دوسری طرف پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ذہین آفیسر روڈ مائیک تھا۔ اس کے لیے احتیاط لازم تھی۔ پروگرام میں معمولی سی گڑبڑ بھی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی

تھی۔ وہ روڈ مائیک کی مصروفیات اور اس مقام کے بارے میں سوچتا رہا جہاں اس کی لاش کے ٹکڑے سجائے جاتے۔ اس کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنا تھا۔ جلد بازی کام بگاڑ سکتی تھی۔

پھر وہ رچرڈ کے بارے میں سوچنے لگا..... اس کا سہارا نارسن کے لیے واقعی اہم تھا!

☆☆☆

اگلے دن علی الصباح رچرڈ نے اسے جگا دیا۔

''معاف کیجیے گا مسٹر مارٹن!'' اس نے کہا ''دراصل طویل سفر کے لیے صبح کا وقت موزوں ہوتا ہے جلدی سے اپنا سامان اٹھائیے اور چلیے۔''

نارسن نے روم سروس کو فون کر کے ناشتا وہیں منگوا لیا۔ ناشتا آنے تک وہ تیار ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ نیچے آئے اور کاؤنٹر پر بل ادا کر کے دونوں ہوٹل سے باہر آ گئے۔

رچرڈ عمدہ ڈرائیور تھا۔ راستے میں وہ اپنی کاروباری زندگی کے واقعات سناتا رہا۔ نارسن خاموش رہا۔ رچرڈ بہت خوشگوار موڈ میں تھا' وہ نینی کی عادتوں کے بارے میں کہانیاں سناتا رہا' ہنستا رہا۔ اس نے چند لطیفے بھی سنائے پھر وہ قدرے بور ہو کر بولا ''مسٹر مارٹن! آپ بہت کھوئے کھوئے اور سنجیدہ نوجوان ہیں۔ کیا آپ کسی پریشانی کا شکار ہیں؟''

''نن..... نہیں۔'' ایسی کوئی بات نہیں۔'' نارسن نے چونک کر کہا اور باہر دیکھتے ہوئے بولا ''کار کو سڑک کے کنارے روک دیجیے۔''

''کیوں' کیا بات ہے؟'' رچرڈ نے بریک پیڈل پر دباؤ بڑھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ نارسن بلاوجہ ہنس پڑا۔

''مناسب جگہ ہے۔'' نارسن دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر بلند آواز میں رچرڈ سے مخاطب ہوا ''آپ بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں ذرا نیچے آیئے..... مسٹر رچرڈ! بعض لوگ اچانک کسی کے کام آ جاتے ہیں' جیسے آپ میرے کام آئے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں..... آپ نے کبھی موت کے بارے میں سوچا ہے؟''

''میں صرف زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں مسٹر مارٹن! لیکن آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ رات تو آپ اتنے الجھے ہوئے نہیں تھے۔'' رچرڈ کار سے اترتے ہوئے بولا۔

دوسرے ہی لمحے رچرڈ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا لیکن وہ ذرا تاخیر سے سمجھا تھا۔ اس وقت اس کی گردن نارسن کے ہاتھوں کے فولادی شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر نارسن نے رچرڈ کی لاش ٹھکانے لگا دی۔ اس کے لباس کی ایک ایک چیز نارسن کے قبضے میں آ گئی تھی۔ احتیاطاً اس نے تیز چاقو کی دھار سے رچرڈ کا چہرہ بگاڑ دیا تاکہ اگر لاش دریافت بھی ہو جائے تو اس کی فوری شناخت نہ ہو سکے۔

اس کے بعد وہ کار میں آ بیٹھا اور رچرڈ کا سامان دیکھنے لگا کمپنی کے چند بل' کچھ ضروری کاغذات' پاسپورٹ وغیرہ۔ ان پر لگی ہوئی تصویر میں رچرڈ کلین شیو تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا اب گویا نارسن نے رچرڈ کی جگہ لے لی تھی۔

''شکریہ مسٹر رچرڈ!'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا ''تم نے میرے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔ اب میرے مقصد کی تکمیل میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا.....''

اس کے ذہن میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا۔ وہ جلد از جلد اپنے باپ اور پولیس آفیسر کو قتل کر کے دلی طمانیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر ساکت بیٹھا ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کار کی رفتار بتانے والی سوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا ذہن انتقام کے گرداب میں گویا چکر کھا رہا تھا۔

پھر ایک موڑ کاٹتے ہوئے اچانک اسے ایک سماعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ذہن پر تاریکی کی دبیز چادر چھاتی چلی گئی۔

☆☆☆

اسپتال میں آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے نارسن نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ ڈاکٹروں نے مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''مجھے سخت تعجب ہے۔'' ایک ڈاکٹر نے دوسرے سے کہا۔

''زخمی کی حالت ایسی تو ہرگز نہیں تھی کہ یہ ہلاک ہو جاتا۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔'' دوسرے ڈاکٹر نے پُرخیال انداز میں کہا اور قریب رکھی ہوئی مریض کی فائل اٹھالی۔ چند لمحے بعد وہ بولا ''اس کی موت غلط گروپ کا خون دینے کے سبب واقع ہوئی ہے جبکہ اس کے کاغذات میں جو گروپ لکھا ہوا ہے وہی گروپ اسے دیا گیا تھا..... یقیناً اس کے کاغذات میں درج خون کا گروپ غلط لکھ دیا گیا ہے..... بے چارہ!''

☆☆

ان لمحوں کی روداد جو زندگی میں فیصلے کے کسی نہ کسی دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں

پہلا رنگ

آتشِ رفتہ

غلام قادر

کچھ لوگ آنکھوں میں جلتے چراغوں کی روشنی میں دلوں کی مسافتیں طے کرتے ھیں ..... راہ میں ملنے والے ان گنت لوگوں میں کوئی ایک دکھ سکھ کے تمام موسموں کا محرم ھی نہیں ..... بلکہ ھم سفر بھی ٹھہرتا ھے ..... ایک ایسے لڑکے کے شب و روز کا احوال جس کی زندگی کی بیشتر راتیں نہایت رنگین و سنگین واقعات سے بھری پڑی تھیں۔

ہزاروں عکس اپنا جوہرِ پندار کھو بیٹھے
مگر اس آئینہ خانے کی حیرت کم نہیں ہوتی

دفتر سے واپسی پر میرا ارادہ صرف کچھ دیر ہی گھر پر رکنے کا تھا لیکن ابھی میں گھر کے راستے میں ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

''شان بول رہے ہو'' میرے موبائل پر ہیلو کہتے ہی دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''جی ..... بول رہا ہوں'' میں نے جواب میں کہا اور ساتھ ہی اس خاتون کی آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری یادداشت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔

''کیسے ہو شان؟'' خاتون نے دوسرا سوال کیا۔ اس کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ یوں بھی مجھے یعنی ذیشان حیدر کو شان صرف میرے گھر والے اور بے تکلف دوست ہی کہتے تھے۔

''ٹھیک ہوں'' میں نے محتاط انداز میں کہا لیکن ساتھ ہی ذہن کے کمپیوٹر کو تکلیف دیتا رہا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا۔'' خاتون نے اس بار بھی بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے جواب میں کہا' احتیاط کا دامن اب بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا لیکن ساتھ اس آواز کو پہچاننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

''میری پوری زندگی میں یہ فقرہ سب سے برا فقرہ ہے جو میں نے سنا ہے'' خاتون نے کہا اور پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آواز میں نے پہلے بھی سنی ہے لیکن کہاں یہ فوری طور پر یاد نہیں آ سکا۔

''جان میری کچھ یاد کرو ورنہ تو میں .....'' اس کا فقرہ ابھی ادھورا ہی تھا کہ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور بہت تیزی کے ساتھ ایک چہرہ ذہن کی اسکرین پر ابھرا تھا۔

''تبسم'' میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اس نے ''جان میری'' جس انداز میں کہا تھا وہ اس کا مخصوص انداز تھا جسے سننے کے ساتھ ہی میرے جسم میں جیسے سنسنی سی پھیلتی چلی گئی تھی۔

''ہائے ..... مر جاواں گڑ کھا کے۔'' اس نے تصدیق کرنے کے لیے ایک بار پھر اپنا مخصوص انداز اپنایا تھا۔

''کہاں ہیں آپ .....؟'' میں نے بے چین ہو کر سوال کیا' وہ ہنس دی۔

''تیرے شہر میں ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

''ائرپورٹ سے باہر نکلی ہوں اکیلی ہوں اور ڈیفنس کی طرف جا رہی ہوں۔'' تبسم کا جواب تھا۔

''کتنے دنوں کے لیے آئی ہیں؟'' میں نے سوال کیا

''دو دن کے لیے .....'' اس کا جواب تھا۔

''ڈیفنس میں کس کے گھر جا رہی ہیں؟'' میں نے تیزی کے ساتھ ایک اور سوال کیا۔

''وہاں سمندر کے کنارے ہوٹل ہے وہیں بکنگ ہے۔'' تبسم کا جواب تھا۔

''تب تو میں آپ کو اپنے گھر کی دعوت دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''تم نے اب تک شادی نہیں کی ہے یا مجھے بھول گئے ہو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''شادی بھی کی ہے اور بھولا بھی نہیں ہوں صرف اتنی سی بات ہے کہ بیوی دبئی گئی ہوئی ہے ایک کانفرنس میں شریک ہونے۔'' میں نے کہا اور اس نے بہت زور سے قہقہہ لگایا۔

''تب پھر ٹھیک ہے ورنہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری شادی شدہ زندگی میں کوئی خرابی آئے۔'' تبسم نے کہا اور میں بھی ہنس دیا۔

اس کے بعد اس نے گھر کا پتا پوچھا جو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے فون یہ کہہ کر ڈرائیور کے حوالے کر دیا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔

میں نے ڈرائیور کو اپنا پتا سمجھایا جسے اس نے بڑی آسانی سے سمجھ لیا۔ ائرپورٹ پر موجود ریڈیو ٹیکسی کے ڈرائیور یوں بھی عام ٹیکسی والوں کی نسبت زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔

میرے فلیٹ پر پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد وہ پہنچی تھی اور ہمارے اپارٹمنٹ کے باہر سے بھی ..... اس نے فون کیا تھا۔

''ہاں شان میں پہنچ گئی ہوں'' اس نے کہا۔

''پھر آ جاؤ یا میں نیچے آؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں' میں ہی آ رہی ہوں'' اس نے کہا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں اسے ایک دو سال نہیں بلکہ پورے بارہ برس بعد دیکھنے والا تھا۔

بارہ برس پہلے وہ میری زندگی میں آندھی طوفان کی طرح آئی تھی اور جب تک وہ یہاں رہی تھی اس نے مجھے مغلوب ہی رکھا تھا۔ اگرچہ وہ مدت بھی مختصر ہی تھی لیکن ان چند دنوں کی ایک یاد بھی ایسی نہیں تھی کہ میں فراموش کر سکتا۔

میں اپنے دروازے پر موجود تھا جب وہ لفٹ سے برآمد ہوئی میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ اس کا وزن کچھ بڑھ گیا تھا اور اس کے لمبے سیاہ بال کاندھوں تک آ گئے تھے۔ اس کے

پاس ایک چھوٹا سا بیگ تھا جو میں نے آگے بڑھ کر لے لیا اور پھر ہم دونوں بغیر کچھ کہے گھر میں داخل ہو گئے تھے۔

''مجھے گلے لگانے دو'' دروازہ بند ہوتے ہی اس نے کہا اور میں نے انکار کر دیا۔

''اب وقت بہت ہو گیا ہے مسز تبسم ریاض'' میں نے کہا اور وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''اب میں وہ میٹرک کا طالب علم شان نہیں ہوں جسے کبھی آپ جو کہتی تھیں اور میں وہی کرتا تھا۔'' میں کہتا چلا گیا اور میرے ہر لفظ کے ساتھ اس کے چہرے پر موجود حیرت کی زیادتی میں اضافہ ہوتا گیا۔

''اب میں ایک بھرپور جوان ذیشان حیدر ہوں۔'' میں نے اچانک یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔

''اب میں سینے سے لگتا نہیں بلکہ لگا لیتا ہوں۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ جواب میں اس نے بھی مجھے اتنی ہی گرم جوشی سے تھاما تھا جتنی گرم جوشی میں نے دکھائی تھی۔

''او.....شان.....'' اس نے میرے سینے پر اپنا سر رگڑتے ہوئے کہا۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی'' اس نے کہا اور میں ہنس دیا۔

''کس بات سے ڈر گئی تھیں؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئی۔

''چلو چھوڑو.....کوئی اور بات کرو۔'' اس نے کہا لیکن میں بضد رہا۔

''اب بتا بھی دیں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میں سمجھی تھی کہ اب تم مجھ سے یہ کہو گے کہ تم نے میرا بچپن خراب کیا اور مجھے ان راستوں پر چلنے پر مجبور کیا جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا'' اس نے کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور میں کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''آپ کے جانے کے بعد سے آج دن تک کوئی دن ایسا نہیں گیا جب میں نے آپ کو یاد نہیں کیا۔'' میں نے ایک بار پھر اسے قریب کرنا چاہا لیکن اس بار وہ ایک ادا کے ساتھ مجھ سے دور ہو گئی۔

''جھوٹ.....'' اس نے ایک ادا کے ساتھ کہا اور میں ہنس دیا۔

''میں اسے جھوٹ مان لوں گا اگر آپ یہ کہہ دیں کہ مجھ سے جدا ہونے کے بعد کوئی ایک دن بھی ایسا گزرا ہے جب آپ نے مجھے یاد نہ کیا ہو؟'' میں نے کہا' وہ ہنس دی تھی۔

''بہت باتیں بنانی آ گئی ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر اس انداز میں کہا جیسے دو دن پہلے ہی اس کی سولھویں سالگرہ منائی گئی ہو۔

''سب آپ کی مہربانی ہے'' میں نے کورنش بجالانے کے انداز میں اس کے سامنے جھکتے ہوئے کہا وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

''واقعی تمہاری زبان بہت چل پڑی ہے۔'' اس نے کہا اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''تمہیں یاد ہے..... پہلی بار.....'' اس نے رک رک کر معنی خیز انداز میں کہنا شروع کیا اور پھر اپنا فقرہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

''اگر آپ کو یاد ہے تو میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔'' میں نے بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

''لیکن.....'' میں نے ہنسی روک کر معنی خیز انداز میں کہا۔

''آج یہ فرق معلوم ہو جائے گا کہ اس طویل عرصے میں فرق کتنا آ گیا ہے۔'' میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''ابھی تو میں ہوں۔'' اس نے کہا اور میں رک بھی گیا۔

''کم از کم دو دن تو ہوں۔'' اس نے مجھے رکتا دیکھ کر کہا لیکن میں آگے بڑھ گیا۔

''دو دن میں صرف اڑتالیس گھنٹے ہوتے ہیں جان میری'' میں نے اسے اسی انداز میں مخاطب کیا تھا جس انداز سے کبھی وہ تنہائیوں میں مجھے مخاطب کرتی تھی۔

''شان پلیز.....'' اس نے مجھے روکنے کی..... ایک اور کوشش کی لیکن چڑھتے دریا فریاد سے نہیں اترتے ہیں اور یہی اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

''شان میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش میں کہا لیکن میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

''میری کیفیت بھی تم سے کچھ مختلف نہیں؟'' میں نے سرگوشی کی۔ اس کی مزاحمت یک دم ہی ختم ہو گئی بلکہ تعاون کا پہلا قدم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازو میری گردن میں حمائل کر دیے۔

چڑھے ہوئے دریا اترے تو اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے پہلے

فیلی نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

''اس تمام عرصے میں تم نے صرف باتیں بنانی ہی نہیں سیکھیں بلکہ ضدی اور ظالم بھی ہو گئے ہو'' اس نے اس مصنوعی غصے کے ساتھ کہا جس کے دوران اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ضد اور ظلم پر اکسانے والی بھی تو آپ ہی ہیں۔'' میں نے جواباً کہا اور وہ ہنس دی۔

''اس ضد اور ظلم کے لیے میں تمام عمر ترستی رہی ہوں۔'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ کہا' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

''تو.....کیا.....؟'' میں نے دو لفظوں میں سوال ختم کر دیا تھا لیکن اس نے ایک لفظ کہے بغیر ہی صرف گردن ہلا کر جواب دیا اور پھر اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔

برسوں پہلے اس کی بیان کردہ کہانی میرے ذہن میں تازہ ہو گئی تھی لیکن اس کی کیفیت دیکھ کر میں اس سے کوئی سوال نہیں کر سکا تھا۔

''یہ بتاؤ گھر میں کچھ کھانے کے لیے ہے یا نہیں؟'' اس نے اچانک مجھے مخاطب کیا اور میں ماضی سے حال میں آنے پر مجبور ہو گیا۔

''شاید کچھ نہ ہو'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے فوراً ہی سوال کیا اور میں ہنس دیا۔

''اس کیوں کا جواب بہت طویل ہے لیکن مختصر جواب یہ ہے کہ میں نے ملازمہ کو چھٹی دے دی تھی کیونکہ آج میرا گھر پر رکنے کا پروگرام ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا اور باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

''تمہارے یہاں کھانا ملازمہ پکاتی ہے؟'' اس نے تیاری کرتے ہوئے دیکھا لیکن خود اپنی جگہ پر رہی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ باہر جانے کے موڈ میں نہیں ہے۔

''ہمارے یہاں تمام کام ملازم ہی کرتے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اور تمہاری بیوی؟'' اس نے میرے خاموش ہوتے ہی ایک اور سوال داغ دیا۔

''وہ ڈاکٹر ہے'' میں نے جواب میں کہا اور چپل پہننے لگا۔

''تو کیا ڈاکٹر گھر کے کام نہیں کرتیں؟'' اس نے سوالوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔

''وہ گائنا کولجسٹ ہے ماہرِ امراضِ نسواں اور اپنا اسپتال بھی چلا رہی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا اور باہر کی جانب جانے سے پہلے اس سے معلوم کیا کہ وہ کیا کھانا چاہے گی؟

''کچھ بھی لے آؤ لیکن جلدی آ جانا'' اس کا جواب تھا۔

''بس گیا اور آیا۔'' میں نے جواب میں کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔

اس کا یوں سوالوں کی بوچھار کرنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا لیکن میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ''یہ بیوقوف کیا یہ سمجھتی ہے کہ یوں مجھے نورین سے بدظن کر دے گی۔'' میں اپنے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بڑبڑایا لیکن پھر فوراً ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھے نورین سے بدظن کرنے سے اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور زندگی کی بہت سی راحتوں سے محروم ہونے کے باوجود اپنی ازدواجی زندگی کی محرومیوں کے بارے میں کسی سے کوئی ذکر بھی نہیں کرتی تھی۔

''بالکل نورین کی طرح'' میرے اندر سے کوئی آواز ابھری لیکن پھر فوراً ہی میں نے اپنے اس خیال کو مسترد بھی کر دیا۔

''نورین اور وہ دونوں ہی اپنے اپنے شوہروں کی وجہ سے اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ لیکن وجہ دونوں کی الگ الگ ہیں۔'' میں نے اپنے خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

میں لفٹ میں تھا جب نورین کی کال میرے موبائل پر آئی جسے میں نے لفٹ سے نکلتے ہی ریسیو کیا۔

''کہاں ہو؟'' نورین نے میری جانب سے کہے گئے ہیلو سننے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

''ایک بہت ہی خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ ہنس دی تھی۔

''اس ذہنی مریضہ کو تین روز تک جانے نہیں دینا'' اس نے کہا اور میں چونک گیا۔

''تم تو دو دن بعد آ رہی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اب ایک دن اور رکنا پڑ رہا ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''مگر تم نے تو کہا تھا کہ کانفرنس.....'' میں جو کہنا چاہ رہا تھا اسے اس نے میری قطع کلامی کر کے کہنے نہیں دیا۔

''کانفرنس تو اپنے وقت پر ختم ہو گئی لیکن چند ڈاکٹرز کو یہ لوگ ایک روز مزید روک رہے ہیں۔'' اس نے تفصیل بتائی جسے میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے سنا اور کار میں

بیٹھتے ہوئے اپنی ناراضی کا اظہار کر بھی دیا۔

''ان چند ڈاکٹرز میں تمہیں کیوں شامل کیا گیا ہے؟'' میں نے ناراض لہجے میں کہا۔

''اس لیے میرے پیارے شوہر صاحب کہ آپ کی بیوی کے پیش کردہ پیپر کو یہاں بہت پسند کیا گیا ہے اور یو اے ای کے چند چیدہ ماہرین کو مدعو کیا گیا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں انہیں اس پر لیکچر دوں۔'' نورین نے میرے کار اسٹارٹ کرنے کے دوران جواب دیا۔ جو بات اس نے نہیں بتائی تھی لیکن میں خود سمجھ گیا تھا وہ یہ تھی کہ اس لیکچر کے لیے منتظمین نے اسے ایک معقول رقم کی آفر بھی کی ہوگی۔

''بہرحال وعدہ خلافی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے بدستور ناراض رہتے ہوئے کہا۔

''اپنی اس خوبصورت حسینہ کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ ضد کر رہی تھی کہ میرے ساتھ فوری نکاح کرو تو میں اسے کورٹ لے جا رہا تھا۔'' میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''شانی تمہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ رات میں تو کورٹ بند ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ہنسنے لگی۔

''ایسا کرتے ہیں ڈارلنگ کہ ہم کل صبح کورٹ چلیں گے۔'' میں نے فون پر ہی کہا لیکن ظاہر یہ کیا تھا جیسے میں کسی اور سے ہم کلام ہوں لیکن نورین کی ہنسی اس کے ساتھ ہی تیز ہوتی چلی گئی۔ یوں بھی جب وہ ہنسنے پر آتی تھی تو ہنستی چلی جاتی تھی۔

''شانی..... پیارے'' اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''تم ایک بار پھر بھول گئے ہو کہ کل اور پرسوں چھٹی ہے'' نورین نے کہا اور میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ قدرت نہیں چاہتی کہ اس خوبصورت لڑکی سے میرا کوئی رشتہ استوار ہو۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور وہ جواب تک ہنس رہی تھی اچانک سنجیدہ ہوگئی۔

''میرے ساتھ ساتھ کیا مونا چوہدری بھی تمہاری نظروں سے گر گئی ہے جو تم نے اس نئی خوبصورت لڑکی سے رابطے پیدا کر لیے ہیں۔'' نورین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے لائن آف کر دی۔

مونا کے نام پر ہمارے درمیان اس سے پہلے بھی کئی بار تلخی ہو چکی تھی لیکن نورین میری کئی بار کی وضاحتوں کے باوجود کسی نہ کسی طریقے سے اس کا ذکر لے آتی تھی۔ جانتا تھا کہ نورین دوبارہ فون کرے گی اور اس کی پہلی وضاحت یہی ہوگی کہ وہ مذاق کر رہی تھی جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ میں اس وقت تک وہاں پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے کھانے کے لیے چیزیں خریدنی تھیں اس لیے میں نے کچھ اور سوچنے کے بجائے ویٹر کو بلا کر آرڈر دینا شروع کر دیا۔

نورین کا فون اس دوران پھر آ گیا جب میں آرڈر دے رہا تھا لیکن آرڈر کے مکمل ہونے تک میں نے اس کا فون اٹینڈ نہیں کیا۔

''اب کیا کہنا ہے یہی نا کہ میں مذاق کر رہی تھی؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''شاید نہیں'' نورین کا سنجیدگی میں ڈوبا ہوا جواب آیا۔

''یا پھر یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میرے اور مونا کے تعلقات ہیں'' میں نے ایک بار پھر طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''یہ بھی کہنا نہیں چاہ رہی ہوں۔'' نورین کا جواب تھا۔

''تو پھر اس کا ذکر کرنے کا تمہارا مقصد کیا تھا؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا تھا۔

''تم نہیں سمجھ سکو گے شان'' نورین کی آواز میں بھاری پن تھا۔

''نہ تم عورت ہو اور نہ ہی تم نے محبت کی ہے۔'' وہ رک رک کر بول رہی تھی ''میں عورت بھی ہوں اور میں نے تم سے ٹوٹ کر محبت بھی کی ہے۔'' نورین نے ایک وقفے کے بعد کہا مجھے اپنے لہجے اور انداز میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی تھی۔

''میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ.....'' میں نے کئی بار کی کہی ہوئی بات کو دہرانا چاہا لیکن اس نے میرا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''شان اس نے مجھ سے وہ وجہ چھین لی ہے جس پر میں تنہائی میں خود پر فخر کرتی تھی۔'' نورین نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

''نورین وہ اپنے ماحول سے تنگ آئی ہوئی ایک کم عمر لڑکی ہے.....'' میں نے اسے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

''مجھے تمہاری جانب سے کوئی بدگمانی نہیں ہے شان لیکن.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اس عمر میں لڑکیوں کے دل و دماغ سادہ سلیٹ کی طرح ہوتے ہیں۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے ایک بار پھر

اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''وہ توجہ کی بھوکی تو پہلے سے تھی ایسے میں اگر کسی کی توجہ نے اسے کچھ احمقانہ باتیں سوچنے پر اکسایا بھی ہے تب بھی تمہیں اس بات کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''شاید تم صحیح کہہ رہے ہو شان لیکن اب ذرا میری پوزیشن پر آ کر سوچو۔'' نورین نے میری دلیل سے اتفاق کرنے کے ساتھ ہی کہا۔

''اپنی چاہت کو حاصل کرنے کے بعد ایک عورت کی سب سے بڑی جو خواہش ہو سکتی ہے۔ اس خواہش کو بھی میں نے اپنی چاہت کے آگے کمتر سمجھا لیکن.....'' نورین یہاں پہنچ کر رک گئی۔

''میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا۔'' اس کے خاموش ہونے کے کچھ دیر بعد میں نے کہنا شروع کیا۔

''وہ دن یاد کرو جب ہماری رپورٹس آئی تھیں۔'' میں کچھ ہی کہہ سکا لیکن نورین میرے خاموش ہونے کے بعد بھی خاموش رہی تھی اور مجھے ہی بات آگے بڑھانی پڑی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اپنی محرومی کے ساتھ ساری دنیا سے نکل جاتا ہوں تاکہ تم تخلیق کے اس عمل سے گزرنے میں کامیاب ہو سکو جو ہر عورت کی خواہش نہیں بلکہ اس کا حق ہوتا ہے۔'' میں اس سے آگے بھی کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے درمیان سے میرا فقرہ اچک لیا۔

''اگر تم کو اپنے فقرے یاد ہیں تو تم ـ یقیناً یہ بھی نہیں بھولے ہو گے کہ میرا جواب کیا تھا؟'' نورین نے تلخی کے ساتھ کہا۔

اس نے سوال کیا تھا لیکن میری جانب سے جواب ملنے کا انتظار کیے بغیر اس نے کہنا شروع کر دیا تھا ''میں نے کہا تھا کہ شان آج تو یہ بات کہہ دی ہے آئندہ کبھی یہ بات بھی ذہن میں نہ لانا کہ میں زندگی میں کبھی تم سے الگ ہونے کا تصور بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے کہا اور میں خاموش تھا۔ وہ یادیں اتنی ہی تلخ تھیں کہ ان کی یاد آتے ہی حلق میں زہر سا اتر آتا تھا۔

''میرے پاس جینے کے لیے یہ بہت بڑا سہارا تھا میں اس بات پر خوش تھی کہ میں نے اپنی چاہت کے لیے ایک عورت کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تیاگ دی لیکن اس نے مجھ سے یہ خوشی بھی چھین لی'' اس نے انتہائی جذباتی انداز میں بات مکمل کی اور کچھ دیر میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ سکا کہ اسے کیا بات کس طرح شروع کرنی چاہیے۔

''تم اس پر اس لیے ناراض ہو کہ اس نے بھی وہی دعوے کیے جن پر تم فخر کر رہی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس نے مجھ سے میرا فخر میری خوشی میرا سب کچھ چھین لیا شان۔'' اس بار وہ تقریباً چیخ پڑی تھی۔

''عمل کرنے اور دعویٰ کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے نور'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم عمل کر رہی ہو اور اس طرح عمل کر رہی ہو کہ وہ کچھ حاصل کر سکتی ہو جو حاصل کرنا چاہتی ہو'' میں نے کہا وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''آج اگر ہم علیٰحدہ ہو جاتے ہیں تو تمہیں مجھ سے اچھا نہیں تو مجھ جیسا تو مل ہی جائے گا؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا لیکن اس نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''میں اس طرح کی گفتگو بالکل بھی نہیں سنوں گی'' اس نے تیزی کے ساتھ کہا۔

''تم نہ سنو لیکن میں کہوں گا کہ مونا سے اپنا تقابل کرتے ہوئے تم اپنے ساتھ زیادتی نہیں کرتی ہو بلکہ اپنی توہین کرتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''تم میرے بارے میں بھی تو سوچو کہ میری کیا حالت ہوگی کہ میں نے جب اس سے کہا کہ ''مونا تم جانتی ہو کہ شان کی میڈیکل رپورٹ یہ ہے کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتے ہیں اور اس نے مجھ سے جواب میں کہا کہ وہ یہ بات نہ صرف جانتی ہے بلکہ یہ فیصلہ وہ یہ جاننے کے بعد ہی کر رہی ہے۔'' نورین نے کہا۔

''جو بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اس پر بھی تو غور کر لو'' میں نے کچھ کہنے سے پہلے تمہید باندھی لیکن وہ اچانک جذباتی ہو گئی۔

''میں ایسے کسی معاملے کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی جو تمہیں مجھ سے چھیننے کے بارے میں ہو'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''نور تم اپنا تقابل اس سے کر کے خود اپنی ہی توہین کر رہی ہو۔'' میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''وہ کس چیز میں تمہارے مقابل آ سکتی ہے۔'' میں نے کہا وہ خاموشی سے سننے لگی تھی۔ ''تعلیم سے لے کر شکل صورت تک اور خاندانی پس منظر سے لے کر گفتگو کرنے کے سلیقے تک وہ کہیں بھی تمہارے پاسنگ بھی نہیں ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''یہ سب جاننے کے باوجود اس کی یہ ہمت کس طرح

ہوئی کہ وہ تم سے محبت کرنے کی دعویدار بنی'' اس کی آواز میں غصے کی جھلک اب بھی تھی۔

نورین مزید بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس وقت شاید کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں ہولڈ کروں۔

ویٹر کھانا لے کر آیا اور میں نے اسے فارغ کر کے دوبارہ کار اسٹارٹ بھی کر لی لیکن وہ فون پر نہیں آئی اور پھر جب آئی تب بھی جلدی میں تھی۔

''شان'' اس نے مجھے مخاطب کیا اور میرا جواب سنے بغیر اپنی بات کہتی چلی گئی۔

''یہ کچھ ساتھی ڈاکٹرز آئی ہیں۔ میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں'' اس نے کہا اور جب تک میں اسے جواب دیتا اس نے لائن ڈسکنکٹ بھی کر دی۔

''یہ تو شکر ہے نورین صاحبہ کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی ہیں۔'' میں نے موبائل کو دوبارہ سے اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے سوچا۔

''اگر کہیں اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب بھی نہ صرف مونا سے ملتا ہوں بلکہ اسے ریڈیو پر پروگرام بھی میری وجہ سے ملے تھے اور میں ہی وہ شخص ہوں جو اس کی تعلیم سمیت بہت سے اخراجات برداشت کر رہا ہے تو نہ جانے کیا کر ڈالے'' میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ذہن میں مونا کا تصور ابھر آیا۔

مونا کھلتی ہوئی رنگت کی اوسط شکل وصورت کی لڑکی تھی جس کی تمام تر خوبی اس کی آنکھوں اور آواز میں ہی تھی۔ اسپتال میں وہ ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے آئی تھی۔ میرا اس زمانے میں اسپتال میں کافی وقت صرف ہو رہا تھا کیونکہ نورین اسپتال میں ایک اور بلاک بنوا رہی تھی اور میں اس تعمیر کی نگرانی کر رہا تھا یوں بھی اسپتال میں میری دلچسپی کے اور بھی بہت سے سامان تھے اگرچہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ نورین کے کانوں تک میری حرکتوں کی بھنک بھی پہنچ گئی تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے کیونکہ میرے معاملے میں اس کا رویہ کافی حد تک مالکانہ سا تھا اگرچہ مجھے اس کا یہ رویہ بھی اچھا لگتا تھا اور میں اسے بھی محبت کا ایک انداز سمجھتا تھا۔

مونا میں میری دلچسپی ابتدا میں کچھ تھی بھی تو اس کے گھریلو حالات سننے کے بعد میری دلچسپی تبدیل ہو گئی تھی۔ چھ بہنوں اور تین بھائیوں میں اس کا نمبر تیسرا تھا۔ اس کے خواب اس کے حالات کے مطابق نہیں تھے لیکن میں نے ان خوابوں کا فائدہ اٹھانے سے گریز کیا تھا۔ مونا میں میری دلچسپی پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن میں نے اپنے رویے میں فرق نہیں آنے دیا کاروبار میں مصروف ہونے کے باوجود میں مونا کی کال ضرور اٹینڈ کرتا تھا لیکن مونا نے کبھی اس طرح کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا جس کا اعتراف اس نے نورین کے سامنے کیا تھا۔

نورین کے علم میں یہ بات آئی کہ مونا مجھ سے بات کرتی ہے تو اس نے مونا سے جواب طلبی کی جس کے جواب میں مونا نے نہ صرف اس کا اعتراف کیا بلکہ نورین کے سوال کے جواب میں وہ یہ اعتراف بھی کر گئی کہ ''نہ جانے کب اور کیسے مجھے ذیشان صاحب سے محبت ہو گئی ہے۔'' لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ گئی کہ ''ہم دونوں کے درمیان اس طرح کی کوئی بات کبھی نہیں ہوئی لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔''

نورین نے یہ جاننے کے باوجود کہ مونا کو نوکری کی کتنی ضرورت ہے اسے نوکری سے نکال دیا اس معاملے میں اس نے میری بھی ایک نہ سنی جس کے بعد میں مونا سے ملا اور اسے مالی امداد کی پیشکش کی۔

ہمارے درمیان تعلقات اب ایک اور رخ اختیار کر گئے تھے۔ ایک بار اعتراف کرنے کے بعد مونا کی جھجک خاصی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اس نے میرے کہنے پر ایم۔ اے میں داخلہ لیا اور میری ہی کوششوں سے اسے ایف ایم پر کام مل گیا جس سے اس کی آمدنی اس سے زیادہ ہونے لگی جتنی وہ نورین کے اسپتال سے کماتی تھی۔

خیال کے اس رو میں بہتے ہوئے میں اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچا تو مجھے ہوش آیا کہ ایک اور ہستی بھی ہے جسے بڑی شدت سے میرا انتظار تھا میں اپنی چابی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا تو وہ ڈائننگ ٹیبل پر ہر چیز سجائے منتظر نظر آئی۔

''اس طرح سے اور اتنا انتظار ہیر نے رانجھے کا اور نہ سسی نے پنوں کا کیا تھا۔'' اس نے کھانے کی چیزیں میرے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

''پرانے زمانے میں انتظار مرد کیا کرتے تھے لیکن اب چونکہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے اس لیے انتظار بھی خواتین کے حصے میں آ گیا ہے۔'' میں نے اس کے سامنے کی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ویسے اگر تم بتا دیتے کہ گھر میں پکانے کے لیے کچھ ہے تو اتنی دیر میں کھانا بھی تیار ہو جاتا۔'' اس نے میری لائی ہوئی چیزوں کو مختلف برتنوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے سگھڑ پن کا تو ایک زمانہ معترف ہے'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''ویسے اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہاری یادداشت کی داد دوں۔'' اس نے تمام چیزیں میز پر سجانے کے بعد ایک نظر میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم ہر وہ شے لائے ہو جو مجھے پسند ہے۔'' اس نے کہا اور میں مسکرا دیا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ میں اپنی پسند کے مطابق چیزیں لایا تھا۔

''شروع ہو جاؤ.....'' اس نے مجھے اشارہ کیا۔

''کھانے کے بعد میں تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں گی۔'' اس نے کہا اور بے اختیار میرے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

''ہمیشہ کی طرح'' اور وہ مسکرا دی۔

''بالکل.....اسی طرح'' اس نے کہا اور میں ماضی میں چلا گیا جبکہ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی

اس زمانے میں یہ میری اس طرح سے دعوت کرتی تھی۔ جب دن میں کسی وقت چپکے سے یہ کہہ جاتی تھی کہ رات کھانا مت کھانا اور میں گھر پر کوئی بہانہ کر کے یا بہت کم کھا کر اس کے یہاں منتقل ہو جاتا تھا۔

ہمارے تعلقات کی پہلی اینٹ اس روز رکھی گئی تھی۔ جب ریاض بھائی کا سعودی عرب سے ویزا آیا تھا اور وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہو گئے تھے پھر ان کی یہ پریشانی میری والدہ کی عدالت میں پیش ہوئی۔

''میں تو کہتی ہوں آپا کہ میں یہاں رہ لوں گی آخر چند مہینوں کی ہی تو بات ہے پھر تو یہ مجھے بلوا ہی لیں گے۔'' تبسم نے کہا تھا۔

''ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔'' اماں نے بھی اس کی حمایت کی تھی۔

''اس طرح کا چانس زندگی میں ایک آدھ بار ہی تو ملتا ہے۔'' اماں نے سمجھایا تھا۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہیں آپا لیکن یہ یہاں تنہا کس طرح رہ سکتی ہے۔'' ریاض بھائی نے کہا۔ ''لاہور اسے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ نہ یہ وہاں جانا چاہے گی اور نہ وہ اسے رکھنے کے تیار ہوں گے۔'' ریاض بھائی نے مسئلے کی پیچیدگیاں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اسے یہیں چھوڑ جاؤ۔'' اماں نے انہیں سمجھایا تھا۔

''دن کا تو یوں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اماں نے مزید سمجھایا۔ ''اور رات میں شان سے کہہ دوں گی وہ اپنی کتابیں لے کر یہاں آ جائے گا۔'' اماں نے گویا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔

''ویسے بھی اسے شکایت رہتی ہے کہ گھر میں شور رہتا ہے اور مجھے سکون سے پڑھنے نہیں دیا جاتا جیسے میٹرک کا امتحان نہ دے رہا ہو بلکہ مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہا ہو۔'' اماں نے کہا اور پھر جیسے معاملہ ہی حل ہو گیا تھا۔

وہ دونوں ہمارے پڑوسی تھے۔ پڑوس میں آئے انہیں اس وقت تک چار ماہ ہی ہوئے تھے لیکن ان چار مہینوں میں ان کی ہم سے بہت اچھی نبھ گئی تھی۔ دو بیڈ رومز کے وہ چھوٹے سے فلیٹ ان دونوں کے لیے خاصے بڑے تھے لیکن ہمارا چار بھائیوں کا خاندان اس میں بہ مشکل ہی سما پاتا تھا۔ تینوں بڑے بھائی نوکری کر رہے تھے جبکہ میں میٹرک کے امتحانوں کی تیاری کر رہا تھا۔ نویں میں میری پوزیشن خاصی بہتر تھی اور میں کوشش کر رہا تھا کہ میٹرک میں بھی وہ برقرار رہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس بار یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔

اماں اور ان دونوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسی رات ریاض بھائی کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا حالانکہ ابھی ریاض بھائی کے جانے میں کچھ دن تھے۔ پرسکون ماحول ملا تو پڑھنے میں مزہ آنے لگا لیکن وہ میرا اس گھر میں چوتھا دن تھا جب میں نے برابر کے بیڈ روم سے سرگوشیوں کی آوازیں سنیں۔ میں نے اپنی توجہ اس جانب کی تو وہ کچھ اور واضح ہو گئیں اور پڑھائی کا تمام موڈ چوپٹ ہو کر رہ گیا۔

میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ سرگوشیوں میں آنے والے ان فقروں کو نہ سمجھ سکوں اگرچہ... میری تمام تر معلومات صرف سننے کی حد تک تھیں یا پھر اس ایک باتصویر رسالہ کی حد تک محدود تھیں جو ایک کلاس فیلو ایک بار لایا تھا۔

ریاض بھائی اس پہلی سرگوشی والی رات کے چھ دن بعد فلائی کر گئے اور میں بیک وقت خوش بھی تھا اور افسردہ بھی۔ خوش اس لیے تھا کہ اب آرام سے پڑھائی ہو سکے گی اور افسردہ اس لیے کہ وہ سرگوشیاں جو میرے جسم میں عجیب سی سنسنی پیدا کرتی تھیں ختم ہو گئی تھیں۔

اس رات تبسم جو اس وقت تک بھابی تھیں خاصی مہربان رہی تھیں اپنے کمرے میں جانے سے پہلے انہوں نے چائے دینے کے بعد کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کیں ان کا موضوع اس روز اخبار میں آنے والی اس خبر کے بارے میں تھا جس کے مطابق ان پانچ میں سے تین لوگ گرفتار ہو گئے تھے

جنہوں نے کالج سے واپسی پر ایک لڑکی کو اغوا کیا تھا اور چار دن تک اس کے ساتھ زیادتی کرتے رہے تھے۔ اس کی موجودگی میں اس کا احساس نہیں ہوا لیکن ان کے کمرے میں جانے کے بعد یہ احساس ہوا کہ وہ خاصی بولڈ گفتگو کر گئی تھیں۔ اتنی بولڈ کہ میرا جی چاہا تھا کہ ابھی نہ جاتیں بلکہ کچھ دیر اور اس موضوع پر بات کرتیں۔

چائے ختم کرنے کے بعد میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر ان کی جانب چلا جاؤں کیونکہ جاتے ہوئے وہ کہہ گئی تھیں کہ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے اٹھا دینا میں دروازہ اندر سے بند نہیں کروں گی۔'' لیکن پھر میں اس کی ہمت نہیں کر سکا لیکن پڑھائی کی جانب بھی دل مائل نہیں ہو سکا۔

ایک گھنٹا یا اس سے بھی کچھ زائد وقت گزرا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل آئی لیکن اس طرح کہ اس کے جسم پر جو ناٹی تھی اس سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو میں نے کہا کہ تمہیں ہی کچھ بور کر دوں۔'' اس نے مجھ سے نظریں ملتے ہی کہا وہ میرے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں نظر بھر کر اس کی جانب دیکھوں لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں بار بار اس جانب اٹھ رہی تھیں۔

''کچھ وقت ہے تو چل کر بیڈروم میں ہی باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے پیشکش کی۔

''ریاض بھائی کی یاد آ رہی ہوگی۔'' میں نے چاہا کہ ان سرگوشیوں کے بارے میں بھی کچھ کہوں لیکن اس سے زیادہ نہیں کہہ سکا لیکن میری توقع کے برعکس اس نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''تم سمیت کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرے گا لیکن میں نے اس کے جانے پر شکر ادا کیا ہے۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بہت خوش نصیب ہوں لیکن میرا دل جانتا ہے کہ میں کس عذاب سے گزر رہی ہوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا میں اور زیادہ حیرت میں ڈوب گیا۔

''لیکن تم نہیں سمجھو گے۔'' اس نے مجھے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور میں اس کے پیچھے پیچھے بیڈروم تک پہنچ گیا۔

''آپ بتائیں تو سہی۔'' میں نے تجسس سے مجبور ہو کر کہا تھا۔

''وعدہ کرو کہ تم ہم دونوں کی باتیں کسی سے نہیں کرو گے ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔'' اس نے بیڈروم میں داخل ہونے کے بعد کہا تھا۔

''وعدہ.....'' میں نے کہا۔

''چلو پھر یہاں آ جاؤ'' اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے اپنے برابر کی جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ میں جھجک گیا تھا لیکن جب اس نے دوبارہ کہا تو میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔

''میرے بھائیوں نے اس کی اسٹیل مل کی نوکری دیکھ کر اپنا فرض ادا کر دیا لیکن اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کیا کہ اس کی پہلی بیوی نے طلاق کیوں لی تھی۔'' اس نے کہا اور مجھ پر حیرت کا ایک اور پہاڑ گرا۔

''اس کی پہلی شادی دس دن کے اندر ہی ختم ہو گئی تھی کیونکہ اس کی بیوی نے جو کہا تھا وہ سو فیصد نہیں تو ستر فیصد صحیح تھا۔'' اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''کیا کہا تھا اس نے؟'' اس کے خاموش رہنے پر میں خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

''چادر لے لو اپنے اوپر'' اس نے میرا جواب دینے کے بجائے مجھے اپنی چادر میں لے لیا۔

''اس نے بھری پنچائیت میں کہا تھا کہ ریاض مرد نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔

''لیکن.....'' میرے ہونٹوں سے بہ مشکل نکل سکا تھا۔

''یہ صحیح ہے میری جان'' اس نے چادر کے اندر ہی میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میرے اندر بجلی سی دوڑ گئی تھی ایسی کہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔

''وہ ایسا پیاسا ہے کہ کنوئیں پر پہنچ کر بھی پیاس نہیں بجھا سکتا لیکن میری آگ مجھے اس عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے دیکھو اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی میری کیا حالت ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ کو اپنے جسم پر رکھا تھا۔

اس کے بعد میں ایک معمول کی طرح اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو مانتا چلا گیا۔ اس نے جو کہا وہ میں نے ایک پیشہ ور ٹائپ شخص کی طرح پورا کیا، جس جگہ میں نے جھجک کا مظاہرہ کیا وہاں اس نے پیش قدمی کی اس طرح کہ وہ فتح کرتی رہی اور میں فاتح بنتا رہا۔

فتح اور شکست کا کھیل اختتام کو پہنچا تو میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ مسکرا رہی تھی اور پھر اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا تھا ''اب ان باتوں کا ذکر کہیں دوستوں میں نہ

کر دینا کہ ہم دونوں ہی کہیں کے نہ رہیں۔''

''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ سمجھ لینا کہ میری زندگی اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

''یہ بات ہم دونوں سے نکل کر تیسرے کے پاس پہنچی اور میں خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔'' اس نے کہا اور میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ''ایسا نہیں ہوگا۔''

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا بہ ظاہر وہ بھی میری طرح لٹے اپنے معدے کی جانب منتقل کر رہی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری طرح وہ بھی ماضی کے کسی حصے کو کھنگال رہی ہے۔ میں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس نے بھی نگاہ اٹھائی اور مجھے اپنے جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا اور میں مسکرا کر چپ رہا۔

''ایک سوال کر سکتی ہوں؟'' اس نے کہا اور میں اسے گھور کر رہ گیا۔

''اس قدر تکلف سے سوال کرو گی تو میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''تمہارے بچے نہیں ہیں؟'' اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟'' اس کے سوال کے جواب میں میری جانب سے بھی سوال ہوا تو وہ کچھ سوچنے لگی۔

''تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے گھر میں گھوم پھر کر دیکھ چکی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں.....'' میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

وہ بات جو وہ کہہ نہیں سکی تھی وہ میں اس کے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گیا تھا۔

''کوئی پرابلم'' اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر سوال کیا اور اس بار میں صرف گردن ہلا کر رہ گیا۔

''لیکن تم تو بتا رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر ہے۔'' اس نے کہا میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔

''پرابلم اس کی جانب سے نہیں میری طرف سے ہے۔'' میں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے پورے وثوق کے ساتھ کہا اور میں ہنس دیا۔

''پیدا ہوتا تو اس کا نام سوال ہی رکھ دیتا لیکن وہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔'' میں نے اپنے آپ کو معمول پر لانے کی غرض سے کہا تھا لیکن وہ مزید سنجیدہ ہو گئی۔

''تم سے کس نے کہی یہ بات'' اس نے شک کا اظہار کیا اور مجھے اسے حقیقت تفصیل سے بتانی پڑ گئی۔

''رپورٹیں ہیں اور نورین نے خود تفصیل معلوم کی تھی بلکہ وہ تو دنیا بھر سے اس ضمن میں رابطے میں رہتی ہے کہ کہیں سے کوئی اچھی خبر بنائی دے۔'' میں نے کہا لیکن اس کے چہرے پر وہی بے یقینی چھائی رہی لیکن میں نے اس کی جانب سے نظریں ہٹالی تھیں۔

''رابطے کی ایک کڑی غائب ہے'' وہ بڑبڑائی لیکن پھر فوراً ہی چونک کر میری جانب دیکھا جیسے وہ نہیں چاہتی ہو کہ میں اس کی بڑبڑاہٹ سنوں۔

''دال میں کچھ کالا ہے۔'' مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اس نے کہا تھا۔

''تم شاید اس کی اس تصویر کی بات کر رہی ہو جس میں اس نے ٹاپس پہن رکھے ہیں؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ اس کی ہماری شادی سے پہلے کی تصویر ہے لیکن اسے وہی تصویر پسند ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''اس کے نزدیک میرا کسی اور جانب دیکھنا بھی جائز نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟'' میں نے تلخ سے لہجہ میں کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں جو کبھی کبھی ہی نمودار ہوتی تھیں بڑھتی چلی گئی تھیں لیکن پھر اس نے اچانک شانے اچکائے۔

''ہم کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہا پھر قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا اس نے سوال کر کے گفتگو کا رخ بدل بھی دیا۔

''یہ بتاؤ اس تمام عرصے میں یہاں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''سب کچھ تبدیل ہو گیا'' میں نے اس کی پیدا کردہ الجھن کے باوجود جواب دینا شروع کیا تھا۔

''ایک ایک کر کے تمام بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اور وہ امریکا سدھار گئے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''اور والدہ؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ بھائیوں کے پاس امریکا میں ہیں۔'' میرا جواب تھا۔

''فلیٹ موجود ہے' چابیاں میرے پاس ہیں لیکن میرا گزر اس طرف ہوتا نہیں ہے۔'' میں نے اس کے پوچھے بنا ہی کہہ ڈالا۔

''میرے بعد کیا کرتے رہے؟'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا اور میں اس کی مسکراہٹ کے ذریعے اس کے اصل سوال پہنچ گیا تھا۔

''جس عمارت کی پہلی اینٹ آپ نے رکھی تھی وہ معمولی عمارت تو یقیناً نہیں ہوسکتی۔'' میں نے جواب دیا اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''یعنی'' اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''ابتدائی جھجک آپ ختم کرگئی تھیں باقی کا کام قدرت کی عنایت کردہ شکل نے کردیا اور کچھ مطالعے کے شوق نے یہ سکھا دیا کہ صنفِ نازک سے بات کس طرح کرنی چاہیے کچھ تجربہ کالج کی ساتھی لڑکیوں نے فراہم کیا اور.....'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔'' اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

''تفصیل میں گئے تو اڑتالیس گھنٹے صرف اس گفتگو میں ختم ہوجائیں گے۔'' میں نے اسے ٹالا۔

''کچھ چیدہ چیدہ ہی بتا دو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''اچھا یہ بتادو کہ میرے بعد کون؟'' اس نے مجھے آمادہ نہ پا کر کہا۔

''وہ جو بھی تھی آپ سے بہتر نہیں تھی۔'' میں نے ایک بار پھر اسے لفظوں کا ڈاج دیا۔

''تم بتانا ہی نہیں چاہ رہے ہو۔'' اس نے ناراض ہونے والے انداز میں کہا اور میں ہنس دیا۔

''آپ کا پڑھایا ہوا سبق مجھے پوری طرح یاد ہے۔'' میں نے کہا اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''آپ یہاں نہیں تھیں۔'' میں نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''لیکن میں نے جب بھی آپ کو یاد کیا تنہائی میں ہی یاد کیا۔ کبھی بھولے سے بھی آپ کا نام میری زبان پر نہیں آیا تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی اور کا نام آپ کے سامنے میری زبان پر آجائے۔'' میں نے اپنی بات مکمل کی تو وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں غلطی کے اعتراف کے ساتھ شرمندگی بھی تھی لیکن پھر اچانک ہی جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔

''اپنی بیوی سے تو تم نے ذکر کیا ہوگا؟'' اس نے تجسس آمیز انداز میں سوال کیا اور میں ہنس دیا۔

''آپ نورین سے ملی نہیں ہیں اس لیے یہ بات کررہی ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیڈروم میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔ خاصی خوش شکل ہے۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''خوش شکل ہونا اس کی ایک خوبی ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ جو چیز اس کی ہے وہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی۔'' میں نے نورین کے غائبانہ تعارف کے طور پر کہا۔

''گویا وہ تم پر بھی مالکانہ حقوق رکھتی ہے۔'' اس کا انداز طنزیہ سا تھا۔

''اپنے والدین کی وہ اکلوتی بیٹی ہے۔'' میں نے نورین کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتانا شروع کیا ''اس کے والد کلکٹر کسٹم کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اس لیے آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ گھر میں دولت کی ریل پیل کی کیا کیفیت ہوگی ایسے میں اکلوتی اولاد کے جو نخرے ہوسکتے ہیں ان کے بارے میں بھی آپ اندازہ لگا سکتی ہیں۔'' میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا کر میری تائید کی۔

''میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ بہت سے افراد شیخی مارنے کے لیے بیویوں کو اپنے تعلقات کی جھوٹی سچی کہانیاں سناتے ہیں۔'' اس نے کہا اور میں ایک بار پھر ہنس دیا۔

''نورین کو اس بات کا یقین ہے کہ میری زندگی میں اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی عورت نہیں آسکی اور نہ آسکتی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''اور اگر اسے یہ معلوم ہوگیا کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی تمہاری زندگی میں اور بھی عورتیں ہیں تو.....'' اس نے عجیب سے انداز میں سوال کیا۔

''اس کی پہلی شادی کی طرح اس کی دوسری شادی بھی ختم ہوجائے گی۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

''تم سے پہلے بھی اس کی کوئی شادی تھی؟'' اس نے اپنی حیرت کو لفظوں کی شکل دی۔

''وہ شادی چھ ماہ سے بھی کم عرصہ چل سکی تھی۔'' میں نے کہا لیکن اس کی حیرت میں کمی نہیں آئی تھی۔

''تمہاری والدہ کس طرح مان گئیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''انہوں نے اب تک اس شادی کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔'' میں نے اسے صورتِ حال سمجھائی۔

''جب ہم یہاں تھے اور میں نے تمہارے بڑے بھائی کے لیے ایک رشتہ انہیں بتایا تھا جس کا صرف نکاح ہوا تھا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی تھی تو تمہاری والدہ نے انکار کردیا

تھا'' اس نے اپنی یادداشت کو دہرایا اور میں جانتا تھا وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔

''نورین سے شادی کرنے سے قبل میں نے اس کا ذکر بھی گھر پر نہیں کیا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''گویا یہ محبت کی شادی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا اور میں ہنس دیا۔

''اس کی جانب سے محبت تھی لیکن میرے لیے ضرورت تھی۔'' میں نے وہی کہا جو سچ تھا۔

''یعنی؟'' وہ ایک بار پھر الجھن کا شکار ہوگئی تھی۔

''جس راستے پر آپ مجھے ڈال گئی تھیں اس کے بعد میری توجہ تعلیم کی جانب اس طرح نہیں رہ سکی جس طرح پہلے تھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں وہ نہیں بن سکا جو بننا چاہتا تھا اور ایک میڈیکل ریپ بن رک رہ گیا'' میں نے کہا۔

''یعنی فارماسیٹیکل کمپنیوں کے وہ افراد جو ڈاکٹروں سے مل کر انہیں اپنی دواؤں کی خوبیاں بتا کر انہیں وہ دوائیں لینے پر مجبور کردیتے ہیں۔'' اس نے وضاحت چاہی اور میں گردن ہلا کر اس کی تائید کردی۔

''نورین سے میری ملاقات اسی ذریعے سے ہوئی تھی۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''اور تم نے اسے اپنے لفظوں کے جال میں الجھا لیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا آپ نے کہا لیکن جب مجھے نورین کے بارے میں معلوم ہوا تو میں نے یہ کوشش ضرور کی تھی اگرچہ یہ ناممکن نظر آتا تھا لیکن پھر حالات کچھ ایسے رخ پر آگئے کہ وہ متاثر ہوتی چلی گئی اور اپنی محتاط طبیعت کے باوجود وہ میری جانب بڑھتی چلی گئی'' میں نے اعتراف کرلیا لیکن اس کی حیرت دور نہیں ہوئی۔

''حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' اس نے سوال کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

''نورین سے اس کی سہیلی کے بھائی نے اپنی مجبوریاں بتا کر رقم ادھار لی اور نورین نے سہیلی کا بھائی سمجھتے ہوئے رقم اسے بھی دی لیکن بعد میں وہ صاحب مفرور ہوگئے جبکہ نورین کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ رقم اس نے دی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''میں نے اپنے دوستوں کے ذریعے اسے وہ رقم واپس ہی نہیں دلوائی بلکہ نورین کی تمام تر کوشش کے باوجود اس میں سے کچھ بھی قبول نہیں کیا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ظاہر ہے تم بکرے کے لیے منصوبہ بندی کررہے تھے جبکہ وہ صرف ایک بوٹی پر ٹرخا رہی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بکرے اور بوٹی کے استعاروں نے مجھے بھی لطف دیا تھا۔

''اس کے بعد کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنے اسپتال میں ملازمت کی آفر کی جسے میں نے یہ کہتے ہوئے قبول نہیں کیا کہ ''آپ مجھے دوست کہہ چکی ہیں اور دوستوں کی نوکری نہیں کی جاتی۔ اس کے بعد کی چوتھی ملاقات میں اس نے شادی کی پیشکش کی اور اندھے نے فوراً آنکھوں کا تحفہ وصول کرلیا'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''شاید وہ عمر میں بھی تم سے کچھ بڑی ہوگی؟'' اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے سوال کیا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''چار برس کا فرق ہے لیکن بہ ظاہر یہ فرق نظر نہیں آتا

اپنا پن

عراق کے نواح میں دو امریکی فوجی ایک ٹرک میں سڑک پر جارہے تھے کہ راستے میں ایک صحیح سلامت بم پڑا نظر آیا۔ ایک فوجی نے چلا کر ڈرائیو کرنے والے فوجی سے کہا۔ ''ارے..... ارے..... گاڑی روکو..... سڑک کے بیچوں بیچ بغیر پھٹا ہوا ایک بم پڑا ہے.....''

ڈرائیو کرنے والے فوجی افسر نے آنکھیں سکیڑ کر بم کی طرف دیکھا پھر بے پروائی سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں..... یہ ہمارا اپنا بم ہے.....''

ذرا ہٹ کے

مین ہٹن کے مرکزی علاقے میں بہت سے مانگنے والے مختلف پلے کارڈ لیے کھڑے ہوتے ہیں جن پر مختلف انداز میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کی مالی مدد کی جائے۔ لوگ ان عبارات پر توجہ نہیں دیتے لیکن پچھلے دنوں ایک مانگنے والے کی عبارت نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے رکھی۔ اس نے اپنے پلے کارڈ پر لکھا تھا:

''برٹینی پٹ اور انجلینا جولی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع ہے۔ میں اس موقع پر تحفہ دینے کے لیے رقم جما کررہا ہوں براہِ کرم مدد کریں۔''

ہے۔'' میں نے کہا اور وہ کچھ کہے بغیر برتن سمیٹنے لگی شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔

''چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے مجھے برتن سمیٹنے میں مدد کرتا دیکھ کر سوال کیا۔

''مل جائے تو پی جا سکتی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تو پھر وہیں کچن میں آ جاؤ۔'' اس نے برتن لے کر کچن کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔... ''چائے بنانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔'' اس نے یہ دیکھے بغیر کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں یا نہیں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

میں کچن میں پہنچا تو وہ بچ جانے والی چیزیں فریج میں منتقل کر رہی تھی اور برتن سنک میں رکھ رہی تھی۔

''اس شادی سے تمہیں مالی فائدے بھی ہوئے ہیں یا.....؟'' چائے کے لیے پانی رکھتے ہوئے اس نے سوال کیا اور میں ہنس دیا۔

''اس وقت میرا اپنا ایک ڈسٹری بیوشن ہاؤس ہے جس کے پاس پندرہ مختلف کمپنیوں کے ڈسٹری بیوشن ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اس میں سرمایہ تو اس کا ہوگا؟'' اس نے سنک میں موجود برتن صاف کرنے سے پہلے سوال کیا لیکن میں نے اس کو جواب دینے سے پہلے اسے روکنا چاہا۔

''انہیں رہنے دو'' میں نے برتنوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنس دی۔

''صبح کام والی آئے گی اور صاف کر دے گی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا' میں نے تائید میں گردن ہلا دی اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''تمہاری تمام عقل شاید صرف ایک معاملے میں ہی چلتی ہے'' اس نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا کیونکہ میں کچھ نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''تمہیں گھر سے نکلنا ہے کیا؟'' اس نے ایک اور سوال کیا اور میری حیرت اور بڑھ گئی ''وہ آئے گی تو کیا مجھے نہیں دیکھے گی؟'' اس نے کہا اور میں چونک گیا۔ اس انداز سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''تمہاری اڑی اڑی رنگت اور میرے کھلے کھلے گیسو اسے ہماری رات کا فسانہ سنا دیں گے اور یہ فسانہ جب تمہاری بیوی کے کانوں تک پہنچے گا تو کیا ہوگا۔ یہ تم بہتر جانتے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے میں پتی ڈال کر دوبارہ برتن دھونے لگی۔

''آپ واقعی صحیح کہہ رہی ہیں۔'' میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور وہ ہنس دی۔

''مانتے ہو نا کہ استاد بہر حال استاد ہوتا ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے اس کی ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔

''ویسے آپ پاکستان آئی کیوں تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ریاض نے میرے نام سے ایک پلاٹ خریدا تھا۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔

''چار برس پہلے ریاض کا موڈ پاکستان واپس آنے کا ہوا تو وہ کراچی آئے تھے اور انہوں نے کسی ٹھیکیدار کو مکان تعمیر کرنے کے لیے کہا تھا لیکن پھر ان کا ارادہ ملتوی ہو گیا اور مکان اس ٹھیکیدار کے ذریعے ہی کرایہ پر دے دیا گیا تھا۔'' وہ تفصیل سے اپنی آمد کے بارے میں بتا بھی رہی تھی اور ساتھ دونوں کام بھی کر رہی تھی۔

''آپ کس لیے آئی ہیں اب؟'' وہ کچھ دیر کے لیے رکی تو میں نے سوال کیا۔

''ریاض نے اس مکان کا سودا کر لیا ہے اور میں کاغذات پر دستخط کرنے اور رقم وصول کرنے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب آپ کراچی کبھی نہیں آئیں گی؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے افسردہ لہجے کی گہرائی تک پہنچنا چاہ رہی ہو۔

''کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے چائے کے مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب چل دی اور میں اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ وہ بیڈ روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے زندگی خوش و خرم بسر ہو رہی ہے؟'' میں نے اس کے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا اور وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''معاشی طور پر ہاں اچھی بلکہ بہت اچھی بسر ہو رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس کے علاوہ جو کہانی ہے وہ تم جانتے ہو۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

اس نے ایک فقرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے متضاد تھے۔

''بچوں کے بارے میں.....؟'' میں نے محتاط انداز میں سوال کیا جس کا جواب اس نے ایک طنزیہ سی ہنسی سے دیا تھا۔ اور ہمارے درمیان اس کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی

چھا گئی۔

''ریاض میں ایک فرق آیا ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

''اب اسے مجھ پر رحم آنے لگا ہے یا پھر یوں کہہ لو کہ وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس ہو گیا ہے کہ نوچنے اور بھنبھوڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے افسردہ لہجے لیکن چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنی بات مکمل کی۔

''وہاں کوئی ذیشان نہیں مل سکا۔'' میں نے مزاحیہ انداز میں کہا وہ ہنس دی۔

''یہاں بھی ذیشان قسمت سے ہی مل سکا تھا وہاں کے تو نین ہی اتنے سخت ہیں کہ کنوئیں پر پہنچ کر بھی پیاسا رہ جانے کو جی چاہتا ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''وہاں کی باتیں وہاں تک'' میں نے اپنے حصے کی چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو کنواں خود چل کر پیاسے تک آتا ہے۔'' میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا اور اس نے میرے ارادوں کو محسوس کرتے ہوئے چائے کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

رات اس طرح گزری تھی جس طرح گزرنی چاہیے تھی لیکن پھر سویرے ہی اس نے مجھے اٹھا بھی دیا۔ ''دروازے پر کوئی ہے۔'' اس نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا اور میری نیند سیکنڈوں میں غائب ہو گئی اپنی حالت درست کرتے ہوئے میں دروازے تک گیا جہاں سے واپسی میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی لیکن وہ بستر سے غائب تھی۔

خود کو دوبارہ بستر پر دراز کر کے میں ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں اترنے کی کوشش کرنے لگا لیکن موبائل فون کی گھنٹی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسکرین پر مونا کا نمبر تھا۔

''کہاں ہیں آپ.....'' اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا۔

''رات فون کرتی رہی لیکن آپ نے موبائل ہی آف کیا ہوا تھا۔'' اس نے کہا۔

''موبائل تو میں نے آن ہی رکھا تھا۔'' میں نے کہنے کو کہہ تو دیا لیکن ساتھ ہی احساس ہوا کہ رات نورین کے فون کے بعد میں نے کوئی فون ریسیو نہیں کیا تھا۔

''اچھا مجھے فون کریں.....'' اس نے کہا اور میری جانب سے مثبت جواب سنتے ہی فون رکھ دیا۔ باتھ روم سے

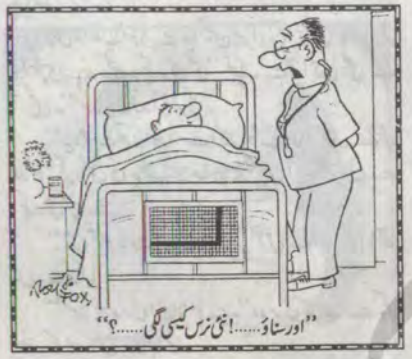

پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جب میں نے مونا کو ڈائل کیا تھا۔

''آپ کی مصروفیت زیادہ ہو گئی ہیں یا مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔'' اس نے فون اٹھاتے ہی شکایت کی پٹاری کھول دی۔

''تیسری صورت یہ ہے کہ آپ مجھے آزما رہے ہو لیکن ہر صورت میں ایک ہی بات سامنے آئے گی۔''

''اور وہ بات کیا ہوگی؟'' اس کی گفتگو میں وقفہ آتے ہی میں نے سوال کیا۔

''یہی کہ مجھے مونا چوہدری سے مونا ذیشان بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' مونا نے کہا اور میں بے اختیار ہنس دیا۔

''آج موڈ میں ہو' خیریت تو ہے'' میں نے اسے چھیڑا؟

''کل رات سے میرا موڈ آف تھا لیکن آپ کی آواز سننے کے بعد غصہ کم ہو گیا ہے اور ملنے کے بعد بالکل ختم ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور مجھے یاد آ گیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔

''مونا آج تو ملنا ناممکن ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ایک بار پھر ناراض ہو گئی۔

''اگر آپ نہیں آئے تو میں گھر پہنچ جاؤں گی۔'' وہ براہ راست دھمکی پر اتر آئی تھی اور اس وقت وہ بھی باتھ روم سے نکل آئی جس کی وجہ سے میں مونا کو ٹال رہا تھا۔ اس نے گیلے بالوں میں تولیا لپیٹا ہوا تھا لیکن مجھے فون پر گفتگو کرتا دیکھ کر اس نے اشارے سے پوچھا تھا کہ ''کون ہے؟''

''کل رات کچھ مہمان آئے ہیں۔'' میں نے بہانہ بنانا

چاہا تھا۔

میں مخاطب مونا سے تھا لیکن میرا رخ اس کی جانب تھا جو دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی ''ٹھیک ہے تو انہیں بھی لے آئیں۔'' مونا نے فوراً آفر کی۔

''یہ دعوت تم براہِ راست انہیں دے دو۔'' میں نے کہا اور موبائل اس کی جانب بڑھا دیا جو تجسس آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں تبسم بات کر رہی ہوں۔'' اس نے موبائل ہاتھ میں لے کر کہا۔

''مونا چوہدری اچھا نام ہے۔'' دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''دوپہر کے کھانے کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا اور آج رات ہم وہاں مدعو ہیں جس کام کے لیے میں سعودی عرب سے آئی ہوں۔'' تبسم نے کہا۔ میں اسے پہلے اشارہ کر چکا تھا کہ وہ کسی طرح اسے ٹالے۔

''دوپہر کا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ ابھی تو دور دور تک ناشتے کا بھی امکان نہیں ہے بلکہ یوں سمجھ لو کہ بیدار ہونے والوں میں میرا پہلا نمبر ہے۔'' تبسم بڑی خوبصورتی سے اسے یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

''تم مجھ سے ملنا چاہتی... ہو لیکن میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں کیونکہ رات بہت دیر تک شان تمہاری باتیں کرتا رہا تھا۔'' اس نے یکا یک ٹریک تبدیل کیا میں اسے ہاتھ کے اشاروں سے روکتا رہ گیا۔

''میں صبح کسی وقت تمہیں فون کروں گی تاکہ کچھ دیر کے ہی لیے سہی لیکن ہماری ملاقات ضرور ہو'' تبسم نے کہا اور پھر کچھ دیر رسمی سی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر کے میری جانب بڑھا دیا۔

''کون تھی؟'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں سوال کیا۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی کہ اس سے یہ کہتیں کہ میں اس کا ذکر کرتا رہا ہوں۔'' میں نے ناراض لہجے میں اس کا ذکر کیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ویسے تھی کون؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''آپ اس کے بارے میں کچھ بھی جانتی نہیں ہیں اور ملاقات کرنے کے وعدے سے لے کر ہر وعدہ کرنا ضروری سمجھا۔'' میں نے اپنے ناراض لہجے کو نہیں بدلا تھا۔

''جب تک یہ نہیں بتاؤ گے کہ وہ کون ہے مجھے احساس کس طرح ہوگا کہ میں نے کیا غلطی کر دی ہے۔'' اس نے ایک اور انداز سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

میں اسے مونا کے بارے میں بتانے لگا تو وہ وہیں بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی اور پوری دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی درمیان میں کہیں کہیں سوال بھی کیے لیکن وہ سوال بھی اس طرح کے تھے کہ جن سے اس کی دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

''شان اس لڑکی سے پیچھا چھڑاؤ بلکہ جو وہ کہتی ہے مان لو'' اس نے میری بات مکمل ہوتے ہی کہا۔

''پاگل ہو گئی ہیں کیا؟'' میں نے کہا۔

''پاگل میں نہیں تم ہو گئے ہو جسے تختہ سیاہ پر سفید چاک سے لکھی ہوئی تحریر بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہنا کیا چاہ رہی ہیں آپ؟'' میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

''تم نے یہی کہا تھا نا کہ وہ اچھی لڑکی ہے لیکن صرف جذباتیت کا شکار ہو گئی ہے اور تم اس کے جذبات سے کھیل کر کسی طرح سے بھی اس کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔'' اس نے کہا اور میری گردن اثبات میں ہل گئی کیونکہ وہ میرے کہے ہوئے لفظ ہی دہرا رہی تھی۔

''فی الحال تو میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں لیکن جانے سے پہلے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں کبھی کسی پر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہیے جتنا تم نے اپنی بیوی پر کیا ہے؟'' اس نے باہر جانے کے ارادے سے قدم آگے بڑھائے لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ.....'' میں جو کہنا چاہتا تھا اسے اس نے مکمل نہیں ہونے دیا بلکہ درمیان میں سے میرا فقرہ اچک لیا۔

''تم نے بتایا نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نے اپنے بارے میں تمام رپورٹوں پر اپنی بیوی پر انحصار کیا ہوگا اور اس کے کہے کو حرفِ آخر سمجھا ہوگا؟'' اس نے رک کر جواب میں سوال کیا تھا۔

''آپ حد سے آگے بڑھ رہی ہیں۔'' میں نے اسے ٹوکا لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایک بار تم کسی ڈاکٹر سے اپنے طور پر رابطہ کر لو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی اور میرے پورے جسم میں جیسے ایک آگ سی لگ گئی۔ اس نے بہت کھل کر نورین پر الزام

لگایا تھا اور الزام بھی ایسا تھا کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''آخر یہ چاہتی کیا ہے؟'' میں نے غصے کی اسی لہر کے تحت سوچا تھا۔

''نورین کی اتنی بڑی قربانی پر اس کی تعریف کرنے کے بجائے.....'' غصے کی زیادتی نے مجھے اس سے آگے سوچنے بھی نہیں دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں کچن میں جاؤں اس سے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دوں کہ ''میں سب کچھ سن سکتا ہوں لیکن نورین کے خلاف نہیں سن سکتا ہوں۔'' لیکن اس وقت اچانک ہی میرے ذہن کے کسی گوشے نے بغاوت کی۔

''اس نے ایسی کوئی غلط بات بھی نہیں کی؟'' باغی گوشے نے اس کی حمایت کی۔

''ایسا واقعی ہوا تھا کہ جو کچھ نورین نے کہا تھا میں نے اس پر یقین کیا تھا۔'' باغی گوشے کی بغاوت کے بعد میں نے سوچا تھا ایک اور لہر ابھری تھی۔

''وہ ڈاکٹر جس نے ابتدائی ٹیسٹ لیے تھے وہ بھی تو نورین کی ہی دوست تھی۔'' سوچ کی ایک لہر ابھری تو ابھرتی چلی گئی۔

''پھر اسی ڈاکٹر نے انگلینڈ ٹیسٹ رپورٹس بھیجی تھیں اور اس کے بچے پر انگلینڈ کی رپورٹیں آئی تھیں۔'' میں غیر ارادی طور پر سوچ کی ان لہروں کے ساتھ بہتا رہا۔

''لیکن نورین نے بتایا تھا کہ اس کا اپنے پہلے شوہر سے اس بات پر اختلاف ہوا تھا کہ وہ اتنی جلدی بچے نہیں چاہتا تھا اور اس نے نورین کے انکار کے بعد نورین کو اسے بتائے بغیر ایسی دوائیں دی تھیں کہ نورین کا حمل ضائع ہو گیا تھا۔'' میں نے نورین کی حمایت کرنی چاہی لیکن باغی گوشے نے اگلے ہی لمحے اس دلیل کو بھی رد کر دیا تھا۔

''یہ بیان نورین کا تھا جو اس نے شادی سے قبل دیا تھا اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس کی ہی نہیں گئی تھی۔'' باغی گوشے سے صدا آئی اور میں مزید سوچ میں گم ہو گیا۔

اس وقت تک یہ ہوا تھا کہ میں نورین کی کسی بھی بات پر کبھی شک کا اظہار نہیں کیا تھا وہ جو کہتی تھی میں اسے اسی طرح تسلیم کر لیتا تھا۔ شاید اس کی وجہ کچھ معاشی تھی اور کچھ یہ تھی کہ میں اس سے ضرورت سے زیادہ متاثر بھی تھا وہ مجھ سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی اور قابل تھی۔ اس کا حلقۂ احباب بھی اس کی طرح کے لوگوں کا تھا۔ امیر، باشعور اور تعلیم یافتہ اور اس کے حلقۂ احباب میں میری جو بھی حیثیت تھی وہ اسی کی وجہ سے

''آج لنچ میں باہر ہوٹل میں بھی میں نے یہی ڈش کھائی تھی، اب میں موازنہ کر سکوں گا کہ کہاں بہتر پکی ہوئی تھی۔''

تھی۔ معاشی طور پر میں جو کچھ بھی تھا وہ بھی نورین کی ہی مہربانی تھی۔ اس نے نہ صرف ابتدائی سرمایہ مہیا کیا تھا بلکہ اس کے تعلقات کی وجہ سے ہی میں کاروبار کو اس تیزی سے اس مقام تک لایا تھا۔

''نورین کے احسانات اپنی جگہ لیکن اگر یہ ایسا ہوا کہ نورین نے غلط بیانی کی تھی تو.....'' میں نے سوچا لیکن اس کا جواب نہیں آ سکا تھا اور آتا بھی کیسے میں نے اس سے پہلے اس طرح سے سوچا بھی تو نہیں تھا۔ اب سوچا تھا تو مختلف جواب آنے لگے لیکن کوئی بھی قابلِ عمل نظر نہیں آ رہا تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہیں جناب؟'' اس کی آواز نے مجھے سوچوں کے بھنور سے نکالا اور میں اس کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔

''آپ کی لگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہوں۔'' میں نے اسے ناشتے کی ٹرے ہاتھ میں لیے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھسکتے ہوئے کہا۔

''اس آگ سے نکلو گے تو کندن بن چکے ہو گے۔'' اس نے ٹرے درمیان میں رکھتے ہوئے کہا تو میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا... اور اس دوران وہ سامنے بیٹھ چکی تھی۔

''میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں شان۔'' اس نے کہا اور میں بری طرح چونکا۔

''میں اگر کہہ رہی ہوں کہ کسی پر بھی آنکھیں بند کر کے اعتماد مت کرو تو بلا سبب نہیں کہہ رہی ہوں۔'' اس نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں گنگ سا ہو گیا۔

''ریاض..... بھائی.....؟'' میں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سوال کیا اور وہ ہنس دی۔

''احمقانہ سوال کرنے کے بجائے ناشتے کی جانب توجہ دو۔'' اس نے جوابی طور پر کہا اور مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو بھی گیا۔

''تو آپ نے.....'' میں نے چند لقمے لینے کے بعد سوال کرنا چاہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

''کچھ باتیں کہی نہیں جاتیں صرف سمجھی جاتی ہیں۔'' اس نے میرے ہر سوال کے لیے اپنے جواب کے دروازے بند کر دیے لیکن میں اس کے باوجود بھی اس سے متفق تھا۔

''آپ صحیح کہتی ہیں۔'' میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

''میں یہ بھی صحیح کر رہی ہوں کہ مونا کو اپنی زندگی سے نہ نکالو چاہے کچھ عرصہ اس سے اپنے رشتے کو تمہیں اپنی بیوی سے چھپانا بھی پڑے۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''اسے معلوم ہوگا تو وہ کچھ بھی کر گزرے گی۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ نورین کے لیے شکست کو قبول کرنا بہت مشکل ہوتا۔ وہ اچھی ڈاکٹر بھی اس لیے تھی کہ وہ وہاں بھی آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔

''اصل میں ہوا یہ ہے میرے راجا کہ تم سمجھتے رہے کہ تم شکار کر رہے ہو لیکن دراصل تم خود شکار ہو رہے تھے۔'' اس نے کہا۔ لیکن میں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''اور وہ وقت کب آئے گا؟'' اس نے فوراً ہی سوال کیا۔

''جب دوسری بار کی رپورٹیں آئیں گی؟'' میں نے جواب میں کہا اور وہ ایک طنزیہ سی ہنسی ہنس دی۔

''کاش میں اس وقت یہاں ہوتی۔'' اس نے کہا اور میں گھور کر رہ گیا۔

''اس بار بھی پہلے کی طرح پھر رابطہ ختم کر دو گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا انحصار تم پر ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرے نمبر آپ کے پاس ہیں جب کہ آپ کے نمبر میرے پاس نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم چاہتے تو میرے نمبر حاصل کر سکتے تھے یہ معلوم کر سکتے تھے کہ میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں لیکن تم نے ایسا اس لیے نہیں کیا کیونکہ میرے بعد تمہیں نئی دلچسپیاں مل گئی تھیں۔'' اس نے اعتراض کا اس خوبصورتی سے جواب دیا تھا کہ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اس نے ہی مجھے مخاطب کیا۔ ''مجھے اس شخص سے بھی ملنا ہے جس سے ملنے میں آئی ہوں۔''

''لیکن آج اور کل تو چھٹی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں یہ معلوم کیے بغیر وہاں سے چل دی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کاغذات تیار ہیں مجھے صرف ان پر دستخط کرنے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''..... یہ بات ہے تو وہ کاغذات ڈاک سے بھی بھیج سکتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا تھا لیکن میں نے نہیں چاہا کہ ایسا ہو۔'' اس کا جواب تھا۔

''تم سے ملنا جو تھا۔'' اس نے میرے ''کیوں'' کہنے سے قبل ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

''شاید میں تیسری بار شکار ہو رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا۔

اس نے مجھے ایسی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر سوچتا رہا۔ وہ ناشتے کے بعد کچن میں چائے بنانے چلی گئی تب بھی میں اسی الجھن میں مبتلا رہا وہ چائے لے کر آ گئی اور اس نے بتایا کہ وہ دوپہر کے لیے کھانا تیار کر رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ اس شخص سے ملنے بھی جانا چاہتی ہے لیکن اسے میرا ساتھ بھی گوارا نہیں تھا میرے اعتراض پر کہ وہ اکیلی کہاں بھٹکتی پھرے گی اس نے جو کہا اس نے ایک بار پھر مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ریاض کی اس سے بات ضرور ہوگی اور میرے لیے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا کہ میں تم سے کہاں اور کیوں ملی تھی۔'' اس نے کہا اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔

''یاد رکھنا شان کہ بزدل ہی شکی بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

چائے پینے کے بعد بھی میں بستر پر دراز رہا جب کہ وہ پورے گھر میں مصروف رہی۔ میں نے اسے روکنا بھی چاہا لیکن روک نہ سکا۔

''مجھ سے گندگی برداشت ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے کہا

... میں اس کا... نورین سے مقابلہ کرنے لگا نورین کو گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کچن تو گھر کا وہ حصہ تھا جہاں وہ دن میں ایک بار بھی جانے کا تصور نہیں کر سکتی کبھی کام والی چھٹی کر جاتی تو گھر میں جیسے دھول اڑنے لگتی تھی اور اس کا تمام غصہ بھی وہ ان پر ہی اتارتی تھی۔

''یہ دونوں الگ الگ شعبوں سے تعلق رکھنے والی خواتین ہیں۔'' میں نے نورین کی حمایت میں سوچنا چاہا لیکن پھر نورین کی گھر کے کاموں سے بیزاری کے واقعات یاد آنے لگے اور میں نے اس موضوع پر مزید سوچنا چھوڑ دیا۔

''یہ بتاؤ کہ کھانا ابھی کھاؤ گے یا میں اپنے کام سے فارغ ہو آؤں پھر کھاؤ گے؟'' اس نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر سوال کیا۔

''فی الحال تو کھانے کی کوئی خواہش نہیں ہے البتہ چائے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے؟'' میں نے فرمائش کی اور وہ مسکرا کر وہیں سے واپس ہو گئی۔

اب کی بار وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا جو اس نے میرے آگے رکھا اور اپنا پروگرام سمجھانے لگی۔ ''میں تمہاری گاڑی لے جا رہی ہوں۔''

اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

''صرف کار کی ہی نہیں آپ جاتے ہوئے فلیٹ کی چابی بھی لے جائیں تاکہ اگر میں سو بھی جاؤں تب بھی آپ کو اندر آنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔'' میں نے تجویز دی اور اس نے اس سے اتفاق بھی کیا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے مجھ پر نیند کا خمار باقی تھا۔ دیر تک جاگنے کی عادت عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ جتنی دیر تک میں اس رات جاگا تھا نورین کی موجودگی میں اتنی دیر جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ہم تمہاری مونا سے آج رات نہیں مل سکتے....؟'' اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے میری جانب رخ کیے بغیر مجھے مخاطب کیا۔

''آپ ملنا چاہیں تو مل لیں لیکن میری استدعا ہے کہ آپ اس کے ذہن میں کوئی نیا بیج نہ بو دیں۔'' میں نے کہا اور اس نے گھوم کر میری جانب دیکھا۔

''آپ کے کہنے پر میں تیار بھی ہو گیا ہوں لیکن نئی رپورٹوں کے آنے تک میں اسے کوئی امید دلانا نہیں چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی سوال کرتی ہوئی نظروں کے جواب میں کہا۔

ہائی وے پر نہایت تیز رفتاری سے جاتے ہوئے ایک صاحب کی گاڑی کو ٹریفک سارجنٹ نے کافی طویل تعاقب کر کے روکا تو وہ انجان اور معصوم بنتے ہوئے بولے۔ ''مجھے کس لیے روکا گیا ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی مجھے اس طرح نہیں روکا گیا.....''

''جی ہاں..... میرا بھی یہی خیال ہے'' ٹریفک سارجنٹ نے دانت پیس کر کہا۔ ''اس سے پہلے جس نے بھی آپ کو روکا ہوگا..... پچھلے ٹائروں پر گولی چلا کر ہی روکا ہوگا۔''

''میرا وعدہ ہے کہ میں اس سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کروں گی۔'' اس نے کہا لیکن اس کے باوجود میں نے اس کے ساتھ مونا سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

''واپس آ کر اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔'' اس نے روانہ ہونے سے پہلے کہا۔

اس نے شاید یہ سوچ کر مونا سے ملاقات کرنے کا ذکر نہیں چھیڑا تھا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں مونا کے تصور میں الجھ جاؤں لیکن ہوا یہی کہ اس کے جاتے ہی میں مونا کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ تصور بھی بہت خوش آئند تھا کہ ''مونا میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔''

اپنی محرومیوں سے میں سمجھوتا کر چلا تھا لیکن اس نے آ کر اچانک امید کی ایک نئی شمع میرے اندر روشن کی تھی پھر نہ جانے کب میں اسی تصور کے ساتھ نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا لیکن وہاں بھی مونا کا ہی راج تھا۔ میں اس وقت بھی مونا اور اپنے بچوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا جب اس نے آ کر مجھے بیدار کیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر آپ کا دشمن آپ کو للکار رہا ہے؟'' اس نے مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر کہا۔

''آؤ اور چن چن کر اپنے دشمن کو ختم کر دو۔'' اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کب واپسی ہوئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ دیر ہوئی۔'' اس نے جواب دیا لیکن ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا۔

''جلدی آؤ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔'' مجھے واش روم کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔

میں ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا تو وہ کھانے کے سامنے بیٹھی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔

''کام ہو گیا؟'' کھانا شروع کرنے سے پہلے میں نے

سوال کیا اور اس نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

''طے یہ ہوا تھا کہ وہ میرے سائن کرنے سے قبل پوری ادائیگی کر دے گا لیکن بہانے بنا رہا تھا کہ رقم پوری نہیں ہو سکی۔'' اس نے وجہ بتانے کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر؟'' میں نے اس کے لہجے کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ کہ کل تک اگر اس نے رقم پوری کر دی تو میں دستخط کر دوں گی۔'' اس کا جواب تھا۔

''اور اگر نہ کی تو؟'' میں نے سوال کیا۔

''تب کچھ نہیں۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''تم جو کچھ کر رہے ہو وہی بہت ہے۔'' اس نے جواب میں کہا لیکن جس انداز میں کہا تھا اس سے میں جھینپ گیا تھا۔

''کھانے کے بعد تمہیں چائے دوں گی اور کچھ دیر کے لیے سو جاؤں گی تاکہ شام میں فریش اٹھوں۔'' اس نے پروگرام بتایا جسے میں نے خاموشی سے سن لیا۔

جس پروگرام کا اس نے اعلان کیا تھا اس کے صرف پہلے حصے پر عمل ہوا کیونکہ دوسرے حصے پر وہ خود بھی شاید عمل نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بعد میں اس نے اپنے نہ سونے کا ذمے دار مجھے ٹھہرایا حالانکہ میرا حصہ اس جرم میں پچاس فیصد سے کچھ کم ہی تھا۔

وہ بیڈ روم سے اس وقت نکلی تھی جب نورین کا فون میرے موبائل پر آیا تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق اس نے اس بار بھی وہی سوال کیا تھا جو وہ ہر بار کرتی تھی۔ ''کہاں ہو؟''

''گھر میں ہوں اور بستر پر اکیلے لیٹے ہوئے پورے بستر پر بادشاہت قائم کیے ہوئے ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''کھانا کھا لیا؟'' اس نے سوال کیا جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا تھا۔

''اگر مائنڈ نہ کرو تو اسپتال کا چکر لگا لو وہاں کچھ پرابلم ہو گئی ہے۔'' نورین نے کہا۔

''کیسی پرابلم؟'' میں نے سوال کیا اور نورین کچھ دیر کے لیے خاموش رہی۔

''پولیس نے اطلاع دی ہے کہ وہاں غیر قانونی طور پر بن بیاہی ماؤں کو فارغ کیا جاتا ہے۔'' نورین نے کہا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یہ کب ہوا؟'' میں نے تیزی کے ساتھ سوال کیا لیکن نورین نے اس بار بھی فوری جواب نہیں دیا۔

''آدھ گھنٹا پہلے ہی پولیس وہاں سے گئی ہے۔'' نورین نے بتایا۔

''جب پولیس وہاں سے جا چکی ہے تو اب کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے تفصیل جاننا چاہی۔

''مسئلہ تو کوئی نہیں ہے البتہ تمہارے جانے سے اسٹاف کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔'' نورین نے کہا۔

''مجھے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تمہارا اسٹاف پہلے ہی بہت حوصلے والا ہے۔'' میں نے کہا اور نورین کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے اس جواب کی توقع نہ کر رہی ہو۔

نورین کو اگر حیرت ہوئی تھی تو اس سے زیادہ حیرت مجھے اپنے آپ پر ہو رہی تھی کہ میں نے وہ جواب دے کس طرح دیا۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اس ذہنی کشمکش کا کمال تھا جو کئی گھنٹوں سے میرے ذہن میں چل رہی تھی۔

''شاید..... تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' نورین نے کچھ دیر بعد کہا لیکن اس کے لہجے سے ناراضی ظاہر ہو رہی تھی۔

''تم چاہو تو میں احمد مبارک سے بات کر لیتا ہوں۔'' میں نے اپنے ایس ایس پی دوست کا حوالہ دیتے ہوئے بات کرنی چاہی لیکن نورین تب تک اپنا موڈ بنا چکی تھی۔

''فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کے فوراً بعد اس نے دوسری باتیں شروع کر دیں اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے اپنا واپسی کا ٹکٹ کینسل کروا دیا ہے اور نیا ٹکٹ ابھی نہیں لیا ہے۔

جس انداز سے وہ رک رک کر بات کر رہی تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے پھر جب اس نے بتایا کہ ''ایک بہت اچھی آفر مجھے یہاں ملی ہے۔'' تو میرا شبہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

وہ اس اسپتال سے لاکھوں کما رہی تھی پیسہ کمانے کے چکر میں اس کے نزدیک جائز اور ناجائز کی کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے جس الزام کے تحت پولیس اسپتال پہنچی تھی وہ کام بھی وہ بہت عرصے سے کر رہی تھی اور اس میں وہ اس حد تک

آگے جا چکی تھی کہ اس کے اسپتال کا نام شہر کے محفوظ ترین اسپتالوں کی فہرست میں شامل تھا جہاں ''رازداری'' کے ساتھ وہ سب کچھ ہوتا تھا جس کی عام طور پر ممانعت تھی۔

جب سے نورین نے یہ کام شروع کیا تھا اس کے تعلقات بھی بہت تیزی سے آگے بڑھے اور اس کا احساس اسے خود بھی تھا۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ ''مجھے اندازہ تو تھا کہ ہمارے اوپر کے طبقے میں یہ برائی پائی جاتی ہے لیکن یہ اس حد تک بڑھ چکی ہوگی اس کا مجھے یقین نہیں تھا۔''

نورین سے گفتگو کر کے میں فارغ ہوا ہی تھا کہ چائے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے اور چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''بڑے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہ کچھ بتانا شروع کر دیا جو ہمارے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

جب تک میں کہتا رہا وہ اتنے اطمینان سے سنتی رہی جیسے اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو لیکن میرے خاموش ہوتے ہی وہ بول پڑی۔

''کاش میں کچھ دن یہاں رک سکتی تو میں تمہاری پرابلم حل کر کے ہی جاتی لیکن اب تم ایسا کرو کہ مونا کو کھانے پر بلا لو۔'' اس نے دو مختلف چیزوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔

''مونا کا اس سے کیا تعلق؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''میں اسی کو سمجھاؤں گی کہ اب تم نے کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔'' اس کا جواب تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ سکا لیکن میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔

اس نے ڈنر کے لیے سمندر کے کنارے کا انتخاب کیا تھا اور کیوں کیا تھا اس کا ادراک وہاں پہنچنے کے بعد ہوا جب وہ دونوں تعارف کے کچھ دیر بعد ٹہلنے چلی گئیں اور واپسی پر یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے صدیوں کی جان پہچان ہو۔

کھانے کے دوران بھی ان دونوں کی توجہ مجھ پر کم ہی رہی لیکن مونا کو رخصت کر کے جیسے ہم گھر کی جانب روانہ ہوئے تبسم نے مونا کے بارے میں ایک سخت فقرہ کہا۔ ''اس لڑکی پر بہت زیادہ بھروسا کبھی نہ کرنا یہ تمہیں ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے اور بس۔''

''..... ملنے سے پہلے آپ کی رائے کچھ اور تھی۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''غلط رائے رکھنے سے بہتر ہے کہ رائے تبدیل کر لی جائے۔'' اس نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔

''وہ اپنے حالات بدلنا چاہتی ہے لیکن مجھے توقع نہیں

''اس نیکر میں تم ایسے لگ رہے ہو جیسے ایک لیٹر کی بوتل میں دو لیٹر کوکنگ آئل ڈال دیا گیا ہو۔''

کہ ایک سیڑھی اوپر چڑھنے کے بعد اس کی مزید اوپر جانے کی خواہش ختم ہو جائے گی۔'' میرے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے جواب دے دیا تھا۔

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ اسے بھی رخصت کر دیا جائے؟'' میں نے کہا اور اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔ ''اپنے خواب کو سچ کرنے کے لیے وہ کسی بھی قوت سے ٹکرا سکتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کی گفتگو میں تضاد نہیں ہے؟'' میرا لہجہ ایک بار پھر طنزیہ ہو گیا۔

''تم اسے سطحی نظروں سے دیکھ رہے ہو اس لیے تمہیں اس میں تضاد نظر آ رہا ہے جب کہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تمہارے لیے موجودہ حالت میں اس سے بہتر لڑکی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس لڑائی میں اس کی ذاتی انا بھی شامل ہے۔'' اس نے پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

''کیسی لڑائی؟'' میں خاموش نہ رہ سکا۔

''جو تمہاری اپنی بیوی کے ساتھ شروع ہوگی اس وقت جب تمہیں رپورٹیں ملیں گی۔'' اس کا جواب تھا۔

''اور رپورٹیں ویسی نہیں ہوئیں جیسے کہ آپ توقع کر رہی ہیں تو؟'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''کاش میں بتا سکتی کہ میں اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہی ہوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''آپ کی گفتگو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' میں نے کار کو پارکنگ میں لگاتے ہوئے کہا جس کا جواب اس نے اپنی ایک اور ہنسی کے ذریعے دیا تھا۔

فلیٹ پہنچنے تک ہمارے درمیان کوئی اور گفتگو نہیں ہوئی لیکن بیڈ روم کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے وہ اچانک رک گئی

''مونا کے آگے بھی تم اسی طرح بچھ گئے جس طرح نورین کے آگے بچھے ہو تو وہ تمہارا حشر اس سے بھی زیادہ برا کرے گی۔'' اس نے کہا اور میں اسے صرف دیکھتا رہا۔

''اپنا رویہ اسی طرح کا رکھنا جس طرح کا اس وقت ہے خاص طور پر باپ بننے کے بعد۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

وہ رات بھی ایک رات پہلے سے کچھ مختلف نہیں تھی لیکن صبح اس طرح مختلف تھی کہ اس نے مجھے سویرے جب اٹھایا تو باہر جانے کے لیے پوری طرح سے تیار تھی۔

''سرہانے چائے رکھی ہے میں کار لے جا رہی ہوں۔'' اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

''لیکن جا کہاں رہی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ کام ہیں انہیں کرتے ہوئے اور ٹکٹ کنفرم کر کے آ جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر کی جانب چل دی۔

وہ جب بول رہی تھی اس وقت میں نیند کے غلبے کی وجہ سے سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن جب وہ چلی گئی اور میں کسی حد تک اس غلبے سے باہر نکلا تب میں نے گھڑی کی جانب نظر کی۔

''اتنے سویرے یہ کہاں چلی گئی؟'' میں نے گھڑی میں دیکھنے کے بعد سوچا تھا جو آٹھ بجے سے آگے نکل چکی تھی۔

نیند ایک بار پھر مجھے اپنی جانب بلا رہی تھی لیکن رات اس نے جو کچھ مونا کے بارے میں کہا تھا وہ یاد آیا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

چائے پینے کے دوران اور اس کے بعد بھی میں اسی میں الجھا رہا۔ تنہائی میں جتنا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا اتنا ہی مجھے اس کی باتوں میں وزن محسوس ہوا۔ پھر یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب دروازے کی گھنٹی نے کسی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

دروازے پر وہی تھی جسے میں ایک روز پہلے رخصت کر چکا تھا۔ میں نے اسے آنے کا راستہ دیا تو وہ آتے ہی ہمیشہ کی طرح کچن کی جانب چلی گئی۔

''اچھا ہوا کہ وہ اس کی آمد سے پہلے ہی نکل گئی۔'' میں نے سوچا تھا۔

''مسلسل انکار سے وہ شک میں مبتلا بھی ہو سکتی تھی۔'' میں نے اسے کچن کی جانب بڑھتا دیکھ کر سوچا اور خود بیڈروم میں آ گیا لیکن بیڈروم میں آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ وہاں پہنچ گئی۔

''میں جاؤں صاحب جی کام تو پہلے ہی کوئی کر گیا ہے۔'' اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''میں رات دیر سے گھر آیا تھا۔'' میں نے بہانہ تراشنے کی کوشش کی۔

''بستر کی حالت تو یہ نہیں بتا رہی ہے صاحب۔'' اس کی معنی خیز مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

''تم اپنے کام سے مطلب رکھو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا لیکن اس کی مسکراہٹ پر کوئی فرق نہیں پڑا وہ اسی طرح مسکراتی رہی۔

''آپ کہیں تو چادر بدل دوں۔'' اس نے آفر کی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں اسے بیڈروم میں چھوڑ کر باہر نکل آیا... لیکن اچانک ہی ذہنی دباؤ میں آ گیا۔

''آخر دو دن سے صرف بیٹی کیوں کام پر آ رہی ہے جب کہ اس سے پہلے ماں بیٹی دونوں آتی تھیں۔'' میں نے اسی ذہنی دباؤ کے تحت سوچا۔

میں بیڈروم میں واپس آیا تو وہ مجھے دیکھ کر ایک بار پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''کبھی ذہن میں یہ خیال بھی نہ لانا صاحب جی کہ مجھ سے کوئی بات بیگم صاحبہ تک جائے گی۔'' اس نے میری جانب سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی شبنم کا بیگ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا۔

''ہم لوگوں کو بہت سے گھروں کی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ سب ہمارے سینوں میں دفن رہتی ہیں۔'' اس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اس کے مزید کچھ نہ کہنے پر کہا۔

''جب چاہیں جس طرح چاہیں آزما لیجیے گا۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''پہلی آزمائش تو شروع ہو چکی ہے دوسری آزمائش کا موقع آیا تب بھی دیکھ لیں گے کہ اس میں کتنا پورا اترتی ہو۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہہ نہیں پا رہی ہو۔

''چائے بناؤں صاحب جی!'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا اور میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''میں باتھ لے لوں پھر بنا لینا۔'' میں نے کہا اور اس نے یوں گردن ہلائی جیسے میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔

میں باتھ روم سے نکلا تو جیسے وہ میرے انتظار میں تھی۔ میں ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ آ گئی۔ ''صاحب جی! آپ کو چائے دے کر میں جاؤں۔ ماں کو اسپتال بھی لے جانا ہے۔'' اس نے کہا اور میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

''وہ چائے لے کر آئی تو میں نے ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دینا۔'' میں نے کہا اور اس نے نوٹ پر یوں قبضہ کیا جیسے وہ اس کا حق ہو۔

مجھے یقین تھا کہ آئندہ کسی مرحلے پر دوسری آزمائش کی امید اور اسی نوٹ کی مہربانی سے وہ نورین سے کچھ نہیں کہے گی۔

میں نے پہلے تو کچھ دیر انتظار کیا لیکن پھر میں نے ارادہ کیا کہ اپنا ناشتا خود ہی بنا لوں لیکن پھر بغیر کسی وجہ کے ہی میں کچن کی جانب نہیں گیا حالانکہ وہ میرے لیے کوئی نئی بات نہ ہوتی۔

وہ واپس آئی تو خوش دکھائی دی تھی اور اس خوشی کا اظہار اس نے آتے ہی گلے میں بانہیں ڈال کر کیا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم نے میرے بغیر ناشتا نہیں کیا ہو گا۔'' اس نے کہا۔

''میں سمجھا تھا کہ تم آتے ہوئے کچھ لاؤ گی۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''سوچا تو میں نے بھی تھا لیکن پھر سوچا کہ اپنے ہاتھ کا آخری ناشتا کروا دوں۔'' اس نے کہا اور مجھے کچن میں آنے کا کہہ کر خود آگے بڑھ گئی... جیسے اسے یقین ہو کہ میں اس کی بات مانوں گا۔

''تم اپنی تسلی ضرور کرنا لیکن میں یہ کنفرم کر آئی ہوں کہ تمہاری رپورٹ تبدیل کی گئی ہے۔'' مجھے کچن میں آتا دیکھ کر اس نے کہا اور میں بری طرح چونکا۔

''کس طرح معلوم کیا آپ نے؟'' میں نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''کس طرح کیا؟ کیسے کیا؟ یہ سوال مت کرو کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ اپنی تسلی ضرور کرنا۔'' اس نے میری جانب نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔

''لیکن.....'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا جو میں کہنا چاہ رہا تھا۔

''لیکن یہ کہ تمہاری بیوی نے اپنی کمی تم پر تھوپ کر تمہیں اپنے زیرِ احسان کیا کہ تم کچھ اور سوچ ہی نہ سکو۔'' اس نے کہا اور میرا جی چاہا کہ اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ پر یقین کر لوں۔

''مونا آپ کے ساتھ تھی؟'' میں نے اپنے خیال کی جو اچانک ہی ذہن میں آیا تھا تصدیق چاہی اور اس نے تصدیق کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

''میں نے تو صرف اسے رشوت دی تھی جسے مونا نے ڈھونڈا تھا۔'' اس نے کہا۔

''اس زبردست خبر سے آپ حاصل کیا کرنا چاہتی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اپنی طرح کا ایک اور شکار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'' اس نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔

''آج رات.... تین بجے میری فلائٹ ہے۔'' اس نے اچانک موضوع تبدیل کیا۔

''اس کے لیے ایک بجے آپ کو ائرپورٹ پہنچنا ہو گا؟'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' اس نے میری جانب رخ کیے بغیر کہا۔

''اور ایک بجے پہنچنے کے لیے بارہ بجے گھر سے نکلنا ہو گا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے اپنا کام کرتے ہوئے کہا۔

''اور بارہ بجے سے لیے گیارہ بجے سے تیاری کرنا بھی ضروری ہے؟'' میں نے کہا اور اس بار وہ کوئی سوال کیے بغیر صرف سوالیہ نظروں سے ہی دیکھتی رہی۔

''وقت بہت کم ہے اور آپ ان بیکار کاموں میں.....'' میں نے اپنی خوشی کا براہ راست اظہار کیے بغیر اسے قریب کرنا چاہا اور اس نے مجھے ہنستے ہوئے دور ہٹا دیا۔

''وقت اس سے بھی کم یوں ہے کہ شام میں مجھے مکان کے سلسلے میں بھی جانا ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن پیٹ پوجا بھی ضروری ہے۔'' اس نے ایک خاص انداز سے مجھے پیچھے دھکیل دیا لیکن اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ ناراض نہیں ہے۔

وہ زبان سے کچھ اور کہہ رہی تھی لیکن جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ چاہتی نہیں تھی اور میں نے وہ کیا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ بظاہر انکار ہی کرتی رہی لیکن پھر اس نے ہتھیار ڈال ہی دیے۔

''اچھا..... چولھا تو بند کرنے دو۔'' اس نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

چولھا بجھ گیا اور آگ بھڑک گئی پھر یہ آگ بار بار

بھڑکتی رہی اور بجھتی رہی۔

''مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔'' اس نے کہا اور دور ہوتی چلی گئی اور پھر وہ کمرے سے ہی چلی گئی اور میں اپنی سوچ میں ڈوب گیا۔

یہ احساس کہ میں باپ بن سکتا ہوں میرے جسم میں ایک نئی توانائیاں پیدا کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے نورین پر غصہ بھی آ رہا تھا اتنا شدید کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے قتل کر دوں یہ فیصلہ تو میں کر چکا تھا کہ میں شادی کروں گا لیکن نورین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

وہ دوبارہ آئی تو آتے ہی اس نے کھانے کی دعوت دی اور میں جو اپنی سوچ میں گم تھا مجھے وہ ایک اچھے مشیر کی طرح دکھائی دی تھی۔

میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا تو وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

''میں نہیں جانتی کہ تمہاری بیوی نے اپنے پہلے شوہر کے بارے میں کیا بتایا ہے لیکن میں آج اس سے بھی ملی ہوں وہ ایک آرٹسٹ ہے۔'' اس نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ اس سے کیونکر ملیں؟'' میں نے سوال کیا' وہ مسکرا دی۔

''نورین شہر میں اتنی غیر معروف تو نہیں کہ اگر کوئی اس کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہے تو اسے زیادہ محنت کرنی پڑے تم نے چونکہ اس کی ہر بات پر یقین کر لیا تھا اس لیے تم نے بھی کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ مجھے بھی ملوا سکتی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ملوا تو سکتی ہوں لیکن تم سے وہ شاید اس موضوع پر کوئی بات نہ کرے کیونکہ وہ تمہیں جانتا ہے'' اس نے جواب میں کہا تھا — اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی تھی جسے میں اس وقت نوٹ نہیں کر سکا تھا۔

''وہ مجھے کس طرح جان سکتا ہے۔'' میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

''وہ تو یہ بھی جانتا ہے کہ تمہارے ڈرائنگ روم میں اب بھی اس کی تصویر موجود ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا۔

''یہ جھونپڑی والی تصویر؟'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''نورین نے کبھی ذکر نہیں کیا؟'' میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

''یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے اپنے پہلے شوہر کا بہت کم ذکر کیا ہوگا اور جو بھی کیا ہوگا وہ غلط کیا ہوگا۔'' اس نے جواب میں کہا اور میں صرف جز بز ہو کر رہ گیا۔

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا اور وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سو فیصد صحیح تھا۔ میں نے واقعتاً اپنی لگام پوری طرح سے نورین کے ہاتھ میں دے رکھی تھی وہ جس طرح کہتی تھی میں اسی طرح کرتا تھا۔ اسے پزا اور برگر پسند تھے تو میں نے بھی انہیں اپنی پسند بنا لیا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے مغربی لباس میں مرد اچھے لگتے ہیں تو میں نے سوٹ کے ساتھ ہیٹ پہننا شروع کر دیا۔ میں وہ سب کچھ اس لیے کر رہا تھا کہ میں نے اس کی اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ وہ میرے لیے اتنی بڑی قربانی دے رہی ہے لیکن اب یہ راز کھل رہا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہی تھی وہ ایک ڈرامے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''آپ نے اس کے پہلے شوہر کو کیسا پایا؟'' میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ سوال کیا تھا۔

''ویسا ہی جیسے کہ یہ آرٹسٹ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اپنے حال میں مست رہنے والے جنہیں نہ کپڑوں کی فکر ہوتی ہے نہ بکھرے ہوئے بالوں کی وہ پروا کرتے ہیں۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تو یہ کہہ کر چلی گئی لیکن اس مختصر سے فقرے نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ نورین اپنی تمام تر وہ خواہشیں جو پہلے حاصل نہیں کر سکی تھی وہ مجھے معاشی اور جذباتی طور پر زیر احسان کر کے خود کو تسکین دے رہی تھی۔

گھر سے ہم شام کو نکلے اور پھر مصروف ہی رہے پہلے وہ اپنے کاموں سے فارغ ہوئی اور پھر مونا کو کال کر کے اس نے بلا لیا اور رات کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا پھر مونا میرے منع کرنے کے باوجود اسے ائرپورٹ چھوڑنے بھی گئی۔

جب تک ہم تینوں ساتھ تھے مونا کا رویہ مختلف تھا لیکن جیسے ہی ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا مونا کا رویہ بدل گیا۔

''یہ ایک انتہائی موقع پرست عورت ہے اس سے آپ جتنا بچ سکتے ہیں بچیں۔'' مونا نے کہا اور میں حیرت سے اسے

دیکھتا رہا۔

''تم اس کے کہنے پر ہر کام کرتی رہی ہو اور اب یہ کہہ رہی ہو؟'' میں نے اعتراض کیا اور وہ مسکرانے لگی۔

''میں اسے سمجھنا چاہ رہی تھی اور اس حد تک میں نے ساتھ دیا جہاں تک میں نے سمجھا کہ وہ آپ کے خلاف نہیں جائے گا۔'' مونا کا جواب تھا۔

''وہ میرے خلاف کوئی بھی کام کیوں کریں گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیوں کا جواب تو میں نہیں دے سکتی لیکن اگر میں اس کو کہا مانوں اور نورین کو آپ کی وہ رپورٹ پہنچا دوں جو نورین کی رپورٹ کو رد کرتی ہو تو کیا یہ آپ کے مفاد میں ہو گا؟'' مونا نے سوال کیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔

''مجھ سے تو انہوں نے کہا تھا کہ تم سے شادی کرنے کے بعد جب تک ہو سکے اس شادی کو چھپاؤں؟'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''جب کہ مجھ سے انہوں نے اس کے برعکس یہ کہا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر نورین تک اپنی شادی کی خبر پہنچا دوں۔'' مونا کا جواب تھا۔

مونا کو ڈراپ کرنے اور گھر واپسی کے بعد بھی میں اسی بات پر غور کرتا رہا لیکن اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

جب تک وہ ساتھ تھی یہ سوال بھی ذہن میں نہیں آیا لیکن اس کے جانے کے بعد دیگر سوالوں کے ساتھ یہ سوال بھی ذہن میں آیا کہ آخر کس سے اس نے میرے نمبر حاصل کیے اور اسے مجھ سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس وقت تو اس کے جواب نہ مل سکے لیکن نورین کے آنے کے بعد اس کے جواب مل گئے اور اس وقت' ملے جب میں کچھ کر گزرنے کے موڈ میں تھا۔

نورین کی واپسی کے بعد میری اس سے نفرت میں کمی نہ ہو رہا تھا۔ میں جب بھی اس کی جانب نظر اٹھاتا تو نفرت کی ایک لہر سی میرے دل میں اتر جاتی تھی۔ اس رات نورین نے باہر کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں اس کے مطابق لباس میں تیار بھی ہو گیا تھا نورین اپنی تیاریوں کو فائنل ٹچ دے رہی تھی کہ میرے دل میں آئی کہ ''اس ناگن کو ختم ہو جانا چاہیے۔''

میں کھانے کی میز سے چھری اٹھا بھی لایا تھا کہ نورین نے میری جانب رخ کیے بغیر کہا۔ ''شان آپ کی ایک پرانی دوست مجھے دبئی میں ملی تھی۔''

نورین نے آئینے میں میرا عکس دیکھ کر کہا اور میرے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

اس نے مجھ سے آپ کا نمبر بھی لیا تھا کہ اس ہفتے وہ پاکستان آئے گی تو رابطہ کرے گی۔'' نورین میرے ارادوں سے بے خبر اپنی بات کہہ رہی تھی۔

''کون؟'' میں نے سوال کیا۔

''تبسم نام بتایا تھا اس نے۔'' نورین نے کہا۔ ''اور میرے سر سے جیسے بوجھ اتر گیا۔

''وہ اپنی بیٹی اور شوہر کے ساتھ چھ برس سے دبئی میں تھی لیکن وہ بتا رہی تھی کہ اس کے شوہر کینیڈا میں سیٹل ہو رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

''تبسم کی بیٹی؟'' میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں شاہینہ نام تھا اس کا یہی کوئی گیارہ برس کی ہو گی۔'' نورین نے جواب دیا اور میرے قدم جیسے ڈگمگانے لگے۔

''وہاں کسی نے اس سے کہا بھی کہ ایک کے بعد اسٹاپ کیوں کر دیا تو اس کا جواب تھا کہ کوشش تو کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔'' نورین نے میری جانب رخ کر کے کہا اور اس کے ساتھ ہنسنے لگی۔

پھر میری جانب اشارہ کر کے کہا ''اب ڈاکٹر صاحب کا تعارف ہوا ہے تو یقیناً ان کے تعاون سے کامیابی ہو جائے گی۔'' نورین نے مسکراتے ہوئے کہا اور بات پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔

نورین ایک بار آئینے کی جانب مڑی اور میں نے اپنے پرانے فیصلے تبدیل کیے اور وہ فیصلہ کیا جس پر اگلے ہی روز عمل بھی کر دیا اگرچہ مونا کو اس پر حیرت بھی تھی کیونکہ میں پہلے کہہ چکا تھا کہ ''ہم رپورٹ آنے کے بعد شادی کریں گے۔''

تین برس سے میں اور مونا اپنے راز کو چھپائے ہوئے ہیں ہمارا بیٹا بھی اب دو برس کا ہو چکا ہے۔ اس کی پیدائش کے روز ہی مجھے کینیڈا سے ایک مختصر خط آیا تھا۔

''میری فیملی مکمل ہو گئی۔ سولہ روز پہلے میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہوں۔ تبسم''

خط پر کوئی پتا نہیں تھا اور ہوتا بھی تب بھی میں جواب نہیں دیتا لیکن کبھی کبھی یہ خواہش دل میں ضرور ابھرتی ہے کہ تبسم سے ایک بار اور مل سکوں کسی اور مقصد کے لیے نہیں بلکہ دوبارہ بے وقوف بننے پر اسے دو تھپڑ مار سکوں۔

* *

دوسرا رنگ

حفظِ ماتقدم

کاشف زبیر

محبت ایک ایسا جذبۂ مسافت ہے ..... جو اپنی راہ پہ گامزن مسافروں کو بھٹکنے نہیں دیتا ..... بکھرنے نہیں دیتا ..... خارزارِ حیات میں کتنے ہی دھوپ چھاؤں کے موسموں سے ٹکراؤ ہو ..... راستے میں محبت کے ستارے جھلملاتے رہتے ہیں ..... ان ستاروں کی مدھم روشنی ہی محبت کرنے والوں کو منزل کی طرف بڑھنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی ..... ایک نوجوان آنکھوں میں خواب سجائے بیٹھا تھا ..... اور اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے اسے کٹھن مراحل درپیش تھے۔

کاشف زبیر کے مخصوص انداز میں لکھی گئی ایک تیز رفتار شوخ و شنگ شگفتہ تحریر

شامی کے چہرے پر بارہ بجتے دیکھ کر تیمور کو احساس ہوا کہ کوئی بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ ویسے توبہ توبہ تیمور شامی کے چہرے پر اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہمہ وقت بارہ بجے رہتے تھے لیکن اس وقت یہ بارہ اتنی شدت سے بجے تھے کہ الگ سے نظر آرہے تھے۔ تیمور نے نہ چاہنے کے باوجود پوچھ لیا ''کیا ہوا میرے یار! تیرے چہرے کے ڈائل پر گھڑی کی سوئی ہمیشہ ایک ہی نظر آتی ہے؟''

''ہوا نہیں ہے' ہوگا۔'' شامی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''مثلاً انتقال بے ملال..... لیکن یہ نیک کام کس کے ہاتھوں انجام پائے گا؟''

''ظاہر ہے' ایک ہی ہیں'' شامی بھنا کر بولا ''دادا حضور وقار الملک المعروف ملک الموت۔''

''دیکھ شامی! یاری اپنی جگہ لیکن دادا حضور کی شان میں گستاخی.....''

''سوری یار! بات ہی اتنی سنگین ہے کہ اس بار میری وفات یقینی سمجھ۔''

''انشاء اللہ ..... میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو.....'' تیمور روانی میں بک گیا تھا۔ ''اب ایسی کیا بات ہوگئی' کیا وہ کالج والے چکر سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس میں ایک لڑکی نے سرِعام تیری چپلوں سے تاج پوشی کی تھی اور بدقسمتی سے دادا حضور نے بہ قلم خود ملاحظہ فرمالیا تھا اور باقی کسر.....''

''خاندانی تاریخ کے ناگفتہ بہ حالات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شامی کراہا ''اور کچھ کر ورنہ اس سے بھی زیادہ دردناک باب ہمارے خاندان کی تاریخ میں شامل ہوجائے گا۔ تو' تو لندن بھاگ جائے گا۔''

''کیوں..... میں کیوں بھاگوں گا..... میں نے کیا' کیا ہے؟''

''تو نے گیہوں کے ساتھ گھن پسنے والی مثال سنی ہے' اب اس کا عملی تجربہ بھی ہوجائے گا۔''

''اس کا مجھے بہ خوبی تجربہ ہے۔ اس وقت کو کوستا ہوں جب مما پاپا نے مجھے لندن سے ڈی پورٹ کرکے پاکستان دادا حضور کی کسٹڈی میں بھیجا تھا۔ جیسے آج کل امریکا والے پاکستانیوں کو ڈی پورٹ کرکے پاکستان بھیجتے ہیں تو ایف آئی اے انہیں اپنی کسٹڈی میں لے لیتی ہے۔''

شامی نے اس کی تائید کی ''ایف آئی اے والے ان لاوارثوں سے اتنا برا سلوک نہیں کرتے ہیں۔''

''خیر' یہ تو ایک لمبا مرثیہ ہے جو جاری رہے گا' یہ بتا کہ تیری وفات میں کون کون سے اسباب شامل ہوں گے۔''

''مجھے اتنی گاڑھی اردو نہیں آتی اس لیے سلیس زبان میں ایک سبب بیان کرتا ہوں..... وہ حسینہ جس کے ساتھ پچھلے سے پچھلے اتوار ہم نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ یعنی کھانے پینے کا بل جس کے سر ڈال کر بھاگ آئے تھے۔''

''خوب تھی وہ حسینہ' ہم نے چند سو کے بل کی خاطر ایک اچھی کمپنی کا موقع گنوادیا اور بلاشبہ وہ تیری کمپنی تھی' اس پر تو لائقِ گردن زدنی ہے..... مگر یہ بتا' وہ حسینہ تیری وفات کا سبب کس طرح بنے گی؟''

''کیونکہ وہ حسینہ مع اپنے ابا حضور کے' سامنے والے بنگلے میں بغرض رہائش تشریف لاچکی ہے اور مبینہ طور پر اس کے ابا حضور ایف آئی اے یا کسی ایسی خفیہ ایجنسی میں افسرِ اعلیٰ ہیں۔''

تیمور کو چکر سا آگیا۔ پچھلے سے پچھلے اتوار کو دادا جان کی عزیز از جان رولس رائس چرا کر وہ تفریح کرنے راول جھیل کی طرف گئے تھے۔ وہاں کچھ شامی کے ذمے تھا۔ جب انہوں نے ڈٹ کر سب کھا پی لیا تو شامی نے اسے اشارے سے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف متوجہ کیا۔ ''کیا خیال ہے' بل اس سے دادا کروایا جائے؟''

بلوری گہری نیلی آنکھیں' گداز لب' ستواں ناک اور کانوں میں سرمئی موتی والے ٹاپس کے ساتھ تیمور کو اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی کہ وہ ان کا بل ادا کرنے پر آمادہ ہوجاتی۔ تیمور نے لڑکی کے متعلق اپنے تجزیے سے شامی کو آگاہ کیا۔ اس نے کہا ''تو اس کی فکر نہ کر' بس میرے کہنے پر عمل کرنا..... باقی کام میرا ہے'' شامی نے اسے جو لائحہ عمل بتایا' تیمور نے اسے فوری طور پر مسترد کردیا تھا۔

''ایسا کر' جو تو مجھے کرنے کو کہہ رہا ہے وہ خود کرلے اور مجھے اپنے حصے کا کام دے دے۔''

''کام بدلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کی فلم میں قدرت نے خاکسار کا انتخاب ولن کے طور پر کیا ہے۔ اگرچہ اب فلموں میں ایسے ہیرو بھی آنے لگے ہیں جن پر پوری فلم کے دوران میں ولن کا شبہ رہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے میرا انجام بھی اکثر وہی ہوتا ہے جو فلم کے آخر میں ولن کا ہوتا ہے۔ جبکہ تجھے تقدیر نے پیدائشی ہیرو بنایا ہے۔ صنفِ نازک تیری بات ذرا توجہ سے سنتی ہے اور تیری کسی بات کا اتنا برا نہیں مناتی جتنا کہ اسے منانا چاہیے۔''

''تو یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ وہ تیری نسبت میری مداخلت کا

کم برا منائے گی؟''

''اب یہ تیری لیاقت پر ہے' ممکن ہے وہ سرے سے برا ہی نہ منائے..... لیکن تجھے یہ سوچ کر جانا ہے کہ وہ ضرور منائے گی اور تجھے اس کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کے باوجود میز پر کم سے کم ایک منٹ کے لیے ضرور تشریف رکھنی ہے۔ چاہے کتنی بے عزتی ہو جائے..... وہ کیا کہتے ہیں پیسہ اور عزت تو آنی جانی شے ہے۔ آدمی کو ڈھیٹ ہونا چاہیے۔''

''میں کسی لڑکی کے ہاتھوں بے عزتی بالکل برداشت نہیں کر سکتا'' تیمور نے صاف انکار کر دیا۔

''تب بل ادا کرنے کے لیے تیار ہو جا' مبلغ آٹھ سو بتیس روپے۔ اس میں سے خاکسار صرف پچاس روپے ڈالنے کی پوزیشن میں ہے۔''

''خبیث..... مردود!'' تیمور غرایا ''اور وہ جو میں نے دادا جان کی اس ہاتھی نما گاڑی میں اپنی جیب سے دو گیلن پیٹرول ڈلوایا ہے؟''

''تو پھر بھی فائدے میں رہا۔ یہ ہاتھی واپسی تک چار گیلن صاف کر چکا ہوگا۔ بہر حال مجھے ابھی ابھی یاد آیا' مجھے دادا حضور سے خاصی منت سماجت کے بعد ہزار کا جو نوٹ ملا تھا' وہ فولاد خان اپنے قرض کے سلسلے میں وصول کر چکا ہے۔ ویسے یار' اس کا قرض مجھ پر کبھی ختم ہوگا بھی یا نہیں؟''

فولاد خان ان کی کوٹھی کا چوکیدار اور بینکار تھا۔ تمام ملازمین بہ وقتِ ضرورت اس سے قرض لیا کرتے تھے۔ بعد میں ان میں شامی اور تیمور بھی شامل ہو گئے تھے۔ ملازمین میں نہیں' فولاد خان کے قرض دہندگان میں۔ وہ کمال مہربانی سے ان سے صرف بیس فیصد ماہانہ سود لیا کرتا تھا جبکہ دوسروں کے لیے یہ ریٹ تیس فی صد ماہانہ تھا۔

''غالباً کبھی نہیں'' تیمور رضا نے نفی میں سر ہلایا ''ایک تو یہ کہ فولاد خان سود کے حساب کتاب میں کسی یہودی سے کم نہیں ہے' دوسرے تجھے قرض لینے سے اتنی رغبت ہے جتنی کہ ہماری حکومت کو۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' شامی بھنا کر بولا۔

''الحمدللہ' میرے ذمے صرف بارہ سو روپے رہ گئے ہیں جو میں اگلے ہفتے پاپا کی طرف سے ڈرافٹ آتے ہی اتار دوں گا'' تیمور بولا ''اپنے بارے میں سوچ..... جتنا واپس نہیں کرتا ہے' اس سے زیادہ لے لیتا ہے۔ امکان یہی ہے کہ جب دادا جان کی وراثت میں سے کچھ تیرے حصے میں آیا بھی..... تو وہ فوراً فولاد خان کے پاس چلا جائے گا۔''

''امکان یہی ہے'' شامی نے اس سے اتفاق کیا ''مگر مسئلہ اس وقت کا ہے..... اگر تو میرے کہنے پر عمل نہیں کر رہا اور نہ ہی بل ادا کرنے کے لیے تیار ہے تو بہتر ہے ہوٹل میں برتن مانجھنے کے لیے تیار ہو جا۔''

''یہ نیک کام بھی تو کر لے تو ٹھیک ہے..... میں جاتا ہوں'' تیمور کھڑا ہو گیا مگر اگلے ہی لمحے ہوا نکلے غبارے کی طرح بیٹھ گیا جب شامی نے اسے جیب سے کار کی چابی نکال کر دکھائی۔ تیمور نے دانت پیسے۔ ''شامی مردود..... لعنت ہو مجھ پر جو میں آئندہ کبھی تیرے ساتھ نکلا۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال ابھی کی بات کرو۔''

مرتا کیا نہ کرتا..... شامی کی شان میں دل ہی دل میں اور کچھ منہ زبانی گستاخیاں کرتا وہ راضی ہو گیا۔ شامی کھڑا ہوا۔ ''جیسے ہی میں اشارہ کروں لڑکی کے پاس پہنچ جانا۔''

''دفع ہو جاؤ'' تیمور غرایا۔

شامی اس ادپن ائر ریستوران کے ہیڈ بیرے کی طرف روانہ ہوا۔ جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچا' اس نے مڑ کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تیمور لپک کر لڑکی کی میز پر پہنچا اور کرسی گھسیٹ کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ ''السلام علیکم' کیسی ہو سونیا!''

''میں سونیا نہیں ہوں'' لڑکی نے متاثر ہوئے یا چوکے بغیر کہا ''یہ بہت گھٹیا طریقہ ہے۔''

''وہ تو ہے..... لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ بہ خدا' آپ کی نہ کسی سونیا سے بہت ملتی ہیں۔''

''اس سے پہلے کہ میں آپ کے بارے میں اظہارِ خیال کروں' یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں'' لڑکی کا لہجہ سرد تھا۔

''بسر و چشم..... یعنی آپ کا فرمایا سر آنکھوں پر'' تیمور نے باچھیں پھیلا کر کہا کیونکہ ہیڈ بیرا اسی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے شامی کی کسی بات پر سر بھی ہلایا تھا ''لیکن میں ایک بات آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں۔''

''..... پہلی بات تو یہ کہ مجھے آپ کی بات نہیں سننی ہے..... دوسرے مجھے لفظ گوش سے نفرت ہے؟''

''غالباً خرگوشوں کی وجہ سے..... اب دیکھیے نا..... اتنے سے جانور پر گدھے جیسے کان' کتنے برے لگتے ہیں؟''

''بعض گدھے کانوں کے بغیر بھی ہوتے ہیں'' لڑکی نے دانت پیسے۔ غالباً اس کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا ''اب آپ جاتے ہیں یا میں ویٹر کو بلاؤں؟''

''نہیں..... نہیں' میں کچھ نہیں لوں گا..... پیٹ بھر چکا ہوں۔ آپ کا شکریہ!'' تیمور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر

اس نے اطمینان محسوس کیا تھا کہ ہیڈ بیرا ایک نئے آنے والے جوڑے سے آرڈر لے رہا تھا۔ وہ باہر کی طرف چل دیا لیکن جب تک وہ کار کے پاس نہیں پہنچا' اس کا دل دھک دھک کرتا رہا تھا۔ شامی کے بچے نے مروا دیا تھا۔ اگر پکڑے جاتے تو کتنی بے عزتی ہوتی۔ اب نہ بھی پکڑے گئے تب بھی آئندہ وہ اس ریستوران میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ بات چھپی نہیں رہتی..... جب لڑکی کو ان دونوں کا بل بھی موصول ہوتا تو اس کا ہنگامہ کرنا عین قرینِ قیاس تھا۔ وہ آئندہ اس طرف کا رخ کرتے تو سیدھے تھانے جاتے۔ اس سے دادا جان کی عزت مٹی میں ملتی تو وہ خود انہیں مٹی میں ملا دیتے۔ شامی دس منٹ بعد آیا تھا جب تیمور کا پیمانہ صبر چھلکنے کو بے تاب تھا ''منحوس آدمی! اتنی دیر..... وہ لوگ بل لے کر لڑکی کے پاس پہنچ جاتے یا محض شبہ ہی ہو جاتا تو ہم دادا جان کی رولز رائس سمیت اسی جگہ دھر لیے جاتے۔''

''وہ میں سچ مچ باتھ روم چلا گیا تھا'' شامی نے دانت نکالے اور چابی تیمور کی طرف اچھال دی۔

''مفتاً اتنا ٹھونسنے کی کیا ضرورت تھی؟'' تیمور نے لپک کر چابی لی اور اتنی عجلت میں کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہوا کہ شامی کو بھی بہ مشکل اس میں سوار ہونے کا موقع ملا تھا۔

☆☆☆

وقار الملک جب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان وارد ہوئے تو بہ قول شامی کہ آتش جوان تھا۔ پیچھے وسیع و عریض جاگیر چھوڑ کر آئے تھے۔ اس کے بدلے انہیں گجرات میں اتنی ہی بڑی زمین اور حویلی مل گئی تھی مگر بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر انہوں نے راولپنڈی میں قیام کو ترجیح دی تھی۔ پہلی منکوحہ سے ان کے دو بیٹے تھے۔ شہریار جنگ اور اظہار الملک' دوسری شادی انہوں نے پاکستان آ کر کی کیونکہ پہلی نے ہندوستان میں داغِ مفارقت دی تھی اور روایت ہے کہ پلاؤ اور قورمے سے شکم سیری کے بعد تربوز کھانے سے ہیضے کے سبب راہیِ ملکِ عدم ہوئی تھیں مگر ان کی تصویر دیکھ کر شامی اور تیمور کی متفقہ رائے تھی کہ دادا جان انہیں جان بوجھ کر ہندوستان چھوڑ آئے تھے۔ دوسری شادی وقار الملک نے خود سے دس سالہ چھوٹی خاتون سے کی تھی جن سے ان کی ایک بیٹی شہر بانو تھیں۔ دس سال چھوٹی ہونے کے باوجود دوسری بیگم بھی ملک کی اوسط عمر یعنی صرف پچاس برس کی تھیں کہ چل بسیں اور بہ قول شامی کہ اس کے بعد دادا جان کو عورتوں پر ترس آنے لگا تھا۔ لہٰذا انہوں نے عقد بعد از ثانی نہیں فرمایا۔

دادا جان ہندوستان سے دادی جان کو تو نہیں البتہ ایک اور خاتون نفیسہ بیگم کو ضرور ساتھ لائے تھے۔ ان کے مطابق وہ ان کے بچوں کی گورنس تھیں اور انہیں صحیح ادب و آداب اور زبان سکھانے پر مامور تھیں۔ کیونکہ نفیسہ بیگم بھی شامی اور تیمور کے ہوش سنبھالنے سے پہلے گزر چکی تھیں۔ اس جہاں سے نہیں بلکہ آشیانۂ وقار سے۔ یہ رخصتی دوسری بیگم کی تحریکِ استحقاق کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی۔ ان کے مطابق نفیسہ بیگم کی موجودگی اور ان کی مشکوک حرکات کی بنا پر ان کا حقِ زوجگی مجروح ہو رہا تھا۔ دادا جان ہرگز نہ مانتے اگر دوسری بیگم ان کی زندگی کے ایوان سے واک آؤٹ کی دھمکی نہ دیتیں' بیگم کی بھی وقار الملک کو اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ اپنی اکلوتی بیٹی شہر بانو کی تھی۔ وہ ان کی چہیتی تھیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان میں وقار الملک کی جان تھی اور بیٹی سے جدا ہونا ان کے لیے ممکن نہیں تھا لہٰذا نفیسہ بیگم کو سامانِ رخصت باندھنا پڑا۔ بہر حال جانے سے پہلے وہ تینوں بچوں کی ادب و آداب اور زبان و بیان کی ایسی پرورش کر گئی تھیں کہ ان کے جانے کے تیس برس بعد بھی اس کا اثر آشیانۂ وقار کی تیسری نسل پر بھی گہرا تھا۔

شہریار جنگ گریجویشن کے بعد فارن سروس میں چلے گئے تھے۔ لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں سروس کا بڑا حصہ گزار کر ریٹائر ہوئے تو بیوی بچوں کے ساتھ وہیں رہائش اختیار کر لی۔ بعد میں برطانوی شہریت بھی حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں برطانیہ میں ایک سپر ڈیپارٹمنٹل اسٹور چلا رہے تھے' ان کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑا عمیر تھا' وہ پاکستان میں پیدا ہوا لیکن اس کی ساری تعلیم لندن کی تھی۔ وہ باپ کے ساتھ اسٹور میں کام کرتا تھا۔ اس سے چھوٹا اشعر انجینئر تھا۔ اس کے بعد میمونہ تھی' جو بیاہ کر لندن سے گلاسکو چلی گئی تھی۔ سب سے آخر میں تیمور رضا تھا' جسے دادا جان پاکستان لے آئے تھے۔ بہ قول شامی کہ تیمور کے لچھن بچپن سے اتنے خراب تھے کہ دادا جان احتیاطاً اسے پاکستان ہی لے آئے تھے۔ اس پر تیمور نے بھنا کر شامی کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ اس کے لچھن پیدائش سے پہلے ہی اتنے خراب تھے کہ فرشتوں نے احتیاطاً اسے پاکستان میں اتارا تھا۔ یہ بات اس کے کرتوتوں سے بھی عیاں تھی۔

اظہار الملک ملک سے تو نہیں گئے تھے لیکن آشیانۂ وقار سے ضرور گئے تھے۔ انہیں بچپن سے دیہی زندگی اچھی لگتی تھی اس لیے شادی کے بعد وہ حویلی چلے گئے تھے۔ اتفاق سے ان کی بیگم بھی سکون پسند تھیں اور شاید اسی وجہ سے شامی کو دادا

جان کے پاس بھجوادیا تھا۔ اظہار الملک کا سب سے بڑا بیٹا اظہر آرمی میں تھا اور ان دنوں سیاچن گیا ہوا تھا۔ اس سے چھوٹی قرۃ العین تھی۔ اس کی شادی ایک جاگیردار خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد شامی تھا جو پانچ سال کی عمر سے دادا جان کے پاس تھا۔ اس سے چھوٹی نور النساء تھی جو ابھی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔

شہر بانو سب سے چھوٹی تھیں اور دادا جان کی لاڈلی بھی تھیں۔ ان کی شادی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی لیکن بیوہ ہونے میں انہوں نے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ شادی کے چار سال بعد ہی دو بچوں کے ہمراہ واپس باپ کی چوکھٹ پر آ بیٹھی تھیں۔ بڑا مبشر تھا اور بہ قول شامی کے پکا شر پسند تھا۔ حالانکہ ابھی صرف بارہ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی دس سالہ مہرین تھی۔ ذیشان عرف شامی اور تیمور کے خیال میں اس گھر میں اگر ان کی ہمدرد کوئی ہستی پائی جاتی تھی تو وہ مہرو تھی۔ دادا جان کے عتاب سے بے شمار بار وہ اسی کی وجہ سے بچے تھے۔

بائیس سالہ تیمور قائداعظم یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا اور اس کا چوتھا سمسٹر حال ہی میں ختم ہوا تھا' جب کہ شامی ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی سے پیٹرولیم انجینئرنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ مدت تو پوری ہو چکی تھی اور دادا جان نے اسے وارننگ دی تھی۔ اگر اس نے ایک سال کے اندر ڈگری حاصل نہ کی تو اسے اس کے باپ کے پاس بھجوادیا جائے گا۔ جنہیں زمینیں سنبھالنے کے لیے ایک منشی کی ضرورت تھی۔ حویلی جانے کا تصور ہی شامی کے لیے لرزہ خیز تھا۔ اس لیے کہ وہاں نہ تو لڑکیاں تھیں (جیسی شامی کو پسند تھیں) اور نہ ہی تفریح گاہیں تھیں۔ بے شک وہاں دادا جان بھی نہ ہوتے لیکن ان کے متبادل کے طور پر والد حضور تھے۔

شہر بانو مزاج میں والد پر گئی تھیں یعنی اکھڑ اور اپنی من مانی کرنے والی۔ شامی کی رائے تھی کہ ان کے شوہر نے ہمت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو بیوہ کرنا پسند کیا تھا ورنہ وہ دادا جان والی تاریخ بھی دہرا سکتے تھے۔ شامی کو اصل ملال تاریخ کے نہ دہرائے جانے کا تھا۔ جبکہ تیمور کو شک تھا کہ تاریخ نے خود کو دہرایا ہے لیکن الٹے انداز میں۔ ورنہ پھپا جی بالکل ٹھیک ٹھاک اور فٹ فاٹ تھے۔ بہر حال تاریخ ان دونوں کے نزدیک گڑے مردے اکھاڑنے کا نام تھا۔ اس لیے وہ صبر شکر سے شہر بانو کو برداشت کر رہے تھے۔

☆☆☆

تیمور دوربین سے دیکھ رہا تھا "یار لگتی تو وہی ہے۔"

"لگتی ہی نہیں..... سو فیصد وہی ہے" شامی نے اصرار کیا۔

"ممکن ہے یار! وہ ہمیں نہ پہچانے..... بعض لڑکیوں کی یادداشت بھی تو کمزور ہوتی ہے۔"

"مشکل ہے..... ہم نے اس کے ساتھ جو کیا ہے' اس کے بعد وہ ہمیں فراموش نہیں کر سکتی ہے" شامی نے انکار کیا۔

"تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ اس کا باپ کسی ایجنسی کا افسرِ اعلیٰ ہے؟"

"یہ بات اس کوٹھی کے چوکیدار نے فولاد خان کو بتائی تھی۔"

"اور اس نے تجھے بتا دی؟" تیمور نے متفکر ہو کر کہا "یہ فولاد خان پیٹ کا ہلکا ہے' مجھے شبہ ہے' ہماری بہت ساری سرگرمیوں کی رپورٹ یہی دادا جان تک پہنچاتا ہے۔ خاص طور سے آمد و رفت کے اوقات۔"

شامی نے نفی میں سر ہلایا "وہ ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے دادا جان ناراض ہوئے تو سب سے پہلے ہفتہ وار جیب خرچ بند ہوگا اور اس طرح اس کی رقم اسے نہیں ملے گی۔"

"شر پسند ہی رہ جاتا ہے پھر....." تیمور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ورنہ دادا جان کو بھلا کیا معلوم کہ ہم رات تین بجے آئے تھے کل۔"

"دادا جان کی فکر نہ کر۔ اس کی فکر کر....." شامی نے بھنا کر کہا "جس دن اس نے ہمارے رخِ روشن ملاحظہ کیے' اس سے اگلے دن میں گاؤں جاؤں گا اور تو شاید لندن....."

"تب تو اسے دیکھ لینا چاہیے" تیمور خوش ہو کر بولا۔

"بکواس نہ کر" شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا "روانگی سے پہلے دادا جان پاپوش مبارک سے جو عزت افزائی فرمائیں گے اس کی گونج گاؤں کی حویلی سے لے کر لندن میں تیرے والد حضور تک پہنچے گی۔"

"سبحان اللہ۔ کیا اردوئے معلیٰ ہے" تیمور نے جھوم کر کہا۔

"دوسرے تو بھول رہا ہے..... ابھی تیرے ایم بی اے میں ایک سال باقی ہے اور تو نے کوئی ایسی خراب کارکردگی بھی نہیں دکھائی ہے کہ دادا حضور اس وجہ سے تجھے تعلیم چھڑوا کر لندن بھیج دیں..... جبکہ میں فی الفور روانہ کر دیا جاؤں گا اور تو دادا اور پھپو صاحبہ کے ستم سہنے کے لیے اکیلا رہ جائے گا۔"

اس بات نے تیمور کو متفکر کر دیا۔ ان میں بے شک بلی کتے کی سی دوستی سہی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ لڑکی اپنی کوٹھی کے لان میں ایکسرسائز کر رہی تھی "یار! لڑکی اچھی ہے..... اسمارٹ قسم کی۔"

شامی نے اس سے دوربین چھین لی اور اس نے لڑکی کے شاعرانہ قسم کے اعضا پر تبصرہ شروع کیا تھا کہ شہر بانو اوپر آ گئیں۔ تیمور نے بوکھلا کر شامی کو خبردار کرنا چاہا "ابے بکواس بند کر....."

"کیوں بند کروں..... تو جو ایک گھنٹے سے اسے تاڑ رہا تھا..... میں نے ذرا سا دیکھ لیا....."

"پھپو جان.....!" شامی کی بکواس بند کرنے کے لیے تیمور کو راست قدم اٹھانا پڑا تھا "موسم بڑا خوش گوار ہے۔"

شامی نے بوکھلا کر دوربین نیچے کی "پھپو جان..... آپ.....؟"

"یہ کسے تاڑا جا رہا ہے؟" انہوں نے مشکوک نظروں سے ان دونوں کو دیکھا "کون سی لڑکی ہے؟"

"کوئی سی بھی نہیں پھپو جان!" تیمور نے بات سنبھالی "ہم کرنل صاحب کی نئی کار دیکھ رہے تھے۔"

"پچھلے ایک گھنٹے سے تم کار دیکھ رہے تھے؟" پھپو جان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"جی پھپو جان!" شامی نے اس کی تائید کی۔

"بہر حال..... اتنی دیر تک چھت پر چڑھے رہنا شریف لڑکوں کے لچھن نہیں ہوتے۔ خاص طور سے شام کے وقت۔"

"جی پھپو جان! یہی بات میں اسے سمجھا رہا تھا" تیمور نے سعادت مندی سے کہا۔

"سنا ہے..... سامنے نئے لوگ آئے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں' ان کے ہاں چکر لگالوں اور انہیں دعوت بھی دے آؤں..... آخر نئے آئے ہیں۔"

"جی پھپو جان!" شامی کا خون خشک ہو گیا "فولاد خان کو ان کا چوکیدار بتا رہا تھا کہ صاحب خانہ نہایت بد دماغ ہیں اور کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلا محلہ بھی انہوں نے اسی لیے چھوڑا تھا کہ وہاں لوگ ان سے زیادہ ملنے آتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ ملاقاتیوں پر کتے بھی چھوڑ دیتے تھے" مستقبل میں ممکنہ ملاقات کے امکان کو ختم کرنے کے لیے شامی بلا تکان اور بلا سوچے جھوٹ بول رہا تھا۔

"کتے....." شہر بانو ڈر گئیں "بڑا بدتمیز آدمی ہے؟"

تیمور جانتا تھا' شہر بانو کتوں سے ڈرتی تھیں۔ وقار الملک کتوں کے شوقین تھے۔ ہندوستان میں اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑ کر آئے تھے۔ پاکستان آ کر بھی انہوں نے کتے پالے تھے۔ گاؤں والی حویلی میں اب بھی کتے تھے لیکن جب سے شہر بانو نے ہوش سنبھالا تھا' حویلی میں کتوں کا داخلہ بھی منع ہو گیا تھا۔ بچپن سے ان کے ذہن میں کتوں کا خوف تھا۔

"میں نے کبھی یہی سنا ہے" تیمور نے محتاط انداز میں شامی کی تائید کی تاکہ مستقبل میں بھانڈا پھوٹ بھی جائے تو اس کی اتنی شامت نہ آئے۔

"اچھا کیا..... تم لوگوں نے بتا دیا..... لیکن جب ان کا سامان آ رہا تھا تو اس میں' میں نے کتے نہیں دیکھے۔"

"کسی اور وقت آئے ہوں گے کتے!" شامی نے مزید جھوٹ بولا "میں نے خود دو عدد گدھے کے سائز کے کتے وہاں دیکھے ہیں۔"

"انسان کے سائز کے گدھے.....! اب یہ کتے کہاں سے پیدا کرے گا؟" شہر بانو کے جانے کے بعد تیمور نے شامی سے پوچھا "پھپو نے کتے نہ دیکھے تو تیری خیر نہیں ہوگی۔"

یہ بات شامی بھی سمجھتا تھا۔ شہر بانو فی الحال مان گئی تھیں مگر وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو سورج کے مشرق سے نکلنے کا یقین اس وقت کرتے ہیں جب وہ خود سورج کو مشرق سے نکلتے دیکھ لیتے ہیں۔ "بس یار! پھپو سے جان چھڑانے کی یہی ترکیب ذہن میں آئی تھی۔"

"بیٹا! ایک جھوٹ چھپانے کے لیے دس جھوٹ مزید بولنے پڑتے ہیں۔ اس کا عملی طور پر پتا تجھ سے چلتا رہتا ہے" تیمور بولا۔

"اور تو ہے راست گو" شامی نے طنزیہ کہا "دادا جان سے روز ہی نت نئے جھوٹ کون بولتا ہے؟"

"وہ بھی تیری وجہ سے بولنے پڑتے ہیں" تیمور نے شامی سے دوربین چھین کر آنکھوں سے لگائی لیکن لڑکی جا چکی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر دوربین شامی پر کھینچ ماری۔

☆☆☆

بلبل شاہ بچپن سے ڈاکو بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ کیونکہ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کے علاقے میں بہادر خان کا چرچا تھا۔ جو علاقے کا واحد ڈکیت رہ گیا تھا۔ باقی سارے ڈکیت یا تو مارے گئے تھے یا انہوں نے بہادر خان کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ ایک طرح سے بہادر خان دنیائے جرائم کا بے تاج بادشاہ تھا۔ ڈاکو تو بس نام کا تھا کیونکہ اس علاقے میں صرف دو طبقے آباد تھے۔ ایک وہ غریب جن کے گھروں میں کھانے کے لیے روٹی ہو یا نہ ہو لیکن بندوق ضرور ہوتی تھی۔ دوسرا طبقہ وہ سردار تھے جن کے پاس دولت بھی تھی'

اسلحہ بھی اور اسے چلانے کے لیے بے شمار لوگ بھی..... جس طرح بہادر خان ان کی طرف جانا خطرے کا باعث سمجھتا تھا اسی طرح سے سردار اسے چھیڑنا سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے برابر سمجھتے تھے۔

بلبل شاہ پہلے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ خان کے کھیتوں میں کام کرتے تھے تب کہیں جا کر انہیں کھانے کو روٹی ملتی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں بلبل شاہ نے بہادر خان کی شان و شوکت کا پہلا منظر دیکھا۔ کوئی درجن بھر شاندار جیپوں پر اس کا قافلہ بلبل شاہ کے گاؤں کے نزدیک سے گزرا تھا اور گاؤں والوں نے اسے بھیڑ اور مرغیوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ بلبل شاہ سخت متاثر ہوا تھا۔ اس کے نزدیک بہادر خان ایک ہیرو تھا جس سے سارا علاقہ کانپتا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکو بنے گا۔ اس کام کے لیے تربیت ابتدائی طور پر اپنے ایک چاچا سے حاصل کی۔ وہ افیم کھاتا تھا اور ظاہر ہے کسی کام کا نہیں تھا۔ اس کی گزر اوقات ہاتھ کی صفائی پر تھی۔ وہ گاؤں کے پاس سے گزرنے والی نہر میں نہاتے لوگوں کے کپڑوں کی صفائی کر جاتا تھا۔ بعد میں اس نے بلبل کو اس کام کے لیے استعمال کیا۔ کئی بار بلبل نے کامیابی سے کپڑوں کی جیبیں صاف کیں مگر ایک بار بدقسمتی سے پکڑا گیا۔ بچہ سمجھ کر اسے معاف کردیا گیا لیکن اس سے پہلے اس کی ایسی مرمت ہوئی تھی کہ پھر اسے پکڑے جانے کے خیال سے بھی خوف آتا تھا' اس نے تہیہ کرلیا کہ ساری عمر بھی کچا کام نہیں کرے گا۔

بارہ سال کی عمر میں ایک ٹرک پر بیٹھ کر وہ گاؤں سے بھاگ نکلا اور پشاور آ گیا۔ وہاں دس سال اس نے بہت کچھ سیکھا۔ کئی کامیاب ہاتھ مارے اور بالآخر دارالحکومت کا رخ کیا۔ صوبائی دارالحکومت اسے اپنے عزائم کے لحاظ سے کم لگنے لگا تھا۔ راولپنڈی آ کر اس نے کامیابی سے وارداتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بلبل شاہ جو اب گل شاہ کہلاتا تھا' اس کی توجہ کا مرکز سونے اور جواہرات والے زیورات تھے۔ یہ کم وزن اور قیمتی ہوتے تھے عام طور سے ایک ہی واردات میں وہ اتنا حاصل کرلیتا تھا جو چھ سات مہینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اگلی واردات کے بارے میں وہ اس وقت سوچتا تھا جب پچھلی واردات کا مال... ختم ہونے لگتا۔

گل شاہ تقریباً بتیس برس کا سامنے سے کھڑے کھڑے بالوں اور شکن زدہ چہرے والا شخص تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا جیسے اس کے اعصاب ہمہ وقت کشیدہ رہتے ہیں۔ ان دنوں وہ پنڈی کی ایک عمارت میں کرائے کے کمرے میں رہ رہا تھا۔ ویسے تو اس کا ایک مکان بھی تھا مگر جن دنوں وہ واردات کرنے جا رہا ہوتا' اپنا ٹھکانا اور حلیہ بدل لیا کرتا تھا۔ ان دنوں راجا بازار کی ایک جوہری کی دکان اس کی توجہ کا خاص مرکز تھی۔ جہاں سے اس کے خیال میں اسے کم سے کم بیس پچیس لاکھ روپے کا مال مل سکتا تھا۔ اگر وہ اس بار کامیاب ہوتا تو اسے کئی سال تک کچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ دکان مین روڈ سے ذرا اندر ایک مصروف گزرگاہ پر تھی۔ دکان کے آگے سیکیورٹی گارڈ تھا لیکن اسے آنے جانے والوں کو راستہ دینے کے لیے مستقل آگے پیچھے ہونا پڑتا تھا۔

گل شاہ کا منصوبہ بہت سادہ سا تھا۔ جب گیارہ بجے کے قریب جیولر دکان بند کرنے لگتا تو وہ وہاں پہنچ جاتا اور سب کو ایک طرف کر کے سارا مال سمیٹ کر لے آتا۔ اس وقت تک سارا بازار ویران ہو چکا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ اس وقت دکان میں جیولر کے ساتھ ایک آدمی اور گارڈ ہوتا تھا۔ واردات کے لیے گل شاہ نے ایک کار بھی تاڑ لی تھی۔ یہ راجا بازار کے نزدیک ایک عمارت کے نیچے کھڑی ہوتی تھی۔ آزمائشی طور پر گل شاہ نے ایک رات کے لیے کار اٹھائی اور رات بھر رکھ کر صبح واپس لے جا کر کھڑی کردی تھی۔ اس کے مالک کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ کار اچھی حالت میں تھی اور پہلے سیلف پر اسٹارٹ ہو جاتی تھی۔

واردات والی رات اس نے پہلے کار چرا کر اس جگہ کھڑی کی جہاں سے اسے فرار ہونا تھا۔ یہ کام اس نے دس بجے ہی کرلیا تھا۔ اسے امید تھی کہ کار کے مالک نے فوری طور پر کار کو غائب پا کر رپورٹ درج کرا بھی دی تب بھی پولیس صبح سے پہلے حرکت میں آنے کی زحمت نہیں کرے گی۔ یعنی رات کو اسے خطرہ نہیں تھا۔ واردات کے لیے اس نے اوورکوٹ اور سر پر فلیٹ ہیٹ لگا کر اپنا حلیہ خاصا بدل لیا تھا۔ وہ ٹھیک گیارہ بجے جیولر کی دکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

''اے..... کدھر جاتا اے'' گارڈ نے اسے روکا۔

''میں کچھ زیورات فروخت کرنے آیا ہوں'' گل شاہ نے اپنا بیگ تھپتھپا کر کہا ''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔''

اس سے پہلے کہ گارڈ اسے روکتا' وہ شیشے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ جیولر نے چونک کر اسے دیکھا اور چوکنا ہوگیا ''کیا بات ہے' شاپ بند ہو رہی ہے۔''

''میں کچھ جواہرات بیچنے آیا ہوں۔''

''کل آنا..... ابھی کیش بھی نہیں ہے'' جیولر بے رخی سے بولا اور گارڈ کو گھورا ''تم نے بتایا نہیں.....؟''

''بتایا تھا صاحب! پر یہ اندر آ گیا۔''

''ناراض مت ہو سیٹھ یہ جواہرات ایک نظر دیکھ تو لو'' اس نے بیگ کاؤنٹر پر رکھ کر اس میں سے ایک سیاہ ڈبا نکالا اور جب اسے کھولا تو جیولر کا سانس رک گیا۔ ڈبے میں ڈائنامائٹ کی اسٹکس ایک الیکٹرونکس سرکٹ کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں ''یہ بم ہے اور اس کا ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی حرکت کی تو میں بٹن دبا دوں گا اور ہم تینوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''خدا کے لیے.....'' جیولر کے حلق سے گھگھیائی آواز نکلی۔ گارڈ کا حال بھی کم خراب نہیں تھا۔

''اپنی رائفل ادھر رکھ دو'' گل شاہ نے گارڈ کو حکم دیا تو اس نے بڑی پھرتی سے تعمیل کی تھی۔ وہ نوکری کے چند ہزار کے بدلے جان گنوانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دوسرے حکم پر وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' جیولر نے حوصلہ پکڑا۔

گل شاہ نے گارڈ کی رائفل اٹھا کر اس کی طرف کی ''ایک منٹ کے اندر سارا کیش اور خاص زیورات سامنے رکھ دو۔''

جیولر کو بھی اپنی جان پیاری تھی۔ ایک منٹ تو نہیں' البتہ دو منٹ میں اس نے تجوری سے کیش اور خاص خاص جواہرات اور زیورات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ گل شاہ نے انہیں پھرتی سے بیگ میں منتقل کیا اگرچہ وہاں لپاد ینے والے کئی زیورات شوکیسوں میں سجے تھے۔ مگر گل شاہ جانتا تھا' لالچ ہی اس کے پیٹے میں مرواتا ہے۔ آخری زیور بھی بیگ میں ڈالتے ہی اس نے بیگ بند کیا اور ڈائنامائٹ والے ڈبے کا ایک بٹن دبایا۔ ''اب اگر تم نے اس ڈبے کو اپنی جگہ سے ہلایا تو یہ پھٹ جائے گا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا تو میں اسے ریموٹ سے اڑا دوں گا۔ اب دعا کرنا کہ کوئی مجھے روکے نہیں..... ریموٹ پانچ سو میٹرز کی دوری سے بھی کام کرتا ہے۔''

''میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا'' جیولر دہشت زدہ نظروں سے بم کے اوپر لگے سرخ بلب کو جلتے بجھتے دیکھ رہا تھا مگر گل شاہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر باہر آ چکا تھا۔ اس نے رائفل اپنے اوورکوٹ میں چھپالی تھی۔ وہ تیز قدموں سے سڑک کی طرف بڑھا۔ ایک ڈسٹ بن کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے رائفل اس میں ڈال دی تھی۔ سڑک پر آتے ہی وہ کار کی طرف لپکا تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی لڑکی اس سے ٹکرائی اور وہ زمین پر جا گرا۔ اس کا ہیٹ اتر گیا تھا اور لڑکی کے سامنے اس کا چہرہ واضح تھا۔

''اسٹوپڈ!'' لڑکی غصے سے بولی ''دیکھ کر نہیں چلتے؟''

گل شاہ نے خود پر ضبط کیا۔ یہ جواب دینے کا موقع نہیں تھا' اس نے ہیٹ دوبارہ اپنے سر پر جمایا اور کار کی طرف لپکا۔ جب وہ چوری شدہ کار میں بیٹھ رہا تھا تو اس نے لڑکی کو کچھ آگے کھڑی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے دیکھا۔ کار اسٹارٹ ہوئی تو اس کی عقبی نمبر پلیٹ کے اوپر لگی لائٹ جل اٹھی تھی۔ گل شاہ کو اس کا نمبر دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ آر ایل آر نو دوبارہ یعنی..... گیارہ ایک نمبر زیادہ۔

دونوں کاریں آگے پیچھے روانہ ہوئی تھیں لیکن ذرا آگے باہر گل شاہ طے شدہ گلی میں گھوم گیا۔ اندر ہی اندر گھوم تا وہ اس جگہ پہنچا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ اس نے اوورکوٹ اور ہیٹ چوری کی کار میں چھوڑا اور بیگ لے کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ اس نے زیورات اور کیش نکال کر برابر والی سیٹ کے خفیہ خانے میں ڈال دیا اور ایک پل سے گزرتے ہوئے چرمی بیگ اور دستانے بھی نالے میں اچھال دیے تھے۔ واردات سے متعلق کوئی شے اس کے پاس باقی نہیں رہی تھی۔ اب اگر پولیس اسے روک بھی لیتی تو اس کے پاس کوئی مشکوک شے نہیں تھی۔ سیٹ تلے خفیہ خانے تک کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

مگر کسی نے اسے نہیں روکا تھا اور وہ بہ حفاظت سیٹلائٹ ٹاؤن میں واقع اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ گھر پہنچ کر حسبِ عادت اس نے ساری واردات کا ازسرِنو جائزہ لیا۔ اس نے دکان میں جانے سے پہلے اس کی دونوں لائنز کاٹ دی تھیں کیونکہ کسی قسم کا الارم جو تھانے یا کسی اور جگہ بجتا ہے۔ وہ فون کی مدد سے کام کرتا ہے۔ تار کاٹ کر اس نے ممکنہ الارم ناکارہ بنا دیا تھا۔ تار اس نے پہلے ہی تاڑ لیے تھے۔ دکان میں جو بم چھوڑ کر آیا تھا' وہ جعلی تھا مگر اس نے اتنی مہارت سے تیار کیا تھا کہ دیکھنے والا اس پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے امید تھی کہ جیولر اور اس کا گارڈ ڈبے کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کریں گے اور نہ ہی انہوں نے لٹنے کا واویلا کیا تھا۔ ورنہ اس کے لیے فرار ہونا آسان نہیں ہوتا۔ مارکیٹ گارڈز کے علاوہ علاقے میں پولیس بھی مسلسل گشت کرتی تھی۔ ایک ذرا سا ہنگامہ اسے سب کی توجہ کا مرکز بنا دیتا۔

اچانک اسے لڑکی کا خیال آیا۔ اس نے گل شاہ کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور جب پولیس اس معاملے میں کوئی انکوائری کرے گی اور لڑکی نے اس سے رابطہ کرلیا تو کم سے کم

اس کا حلیہ ضرور پولیس کے علم میں آجائے گا اور اگر پولیس نے زیادہ مستعدی دکھائی تو پشاور سے اس کے بارے میں معلوم ہوسکتا تھا۔ پشاور سے نکلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پولیس والے بھتے کے باوجود اسے تنگ کرتے تھے۔ آئے دن اس کے گھر کے چکر لگاتے تھے۔ دو تین بار اسے خواہ مخواہ تھانے لے گئے۔ ان کا منشا کھانا پینا تھا اور گل شاہ اپنی محنت میں کسی اور کو شریک کرنے کا روادار نہیں تھا لہٰذا ایک روز چپکے سے وہاں سے نکل گیا۔

ممکنہ خطرہ سامنے آتے ہی گل شاہ کے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ یہ اس کی پرانی کمزوری تھی۔ خطرے کا احساس اس کے پیٹ میں مروڑ پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کیا ایک بار پھر اسے اس جگہ سے جانا پڑے گا؟ یہاں اس نے اچھی خاصی حیثیت بنالی تھی۔ اس کے پاس مکان تھا' چند اچھی جگہوں پر پلاٹ بھی تھے' کار تھی۔ اس کے محلے والے اسے ایک شریف آدمی کے طور پر جانتے تھے اور وہ شادی کرنے پر بھی غور کررہا تھا۔ تیئس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس کے ولولے خاصے سرد پڑ گئے تھے اور اسے جرائم زدہ زندگی سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی پُرسکون زندگی ہو' بیوی بچے ہوں۔ اس جیولری کی دکان سے اسے امید تھی کہ اچھا خاصا مال مل جائے گا۔ اس کا ارادہ زرعی زمین لے کر اس پر فارم بنانے کا تھا۔ دو تین سالوں میں وہ خود کو معقول قسم کا زمیندار ثابت کرسکتا تھا جس کے بعد اسے آسانی سے کسی اچھے گھرانے میں رشتہ مل جاتا۔

غور و فکر سے فارغ ہو کر گل شاہ نے لوٹ کے مال کا جائزہ لیا۔ رقم زیادہ نہیں تھی۔ شاید پونے تین لاکھ کیش تھا مگر جواہرات دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ دو عدد جڑاؤ سیٹ تھے۔ جن میں بیش قیمت ہیرے اور زمرد جڑے تھے۔ ایک نیکلس تھا۔ اس میں بھی سو کے قریب چھوٹے بڑے ہیرے جڑے تھے۔ ایک بازو بند تھا اور سو کے قریب مختلف جواہر تھے اور ان میں سے کوئی پتھر دس ہزار روپے سے کم مالیت کا نہیں تھا۔ صبح تک وہ کاغذ پنسل پر جواہرات اور زیورات کی مالیت کا حساب کرتا رہا اور جب حساب مکمل کرکے اس نے کل رقم نکالی تو اس کے پیٹ میں ایک بار پھر گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ کاغذ پر لکھا ہندسہ پچاس لاکھ روپے کا تھا۔

☆☆☆

فولاد خان نسوار لگانے کے بعد اس کی ڈبیا میں لگے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ جب خاصی دیر تک اس نے منہ کے آگے سے آئینہ نہیں ہٹایا تو مجبوراً شامی کو اسے کھنکھار کر متوجہ کرنا پڑا۔ فولاد خان نے بے رخی سے اس کی طرف دیکھا اور اسے مطلع فرمایا ''چوٹا صاحب! تو مارا حساب خراب ہورہا ہے۔''

''وہ تو بچپن سے ہے..... ورنہ اب تک انجینئرنگ نہ کرچکا ہوتا۔ ہر بار میتھس کے پرچے میں رہ جاتا ہوں۔'' شامی نے اعتراف کیا ''فولاد خان' تمہارے حساب کتاب پر رشک آتا ہے۔ مرکب سود کا بھی سود منہ زبانی نکال لیتے ہو۔ کیا تمہارے سر میں کمپیوٹر فٹ ہے؟''

''فرنگی کی ایجاد پر لعنت!'' فولاد خان خفگی سے بولا ''امارے سر میں امارا دماغ ہے۔ ام فرمارہا ہے کہ تمارا قرض مہنگائی کے ماتق بڑھ رہا ہے۔ ابھی تم کو امارا مغلظ دو ہزار سات سو ستر روپے اور ساڑھے بارہ پیسے دینا ہے۔''

''مبلغ'' شامی نے تصحیح کی ''میرے حساب سے تو دو ہزار سات سو ستر روپے اور ساڑھے نو پیسے بنتے ہیں۔''

''ساڑھے بارہ پیسے'' فولاد خان نے قطعی لہجے میں کہا۔

''تو مارا حساب کمزور اے چوٹا صاحب!''

''او کے ساڑھے بارہ پیسے'' شامی نے تسلیم کرلیا ''فولاد خان! تم سے ایک کام ہے۔''

''پہلے پچھلا حساب صاف کرو تب ہم نیا قرض دے گا۔ ورنہ سود ڈبل لے گا۔''

''میں قرض نہیں مانگ رہا'' شامی نے رسان سے جواب دیا ''کام کچھ اور ہے۔ دو گلی پیچھے تمہارا ایک دوست چوکیدار ہے۔ بدبخت خان نام ہے شاید۔''

''بیدار بخت خان!'' فولاد خان نے تصحیح کی ''وہ امارا دوست تھا..... اب امارا دشمن اے۔''

''اچھا!'' شامی کا منہ لٹک گیا ''فولاد خان' کیا تم میری خاطر اس سے دشمنی کو ایک بار پھر دوستی میں نہیں بدل سکتے؟'' شامی کا لہجہ پُرامید تھا۔

''کر تو سکتا اے..... پر ام نے اس سے مغلظ دو سو سات روپے اور دس پیسے لینا اے..... پر وہ بدبخت مانتا نہیں ہے۔ اس بات پر تو امارا دوستی' دشمنی میں بدلا۔''

''صرف دو سو سات روپے نہیں دیتا' یہ تو کمینگی ہے۔''

''بہت بڑا کمینگی..... وہ دو سو سات روپے تو دیتا اے پر دس پیسے نہیں دیتا۔''

''صرف دس پیسے کے لیے دوستی دشمنی میں بدل گئی۔'' شامی دم بہ خود رہ گیا ''فولاد خان! کیا تم یہ دس پیسے معاف نہیں کرسکتے؟''

''ام کیوں کرے؟'' اس نے صاف انکار کردیا ''وہ خنزیر کا بچہ کیوں نہیں دیتا؟''

''تم اس خنزیر کے بچے کے بجائے مجھ سے لے لو۔ پورا ایک روپیہ لے لو۔''

''ام بھیک نہیں لیتا'' فولاد خان نے پھر انکار کیا ''اپنا حق لے گا اور اس بدبخت خان سے لے گا۔''

شامی سرد آہ بھر کر بیدار بخت خان کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ بھی نسوار لگا کر آئینے میں دیکھ کر اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا۔ شامی نے بعد سلام اس سے عرض کیا ''بیدار بخت خان! فولاد خان ہمارا چوکیدار ہے۔''

''تو مارا چوکیدار اے'' بیدار بخت خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور اس نے اپنی رائفل یوں تھام لی تھی جیسے ابھی شامی کے جسم میں ایک عدد سوراخ مزید کردے گا۔ اس کے تیور دیکھ کر شامی پچھتانے لگا۔

''ارے خان بھائی! بات تو سنو..... فولاد خان ہمارا چوکیدار ہے لیکن سخت کمینہ آدمی ہے۔''

''ہے نا'' بیدار بخت خان خوش ہوگیا ''ام سے پورے دس پیسے اوپر مانگتا ہے۔''

''تو دے دو نا..... دس پیسے کی کیا بات ہے۔ دو مسلمان آپس میں لڑیں' یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''ام نے دینے سے انکار نہیں کیا۔ پر ام دس پیسہ کدر سے لائے..... اب تو کباڑی کے پاس بھی نہیں ملتا۔''

یہ واقعی گمبھیر مسئلہ تھا۔ شامی اور بیدار بخت خان اس کے حل کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے۔ پھر شامی کے زرخیز دماغ نے کام دکھایا۔ اس نے بیدار بخت خان سے کہا ''تمہارا کسی بینک میں اکاؤنٹ ہے؟''

''اے..... چار سدہ میں۔''

''بے شک کسی بھی سدہ میں ہو۔ تم اس کا ایک چیک مبلغ دو سو سات روپے اور دس پیسے کا لکھ کر فولاد خان کو دے دو۔ اب یہ مسئلہ اس کا ہے کہ کہاں سے کیش کراتا ہے یا اپنے اکاؤنٹ میں ڈالتا ہے۔''

بیدار بخت خوش ہوگیا ''تو م نے امارا مسئلہ حل کردیا اے۔ اب ام فولاد خان سے دشمنی ختم کرے گا۔ اس سے بڑا قرضہ لے گا۔ تو مارا شکریہ صاب۔''

''بیدار بخت خان! اگر تم صحیح طرح سے شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو تو ایک زحمت کرو' شام کو تم اپنے صاحب کے کتے کرانے کے لیے لے جاتے ہو؟''

''لے جاتا اے'' اس نے اقرار کیا۔

''تو یہ کتے چند سیکنڈ کے لیے..... میرے گھر کے سامنے والی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے روکنا۔''

''روک لے گا..... پر کیوں؟''

''یہ مت پوچھو..... بس شام پانچ بجے یہ کام کرنا..... میں اوپر بالکونی میں ہوں گا جب تک میں سفید رومال نہ لہراؤں' جانا مت..... ہوسکے تو کوٹھی کے چوکیدار سے گپ شپ کرنا۔''

''ام..... فولاد خان سے فی الحال قتل و خون کرسکتا اے' گپ شپ نہیں۔''

''میرا مطلب ہے سامنے والی کوٹھی کے چوکیدار سے..... وہ بھی کسی سدہ کا خان ہے۔''

معاملہ سیٹ کرکے شامی' فولاد خان کے پاس آیا اور اسے خوش خبری سنائی کہ بیدار بخت خان اس کا پورا قرضہ واپس کرنے اور اس سے نیا قرض لینے کے لیے تیار ہے۔ فولاد خان نے قرض لینے والی بات میں زیادہ دلچسپی لی تھی۔ شامی نے کتابوں میں سر کھپاتے تیمور کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔ اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ کوشش کرنا جب تک کتے پھپھو جان کو نہ دیکھ لیں' وہ جانے نہ پائیں۔''

''پھپھو جان کو کتے دکھانے ہیں'' شامی دانت پیس کر بولا۔

''جس کو جو مرضی دکھا..... یہ تیرا مسئلہ ہے' میرا نہیں'' تیمور نے کتاب پر جھکتے ہوئے کہا ''اور براہِ کرم! اپنی یہ صورت اب چار گھنٹے سے پہلے مت دکھانا۔''

شامی بھنا کر اس کے کمرے سے نکل گیا اور شامت کا مارا لان کی طرف چلا گیا جہاں وقار الملک دھوپ سینک رہے تھے۔ اگرچہ موسم اب دھوپ سینکنے والا نہیں رہا تھا مگر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ روز ایک گھنٹا دھوپ لیا کرتے تھے تاکہ بڑھاپے میں ان کی ہڈیاں مضبوط رہیں۔ شامی کا خیال تھا کہ دادا جان کی ہڈیاں دھوپ سینکے بغیر بھی خاصی مضبوط تھیں۔ شامی پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اپنے ملازم خاص نظام دین کو اشارہ کیا اور وہ شامی کی طرف لپکا ''چھوٹے نواب صاحب! بڑے نواب صاحب یاد فرماتے ہیں'' اس نے نستعلیق اردو دیہی لہجے میں بولی۔

''ہم ابھی آتے ہیں'' شامی نے دروازے کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

''نواب صاحب ابھی یاد فرماتے ہیں'' نظام دین اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔

بادلِ ناخواستہ شامی کو دادا حضور کا رخ کرنا پڑا ''برخوردار! سنا ہے ان دنوں راوی تمہارے لیے چین لکھ رہا ہے۔'' دادا جان نے اپنی تیغ نما مونچھوں کے عقب سے ارشاد فرمایا۔

''راوی کیا دادا حضور! اگر پاکستان کے تمام دریا مل کر بھی میرے لیے کوئی چین بھرا لمحہ لکھنا چاہیں تو فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔''

''راوی..... یعنی روایت کرنے والا..... دریائے راوی نہیں۔'' دادا جان خفگی سے بولے اور پھر لہجہ بدل کر کہا ''تم شہر بانو کو بتا رہے تھے کہ سامنے جو شخص آ کر آباد ہوا ہے' وہ نہایت کج خلق ہے اور اس نے کتے پال رکھے ہیں' گدھے..... یعنی تمہارے سائز کے؟'' آخری جملے پر ان کے لہجے میں اشتیاق سمٹ آیا تھا ''کیسے ہیں کتے؟''

شامی نے خود کو کوسا۔ پھپھو جان کو کتوں سے ڈرانا ضروری تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ دادا حضور کو کتوں سے اتنا ہی شغف ہے ''دادا حضور' میں نے بھی سنا ہے۔''

''سنا ہے..... ہم نے تو سنا ہے کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہیں تم غلطی سے گدھوں کو کتے تو نہیں سمجھ بیٹھے تھے..... آج کل کے جوانوں کو کیا پتا جانوروں کی نسلوں کا؟''

''پتا کیسے نہیں ہوگا دادا حضور! بچپن سے ان کے نام اپنے القاب کے طور پر سنتا آیا ہوں'' شامی نے خفگی سے کہا ''پھپھو حضور کو سننے میں مغالطہ ہوا ہوگا۔''

''اچھا..... بہرحال' تم معلوم کرو' کیا سچ مچ سامنے والے صاحب کے ہاں کتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ بدخلق نہیں ہو سکتے یا کتے نہیں ہوں گے'' دادا جان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''بجا ارشاد فرمایا.....'' شامی مستعدی سے بولا ''اب میں جاؤں.....؟ مجھے اپنی ایک کتاب لینی تھی۔''

''ضرور جاؤ..... لیکن کتاب لینے نہیں' اس کا تم نے کیا کرنا ہے؟ کتاب تو پڑھے لکھے لوگوں کے کام کی شے ہے۔''

''دادا حضور! میں انجینئر بننے والا ہوں'' شامی نے احتجاج کیا۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو..... لیکن ہمیں اس بارے میں شک ہے۔ بہرحال کتاب کی فکر تم بعد میں کرنا' ہمیں اگلے دو گھنٹے میں معلوم کر کے بتاؤ کہ اس شخص نے واقعی کتے پالے ہیں یا نہیں تاکہ ہم مستقبل میں اس سے تعلقات کا تعین کر سکیں۔''

''جی بہتر دادا حضور!'' شامی نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ نئی آفت آ گئی تھی۔ شامی اس چکر سے نکلنے کے لیے جتنے ہاتھ پیر مار رہا تھا' اتنا ہی مزید پھنستا جا رہا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے اور امید تھی کہ بیدار بخت اپنے صاحب کے کتوں کو لے کر پہنچنے والا تھا۔ شامی نے دوربین لی اور اوپر والی منزل پر پہنچ گیا جہاں سے سامنے والی کوٹھی کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے لان پر نظر ڈالی اور وہاں لڑکی کو ایکسر سائز کرتے دیکھ کر شامی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ نہایت انہماک سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور اسے بالکل پتا نہیں چلا کہ کب پھپھو جان عقب میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے غرا کر کہا۔

''شامی' بے ہودہ..... پھر دوسروں کے گھروں میں جھانک رہے ہو؟''

وہ بوکھلا کر مڑا ''پھپھو جان! ہرگز نہیں..... میں تو کتے دیکھ رہا تھا۔ سوچا تھا' آپ کو بھی دکھا دوں..... مگر اب تک نظر نہیں آئے۔''

اسی لمحے شامی نے بیدار بخت خان کو کتوں سمیت کوٹھی کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس نے جلدی سے دوربین شہر بانو کو پکڑا دی ''دیکھیں' کوٹھی کے گیٹ پر کتے ہیں۔''

شہر بانو نے دوربین آنکھوں سے لگائی ''کہاں ہیں کتے..... ارے' یہ تو بے حیا..... ناچ رہی ہے۔''

شامی نے تصحیح کی ''وہ ایکسر سائز یعنی ورزش کر رہی ہے۔ کتے کوٹھی کے گیٹ پر ہیں۔'' روانی میں وہ بول گیا تھا اور اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب شہر بانو نے اسے گھورا تھا ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ورزش کر رہی ہے؟''

''لڑکی مجھے یہاں سے دوربین کے بغیر بھی نظر آ رہی ہے'' شامی نے بدحواسی سے وضاحت کی۔

''اور کتے دیکھنے کے لیے تمہیں دوربین کی ضرورت پڑ گئی؟'' شہر بانو نے طنز کیا۔

''پھپھو جان! خدا کے لیے کتے دیکھ لیں'' شامی نے انہیں دوربین کا زاویہ درست کر کے دیا۔

''اوئی اللہ' اتنے خوفناک کتے!'' شہر بانو نے کوئی دو سو فٹ کی دوری سے کانپنا شروع کر دیا ''میری توبہ' جو میں کبھی اس کوٹھی میں قدم بھی رکھوں۔''

''اب تو یقین آ گیا نا..... مگر خدا کے لیے' یہ بات دادا حضور کو مت بتایئے گا۔ وہ کتوں کے شیدائی ہیں۔ خواہ مخواہ اس ایس ایس قدوائی سے تعلقات قائم کر لیں گے اور

شرما حضوری میں شاید آپ کو بھی جانا پڑ جائے۔ میں نے اکثر ان کتوں کو لان میں پھرتے دیکھا ہے۔''

''ہرگز نہیں..... میں ابا حضور کو کیوں بتانے لگی بلکہ تم بھی مت بتانا..... کہہ دینا کہ قدوائی کو کتوں سے نفرت ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں دادا حضور کو ایسا پکا کر دوں گا کہ وہ قدوائی سے ملنا تو کیا اس کا اور اس کی بیٹی کا آشیانہ میں داخلہ تک ممنوع قرار دے دیں گے۔''

شامی خوش تھا کہ ایک کام تو ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی شہر بانو چھت سے گئیں' اس نے کتوں کا زبردست شور سنا۔ دو کتے اتنا شور نہیں مچا سکتے تھے' اس نے جلدی سے دوربین لگا کر دیکھی۔ اب وہاں دو کے بجائے چار پانچ کتے نظر آ رہے تھے اور سب ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ دو کی زنجیریں بیدار بخت خان کے ہاتھ میں تھیں اور تین آزاد تھے۔ قدوائی کا چوکیدار انہیں قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ کتوں کی آواز دادا جان نے نہ سنی ہو۔ شامی دوربین پھینک کر نیچے کی طرف بھاگا تھا۔

☆☆☆

اس سارے ہنگامے میں اگر کوئی شخص خوش تھا تو وہ وقار الملک تھے۔ ایس ایس قدوائی کے پاس پچ پچ کتے تھے اور اسے بھی کتے پالنے کا شوق تھا مگر جب تک وہ آ کر ہنگامہ فرو کرتا' اس کے تین کتے بیدار بخت خان کو تسلی بخش حد تک بھنبھوڑ چکے تھے۔ کتے پھرتیلے تھے' انہیں جنگ میں خاص نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ بیدار بخت خان ان کا مالک نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اسے بھنبھوڑے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ بیدار بخت جھگڑے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پشتو میں شامی کو بہ زبانِ دیگر کوستا ہوا رخصت ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے نولاد خان جائے وقوعہ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ کتوں سے اس کی جان بھی نکلتی تھی اس لیے وہ نہیں جان سکا تھا کہ بیدار بخت خان شامی کے بارے میں کیا ارشاد فرما رہا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟

قدوائی اپنے کتوں کے بارے میں فکرمند ہو گیا تھا اور وقار الملک سے رسمی علیک سلیک کے بعد وہ خاصی دیر تک کتوں کو الٹ پلٹ کر ملاحظہ کرتا رہا تھا۔ اگر یہ سلوک وقار الملک کے ساتھ کوئی انسان کسی انسان کی وجہ سے کرتا تو وقار الملک اس کی سات نسلوں کے دشمن ہو جاتے مگر اس وقت اپنے کتوں کے لیے ایس ایس قدوائی کی فکرمندی دیکھ کر وہ بے حد خوش تھے۔ انہوں نے ... قدوائی کو کتوں کے بارے میں چند مفید مشورے دیے تو وہ چونک گیا۔ اس نے دادا جان سے معافی طلب کی کہ ان کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔

''کوئی بات نہیں'' دادا جان نے اسے کمال فراخ دلی سے معاف کر دیا ''لگتا ہے آپ بھی کتے پالنے کا ذوق رکھتے ہیں۔''

''واللہ کیا فرمایا ہے.....'' ایس ایس قدوائی اچھل پڑا۔ ''کتوں کا کوئی صحیح قدرشناس ہی یہ جملہ کہہ سکتا ہے۔''

اس کے بعد پانچ منٹ کے اندر وقار الملک اور ایس ایس قدوائی یوں بے تکلف نظر آنے لگے تھے جیسے بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے وقار الملک بے دھیانی میں قدوائی کے ساتھ اس کی کوٹھی میں چلے گئے۔ حالانکہ اس معاملے میں وہ اتنے روایت پسند تھے کہ بن بلائے ملک الموت کے ساتھ جانا بھی پسند نہ فرماتے۔

شامی کو لگ رہا تھا' اس کے برے دن توقع سے زیادہ تیزی سے نزدیک آ رہے تھے۔ اگر تعلقات میں ترقی کا یہی عالم رہا تو وہ زیادہ سے زیادہ کل تک اس لڑکی کی نظروں میں آ جاتا اور اس کے بعد دادا جان کے ہاتھوں اپنا حشر اسے قرین قیاس نہیں لگ رہا تھا۔ دادا جان کے قدوائی کے ہاں جانے کے بعد وہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا کہ نولاد خان نے اسے ڈرتے ڈرتے بلایا ''چھوٹا صاب' تم ٹھیک اے نا؟''

''نہیں'' شامی نے گلوگیر لہجے میں کہا ''میں وفات پا چکا ہوں۔''

''وفات پا چکا ہے؟'' نولاد خان دنگ رہ گیا ''پر کیسے..... تم تو بولتا اے..... تم کو کتا تو نہیں کاٹا؟''

''کاش..... کہ کاٹ لیتا..... اس روز روز کے مرنے سے تو نجات ملتی'' شامی کو اب طیش آنے لگا تھا۔ قدوائی اور اس کے کتوں پر جنہوں نے عین موقع پر آ کر کام بگاڑ دیا تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ اس ہنگامے میں وہ لڑکی نہیں آئی ورنہ وہ اسی وقت پھنس جاتا۔ وہ دل سے دعا مانگنے لگا کہ لڑکی اندھی ہو جائے یا کم سے کم اس کی یادداشت چلی جائے جیسا کہ بے شمار فلموں میں وہ دیکھ چکا تھا یا اس کی چٹ منگنی' پٹ بیاہ اور جھٹ رخصتی ہو جائے اور اس کے بعد وہ کبھی یہاں نہ آئے حالانکہ اسے معلوم تھا' ان میں سے کسی دعا کی قبولیت کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ اس لڑکی کی نظروں سے بچا رہے اور حتی الامکان اس کا سامنا نہ کرے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ خود یہاں سے دفع

ہو جائے۔

☆☆☆

گل شاہ نے زیورات سے ہیرے الگ کر کے انہیں پشاور لے جا کر بیچ دیا تھا۔ پڑوس ملک کے جنگ جو سردار یہ ہیرے منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے۔ اس کے بدلے میں وہ ڈالرز دیا کرتے تھے۔ گل شاہ کے ایسے دو ایجنٹس سے روابط تھے' جو جواہرات اور سونے کی فوری ادائیگی کرتے تھے اور اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔ سونے کو وہ پگھلا لیا کرتا تھا۔ اس کام کے لیے اس کے پاس اوزار تھے۔ اس سونے کو وہ کسی بھی مقامی صراف کو بیچ دیا کرتا تھا کیونکہ اب سونے کے بارے میں کوئی رسید طلب نہیں کرتا تھا۔

اس نے اچھے والے جواہرات الگ کر لیے تھے اور صرف کم تر درجے کے جواہرات بیچ کر آیا تھا۔ اس کے بدلے اسے بیس لاکھ روپے کی خطیر رقم ملی تھی۔ اس سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ سات لاکھ روپے حاصل کر سکا تھا۔ اگر وہ اچھے ہیرے اور سونا ہوشیاری سے فروخت کرتا تو اتنی ہی رقم اور کما سکتا تھا۔ اس نے واپس آتے ہی ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایسی زمین کا بندوبست کرے جس پر وہ کاشت کاری کے ساتھ پولٹری اور فش فارمنگ بھی کر سکے۔ ڈکیتی کے بعد جو خدشات اس کے پیٹ میں بار بار مروڑ پیدا کر رہے تھے' اب وہ خدشات اسے ہلکے لگنے لگے تھے۔ واپس آنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب اسے اپنی شخصیت میں تبدیلی لانی چاہیے۔ وہ ایک معزز لینڈ لارڈ بننے جا رہا تھا۔ اس لیے اسے شخصیت بھی ایک لینڈ لارڈ والی بنانی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بال بڑھائے اور انہیں پیچھے کی طرف کر کے بنانا شروع کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ چہرے کو سپاٹ رکھنے کی مشق کرتا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ورزش کے ذریعے اپنے بے ڈول جسم کو چست بنانا شروع کر دیا تھا۔

مگر اس صبح اس نے ایک ایسی شے دیکھی جس نے اس کا سارا سکون غارت کر دیا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی پیٹ بھرا ہوتا تو مروڑ اٹھنے کی وجہ سے اسے الٹی آ جاتی۔ اس وقت وہ بیکری سے انڈے' دودھ اور ڈبل روٹی لے کر واپس آ رہا تھا جب اس نے پارک کی جانب سے اس لڑکی کو جاگنگ کرتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ ذرا فاصلے پر تھی تو گل شاہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ وہی لڑکی تھی جو واردات کے فوراً بعد اس سے ٹکرائی تھی اور جس نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا۔ گل شاہ فوری طور پر درخت کی آڑ میں ہو گیا تھا اور اس وقت تک آڑ میں رہا تھا جب تک وہ اس کے پاس سے گزر کر آگے نہیں چلی گئی تھی۔ گل شاہ اسے بغور دیکھ رہا تھا' اس نے نیلے رنگ کا ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی۔ پیروں میں جاگنگ شوز تھے۔ گل شاہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ لڑکی کا رخ بڑے بنگلوں کی طرف تھا۔ اس طرف دو کنال سے زیادہ رقبے پر بنے گھر تھے۔ لڑکی جاگنگ کرتی رہی اور گل شاہ محتاط انداز میں اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ علاقہ دن میں بھی سنسان رہتا تھا اور اس وقت بھی اِکا دُکا لوگ نظر آ رہے تھے جو ان پر توجہ دیے بغیر گزر رہے تھے۔ لڑکی ایک بڑی گلی میں داخل ہوئی جس وقت گل شاہ نے گلی کے سرے سے جھانکا تو لڑکی ایک کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد چہل قدمی کرتے ہوئے گلی سے گزرا۔ کوٹھی کے سامنے اس نے سرسری سی نظروں سے دیکھا۔ یہ خاصی وسیع و عریض اور جدید طرز ڈیزائن پر بنی کوٹھی تھی۔ اس کے گیٹ پر بڑی سی نیم پلیٹ لگی تھی جس پر ایس ایس قدوائی لکھا تھا اور گیٹ کے اندر چوکیدار موجود تھا اس لیے گل شاہ نے گیٹ کے نزدیک جانے سے گریز کیا تھا۔

کوٹھی دیکھ کر اس کے پیٹ میں اٹھتی مروڑیں تیز ہو گئی تھیں۔ لڑکی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی گل شاہ کے خلاف گواہی مانی جاتی۔ اگرچہ پولیس نے اس کیس کو ایک طرح سے داخلِ دفتر کر دیا تھا۔ پولیس سے لڑکی نے رابطہ نہیں کیا تھا یا پھر اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ واردات کے معاملے میں وطن عزیز کے شہریوں کے عمومی رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ یعنی ہماری بلا سے' بھاڑ میں جائے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ لڑکی نے اسے سرے سے اہمیت ہی نہ دی ہو اور اسے پتا ہی نہ ہو کہ اس سے ٹکرانے والا شخص ایک واردات کر کے آ رہا ہے۔

گل شاہ واپس آیا تو اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ ایک لڑکی کی وجہ سے اس کی ساری پلاننگ خطرے میں تھی۔ وہ اس وقت اپنے کیریئر کے اہم ترین موڑ پر تھا۔ یہاں سے وہ عزت اور دولت کی بلندیوں پر جا سکتا تھا۔ وہ ایک پُرسکون اور بے خوف زندگی بسر کرتا۔ دوسری طرف اس کی ذرا سی غلطی اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھیج دیتی۔ جہاں سے نکلنے کے بعد اس کے لیے سوائے ذلت اور مفلسی کے کچھ نہیں رہ جاتا۔

''ایک لڑکی.....!'' اس نے خود سے کہا ''ایک لڑکی تمہارے لیے خطرہ ہے بلبل شاہ۔ اس سے پہلے' وہ تمہیں جیل بھجوائے' تم اسے دوسری دنیا بھیج دو'' وہ ہنسنے لگا جیسے فلموں

میں ولن عفت مآب ہیروئن کے بارے میں کوئی شیطانی منصوبہ بنا کر خنداں زن ہوتا ہے۔

☆☆☆

''تیری حالت اسہال کے اس مریض کی طرح ہو رہی ہے جو لوٹے سمیت ساری رات بیت الخلا کے مدار میں گردش کرتا رہا ہو'' تیمور نے غور سے شامی کو دیکھا۔

''بس بھیا! چل چلاؤ کا وقت ہے'' شامی نے سرد آہ بھر کر کمرے کو اور یخ کر دیا تھا۔ شام سے بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے موسم اچانک یخ بستہ ہو گیا تھا۔ تیمور نے جلدی سے کمبل اوپر کیا۔

''یعنی تیرے حویلی جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگرچہ ذرا دیر سے آیا ہے لیکن خوب آیا ہے۔''

شامی نے خفگی سے اسے دیکھا ''لیکن تیرے لندن جانے کا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ دادا حضور تجھے کولھو کا بیل بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں غالباً۔''

''تو ہو گا بیل!'' تیمور نے تشویش سے کہا ''یعنی شوہر اور یہ غالباً سے تیری کیا مراد ہے؟''

''جب سے دادا حضور ایس ایس قدوائی کے ہاں سے آئے ہیں' اس کی' اس کے کتوں کی اور اس کی لڑکی کی تعریف کیے جا رہے ہیں۔ دو بار کہہ چکے ہیں کہ لڑکی ہمارے خاندان کے لیے نہایت موزوں ہے۔''

''اچھا.....!'' تیمور نے اشتیاق سے کہا مگر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کر چکے تھے ''یہ ممکن نہیں ہے یار! حالانکہ لڑکی خوب ہے۔''

''خیریت تو ہے نا.....؟'' شامی نے اسے مشکوک انداز میں دیکھا۔ ''لڑکی کے بارے میں اتنا دکھی لہجہ.....!''

''تجھے تو شاید وہ قبول بھی کر لے۔ اگرچہ تو ہرگز اس ماہ جبیں کے قابل نہیں ہے لیکن میری تو وہ صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہو گی۔ بے شک وہ بل والی حرکت بھول بھی جائے لیکن اس روز میری اداکاری کو دل و جان سے سچ مان کر مجھے لفنگا تسلیم کر چکی ہو گی۔''

''تسلیم کیا کرے گی' یہ بات تو سارا زمانہ جانتا ہے'' شامی نے جلدی سے کہا ''یہ تو نے نکتے کی بات کی ہے یعنی اگر تو اس کے سامنے نہ جائے اور صرف میں جاؤں' تب بھی بات بگڑے گی نہیں۔''

''ایسا ممکن ہی نہیں ہے'' تیمور نے اطمینان سے کہا ''اگر تو اس سے ملا تو میں بھی پیچھے نہیں رہوں گا۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے ورنہ تو بھی اس سے دور رہے گا۔''

''خدا ایسا دوست کسی دشمن کو بھی نہ دے'' شامی نے بلبلا کر دعا مانگی۔ ''تیمور! کیوں میرا اسکوپ خراب کرتا ہے۔ ممکن ہے بات بن جائے اور میں ایس ایس قدوائی کا گھر داماد بن جاؤں۔ جب دادا جان مجھے حویلی بھیجنے کی کوشش کریں' تو میرے پاس کم سے کم ایک متبادل ٹھکانا تو ہو۔''

تیمور نے افسوس سے سر ہلایا ''میرے نام نہاد دوست اور کزن! تیری سوچ افسوس ناک ہے۔ تو گھر بسانے کے بجائے محض ایک ٹھکانا بنانا چاہ رہا ہے۔ تیری سوچ گھٹیا ہی نہیں' محدود بھی ہے۔''

''چل' میری سوچ گھٹیا ہی سہی..... لیکن میرے کام میں ٹانگ اڑا کر تو کون سی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دے رہا ہے؟''

''شامی! میں تجھے برے دنوں سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو ایک ٹھکانے کے چکر میں تو آشیانہ سے بھی ہاتھ دھو لے اور فارغ ہو کر گھر جا بیٹھے..... میرا مطلب ہے حویلی!''

''خدا نہ کرے'' شامی نے دہل کر کہا ''تیمور! منہ اچھا نہ ہو تو آدمی بات تو اچھی کرے۔''

''بھئی جیسا سامنے والے کا منہ ہوتا ہے' ویسی بات نکلتی ہے'' تیمور نے سر مزید کمبل میں کر لیا ''شامی' جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر کر..... ورنہ میں تیرا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ ایک ہفتے بعد میرا ٹیسٹ ہے' اس کی تیاری کرنی ہے۔''

شامی غور کر رہا تھا۔ ''فرض کر' دادا حضور..... اس مہ لقا سے تیرا رشتہ کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں تیرا کیا ردِعمل ہو گا؟''

''اول تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دادا جان میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میرے مما پاپا سے ضرور پوچھیں گے۔ دوم اگر انہوں نے ایسا کوئی ارادہ کیا بھی تو یہ دو سال سے پہلے ممکن نہیں ہو گا۔ کیونکہ میرے تعلیم مکمل کرنے میں دو سال باقی ہیں۔ سوم اگر دادا جان نے زبردستی کی تو میں دل و جان سے راضی ہو جاؤں گا۔''

شامی بھنا گیا ''مجھے پہلے ہی پتا تھا' تیری نیت میں فتور ہے۔''

''اپنی نیت کے بارے میں کیا خیال ہے..... جو ہمیشہ بدنیت رہتی ہے'' تیمور نے طنز کیا۔

شامی نے کمرے کے چار پانچ چکر لگائے۔ دو بار کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور کمرے کو مزید یخ کیا اور پھر تیمور کے پاس آ کر گلوگیر لہجے میں بولا ''بات یہ ہے کہ میں نوشی پر عاشق ہو چکا ہوں۔''

''تب تو مسئلہ حل ہوا..... تو نوشی کے پاس جا اور اسے میں سنبھال لوں گا۔''

شامی نے گویا ضبط سے کام لیا اور تیمور کو قتل وغیرہ کرنے کی کوشش نہیں کی ''اس ماہ لقا کا نام نوشی ہے۔ اصل نام انوشہ ہے لیکن میں پیار سے نوشی کہتا ہوں۔''

''پیار سے.....؟'' تیمور بھونچکا رہ گیا ''اور وہ تجھے کچھ نہیں کہتی؟''

''کہے گی'' شامی شرما کر بولا ''ابھی اسے پتا کہاں ہے کہ میں اسے پیار سے نوشی کہتا ہوں۔''

''تیری خیریت اسی میں ہے کہ اسے پتا بھی نہ چلے'' تیمور نے اسے خبردار کیا۔

''میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرلوں اور بل مع جرمانے کے ادا کردوں۔''

''اور اس کے بعد بے آبرو ہو کر اس کے کوچے سے نکلوں'' تیمور نے لقمہ دیا ''مگر مجھے ایک جملے پر تکنیکی اعتراض ہے' تیرے بل مع جرمانہ ادا کرنے کی رقم کہاں سے آئے گی؟''

''فولاد خان سے'' شامی نے دانت نکالے ''جب سے اس نے کتوں کے ہاتھوں بیدار بخت کی درگت بنتے دیکھی ہے' تب سے اس کا دل میری طرف سے باغ باغ ہے۔ میں قرض کیا' جان بھی مانگتا تو فولاد خان خوشی خوشی دے دیتا۔''

''اسے ان لڑکیوں کی طرح نہ سمجھ' جنہیں تو آئے دن بے وقوف بناتا ہے۔''

''قصہ مختصر میرے یار.....! میں نوشی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''میں بھی نوشی کے بغیر نہیں رہ سکتا'' تیمور نے جوابی سرد آہ بھری اور شامی کے تیور قاتلانہ ہونے سے پہلے وضاحت کردی۔ ''سگریٹ نوشی اور چائے نوشی' وغیرہ وغیرہ کے۔ ایک اور نوشی کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ قبلہ دادا حضور جوانی میں کرتے تھے بھی دادی جان مرحومۂ اول سے شادی کر بیٹھے تھے۔''

''یار تیمور! یہ نوشی کی کوٹھی کے سامنے کوئی پُراسرار سا آدمی کھڑا ہے۔'' شامی نے ٹہلتے ہوئے اچانک کہا۔

''ہوگا کوئی اور احمق.....! ایک تو ہی تو نہیں ہے زمانے میں..... احمق اور بھی ہیں قدرت کے کارخانے میں۔ خدا کے لیے کھڑکی بند کردے' میری کمبل میں قلفی جم رہی ہے۔''

''بکواس نہ کر..... ایسا نہ ہو' میں اس مبینہ رقیبِ روسیاہ سے پہلے تجھے قتل کردوں۔ ادھر آ کر دیکھ..... اس شخص نے پرانی جاسوسی فلموں کے ہیرو کا سا حلیہ بنا رکھا ہے۔''

تیمور نے بادلِ ناخواستہ کمبل سے نکل کر کھڑکی سے جھانکا۔ ''اس میں کیا خاص بات ہے' اس سردی کے عالم میں آدمی اوورکوٹ اور ہیٹ نہ پہنے تو کیا نیکر بنیان پہن کر گھومے؟''

''مجھے اس کے اوورکوٹ اور ہیٹ پہننے پر اعتراض نہیں ہے۔ اس بات پر ہے کہ یہ نوشی کی کوٹھی کے سامنے کیوں کھڑا ہے؟ اور وہ بھی رات کے دس بجے..... جبکہ باہر نہ بندہ نہ بندے کا پُتر ہے۔''

''نام نہاد زیروزبر دسیون! کھڑکی بند کردے اور باہر جا کر بہ قلم خود جاسوسی کر..... مجھے کیوں سردی سے مارتا ہے؟'' تیمور نے بھنا کر کہا۔

مشورہ شامی کے دل کو لگا تھا۔ اس نے جوتے پہنے' اپنی جیکٹ چڑھائی اور سر پر ٹوپی پہن کر باہر نکلا اور فوری طور پر اندر واپس جانے کی خواہش پر بہ مشکل قابو پایا تھا۔ فولاد خان گیٹ کے ساتھ اپنی کوٹھری میں کمبل اوڑھے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ شامی نے آرام سے اس کی جیب سے بیرونی گیٹ کی چابیوں کا گچھا نکالا۔ فولاد خان قرض وصول کرنے کی طرح نیند کے معاملے میں بھی پکا تھا۔ اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر اس نے چابی واپس فولاد خان کی جیب میں رکھ دی۔ گیٹ کا لاک آٹومیٹک تھا۔ بند کرتے ہی خود بہ خود لاک لگ جاتا تھا۔ باہر جاتے ہوئے شامی نے گیٹ ذرا سا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پُراسرار شخص بدستور کھمبے تلے موجود تھا اور یہ اس کی حماقت تھی۔ اگر وہ کسی درخت کے نیچے کھڑا ہوتا تو شامی کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوتی۔ جیسے ہی شامی آشیانہ کے مین گیٹ کے برابر میں لگے درخت تلے پہنچا' اسے فوراً پتا چل گیا کہ پراسرار شخص درخت تلے کیوں نہیں کھڑا ہوا تھا کیونکہ ہلکی بارش ہو رہی تھی اور درختوں کے نیچے بوندا باندی جاری تھی۔ شامی پُراسرار شخص کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا اس لیے درخت تلے ہی رہا۔

پُراسرار شخص کھمبے کے نیچے اس طرح کھڑا تھا کہ اس کا چہرہ درست طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوورکوٹ میں کمزور آدمی بھی مضبوط نظر آتا ہے۔ اس نے فلیٹ ہیٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے خدوخال نیم تاریکی میں تھے۔ پھر بھی شامی نے محسوس کیا کہ وہ جوان آدمی ہے' اس کا خون اس سردی میں بھی کھولنے لگا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں پُراسرار شخص سے کہا ''خبیث آدمی' تجھے بعد میں پتا چل جائے گا۔ نوشی پر بری نظر ڈالنے کا کیا انجام ہوسکتا ہے۔ شامی منتظر تھا کہ پُراسرار شخص کوئی غلط حرکت کرے اور وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑوائے۔ اس نے اپنے ہاتھ پشت کی طرف کر رکھے تھے۔ معاً اس نے حرکت کی تو شامی کو اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی سی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے بہ غور دیکھا تو اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ پُراسرار آدمی نے ہاتھ میں آبدار اور لمبا سا چاقو تھام رکھا تھا۔ اس قسم کا چاقو بڑی عید پر گوشت کاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ شامی جو پیش قدمی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ممکنہ رقیبِ روسیاہ سے دو دو ہاتھ کرسکے مگر خنجر نظر آتے ہی اس نے پسپائی کا فیصلہ کیا۔ خنجر بدست رقیب سے نمٹنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ فولاد خان کو جگا کر اس شخص کی سرکوبی پر آمادہ کیا جائے۔

اس سے پہلے کہ شامی گیٹ کی طرف جاتا' اس شخص نے حرکت کی اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ شامی نے فولاد خان کو اٹھانے کا ارادہ ملتوی کیا کیونکہ جتنی دیر میں وہ فولاد خان کو بیدار کرتا..... پُراسرار شخص اپنے گھر پہنچ کر بھی سو چکا ہوتا۔ شامی ڈرنے کے باوجود تجسس کے جذبے کے تحت اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ پُراسرار شخص فٹ پاتھ پر جا رہا تھا اور شامی کو اس کی نظروں سے بچنے کے لیے درختوں تلے رہنا پڑ رہا تھا۔ وہ خاصا بھیگ چکا تھا اور اس کے دانت باقاعدگی سے بجنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ پلٹ جائے اور گھر جا کر گرما گرم بستر میں گھس جائے مگر پُراسرار شخص کے بارے میں جاننے کی خواہش کی وجہ سے وہ دل پر جبر کر کے اس کے پیچھے چلتا رہا۔

تین سڑکیں عبور کر کے پُراسرار شخص پارک کی ساتھ والی فٹ پاتھ پر چلنے لگا تھا۔ شامی دوسری فٹ پاتھ پر اس کا تعاقب کر رہا تھا اور اب تک کامیاب تعاقب پر خود کو کئی بار شاباش دے چکا تھا۔ بالآخر پُراسرار شخص اگلے بلاک میں داخل ہوا اور ایک نسبتاً چھوٹے بنگلے میں گھس گیا۔ اس نے چابی سے تالا کھولا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ یہاں رہتا ہے۔ شامی چلتا ہوا بنگلے تک آیا۔ اس نے غور سے نمبر دیکھا۔ مالک کا نام نہیں لکھا تھا اور گیٹ سے اوپر صرف ایک بلب روشن تھا۔ دوسرا بجھا ہوا تھا یا فیوز ہوگیا تھا۔ باقی مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

پُراسرار شخص کو اتنے نزدیک کا رہائشی پا کر شامی کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ رقیبِ روسیاہ ہے۔ مگر وہ خنجر لے کر کیوں آیا تھا' کیا اسے بھی شبہ ہے کہ کوئی اور رقیب ہے اور وہ خنجر بدست اس کے انتظار میں وہاں کھڑا تھا؟ گویا دونوں طرف رقابت کی آگ برابر کی لگی۔ ایک تو سردی' اوپر سے خنجر بکف رقیب کا سوچ کر اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ پراسرار شخص جواب پراسرار نہیں رہا تھا' اسے دیکھ نہ لے۔ شامی کل اس کے بارے میں سب معلوم کرسکتا تھا۔ دل ہی دل میں رقیب کے خلاف منصوبے بناتا وہ واپس آیا اور چھوٹا گیٹ بند پا کر ناچ اٹھا۔ دروازہ کیسے بند ہوگیا' کیونکہ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی اور فولاد خان سے امید نہیں تھی کہ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا ہوگا۔ شاید کوئی بلی یا کتا دروازے سے ٹکرایا ہو تو دروازہ بند ہوگیا۔ اندر جانے کا واحد ذریعہ صرف دروازہ تھا۔ دیواریں نہ صرف دس فٹ تک اونچی تھیں بلکہ ان پر نوکدار سلاخیں بھی لگی تھیں۔ اسی لمحے آسمان پر موجود بادل گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ شامی نے دروازہ پیٹنا شروع کردیا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ فولاد خان کو جگانے کے لیے کم سے کم دستی بم درکار تھا۔

☆☆☆

''ایک سو بارہ'' تیمور نے شامی کی چھینک گنتے ہوئے کہا۔ ''تجھے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ اتنی سردی میں رقیب کا تعاقب کر..... شکر کر اس خنجر بدست رقیب کی نظر تجھ پر نہیں پڑی ورنہ اس وقت تیرے کفن دفن کی تیاریاں کی جارہی ہوتیں۔''

''ارے مر گئے مارنے والے'' شامی نے اپنی پکوڑا ہوجانے والی سرخ ناک سے اسٹیم انجن جیسی آوازیں نکالتے ہوئے کہا ''تیمور! اب یاوہ نہیں' یا میں نہیں.....''

''ابھی تو ہی نہیں'' تیمور نے اس کی بات کاٹی ''دیکھ بے مجنوں کی اولاد! وہ وقت اور تھا جب شرفا..... مشتر کہ محبوب کے لیے دست و گریباں ہوجاتے تھے اور ایک دوسرے کے کپڑے اور پیٹ وغیرہ پھاڑا کرتے تھے۔ آج کل ٹھنڈے خون کے ساتھ عشق کا رواج ہے۔ اس میں قتل و خون کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اس کی وجہ لڑکیوں کی بااَفراط دستیابی ہے تو بھی انگریزی مقولے پر عمل کر..... لڑکی اور بس کے نکل جانے کا غم نہ کر دوسری آتی ہوگی۔''

''ہرگز نہیں..... نوشی پر صرف میرا حق ہے'' شامی مارے جوش کے بستر سے اٹھ گیا۔

''لیٹا رہ..... دوبارہ سردی لگ جائے گی'' تیمور نے اسے زبردستی لٹایا ''دادا جان نے سختی سے حکم دیا ہے کہ تجھے

بستر سے نہ اٹھنے دوں اور ایک بات پر تو نے غور کیا ہی نہیں۔ نوشی ابھی تیرے وجود سے بھی لاعلم ہے۔ ممکن ہے پراسرار شخص اس کا محبوب ہو اور دونوں ایس ایس قدوائی سے چھپ کر ملتے ہوں۔"

"نہیں" شامی کراہا "یہ ایس ایس قدوائی کا نام سن کر مجھے کسی بحری جہاز کا خیال آجاتا ہے۔"

"بات کو ٹال مت۔ اس لحاظ سے تو پراسرار شخص کا رقیب بنتا ہے اور تیری عافیت اسی میں ہے کہ لڑکی سے راہ و رسم مت بڑھا کہ بات تیرے قل اور چہلم تک جا پہنچے گی۔"

"قل اور چہلم میرا نہیں..... رقیب کا ہوگا" شامی نے دانت پیسے۔

"یہ تو جلد پتا چل جائے گا" تیمور نے سوئیٹر چڑھایا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آج کچھ ضروری کام بھی نمٹانے ہیں' دیر سے آؤں گا۔"

شام کو شامی کی طبیعت بہتر ہوتے ہی دادا جان نے طلب کرلیا۔ "کیوں برخوردار! رات تم کہاں تھے؟"

"گھر میں دادا جان!" شامی نے چھینک مار کر کہا۔

"تب گھر سے باہر کیوں پائے گئے تھے" دادا جان نے سخت تیوروں کے ساتھ دریافت کیا۔

"بات یہ ہے دادا جان کہ مجھے گھر کے سامنے ایک مشکوک آدمی نظر آیا' میں اسے دیکھنے کے لیے باہر گیا اور پیچھے چھوٹا دروازہ آٹومیٹک بند ہوگیا۔ اگر آپ اضافی چابی مجھ سے نہ لیتے تو میں دو گھنٹے بارش میں نہ بھیگتا رہتا۔"

"تم خود کیوں گئے' فولاد خان کو بھیجتے..... بلکہ ون فائیو کو کال کرتے۔"

"شاید سردی کی وجہ سے میرے دماغ نے کام کرنا ترک کردیا تھا۔"

"برخوردار! کیا اس نام کی کوئی شے تمہارے پاس ہے۔"

"دادا جان! قدوائی انکل سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی؟" شامی نے موضوع بدل کر اسے دادا جان کے پسندیدہ ٹریک پر ڈال دیا "ان کے کتوں کا کیا کہنا۔"

"اگرچہ تمہیں کتوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم..... لیکن قدوائی کے کتے واقعی شاندار ہیں۔"

"دادا جان! آپ کتے پال کیوں نہیں لیتے؟" شامی نے انہیں اکسایا "پورے ملک میں آپ سے زیادہ کتوں کا ماہر کون ہوگا۔"

"تمہیں کیا معلوم..... ایک زمانے میں سربراہ ملک تک اپنے کتوں کو تربیت کے لیے ہمارے پاس بھیجا کرتے تھے۔" وقار الملک نے سرد آہ بھری "مگر شہر بانو کو کتوں سے اختلاف ہے۔"

"آپ کتوں کے لیے کوٹھی میں الگ جگہ بنوالیں۔"

دادا جان نے نفی میں سر ہلایا "شہر بانو ہمیں ہرگز کتے نہیں پالنے دیں گی۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلی جاتیں اور ہم اپنی بیٹی کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے۔"

"دادا جان' یہ قدوائی صاحب کیسے آدمی ہیں؟ سنا ہے کسی خفیہ ایجنسی میں کام کرتے ہیں۔ ان کے بچے کتنے ہیں؟"

"ہمیں تو بتا رہے تھے کہ وزارت داخلہ میں ہیں..... لیکن جدی پشتی رئیس ہیں۔ شہر بھر میں جائداد ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے' نام کیا ہے بھلا سا.....؟"

"انوشہ!" شامی روانی میں کہہ گیا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" دادا جان نے اسے گھورا "تمہیں تو قدوائی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"وہ دادا جان! شاید آپ سے ہی سنا تھا..... ذہن میں رہ گیا۔"

"ذہن میں صنفِ نسواں کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو اب تک انجینئر بن چکے ہوتے" وقار الملک نے طنز کیا "ویسے لڑکی اچھی ہے۔ با ادب اور شائستہ..... ہمیں تو بہت پسند آئی۔"

"کس کے لیے؟" شامی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

دادا جان خفا ہوگئے "ظاہر ہے احمق..... تمہارے یا تیمور کے لیے..... اپنے لیے ہم کہاں پسند کریں گے؟"

"دادا جان! ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے" شامی نے مکھن لگایا "صحت تو ہم دونوں سے بہتر ہے مگر ایک لڑکی دو افراد کے لیے۔"

"بے ہودہ..... نالائق! ابھی ہم نے سوچا نہیں ہے اور پھر قدوائی کا ارادہ بھی تو دیکھنا ہے۔ ہوسکتا ہے لڑکی پہلے سے نسبت شدہ ہو؟"

"یعنی آپ لڑکی کی پسند کا خیال بھی رکھیں گے؟" شامی متفکر ہوگیا۔

"ظاہر ہے' یہ ہمارا دور تو ہے نہیں' ابا حضور نے جس کھونٹے سے چاہا باندھ دیا" دادا جان غالباً اپنا وقت یاد کرکے افسردہ ہوگئے تھے' جب ان کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی "اب تو لڑکے لڑکی کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔"

"دادا حضور! اگر نوشی..... میرا مطلب ہے انوشہ' مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی تو آپ کوئی اعتراض نہیں تو کریں گے" شامی نے ہمت کرکے دریافت کرلیا۔

وقار الملک نے غور سے پوتے کو دیکھا "برخوردار! بات کیا ہے..... تم منہ پھٹ ہو لیکن کبھی ہم سے اس طرح شادی بیاہ کے موضوع پر بات نہیں کی۔"

"کچھ نہیں دادا جان!" شامی بوکھلا گیا "اب اجازت دیں..... مجھے اپنے ایک ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔"

"نظام دین.....!" دادا جان نے متفکر ہوکر اپنے ملازم کم سیکریٹری کو پکارا "ڈاکٹر کو فون کرو۔ لگتا ہے بخار برخوردار کے سر پر چڑھ گیا ہے۔"

☆☆☆

"ہیلو!" شامی نے پھولے سانس کے ساتھ کہا۔ وہ پچھلے دس منٹ سے یہ لفظ کہنے کے لیے ہمت مجتمع کررہا تھا اور اسے انوشہ کا ساتھ دینے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ شامی کی بائیس سالہ زندگی میں ایسے مواقع کم ہی آئے تھے جب اس نے مشرق سے سچ مچ سورج طلوع ہوتے دیکھا ہو اور یہ ان میں سے ایک موقع تھا۔ اسے معلوم تھا' انوشہ صبح سویرے سورج نکلنے سے ذرا پہلے جاگنگ کرنے قریبی پارک تک جاتی تھی۔ یہ بات اسے فولاد خان نے بتائی تھی جو رات بھر گھوڑے بیچ کر سونے کے بعد فجر پڑھنے ضرور جاتا تھا۔ شامی کئی دن تک ہمت کرتا رہا مگر اتنی صبح اٹھنا اس کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ بالآخر اس نے دوسری ترکیب اختیار کی۔ وہ رات تین بجے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں ان جملوں کی ریہرسل کرتا رہا جو اس نے انوشہ سے کہنے تھے۔ صبح چھ بجے کے قریب اس نے نیا جاگنگ سوٹ پہنا۔ جوتے چڑھائے اور باہر نکل آیا۔ ابھی تاریکی تھی اور فولاد خان فجر پڑھنے گیا تھا۔ شامی دروازے کی جھری سے سر ٹکا کر انوشہ کے گیٹ کی جانب نظریں جمائے تھا۔ فولاد خان کی آمد کا اس وقت پتا چلا جب اس نے گیٹ کھولنے کی کوشش کی اور اس کا سر کھلتے گیٹ سے ٹکرایا۔

"چوٹا صاحب! آپ اس وقت.....؟" فولاد خان بھونچکا رہ گیا "اتنی سویرے.....؟"

"ہاں فولاد خان! میں نے سوچا ہے' اب روز صبح ورزش کیا کروں گا' اس سے صحت بہتر رہتی ہے۔"

"پر یہ کون سا ورزش تھا صاحب! آپ تو دروازے سے سر لگائے کھڑا تھا" فولاد خان کے لہجے میں شک تھا۔

"میں باہر جا رہا تھا کہ تم آگئے" شامی جلدی سے باہر نکل گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ عین اسی وقت انوشہ باہر آئی تھی۔ اس نے سرسری نظروں سے شامی کی طرف دیکھا اور اس کی کھلی باچھیں نظر انداز کرکے جاگنگ کرتی پارک کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ شامی سے ٹرائی' ٹرائی اگین کے سنہرے اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کے تعاقب میں جاگنگ شروع کردی لیکن جلد اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جاگنگ آسان کام نہیں ہے' خاص طور سے اس جیسے تن آسان کے لیے۔ وہ جیسے تیسے دوڑتا رہا۔ پارک میں انوشہ کے نقش قدم پر چلتے بلکہ بھاگتے ہوئے وہ ہمت جمع کرتا رہا۔ پہلے تو اس کے پاس جانے کے لیے بھی خاصی ہمت درکار تھی اور اس کے بعد اسے مخاطب کرنا۔ شامی کو اس سے پہلے تمام لڑکیوں سے بات کرنے میں مجموعی طور پر اتنی دشواری پیش نہیں آئی تھی جتنی کہ اس لڑکی کے سلسلے میں پیش آرہی تھی۔ بالآخر وہ کوشش کرکے اس کے برابر میں آگیا تھا۔ ہیلو کے جواب میں انوشہ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی "ہیلو!" یہ کہہ کر اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔

"ہم پڑوسی ہیں" شامی نے ہانپتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

"میں واقف ہوں..... تو پھر.....؟" لڑکی نے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی فکر ہے" شامی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بات کیسے اس تک پہنچائے۔

"میرے پڑوس میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ میری فکر کریں۔ اپنی فکر کرنے کے لیے میں خود ہی کافی ہوں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھ رہی ہیں..... ایک شخص راتوں کو آپ کی کوٹھی کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ میں نے خود اس کے ہاتھ میں خنجر دیکھا ہے۔"

"آپ کو یقین ہے؟" انوشہ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔

شامی کو خوشی ہوئی۔ دوڑتے دوڑتے اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ "اتنا ہی..... یقین..... جتنا آپ کے سامنے ہونے کا ہے۔"

"دیکھیے..... میں لڑکی ذرا مختلف قسم کی ہوں..... اگر آپ کی یہ بات غلط ہے تو بہتر ہے' آپ یہیں سے اپنا راستہ لیں۔ میں بھی اسے بھول جاؤں گی..... لیکن آپ کو اصرار ہے تو....."

"میں ثبوت دے سکتا ہوں..... اس شخص کا گھر دکھا سکتا ہوں۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے بھیگ کر میں بیمار ہوگیا تھا" شامی کے لہجے میں شکوہ آگیا "اور آپ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی میں نے اسے دوبار دیکھا..... لیکن جب تک میں اپنے چوکیدار کو خبردار کرتا' وہ

غائب ہوگیا تھا۔"

"آپ نے اس کا گھر دیکھا ہے؟" انوشہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"کیوں نہیں..... آپ کہیں تو میں اس وقت بھی آپ کو اس کا گھر دکھا سکتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں گل شاہ نامی شخص اکیلا رہتا ہے۔ محلے والوں کے نزدیک ..... وہ پُراسرار سا شخص ہے' جو کسی سے گھلتا ملتا نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو اس کے بارے میں یہ پتا ہے کہ کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

انوشہ نے دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ پارک کے مزید دو چکر لگانے کے بعد اس نے شامی سے کہا "کیا مجھے اس شخص کا گھر دکھا سکتے ہیں؟"

"یہ فرمائش آپ ان دو چکروں سے پہلے بھی کر سکتی تھیں" شامی نے جل کر کہا اور نزدیکی بینچ پر ڈھیر ہوگیا۔

انوشہ مسکرائی "آپ کی حالت خراب ہو رہی ہے؟"

"وہ تو میں..... بیمار رہا ہوں" شامی نے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی' اسے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔ انوشہ کی سانس بالکل ہموار تھی "بارش میں بھیگنے کے بعد طبیعت کئی دن خراب رہی تھی۔"

"اب تو ٹھیک نظر آ رہی ہے" انوشہ نے اس کا جائزہ لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا "جلدی کریں' میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔"

"آپ کیا کرتی ہیں؟" شامی بادل ناخواستہ اٹھا۔

"میں گریجویشن کر رہی ہوں۔ آپ کے بارے میں آپ کے گرینڈ فادر بتا رہے تھے کہ آپ انجینئرنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"دادا جان بے عزت کروانے میں ماہر ہیں" اس نے دل میں کہا اور منہ سے بولا "میں تقریباً کر چکا ہوں۔ کچھ سمسٹر کے چند پیپر زبیماری کی وجہ سے چھوٹ گئے تھے۔"

"آپ بیمار زیادہ ہی نہیں ہوتے؟" انوشہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا تو وہ قربان ہوتے ہوتے بچا۔ انوشہ اسے بروقت نہ کھینچتی تو وہ سامنے سے آتی ڈبل روٹی سپلائی کرنے والی وین تلے آ چکا ہوتا۔

"شکریہ!" شامی نے جھرجھری لے کر کہا "یہ دین والا بھی جل رہا تھا مجھ سے۔"

"کس وجہ سے؟" انوشہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"یہی کہ میں آپ کے ساتھ جاگنگ کر رہا ہوں" شامی نے اسے والہانہ نظروں سے دیکھا۔

"ذیشان صاحب! یاد رکھیں' میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"مجھے سو فیصد یقین ہے۔" شامی نے دانت نکالے۔

وہ بے رخی سے بولی "براہ کرم جلدی گھر دکھائیں۔"

شامی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری عمر اس کے ساتھ اسی طرح دوڑتا رہے۔ یہ اور بات تھی کہ انوشہ کے ساتھ جاگنگ کرنے کی صورت میں اس کی زندگی ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس طرح اس کی یہ خواہش پوری ہو جاتی مگر انوشہ کو جلدی تھی۔ بادلِ ناخواستہ وہ اسے پُراسرار شخص جواب اتنا بھی پراسرار نہیں رہا تھا' کے مکان تک لایا۔

"یہ ہے اس خبیث کا گھر..... مبینہ گل شاہ۔"

"مبینہ.....!" انوشہ نے غور کیا "کیا وہ شخص گل شاہ نہیں ہو سکتا؟"

"میں اسے گل کے بجائے خار شاہ کہنا زیادہ پسند کروں گا" شامی نے کہا۔

انوشہ نے بہ غور مکان کا معائنہ کیا۔ سامنے کبھی لان تھا جو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اجڑ گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہ لڑکا درست کہہ رہا ہے۔ اس مکان میں رہنے والا شخص اس کے بنگلے کے سامنے کیوں آ کر کھڑا ہوتا تھا؟ کچھ سوچ کر اس نے شامی کو بائے کہا اور دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ شامی ہونق بنا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گل شاہ نے صبح سویرے دو عدد ابلے انڈے اور مسکہ بن کھایا تھا اس لیے اس کے پیٹ میں زبردست مروڑ اٹھتے ہی اسے باتھ روم کا رخ کرنا پڑا۔ واش بیسن پر معدہ صاف کرتے ہوئے وہ جب بھی اس لڑکی کے بارے میں سوچتا جو اس کے مکان کے سامنے کھڑی تھی' تو اس کے پیٹ میں نئے سرے سے مروڑ اٹھنے لگتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کا معدہ مکمل طور پر خالی ہوگیا تھا۔ وہ منہ صاف کرتا ہوا کھڑکی کی طرف لپکا۔ اب وہاں لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی البتہ ایک لڑکا کھڑا تھا۔ گورا رنگ' نپٹا طویل قامت اور دبلا جسم' اس کے براؤن بال بکھرے تھے۔ لڑکے میں اسے کوئی خطرناک بات محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن وہ لڑکی..... آخر وہ اس کے مکان تک کیسے آئی۔ بہرحال جیسے بھی آئی تھی' ایک بات طے تھی کہ وہ شدید خطرے میں تھا۔ عین ممکن تھا کچھ دیر بعد پولیس اس کے مکان پر ہوتی۔ اس نے بے حد عجلت میں اپنی ضروری چیزیں سمیٹیں۔ اپنا کپڑوں والا ایک سوٹ کیس وہ ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔ اس نے مکان میں ایسی کوئی شے نہیں چھوڑی تھی' جس سے اس کی نشاندہی ہوتی۔ اس نے

سوٹ کیس اور بیگ اپنی گاڑی میں رکھا۔ احتیاطاً ایک بار گلی کا معائنہ کیا اور وہاں کسی مشکوک فرد کو نہ پا کر وہ فوری طور پر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

گل شاہ کے پاس ایک پرانی کار تھی۔ اب تک اچھی حالت میں چل رہی تھی۔ اس میں اس نے اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کرا رکھی تھیں۔ اس نے ہنگامی حالات کے لیے ایک خفیہ ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ایک نئی اسکیم میں اس نے چھوٹا سا کاٹیج بنا رکھا تھا۔ جس میں صرف معمولی فرنیچر اور سامان تھا۔ کاٹیج بند پڑا رہتا تھا۔ یہ آبادی کا بالکل آخری حصہ تھا۔ اس کے بعد بے آباد علاقہ تھا اور جنگل..... تھا۔ کاٹیج سے کچھ فاصلے پر برساتی نالا تھا جس کے ساتھ لمبی اونچی گھاس اگی تھی۔ گل شاہ جیسے شخص کے لیے یہ مثالی جگہ تھی۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں وہ بہ آسانی فرار ہو سکتا تھا۔ لمبی گھاس کا سلسلہ اس کے کاٹیج کے عقبی حصے تک آیا تھا۔

ایک جگہ رک کر اس نے کچھ ضروری سامان لیا جس میں کھانے پینے کی اشیا بھی شامل تھیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کم سے کم دو دن وہاں روپوش رہے گا۔ اس کے بعد کوئی لائحہ عمل طے کرے گا۔ اگر لڑکی نے اس کے خلاف پولیس کو اطلاع دے دی تو اس کے لیے سوائے فرار کے کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں وہ کوئی اور پلان سوچ سکتا تھا۔ کاٹیج کے سامنے پہنچ کر اس کو اپنے پیٹ کے مروڑ میں افاقہ محسوس ہوا تھا۔ اسے لڑکی پر شدت سے غصہ آ رہا تھا جو اس کی جان کا وبال بن گئی تھی۔

☆☆☆

شامی بے حد خوش تھا۔ انوشہ سے صبح کے وقت دوسری ملاقات میں وہ اس سے اچھی طرح پیش آئی تھی یعنی ہیلو اور بائے کے درمیانی عرصے میں اس نے شامی کے ساتھ ساتھ دوڑنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ شامی نے فخریہ انداز میں یہ بات کہی تھی "آج میرا سانس بھی نہیں پھولا تھا۔"

تیمور نے قہقہہ مارا "اگر تو اس کے ساتھ اسی دل جمعی سے دوڑتا رہا تو تیری صحت ضرور بہتر ہو جائے گی۔"

"بیٹا' یہ آغاز ہے..... دیکھنا' وہ کچھ عرصے بعد میرا ساتھ دینے کے لیے جاگنگ کیا کرے گی۔"

"شامی..... تو خواب مت دیکھ..... میں نے اس قسم کی لڑکیوں کو معاملاتِ عشق میں خاصا گاؤدی پایا ہے یعنی یہ چیز ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"میں نے صنفِ نازک کے بارے میں تجربہ حاصل کیا ہے..... یہ صرف اوپر سے مختلف ہوتی ہیں ورنہ اندر سے سب

سوالاً جواباً

○ "کیا مرتے وقت تمہارے والد صاحب کی جسمانی اور ذہنی حالت بالکل صحیح تھی؟"

"یہ تو صبح ہی پتا چلے گا۔ صبح ان کا وصیت نامہ پڑھا جائے گا۔"

○ آدم خور قبیلے کے ہتھے چڑھنے والے ایک سفید فام نے اپنے قریب کھڑے قبائلی سے پوچھا۔ "تم اتنے غور سے میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"میں یہاں کا فوڈ انسپکٹر ہوں۔" اس قبائلی نے جواب دیا۔

○ خدا کی پناہ.....! ان دونوں لڑکیوں میں کس قدر مشابہت ہے' کیا یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں؟"

"نہیں..... یہ دونوں اتفاق سے ایک ہی سرجن سے پلاسٹک سرجری کرا چکی ہیں۔"

○ تم کہتے ہو میں شکر ادا کروں؟ میں کس بات پر شکر ادا کروں؟ میرا تو بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے....."

"تم کم از کم اس بات پر تو خدا کا شکر ادا کر سکتے ہو کہ تم ان لوگوں میں سے ایک نہیں ہو جن کے تمہیں قرضے دینے ہیں۔"

ایک جیسی نرم اور گداز فطرت رکھتی ہیں۔ مرد ذرا سی کوشش کرے' انہیں بالآخر اس پر ترس آ ہی جاتا ہے" شامی نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا۔

"انوشہ مختلف قسم کی لڑکی ہے' جس دن اس نے میری صورت دیکھ لی' تجھے اس سے مخالف سمت میں دوڑنا پڑے گا" تیمور نے اسے خبردار کیا۔

"اس کا ایک طریقہ ہے..... تو اس سے دور رہا کر..... دیکھ' تو صبح یونیورسٹی جاتا ہے۔ وہ تیرے بعد نکلتی ہے' دوپہر کو جب تو آتا ہے تو وہ پہلے آ چکی ہوتی ہے۔"

"تو اتفاقات کو فراموش کر رہا ہے۔ میرا کبھی بھی اس سے سامنا ہو سکتا ہے۔"

"یار! تو میرا معاملہ سیٹ ہونے تک کہیں دفع نہیں ہو سکتا؟"

"میں کہاں جاؤں؟" تیمور خفگی سے بولا۔ "اور کیوں جاؤں؟"

"میری خاطر!" شامی گھگیایا۔

"سوری' میرے ایگزام ہونے والے ہیں اور مجھے تیاری کرنی ہے۔ ہاں' میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ باہر آتے جاتے احتیاط کروں گا۔"

شامی کے لیے اتنا کافی تھا۔ اگلی صبح وہ جاگنگ بلکہ انوشہ کے لیے نکلا تو اس نے دادا جان کے خاص گلابوں کی کیاری سے ایک کلی توڑی اور اس کے آنے سے پہلے باغ میں جا کر ایک مناسب جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ انوشہ کو آتے دیکھ سکتا تھا۔ اچانک اس کی نظر پارک کے سامنے کھڑی ایک مورس کار پر پڑی اور اسے یاد آیا کہ وہ ایسی ہی کار گل شاہ کے مکان میں دیکھ چکا ہے۔ پراسرار گل شاہ اس دن کے بعد سے غائب تھا' جس دن اس نے انوشہ کو اس کا مکان دکھایا تھا۔ شامی نے اس علاقے کے چوکیدار سے دوستی گانٹھ لی تھی اور وہ پابندی سے اسے گل شاہ کے بارے میں بتاتا تھا۔ شامی اٹھ کر کار کی طرف بڑھا۔ لیکن ابھی وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا کہ کار اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے وہاں سے روانہ ہوگئی اور اس وقت تو شامی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب سائیڈ روڈ سے آتی انوشہ کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ وہ اچھل کر فٹ پاتھ پر ہوئی تھی اور پھر گر پڑی تھی۔ شامی اس کی طرف بھاگا اور ایک بار پھر اس ڈبل روٹی والی وین تلے آتے آتے بچا جو روزانہ اسی وقت وہاں سے گزرتی تھی۔ ڈرائیور نے ذرا آگے وین روکی اور سر نکال کر بولا۔

"الودے پتر..... تجھے خودکشی کے لیے میری گڈی ملی اے۔"

"ہاں' مجھے ضد ہے..... میں نے تیری گڈی تلے آ کر مرنا ہے" شامی نے چڑانے والے انداز میں جواب دیا۔

انوشہ فٹ پاتھ پر بیٹھی اپنا گھٹنا سہلا رہی تھی اور کچھ سوچ بھی رہی تھی "تم..... آپ..... کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہوں..... بس ذرا سا گھٹنا لگ گیا ہے..... یہ کار والا شخص مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے یہ گل شاہ تھا' اس کے پاس بھی مورس کار ہے۔ میں ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکا تھا۔"

انوشہ کسی قدر مشکل سے کھڑی ہوئی۔ اس نے شامی کا ہاتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کا حلیہ دہرایا تو شامی نے پُرجوش لہجے میں کہا "خدا کی قسم' وہ گل شاہ ہی تھا۔ مجھے تو یہ آپ کا دشمن لگتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" انوشہ چونکی۔

"دیکھیں نا..... اگر کوئی کسی کو پسند کرتا ہو تو خنجر لے کر اس کے گھر کے سامنے تو نہیں کھڑا ہوگا اور نہ ہی اس پر گاڑی چڑھانے کی کوشش کرے گا۔"

"تت..... تمہارا مطلب ہے اس نے جان بوجھ کر مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی؟" انوشہ ہکلائی۔

"ظاہر ہے' کوئی کسی کے غلطی سے تو گاڑی نہیں ٹکراتا۔ کیونکہ غلطی کی صورت میں بھی بندہ فوت ہو سکتا ہے۔" شامی نے خیال ظاہر کیا۔

انوشہ نے چلنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا گئی تھی۔ شامی نے فوری طور پر اسے سہارا دینے کا خوشگوار فرض انجام دیا تھا "میں..... آپ کو سہارا دے کر لے چلتا ہوں۔"

"شکریہ!" انوشہ نے آہستہ سے کہا۔

"اٹس مائی پلیژر.....!" شامی کی باچھیں کھل گئی تھیں اور اس وقت تک کھلی رہی تھیں جب تک اس نے انوشہ کو بازو کا سہارا دے کر اس کی کوٹھی کے اندر تک نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے بیڈروم تک چھوڑ کر آتا لیکن انوشہ نے اسے باہر ہی روک دیا "شکریہ' اب میں چل لوں گی۔ پہلے سے بہتر فیل کر رہی ہوں۔"

"میں چھوڑ آتا ہوں' آپ خطرہ مول نہ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ چوٹ بگڑ جائے؟"

"آپ فکر نہ کریں" انوشہ نے اس بار رکھائی سے کہا۔

"اور ہاں..... میں یہ کلی لایا تھا آپ کے لیے" شامی نے اسے کلی پیش کی۔

"شکریہ!" انوشہ پھر مسکرانے لگی۔ اس نے کلی لے لی تھی "میں کوشش کروں گی کہ آج کی دعوت میں آؤں۔"

"کک..... کیسی دعوت؟"

"ارے آپ کو نہیں پتا..... آج آپ کے گرینڈ فادر نے ہمیں ڈنر پر مدعو کیا ہے۔"

شامی کا خون خشک ہو گیا "اچھا..... اچھا..... ہو سکتا ہے انہوں نے ذکر کیا ہو۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"ایک بار پھر شکریہ!" انوشہ بولی۔

شامی بدحواسی کے عالم میں آیا اور سوتے تیمور کو جھنجوڑ ڈالا "مارے گئے۔"

"کیا ہوا؟" تیمور ہڑبڑا کر اٹھا "کیا نوشی کو پتا چل گیا؟"

"آج شام..... تک پتا چل جائے گا" شامی نے روتے لہجے میں کہا "دادا جان نے قدوائی فیملی کو ڈنر پر مدعو کیا ہے اور ظاہر ہے' ہم سب بھی موجود ہوں گے۔"

"مارے گئے" تیمور کے منہ سے نکلا "میں کہیں غائب ہو جاتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دادا حضور انہیں خاندانی البم دکھائیں گے' جس میں تیری صورت جا بہ جا نمایاں ہے۔ تجھے تصویریں کھنچوانے کا زیادہ ہی شوق ہے۔" شامی نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"بس اللہ نے صورت ہی ایسی دی ہے کہ کیمرا خود فوکس کر لیتا ہے" تیمور نے انکساری سے کہا۔

"اب یہ سوچ..... کہ کرنا کیا ہے؟"

"آئیڈیا..... البم غائب کر دیتے ہیں" تیمور نے چٹکی بجائی۔

"یہ ممکن نہیں ہے دادا جان! البم قیمتی اشیا کے ساتھ تجوری میں رکھتے ہیں۔"

"تب تو فیصلہ کر لے۔ میں یونیورسٹی سے کہیں ٹہل جاؤں گا اور اس وقت تک واپس نہیں آؤں گا جب تک تو کلیئر آل کا سگنل نہیں دے گا۔"

"اگر میں سگنل دینے کے قابل ہوا تو ضرور دوں گا۔" شامی بولا "ممکن ہے' میں تجھے واپسی پر گھر کے بجائے کسی اسپتال میں ملوں۔"

"یا حویلی روانہ کر دیا جائے گا" تیمور نے سوئی چبھوئی۔

"یہ بھی ممکن ہے" شامی نے خون کے گھونٹ پی کر کہا "منحوس..... منہ اور زبان والے..... لگتا ہے آج میرے خلاف تیری ساری باتیں پوری ہوں گی۔"

تیمور تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو وقار الملک نے اسے گھورا "یہ شامی کہاں ہے؟"

"اپنے نصیبوں کو رو رہا ہے" تیمور بے خیالی میں بولا۔

"اس کے نصیب ہی ایسے ہیں" دادا جان نے تائید کی اور نظام دین کو اسے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ شامی آیا تو وقار الملک نے اسے غور سے دیکھا "برخوردار! کیا بات ہے' کیا کوئی امتحان ہے؟"

"بس دادا جان! دنیا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے" شامی نے سرد آہ بھری اور ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

"بہرحال ہم نے یہ بتانا ہے کہ آج ہم نے ایس ایس قدوائی کو اور ان کی صاحب زادی کی دعوت کا اہتمام کیا ہے۔"

"جی!" شامی نے حلق میں پھنس جانے والا نوالہ پانی سے اتارا "ہمیں معلوم ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم..... جبکہ میں نے ابھی کسی کو بتایا نہیں ہے؟" دادا جان نے اسے گھورا۔

"جی..... وہ اسے فولاد خان نے بتایا تھا۔ اسے قدوائی صاحب کے چوکیدار نے بتایا تھا" تیمور نے بات سنبھالی اور دل ہی دل میں دعا کی کہ دادا جان فولاد خان سے انکوائری نہ کرنے بیٹھ جائیں۔

"اچھا..... اچھا' بہرحال..... تم دونوں کو لازمی طور پر شام کو موجود ہونا چاہیے۔"

اس بار تیمور کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ اس نے جلدی سے نوالہ نیچے کیا "لیکن دادا جان! مجھے آج ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"کوئی بھی ضروری کام ہو' وہ بعد میں کیا جائے گا" دادا جان فیصلہ کن لہجے میں بولے "تم دونوں آج شام کو ڈنر کے وقت گھر میں رہو۔"

"مارے گئے" شامی نے دل میں کہا۔ جیسے ہی تیمور ناشتا کر کے تیار ہونے اپنے کمرے میں گیا' شامی اس کے پیچھے لپکا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"احباب کھائیں گے قورمہ پلاؤ..... فاتحہ ہوگی۔" تیمور نے منطقی جواب دیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو شام کو ڈنر میں ہو مگر نوشی تجھے دیکھنے نہ پائے؟"

"سلیمانی ٹوپی میسر نہیں ہے مجھے" تیمور بھنا گیا "تو کیا اس لیے معرضِ وجود میں آیا تھا کہ میرے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا کرتا رہے۔"

"خود میری زندگی کون سی اچھی گزر رہی ہے" شامی نے شکوہ کیا "اور کیا میں تیرے لیے بارہا مشکلات سے دوچار نہیں ہوا۔ جب تجھے دوستوں کے ساتھ مری جانا تھا تو تیری خاطر

کاہل

دفتر کے ایک ملازم کی کاہلی مثالی تھی۔ ایک روز اچانک انہوں نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا۔ "بھئی آج میں جمناز یم جاؤں گا....."

"بہت خوب....." ایک صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ کو ورزش کرنے کا خیال آ ہی گیا!"

"ورزش کرنے کون کمبخت جا رہا ہے....." وہ صاحب منہ بنا کر بولے۔ "مجھے تو اپنی ممبر شپ کینسل کرانے جانا ہے۔"

مجھے رائے ونڈ جانا پڑا اور وہ جو..... جب تجھے زہرہ جبیں کی طرف سے بلیک میلنگ کا خطرہ تھا تو کس نے جان پر کھیل کر اسے باز رکھا تھا اور وہ.....''

''او کے..... او کے! میں نے مان لیا..... مگر اس مسئلے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تو..... کیا کر سکتا ہے.....؟'' شامی نے سوچا اور پھر اچھل کر بولا ''تو زخمی ہو سکتا ہے۔''

''میں زخمی ہو سکتا ہوں'' تیمور نے شامی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل جانے کے امکانات پر غور کر رہا ہو۔

''ہاں' دیکھ نا..... اگر تو اس طرح کا زخمی ہو جائے کہ تیرے سر اور منہ پر پٹیاں بندھ جائیں تب نوشی تجھے نہیں پہچان سکے گی۔''

''لیکن میں بھلا کیوں زخمی ہونے لگا؟'' تیمور نے اعتراض کیا۔

''مصنوعی زخم میرے دوست..... بس تجھے پٹیاں باندھنی ہوں گی' کل کھول لینا۔''

''اور دادا جان جب زخموں کے بارے میں پوچھیں گے تو انہیں کیا کہوں؟''

''ہاں..... یہ تو ہے..... ایسا کر' تو تین چار دن باندھے رہنا۔''

''شامی..... شامی!'' تیمور نے اپنے بال نوچے ''کاش کہ دادا جان مجھے لندن سے نہ بلاتے۔''

''اب تو آ ہی گیا ہے تو بھگت..... اگر تیرے ذہن میں کوئی اور تجویز ہے تو بتا..... ہم اس پر عمل کریں گے۔''

تیمور نے غور کیا مگر اس کے ذہن میں کوئی تدبیر نہیں آئی تھی۔ اس نے تھک ہار کر کہا ''ٹھیک ہے' تو جیتا میں ہارا..... ایسا ہی کرتے ہیں۔''

☆☆☆

گل شاہ تین دن تک اس کا میچ میں چھپا رہا تھا اور غور کرتا رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ بالآخر اس کے ذہن میں یہی حل آیا کہ لڑکی یعنی انوشہ کو غائب کر دیا جائے۔ سچ مچ غائب کر دیا جائے۔ کسی کو پتا نہ چلے کہ اس کے ساتھ کس نے کیا اور کیوں کیا؟ گل شاہ نے اپنے طور پر انوشہ کی آخری آرام گاہ بھی منتخب کر لی تھی۔ اپنے کاٹیج کے عقب میں اگی گھاس میں ایک گڑھا کھود کر وہ ہمیشہ کے لیے اس خطرے سے نجات حاصل کر لے گا۔ تین روز تک اسے کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ وہ روز کار میں اپنے گھر کا چکر لگاتا تھا۔ اسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ اس کے مکان پر بدستور تالا لگا تھا۔ اگر پولیس کا کوئی چکر ہوتا تو کم سے کم یہ تالا غائب ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ بات اب تک پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔

اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے انوشہ کو اغوا کرنے کے پلان پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس روز وہ اس کے معمولات کو ایک نظر دیکھنے کے لیے صبح سویرے اس پارک کے باہر موجود تھا۔ اس پارک میں انوشہ جاگنگ کرنے آتی تھی۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ اچانک اس کی نظر عقبی آئینے میں اس شخص پر پڑی جسے اس نے انوشہ کے ساتھ اپنے مکان کے باہر دیکھا تھا۔ وہ اس کی کار کی سمت آ رہا تھا۔ گل شاہ کو خطرے کا احساس ہوا' اس نے جلدی سے کار اسٹارٹ کر کے دوڑا دی تھی۔ بدحواسی میں وہ سائیڈ روڈ سے آتی انوشہ کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ کار تلے آتے آتے بچی تھی۔ گل شاہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کار تلے نہیں آئی ورنہ وہ پھنس جاتا۔ اس جرم کے بعد اس کے لیے فرار ناگزیر ہو جاتا۔ کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے' اس میں وہ لڑکا بھی ملوث ہو چکا ہے اور صرف انوشہ سے نمٹنے سے خطرہ ختم نہیں ہوگا۔ ممکن ہے انوشہ نے اسے گل شاہ کے بارے میں بتا دیا ہو۔ گویا اسے اب ایک سے نہیں بلکہ دو افراد سے نمٹنا تھا یعنی دو عدد قتل۔ یہی سوچ کر اس کے پیٹ میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

انوشہ نے حیرت سے تیمور کو دیکھا ''یہ کیا ہوا' آپ کو؟''

''بائیک سے سلپ ہو گیا تھا۔'' شامی نے جلدی سے آگاہ کیا ''یہ میرے کزن اور بہترین دوست تیمور رضا ہیں۔ ایم بی اے کر رہے ہیں۔''

تیمور کے لیے مسکرانا بے کار تھا۔ پٹیوں تلے اس کی مسکراہٹ بھلا کہاں نظر آتی۔ خون کے گھونٹ پی کر اس نے کسی قدر بدلی آواز میں انوشہ کو خوش آمدید کہا ''آپ سے مل کر اس حالت میں بھی خوشی ہو رہی ہے۔''

''جی' یہ بہت خوش اخلاق ہیں'' شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ وہ اپنا کردار بھول کر انوشہ سے فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اوہ..... مجھے افسوس ہوا آپ نے ہیلمٹ نہیں پہنا تھا؟''

''یہ اپنا ہیلمٹ بھول گیا تھا'' شامی نے پھر کہا۔

''کیا آپ ان کے سیکریٹری ہیں؟'' انوشہ نے طنز کیا۔

''نہیں'' شامی کھسیا گیا۔

''تب انہیں خود جواب دینے دیں۔''

''دراصل اسے بولنے سے بھی تکلیف ہو رہی ہے'' شامی انوشہ کی اتنی توجہ سے سلگ اٹھا تھا۔ وہ اتنے دن سے اس کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا' انوشہ نے کبھی اس پر اتنی توجہ نہیں دی تھی۔

تیمور کی ''مرہم پٹی'' ان کے ایک مشترکہ ڈاکٹر دوست نے کی تھی جو پہلے کئی بار سچ مچ ان کی پٹیاں کر چکا تھا۔ یونیورسٹی سے واپسی پر بائیک سلپ ہو جانے کی کہانی تراشی گئی۔ دادا جان بہرحال مطمئن تھے کہ وہ ڈنر میں شرکت کریں گے۔ اب صرف البم کا خطرہ باقی تھا لہٰذا مہرو کی ذمے داری لگا دی گئی تھی کہ وہ ڈنر کے بعد انوشہ کو کہیں لے جائے تاکہ وہ تصاویر نہ دیکھ سکے۔ مہمانوں کو تصاویر عام طور سے ڈنر کے بعد دکھائی جاتی تھیں۔ شامی کا غصے سے برا حال تھا۔ تیمور پٹیوں میں لپٹ کر بھی انوشہ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ اس سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی اور تیمور بے حد خوش تھا۔ شامی کو ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ مارے خوشی کے پٹیوں سے باہر نہ ہو جائے۔

ایس ایس قدوائی' وقار الملک کے ہمراہ مقامی اور بین الاقوامی کتوں کی نسلوں پر سیر حاصل بحث کر رہا تھا۔ اس نے ایک عدد افغان گرے ہاؤنڈ کی جوڑی منگوائی تھی جو سرحد پر حالات سازگار ہوتے ہی پاکستان پہنچ جاتی۔ شامی دیکھ رہا تھا کہ دادا جان ابھی سے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ اس نے چپکے سے ان کے کان میں کہا ''دادا حضور' کیا خیال ہے ڈنر کا آغاز نہ کر دیا جائے؟''

''ابھی نہیں'' دادا جان جھنجلائے ''ہم بات کر رہے ہیں۔''

''مہمان کو زیادہ دیر بھوکا رکھنا مناسب نہیں ہوتا'' شامی نے پھر سرگوشی کی تو دادا جان بادلِ ناخواستہ مانے۔

''ٹھیک ہے..... نظام دین سے کہو کھانا لگوائے۔''

شامی نے فوراً نظام دین کو حکم دیا کہ دس منٹ کے اندر کھانا لگوائے۔ منہ پر لگی پٹیوں کی وجہ سے تیمور کی ڈنر میں شرکت ممکن نہیں تھی۔ اسے انوشہ سے دور ہونا پڑا اور یہی شامی چاہتا تھا۔ جیسے ہی ڈنر لگا' وہ ان کے پاس پہنچ گیا ''آیئے مس انوشہ! ڈنر تیار ہے۔''

''آپ بھی آیئے'' انوشہ نے تیمور سے کہا ''بے شک آپ کھا نہیں سکتے لیکن ہمارے ساتھ بیٹھ تو سکتے ہیں۔''

''کیوں نہیں' ضرور'' تیمور کھڑا ہو گیا۔

''ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کو کہا ہے۔''

''وہ میں رات کو کر لوں گا۔''

کھانے کی میز پر بھی انوشہ اور تیمور پاس پاس بیٹھے تھے اور کیونکہ تیمور کھا نہیں رہا تھا اس لیے انوشہ سے باتیں کر رہا تھا۔ شامی کو آخر میں نشست ملی تھی۔ کھانے سے زیادہ خونِ جگر کے ٹکڑے چباتا اور پیتا رہا تھا۔ بیچ دتاب کھا کھا کر اس نے ایک گھنٹے میں اپنا کوئی ایک لیٹر خون جلا لیا تھا۔ ڈنر کے فوراً بعد اس نے مہرو کو نظروں سے اشارہ کیا مگر اس سے پہلے' تیمور نے انوشہ سے کہا ''آیئے' میں آپ کو دادا جان کی اس کوٹھی کی سیر کراؤں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا'' مہرو جان بچ جانے پر خوش تھی۔

''مہرو' تم مس انوشہ کو اپنی گڑیاں دکھانا چاہ رہی تھیں'' شامی نے کھنکھار کر کہا۔

''میں گڑیوں والی عمر سے گزر چکی ہوں'' انوشہ نے خشک لہجے میں کہا اور تیمور سے بولی ''آئیں' مجھے اپنا گھر دکھایئے۔''

''کیوں نہیں'' تیمور اٹھا تھا کہ شہر بانو نے انہیں روک لیا۔

''کہاں جا رہے ہو..... میں نے البم نکالی ہے۔ تمہیں خاندان کی تصاویر دکھاتی ہوں۔''

''پھپھو جان! ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی'' تیمور جلدی سے بولا اور شامی بھی جذبۂ رقابت فراموش کر کے اصل مسئلے کی

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹس | ہوم اکنامکس | بیوٹی پارلر کورس
انٹیریئر ڈیکوریشن | ایئر کنڈیشننگ | بوتیک فیشن | آٹو سوئنگ
ریڈیو ٹی وی وی سی آر ریپیئرنگ | الیکٹریشن | ڈرائفٹس مین | ڈرائنگ ٹیچنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ | صحافت | فوٹو گرافی | اسٹینو ڈیکوریشن
ہیلپر ورک | شمعی تعلیمی | مہر سازی | سلنگ بیوٹی | حکمت | اردو ادب
موٹر بائیکل مرمت | لائبریرین | کمپیوٹر | کوکنگ کیٹنگ | لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (ہارٹیکلچر) | میڈیکل ایڈ | آرٹ پینٹنگ | ڈینٹل ٹیکنیشن
پولٹری ڈیری فارمنگ | نیوز رپورٹر | فلاور میکنگ | پبلک ریلیشن آفیسر
یہ تمام کورسز فرد میں میٹریل ڈیزائن تصاویر اور لوگو یا گرام کیساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک ملتے ہیں ایک کورس کو گھر پر کرتے ہیں کورس کے دورانیہ اور سند لینے کے بعد ہمیں مکمل رابطہ ایک تحریر میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔
اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او، اسلام آباد

طرف متوجہ ہوا تھا۔

''اور کیا پھپھو جان! البم تو دکھاتی رہیے گا' اب یہ آتی رہیں گی۔''

''چائے آنے والی ہے'' شہر بانو فیصلہ کن لہجے میں بولیں ''اسی دوران میں البم بھی دکھادوں گی۔ اس کے بعد تم لوگ چاہو تو کوٹھی کی سیر کرلینا۔''

بادلِ ناخواستہ انہیں چائے پینے کے لیے کمرے میں جانا پڑا۔ شامی اور تیمور آنے والے وقت کا سوچ کر لرز رہے تھے۔ سب کے سامنے بے عزتی ہونے والی تھی۔ چائے اور البم کے آتے ہی تیمور کھڑا ہوگیا ''میری طبیعت خراب ہورہی ہے' اس لیے مجھے اجازت دیں۔''

''ابھی تو آپ کی طبیعت ٹھیک تھی'' انوشہ نے حیرت سے کہا ''آپ مجھے کوٹھی کی سیر کرانے لے جارہے تھے۔''

''ہاں..... لیکن اچانک تکلیف محسوس ہونے لگی ہے..... سیر آپ کو شامی کرادے گا۔''

''میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں'' شامی جلدی سے بولا ''مس انوشہ کو بعد میں سیر کروادیں گے۔''

''شامی تم تو بیٹھو'' شہر بانو بولیں ''تیمور کو آرام کرنے دو۔''

''تاکہ ساری شامت بے چارے شامی کی آئے'' اس نے زیرِ لب کہا اور تیمور کو جاتا دیکھتا رہا مگر جب شہر بانو نے البم اٹھائی تو اس سے رہا نہ گیا۔ ''پھپھو جان! میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہورہی ہے..... میں ابھی آتا ہوں۔''

اس بدتہذیبی پر دادا جان اور پھپھو جان نے اسے بیک وقت گھورا تھا لیکن یہیں روکا شامی جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتا وہاں سے بھاگا۔ تیمور پورچ میں بائیک پر فرار ہونے والا تھا جب شامی نے اسے جالیا۔

''اکیلے اکیلے بھاگ رہا تھا'' شامی اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

''نہیں' سارے محلے کو لے کر بھاگتا'' تیمور نے جھنجلا کر کہا اور بائیک آگے بڑھادی۔

☆☆☆

شامی تیسرے دن ڈرتے ڈرتے انوشہ کے ساتھ جاگنگ کے لیے نکلا تھا۔ گھر میں پُراسراری خیریت تھی۔ یعنی دادا جان اور پھپھو جان انہیں کچھ کہہ تو نہیں رہے تھے لیکن معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ دادا جان تو کئی بار بلاوجہ خفا بھی نظر آئے تھے۔ تیمور اور شامی بالکل اندازہ نہیں لگا سکے کہ ان کے علم میں ان دونوں کی حرکت آگئی ہے۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا کہ دادا جان کے قہر کا آتش فشاں فوری طور پر نہیں پھٹا تھا۔ بعد میں مناسب موقع پر انہوں نے ان دونوں کی گوشمالی کی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

''تیمور' مجھے لگتا ہے دادا جان میرے رزلٹ کا انتظار کررہے ہیں'' شامی نے اندیشوں سے لرزتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد وہ جوابی کارروائی کریں گے۔''

''میں بلاوجہ مارا جاؤں گا'' تیمور کراہا ''میری توبہ' جو آئندہ تیرے ساتھ کھانے پر کہیں جاؤں۔''

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے انوشہ نے ان لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔''

''ممکن ہے اسے یاد ہی نہ ہو'' تیمور خوش ہوکر بولا۔

''زیادہ خوش فہمی مناسب نہیں ہے'' شامی نے خبردار کیا ''یہ لڑکیاں اندر سے بڑی گہری ہوتی ہیں' مجھے چیک کرنا پڑے گا۔''

''میں بھی چیک کرسکتا ہوں'' تیمور نے کہا ''میری صورت تو وہ دیکھ چکی ہے..... اور مجھ سے بے تکلف.....''

''تیمور..... مارِ آستین.....!'' شامی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ''لگتا ہے اس نام نہاد رقیب سے پہلے تو میرے ہاتھوں مارا جائے۔''

''تیری مرضی..... میں تو تجھے اس کے عتاب سے بچانا چاہتا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ ہمیں پہچان گئی ہے اور پہلے خود بے عزت کرنا چاہتی ہے۔''

''تو تو بے عزتی کروانے کے لیے کیوں مرا جارہا ہے؟'' شامی غرایا ''یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔''

تیسرے دن شامی ہمت کرکے نکلا۔ کچھ دیر وہ انوشہ کے پیچھے رہا اور پھر اس کے برابر میں آگیا ''کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں'' انوشہ نے مختصر جواب دیا۔ شامی اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس کا لہجہ کیا کہہ رہا تھا۔

''کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' شامی نے مزید ہمت کی۔

''کس بات پر؟'' انوشہ نے پھر اسی انداز میں کہا۔

''اس دن جو میں وہاں سے چلا گیا تھا: جب پھپھو جان آپ کو البم دکھارہی تھیں؟''

''میں بور ضرور ہوئی تھی لیکن ناراض نہیں ہوں'' انوشہ بولی ''میں نے تیمور کی تصویر بھی دیکھی ہے' جانے وہ مجھے کیوں جانا پہچانا لگا۔''

شامی کا خون خشک ہوگیا ''وہ ایسے ہی..... بعض اوقات آدمی کسی کو دیکھتا ہے تو وہ اسے جانا پہچانا لگتا ہے حالانکہ ان میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر آپ ہمارے سامنے رہتی ہیں' تیمور کو کبھی نہ کبھی آتے جاتے دیکھا ہوگا'' شامی جلدی جلدی وضاحت کرنے لگا۔

''ہاں' ممکن ہے'' انوشہ بے خیالی میں بولی ''ویسے پٹیوں میں لپٹے دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ آپ کا کزن اتنا ہینڈسم ہوگا۔''

شامی کا موڈ خراب ہوگیا۔ ''بس جی..... میں اس سے اسی معاملے میں مار کھاتا ہوں..... ورنہ ہر لحاظ سے اس سے بہتر ہوں۔ اس نے صرف لڑکیوں کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ کیونکہ مجھے اس قسم کی خرافات سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے انجینئرنگ یونیورسٹی چلا گیا۔''

''رئیلی!'' انوشہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''شاید آپ سوچ رہی ہیں کہ میں روزانہ آپ کے ساتھ جاگنگ کرتا ہوں اس لیے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے متاثر کیا ہے..... لیکن.....''

''مجھے یقین ہے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں'' انوشہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''پلیز' اب ذرا چپ رہیں۔ میں ایکسرسائز کرتے ہوئے بات کرنا پسند نہیں کرتی ہوں۔''

''جی شکریہ!'' شامی نے جل کر کہا اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ انوشہ پارک کے چکر لگانے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ لڑکی اس سے بالکل متاثر نہیں ہے جبکہ تیمور سے وہ خاصی متاثر لگ رہی تھی۔ مارے غم و غصے کے اس نے انوشہ پر لعنت بھیجنے اور اپنی توجہ تعلیم کی طرف لگانے کا بھی سوچا تھا۔ وہ اٹھ کر واپس جانے لگا تھا۔ انوشہ نے اسے جاتا دیکھا تو پارک کا چکر لگانے کے بعد اس کے پیچھے روانہ ہوگئی تھی۔ شامی اس وقت سڑک عبور کرکے سائڈ روڈ پر جارہا تھا۔ اسی لمحے ایک کار آکر عین اس کے پاس رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر گل شاہ تھا۔ اس نے ذرا جھک کر انوشہ کو پستول دکھایا ''اندر آجاؤ..... ورنہ یہیں گولی مار کر چلا جاؤں گا۔''

''تت..... تم وہی ہو..... اس گھر والے.....'' انوشہ نے اسے پہچان لیا تھا۔

''ہاں..... اور لگتا ہے تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اندر آجاؤ..... میں تین تک گنوں گا۔''

''میرا قصور کیا ہے؟'' انوشہ روہانسی ہوگئی ''کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

''معزز مہمانانِ گرامی! کھانا تیار ہوا ہی چاہتا ہے..... اس دوران میں میرے شوہر آپ کو ایک نئی انشورنس پالیسی کے فوائد کے بارے میں بتائیں گے۔ آپ کو معلوم ہی ہے یہ ایک انشورنس ایجنٹ ہیں۔''

''ایک..... دو.....'' گل شاہ نے گننا شروع کردیا۔ اس کے تین کہنے سے پہلے انوشہ فرنٹ سیٹ پر آبیٹھی۔

''تم ایک سنگین جرم کررہے ہو۔ اغوا کی سزا اب موت بھی ہوتی ہے۔''

''وہ اغوا برائے تاوان کی ہوتی ہے'' گل شاہ نے کار چلادی۔ پستول کا رخ اس نے انوشہ کی طرف رکھا تھا۔ ''اور میں تمہارا تاوان مانگوں گا ہی نہیں۔''

''پولیس نے تمہیں پکڑا تو یہ بات کون مانے گا؟''

''پولیس مجھے کبھی نہیں پکڑ سکتی..... اب اپنا منہ بند رکھو۔''

ذرا دیر میں وہ آبادی سے باہر آچکے تھے۔ انوشہ کو اب خوف محسوس ہورہا تھا۔ ''تت..... تم مجھے کہاں لے جارہے.....''

''چپ رہو.....'' گل شاہ غرایا تھا ''ابھی پتا چل جائے گا اور ہاں' یاد رکھنا۔ راستے میں کسی پولیس والے کو دیکھ کر تم نے اشارہ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

انوشہ اس کے لہجے میں درندگی محسوس کرکے کانپنے لگی۔ وہ کوشش کے باوجود اسے نہ بتا سکی کہ اس سے برا فی الوقت انوشہ کے لیے اور کوئی ہے بھی نہیں۔ کاش اس نے شامی کا دل نہ توڑا ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ رہتا اور یہ شخص اتنی آسانی سے اسے اغوا نہیں کرسکتا تھا۔ نہ جانے یہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے؟

☆☆☆

شامی نے اتفاق سے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس وقت وہ سائیڈ روڈ پر تقریباً داخل ہوچکا تھا تب اسے انوشہ جانی پہچانی

مورس میں بیٹھتی نظر آئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انوشہ کیوں بیٹھی تھی۔ کیا اسے اغوا کیا جا رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی شامی پوری رفتار سے مورس کی طرف بھاگا۔ مگر انوشہ کے بیٹھتے ہی وہ پوری رفتار سے روانہ ہوگئی تھی۔ اچانک شامی کے عقب میں بریک چرچرائے اور ڈبل روٹی والی وین رک گئی۔ شامی ایک بار پھر بچ گیا تھا۔ شامی نے مڑ کر دیکھا۔ وین کا ڈرائیور غضب ناک تاثرات کے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔

''الودے پتر! آج میں تینوں چھڈاں گا نئیں۔''

شامی دوسری طرف بھاگا۔ وین کا مالک خاصا تنومند تھا۔ وہ وین کے پیچھے آیا۔ ڈرائیور اس کے پیچھے تھا۔ شامی گھوم کر سامنے والے حصے میں آیا اور ڈرائیور سے بچنے کے لیے وین کے اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ شیشے بند تھے اور انجن اسٹارٹ تھا۔ ڈرائیور نے شیشے پر ہاتھ مارا اور چلایا ''کھول الودے پتر!''

''تو خود الودا پتر!'' شامی نے جواب آں غزل کے طور پر عرض کی اور وین آگے بڑھادی۔ مورس خاصی دور جا چکی تھی اس نے ایکسی لریٹر دبایا تو وین کے ساتھ ریس لگانے والا ڈرائیور پیچھے چلّاتا رہ گیا۔

''اوئے ..... اوئے میری گڈی..... تیری تو.....'' اس سے آگے شامی نہیں سن سکا تھا۔ اس کے خیال میں ڈرائیور برا بھلا کہنے میں حق بجانب تھا مگر مسئلہ انوشہ کو بچانے کا تھا جسے مورس میں گل شاہ اغوا کیے لے جا رہا تھا۔ وین کا انجن زیادہ طاقت ور نہیں تھا۔ شامی بہ مشکل طاقت ور مورس کو نظروں میں رکھے ہوئے تھا جو آبادی سے باہر جا رہی تھی۔ ڈبل روٹی کی وین میں مورس کا تعاقب کرنے کا خیال اچانک ہی اس کے ذہن میں وارد ہوا تھا۔ کیونکہ وہ تو ڈرائیور سے بچنے کے لیے وین میں گھسا تھا۔ مگر جب مورس کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا تو اچانک ہی وین چلادی تھی۔

وین خاصی خستہ حالت میں تھی اور پچاس سے اوپر کی اسپیڈ پر اس کے مختلف حصے بجنے لگتے تھے۔ مورس اڑی جا رہی تھی۔ شامی کو خطرہ تھا کہ یہ کھٹارا وین عین موقع پر جواب نہ دے جائے یا پھر پیٹرول نہ ختم ہوجائے۔ وہ مورس کو کھو دیتا۔ نصف گھنٹے بعد مورس ایک نوآباد کالونی میں داخل ہوئی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ اندر آنے کے بعد چھوٹی سڑکوں پر مورس کی رفتار خود بہ خود سست ہوگئی تھی۔ شامی کے لیے اب اس کا تعاقب کرنا کسی قدر آسان ہوگیا تھا۔ لیکن اچانک وہ ہوا جس سے شامی سارے راستے ڈرتا آیا تھا۔ وین کے انجن سے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ اس نے چند ہچکیاں لیں اور جھٹکے سے بند ہوگیا۔ شامی نے جلدی سے سیلف گھمایا مگر انجن گھر گھرا تا رہا' اسٹارٹ نہیں ہوا تھا۔ مورس غائب ہوچکی تھی۔

☆☆☆

انوشہ کے دل میں کئی بار آیا کہ وہ چلتی کار سے چھلانگ لگادے مگر ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کا خوف اسے روکے ہوئے تھا۔ وہ کئی بار گل شاہ سے پوچھ چکی تھی کہ آخر وہ اسے یوں اغوا کس خوشی میں کر کے لے جا رہا ہے۔ اس کے مسلسل پوچھنے سے تنگ آکر گل شاہ نے جواب دیا ''تم جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیوں بار بار پوچھ رہی ہو'' اس نے بدمزگی سے جواب دیا۔

''میں کیسے جانتی ہوں؟'' انوشہ چلائی۔

''کیا تم نے مجھے پہچان نہیں لیا ہے؟''

''ہاں..... تو اس میں اغوا کرنے کی کون سی بات ہے؟''

''خوب..... تم نے مجھے پہچان لیا ہے پولیس کو میرے بارے میں بتا کر میرا سارا مستقبل تباہ کرسکتی ہو اور پوچھ رہی ہو کہ کیوں اغوا کر رہا ہوں؟''

''اگر میں تمہیں پہچان گئی ہوں تو اس میں پولیس کو بتانے والی کیا بات ہے؟ اگر تم راتوں کو میرے گھر کے آگے کھڑے رہے ہو تو اتنی سی بات پر میں پولیس کو تو رپورٹ نہیں کرسکتی۔''

گل شاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ کیا یہ لڑکی اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ ایک طرف وہ اسے پہچاننے کا دعویٰ کر رہی تھی اور دوسری طرف اس نے ڈکیتی والی بات کا سرے سے تذکرہ گول کردیا تھا۔ ''تم نے مجھے کیسے پہچانا؟''

''شامی نے مجھے تمہارا حلیہ بتایا تھا اور تمہارا گھر بھی دکھایا تھا۔ پھر تم نے مجھے کار سے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی۔ شامی نے بتایا تمہارے پاس مورس کار ہے۔ میں نے فٹ پاتھ پر گرتے ہوئے تمہاری جھلک بھی دیکھی تھی۔ آج جب تم نے مجھے زبردستی روکا تو میں تمہیں پہچان گئی۔''

''تو کیا تم نے اس سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا؟''

''نہیں دیکھا تو ہے لیکن یہ یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا تھا۔''

''وہ بھی یاد آجائے گا اور تب تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں تمہیں اغوا کرنے میں حق بہ جانب تھا بلکہ اب جو کروں گا اس میں بھی حق بہ جانب ہوں۔''

''کک..... کیا کرو گے؟'' انوشہ لرز گئی ''دیکھو' میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔''

''یہ شامی کون ہے؟'' گل شاہ نے اس بار نرمی سے پوچھا۔

''ہمارا پڑوسی ہے۔ اس نے تمہیں ہمارے گھر کے سامنے

دیکھا تھا۔ اسی نے تمہارے گھر کا سراغ لگایا تھا اور مجھے بتایا تھا۔ تم کیوں راتوں کو وہاں کھڑے ہوتے تھے؟''

''ابھی پتا چل جائے گا'' گل شاہ نے جواب دیا۔ کاٹیج قریب آگیا تھا ''ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں' کوئی غلط حرکت نہ کرنا ورنہ میں گولی مار دوں گا۔ اس جگہ دور دور تک کوئی نہیں ہے'' اس نے کار کاٹیج کے سامنے روک دی ''نیچے اترو.....'' اس نے پستول سے اشارہ کیا۔

انوشہ کانپتے پیروں سے نیچے اتری ''پلیز! مجھے جانے دو..... میں تمہارے خلاف کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔''

''اب آہی گئی ہو تو کچھ دیر میری مہمان رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ لو چابی' دروازہ کھولو۔'' اس نے چابی انوشہ کو تھمادی۔ مجبوراً اس نے تالا کھولا ''پستول کے سامنے وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی' اندر کاٹیج ویران تھا۔ بے حد معمولی سا سامان تھا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی احساس ہوجاتا تھا کہ یہاں کوئی رہتا بھی ہے تو یہ اس کا عارضی ٹھکانا تھا۔ ہر شے گرد سے اٹی تھی صرف چند جگہیں صاف نظر آرہی تھیں۔ انوشہ نے سہمی ہوئی نظر سے گل شاہ کو دیکھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس جگہ ایک مرد کے ساتھ اکیلی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ زبردستی پر اتر آتا تو اسے سوائے خدا کے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

''اس کرسی پر بیٹھ جاؤ'' گل شاہ نے اسے حکم دیا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے کرسی پر بیٹھی تھی کہ گل شاہ نے عقب سے ایک بیلٹ اس کے سینے اور بازوؤں کے گرد رکھ کر اسے کرسی کے عقب میں باندھ دیا۔ وہ مچلی ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے چلّا کر کہا۔

''اپنا اطمینان کر رہا ہوں کہ تم کوئی غلط حرکت نہ کرو'' گل شاہ دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب آگیا ''مس انوشہ! میں تم سے جو پوچھوں' اس کا درست جواب دینا۔ یہ بتاؤ تمہیں یاد آیا کہ تم نے پہلے مجھے کہاں دیکھا تھا؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے نہیں یاد'' انوشہ بیلٹ کی سخت گرفت میں تلملا رہی تھی۔

''چلو میں یاد دلاتا ہوں۔ ایک سرد رات تھی۔ بارش زدہ دن تھا۔ تم عجلت میں اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے ایک شخص سے ٹکرائی تھیں۔''

''میرے خدا! وہ تم تھے نا؟'' انوشہ نے بے ساختہ کہا۔

''دیکھا' یاد آگیا نا.....'' گل شاہ نے افسردگی سے کہا ''مجھے یہی خطرہ تھا۔ میں یاد نہ بھی دلاتا تو کبھی نہ کبھی تمہیں یاد آجاتا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔''

''اگر میں اس رات تم سے ٹکرا گئی تھی تو یہ کون سا اتنا بڑا قصور تھا؟'' انوشہ چلائی۔

''نہیں' ٹکرانا اتنا بڑا قصور نہیں تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں وہاں موجود جیولرز کی دکان سے ڈاکا مار کر نکل رہا تھا۔ کسی نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا سوائے تمہارے..... اور اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص نہ رہے جو مجھے دیکھ چکا ہو۔''

انوشہ کے جسم میں دہشت کی لہر سی دوڑ گئی تھی ''کک..... کیا مطلب؟''

''مطلب بھی بتادوں گا'' گل شاہ نے اٹھ کر اس کے منہ پر چوڑا ٹیپ چپکایا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

شامی بے بسی سے مورس کو غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس کالونی میں آیا ہے' اس کا مطلب تھا وہ اسی جگہ کہیں رہ رہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ گل شاہ کی مورس تھی۔ اس کی عقبی بریک لائٹ پر ڈینٹ تھا۔ جو اس مورس پر موجود تھا۔ وہ وین سے اترا اور اس نے اس طرف بھاگنا شروع کردیا جس طرف مورس گئی تھی۔ کالونی کے شروع میں اِکّا دُکّا مکانات تھے۔ درمیان میں مشکل سے ایک دو نظر آئے اور اس وقت شامی جس جگہ کھڑا تھا وہاں سوائے جھاڑ جھنکاڑ کے اور کچھ نہیں تھا۔ راستے بھی کچے تھے۔ وہ اس راستے پر بھاگتا رہا جس پر کار کے پہیوں کے نشانات تھے۔ بعض مقامات پر اونچی گھاس اور جھاڑیاں راستے پر آگئی تھیں۔ اسے ہاتھ سے راستہ بنانا پڑتا تھا۔ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے راستوں تک پر گھاس اگ آئی تھی۔ ایک بار وہ غلط راستے پر مڑ گیا تھا جو ندی کے کنارے جا کر ختم ہوگیا تھا۔ وہ واپس پلٹ کر آیا تھا۔ دس منٹ بعد اسے کاٹیج نظر آگیا تھا۔ وہ چاروں طرف سے اونچی جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اگر اس کی اونچی چھت نہ نظر آتی تو شاید شامی کو پتا بھی نہ چلتا۔ وہ محتاط قدموں سے چلتا کاٹیج کے سامنے آیا۔ مورس کار نظر آتے ہی اس کے اندر جوش و ولولہ بھر گیا تھا۔ وہ انوشہ کے قریب آگیا تھا۔

شامی نے تار کے پاس آکر جھک کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کوئی آواز آرہی تھی لیکن نہیں..... ہلکی ہلکی سی آواز آرہی تھی جیسے کوئی کلہاڑی سے درخت کے تنے پر ضرب لگا رہا ہو۔ اس نے کاٹیج سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کھڑکیوں کے شیشوں پر اتنی گرد تھی کہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس طرف بڑھا جس طرف سے آواز آرہی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ یہ کسی پھاوڑے یا گینتی کا ڈنڈا تھا جس کے ایک

طرف پکڑنے والا حصہ تھا' اس نے یہ ڈنڈا اٹھالیا۔ شامی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے ڈنڈا بدست کسی کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ وہ احتیاط سے گھاس دائیں بائیں کرتا' آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ اچانک ہی گل شاہ نظر آیا تھا۔ وہ کدال ہاتھ میں لیے زمین کھود رہا تھا۔ آواز دراصل زمین سے کدال ٹکرانے کی تھی۔ شامی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ زمین کیوں کھود رہا تھا۔ معاً اس کے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا گل شاہ قبر کھود رہا تھا مگر کس کے لیے..... انوشہ کہاں تھی؟

کم از کم وہاں اسے انوشہ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ احتیاط سے واپس آیا۔ انوشہ کو کاٹیج میں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے واپس آکر کاٹیج کا سامنے والا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ شامی گھوم کر عقبی حصے میں آیا۔ اس طرف بھی ایک دروازہ تھا اس نے اسے چیک کیا۔ یہ کھلا تھا۔ وہ اندر آیا۔ اسے اطمینان تھا کہ گل شاہ یہاں نہیں ہے۔ دروازہ باورچی خانے میں کھلا تھا۔ اس نے اندر کمرے میں جھانکا اور انوشہ کو کرسی سے بندھے پا کر اچھل پڑا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ انوشہ خود کو آزاد کرانے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب شامی اس کے گرد بندھی بیلٹ کا بکل کھولنے کی کوشش کر رہا تھا تو انوشہ ناک سے آوازیں نکال کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر شامی نے اس کے منہ پر لگا ٹیپ کھینچ لیا اور انوشہ چلائی ''شامی بچو!'' اسی لمحے کوئی ٹھوس چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ چکر کر گر پڑا۔

☆☆☆

''شکر ہے' بروقت آیا'' گل شاہ نے مسکرا کر کہا۔ انوشہ چیخے جا رہی تھی۔ گل شاہ نے دوبارہ اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک چادر پھاڑ کر اس کی پٹیاں بنائیں اور شامی کے ہاتھ پیر اس سے باندھ دیے۔ جس وقت وہ گڑھا کھود رہا تھا' اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا تھا۔ وہ واپس آیا اور کاٹیج کا عقبی دروازہ کھلا پا کر چوکنا ہو گیا۔ کوئی اس طرف آیا تھا۔ اس نے کدال رکھ کر ایک عدد ڈنڈا اٹھالیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا۔ انوشہ نے اسے دیکھ لیا تھا جب شامی اس کی بندشیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے انوشہ کے منہ سے ٹیپ اکھاڑا تھا' اس نے چیخ کر خبردار کیا تھا۔ اسی لمحے گل شاہ نے شامی کے سر پر ڈنڈا رسید کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔

شامی کی مشکیں کسنے کے بعد گل شاہ نے باچھیں پھیلا کر انوشہ کی طرف دیکھا۔ ''میں اس کے لیے بھی پریشان تھا' تم سے نمٹ کر مجھے اسے بھی راستے سے ہٹانا تھا۔ میری خوش قسمتی دیکھو' یہ خود آپھنسا۔ پتا نہیں اس نے ہمارا تعاقب کیسے کیا..... خیر' اب مجھے ایک بار ہی محنت کرنا پڑے گی..... تمہیں پتا ہے میں باہر کیا کر رہا تھا.....؟'' وہ مسکرایا ''میں تمہارے لیے قبر کھود رہا تھا۔ اب مجھے اس قبر کو ذرا زیادہ بڑا کرنا پڑے گا تاکہ تم دونوں اس میں سما جاؤ۔''

انوشہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے سر ہلایا لیکن منہ پر ٹیپ کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھی۔ گل شاہ نے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''فکر نہ کرو..... تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ بے ہوش ہے' تمہیں بھی بے ہوش کر دوں گا۔ پھر تم دونوں کو اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈالوں گا تو قتل کا الزام بھی مجھ پر نہیں آئے گا' کیا خیال ہے؟''

انوشہ کو اپنا دل حلق میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ گل شاہ اپنے عزائم سے آگاہ کر کے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انوشہ نے خود دوبارہ بل کھانا اور آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی مگر بیلٹ اتنی سختی سے بندھی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اسے ذرا سا نرم بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ بیلٹ اس کے نرم و نازک جسم میں گڑی جا رہی تھی۔ ایک بار کوشش کر کے وہ ذرا سا پیروں پر اٹھی تھی مگر بیلٹ کی وجہ سے اس کا نچلا جسم بھی کرسی میں ایک طرح سے پھنس گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر نہیں کھڑی رہ سکتی تھی۔

اس سے پہلے اس کی جدوجہد عمومی تھی لیکن جب سے گل شاہ اسے موت کی نوید سنا کر گیا تھا' اس کے جسم میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ اس نے آزاد ہونے کے لیے دیوانہ وار جدوجہد شروع کر دی تھی۔ وہ خود کو جھٹکے دینے لگی۔ کرسی لکڑی کی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ ٹوٹ جائے گی اور بیلٹ ڈھیلی پڑ جائے گی۔ مگر جھٹکے دینے کے باوجود کرسی میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر بیلٹ اس کی پشت سے اوپر نکالنے کی کوشش کرے۔ اس نے پاؤں اوپر کیے۔ خاصی کوشش کے بعد اس نے ایڑیاں کرسی کے کنارے پر ٹکائیں اور جسم اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ خاصی دیر کے بعد وہ خود کو اتنا اٹھانے میں کامیاب ہوئی کہ اپنے دونوں پاؤں کرسی کی نشست پر رکھ سکے۔ اب کسی قدر آسانی سے خود کو اوپر کرنے لگی۔ جھٹکے دے دے کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ جہاں جہاں بیلٹ بندھی تھی' وہاں سے یوں لگ رہا تھا جیسے کھال اتر گئی ہو مگر تکلیف سے زیادہ فکر اسے آزاد ہونے کی تھی۔ بیلٹ رفتہ رفتہ اوپر ہو رہی تھی اور وہ آرام سے پنجوں کے بل بیٹھ سکتی تھی۔

بیلٹ اس کے جسم اور کرسی کی پشت پر ترچھی ہونے کے سبب مزید ترچھی ہو رہی تھی۔ تکلیف کی وجہ سے اس کے آنسو نکل آئے تھے۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کے منہ سے کراہ نکل رہی تھی۔ جب تھک جاتی تو آرام کرتی اور شامی کو آواز دیتی جو ہوش وحواس سے بے گانہ نظر آرہا تھا۔ انوشہ کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اسے اپنے باپ کا خیال آرہا تھا۔ وہ ایس ایس قدوائی کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ اس طرح غائب ہوئی تو اس کے باپ پر کیا گزرے گی۔ وہ کیا سوچے گا اور ممکن ہے اس کی گم شدگی کو شامی سے منسلک کردیا جائے۔ اس کا باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے نئے جوش کے ساتھ بیلٹ کو کرسی کی پشت سے نکالنے کی کوشش شروع کردی۔ بیلٹ خاصی اوپر آچکی تھی۔ وہ پوری قوت صرف کررہی تھی۔ اسے معلوم تھا' وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ گل شاہ کسی وقت بھی واپس آسکتا تھا اور ممکن ہے وہ اسے آزاد ہونے کی کوشش کرتے دیکھ کر قتل کردے۔ شامی بے ہوش پڑا تھا اور پھر بندھا ہوا تھا۔ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ انوشہ کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ دبی آواز میں رونے کے ساتھ گل شاہ کو کلاسیکل گالیوں سے نواز رہی تھی۔ خود کو آزاد کرانے کا جذبہ جنون بنتا جارہا تھا۔ ایک بار اس نے پوری شدت سے جھٹکا دیا۔ اس نے خود کو فضا میں بلند ہوتے پایا اور وہ کرسی کے عقب میں جاگری۔ بیلٹ کرسی کی پشت سے نکل گئی تھی۔ گرنے سے اسے چوٹ لگی تھی۔ مگر یہ موقع رونے کا نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر بیلٹ کو نیچے سرکایا۔ اب اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ذرا سی کوشش سے انوشہ نے اسے نیچے کرکے اپنی پتلی کمر تک لا کر اس میں سے بازو نکال لیے۔ بیلٹ کی رگڑ سے جسم میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے بیلٹ سے نجات حاصل کی اور پھر شامی کی بندشیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر گل شاہ نے اسے بھی اتنی سختی سے باندھا تھا کہ انوشہ اسے کھولنے میں ناکام رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کاٹیج کا جائزہ لیا۔ کچن میں اسے ایک چھری مل گئی اس نے واپس آکر شامی کی بندشیں اس سے کاٹ دی تھیں۔

''شامی..... خدا کے لیے ہوش میں آؤ'' اس نے روہانسی ہوکر کہا۔

شامی کراہنے لگا۔ انوشہ نے پانی تلاش کرکے پوری بوتل شامی کے منہ پر الٹ دی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''تیمور کے بچے!'' اس نے دھاڑ کر کہا۔

''ہوش میں آؤ..... یہاں تیمور نہیں ہے'' انوشہ نے اسے جھنجوڑا۔

شامی نے چاروں طرف دیکھا ''ہم کہاں ہیں؟''

''گل شاہ کی قید میں.....'' انوشہ نے اسے آگاہ کیا۔

''اب بھاگنے کی فکر کرو۔ اس سے پہلے کہ وہ آجائے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''جہنم میں.....'' انوشہ بھنا گئی۔ ''وہ ہماری قبر کھودنے گیا ہے۔''

''قبر.....!'' شامی اچھل پڑا تھا ''لیکن ابھی تو ہم زندہ ہیں۔''

''تم فرار ہونے کے بجائے اسی طرح یہاں کھڑے بکواس کرتے رہے تو زندہ بھی نہیں رہو گے'' انوشہ نے اسے دھکیلا ''یہاں سے نکلو۔''

شامی کا دل اندر سے لرز رہا تھا لیکن اوپر سے اس نے حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے کاٹیج کے عقبی دروازے سے باہر جھانکا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی' کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس دوران میں انوشہ نظر بچا کر جسم کے ان حصوں کو سہلا رہی تھی' جہاں پر بیلٹ سے رگڑ آئی تھی۔ شامی اس کی طرف مڑا تو وہ جلدی سے سیدھی ہوگئی ''وہ باہر نہیں ہے'' شامی نے اسے آگاہ کیا۔

''تو نکلو یہاں سے۔ کیا اس کے آنے کا انتظار کررہے ہو؟'' انوشہ نے اسے دھکیلا۔

وہ باہر آئے' شامی نے ڈنڈا اٹھا لیا تھا ''اس کا فائدہ نہیں ہے' اس کے پاس پستول ہے۔'' انوشہ نے اسے آگاہ کیا۔ شامی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

''اب کیا کریں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''ظاہر ہے' بھاگ چلیں۔''

''اس طرف تو وہ قبر کھود رہا ہے'' شامی نے بتایا ''اور اس طرف فرار کا راستہ ہے۔''

''ہم اس طرف سے نہیں جائیں گے'' انوشہ کا ذہن بہتر طور پر کام کررہا تھا ''ہماری گمشدگی محسوس کرتے ہی وہ پیچھے آئے گا' اس کے پاس کار اور پستول ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

''پھر کہاں جائیں؟''

''اس سمت سے جاتے ہیں'' انوشہ نے تیسری سمت اشارہ کیا تھا۔ اسی لمحے انہیں جھاڑیوں کی طرف سے آہٹ سنائی دی' جیسے کوئی اس طرف سے آرہا ہو..... وہ ڈر کر بھاگے اور جھاڑیوں میں گھستے چلے گئے۔

☆☆☆

گل شاہ نے گڑھے کا معائنہ کیا۔ یہ کوئی پانچ فٹ گہرا اور اتنا ہی لمبا چوڑا تھا۔ نرم مٹی ہونے کی وجہ سے اسے کھدائی میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے خیال میں اتنا گڑھا مناسب تھا۔ پھر اسے گھاس بھی ڈھک لیتی اور شاید قیامت تک کسی کو ان کا سراغ نہ ملتا۔ یہ کاٹیج گل شاہ نے فرضی نام سے لے رکھا تھا۔ کسی زمانے کا بنوایا اس کے پاس جعلی شناختی کارڈ تھا۔ اس کی مدد سے کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر مستقبل میں لاشیں برآمد بھی ہوجاتیں تو اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ وہ دوبارہ اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتا ورنہ جب تک چاہتا اس کاٹیج کو اسی طرح عارضی ٹھکانے کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔

گڑھے سے مطمئن ہوکر وہ کاٹیج کی طرف آرہا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اسے لگا جیسے کوئی بات کررہا ہو اور پھر کسی کے بھاگنے کی آواز بھی آئی۔ مگر جب وہ لپک کر کاٹیج کے سامنے آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ عقبی دروازہ ایک بار پھر کھلا دیکھ کر اس کے اندر الارم بجنے لگا تھا۔ وہ اندر کی طرف بھاگا اور انوشہ اور شامی کو وہاں سے غائب پا کر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا تھا۔ اس نے پستول نکالا اور کاٹیج کے اس طرف آیا جہاں اس نے کسی کے بھاگنے کی آواز سنی تھی۔ اس کی ذرا سی غفلت سے وہ دونوں نکل گئے تھے۔ اگر وہ کچن کے باہر کھلنے والے دروازے کو باہر سے لاک کردیتا تو وہ ہرگز نہیں جاسکتے تھے۔ ان لوگوں نے چالاکی کی تھی' آبادی کی طرف جانے کے بجائے جھاڑیوں میں گھس گئے تھے جہاں ان کا پیچھا کرنا اور انہیں تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر وہ آبادی کی طرف بھاگتے تو گل شاہ کار میں ایک منٹ میں انہیں پکڑ سکتا تھا۔ جھاڑیوں میں گھستے ہی وہ محتاط ہوگیا۔ اتنے چالاک لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کہیں گھات لگا کر بیٹھے ہوں اور اس کے سامنے آتے ہی اس پر حملہ کردیں۔ اونچی گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بہت شور ہو رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے رک کر آواز سنتا اور جس طرف سے آواز آتی تھی' اسی طرف بڑھ جاتا۔

گل شاہ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ انہیں دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو لا کر گڑھے میں ڈالنا اتنا مشکل کام نہیں رہے گا۔ وہ اونچی گھاس کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اسے سانپوں کا خوف بھی تھا۔ جو اس علاقے میں پائے جاتے تھے گزشتہ روز بھی اس نے ایک سانپ دیکھا تھا جو بل کھاتا جھاڑیوں میں غائب ہوگیا تھا۔ لہٰذا عین ممکن تھا' ان دونوں کے بجائے اس کا سامنا کسی سانپ سے ہوجائے۔ اسے رہ رہ کر اپنی غفلت پر غصہ آرہا تھا۔

اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سامنے گھاس اتنی اونچی تھی کہ اسے قطعی اندازہ نہیں ہوسکا۔ وہ برساتی ندی کے بالکل کنارے تک چلا آیا تھا۔ گھاس پر اس کے پیر پھسلے اور وہ اضطراری سی آواز نکالتا ندی میں جاگرا۔ درمیان میں معمولی سا پانی تھا۔ اس لیے صرف کپڑے بھیگے۔ اگر ندی میں برسات کا پانی ہوتا تو اس کے لیے مشکل ہوجاتی' اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ گرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا تھا۔ اس نے بے تابی سے گھاس پر ہاتھ مارا جو ندی کی تہ تک چلی آئی تھی۔ اس کی خوش قسمتی کہ پستول اسے فوراً مل گیا تھا۔ گل شاہ کے ساتھ ایک مسئلہ تھا۔ جسم پر پانی لگتے ہی اس کی ناک میں سرسراہٹ شروع ہوجاتی تھی اور پھر اسے چھینکیں آنے لگتی تھیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا' ایک طرف اسے پستول ملا تھا اور دوسری طرف اسے چھینک آگئی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنی اس بیماری کو برا بھلا کہا۔ ایسے موقع پر چھینک آنا' جب وہ اپنے دو دشمنوں کا تعاقب کررہا تھا اور انہیں قتل کرنا چاہتا تھا' خود اس کی وفات کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ وہ پستول لے کر نالے پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس کی نظر نیچے گیلی زمین پر پیروں کے نشانات پر پڑی۔ دو افراد کے جوتوں کے نشان تھے۔ وہ مسکرانے لگا۔ ندی کی تہ میں گرنا کام آیا تھا۔ وہ دونوں اس جگہ سے ہوکر گئے تھے۔ وہ جوتوں کے نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تقریباً ایک فرلانگ کے بعد نشانات غائب ہوگئے۔ اس طرف ندی کا کنارہ کسی قدر ڈھلوان تھا۔ اس پر آسانی سے چڑھا جاسکتا تھا۔ وہ ندی سے نکل کر اوپر آیا جہاں گھاس مختصر تھی۔ چاروں طرف ناہموار اونچی نیچی زمین تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی' وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ لوگ اتنی جلدی کہاں جاسکتے تھے۔ ندی اس طرف سے گھوم رہی تھی اور اسے کچھ دور کسی سنہری سی شے کی جھلک نظر آئی۔ زمین پر کوئی نشان بھی نہیں تھا اس لیے وہ اس سنہری شے کی طرف چل پڑا۔

ڈھلان بتدریج گھوم رہی تھی اور سنہری شے سامنے آگئی۔ یہ ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا جو خشک کی ہوئی گھاس سے بنایا گیا تھا۔ یہ ندی کے گھومتے دوسرے کنارے کے ساتھ تھا۔ جھونپڑا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے سات بائی سات کا تھا۔ اوپر گھاس سے ہی چاروں طرف ڈھلان چھت تھی۔ جھونپڑے کے اردگرد سبز گھاس اگی تھی۔ گل شاہ ایک دم محتاط ہوگیا۔ اس پورے علاقے میں یہی ایک جگہ تھی۔ جہاں کوئی پناہ لے سکتا تھا۔ وہ محتاط انداز میں جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ اس کے سامنے مختصر سا دروازہ تھا اور اندر تاریکی نظر آرہی تھی۔

اچانک یوں لگا جیسے جھونپڑے کے اندر ہلچل مچی ہو۔ وہ اچھل پڑا۔ وہ دونوں اندر ہی تھے۔

''انوشہ..... شامی! باہر آ جاؤ' میں تین تک گنوں گا'' گل شاہ نے انہیں للکارا اور پھر تین تک گنا مگر کچھ نہیں ہوا۔ ''تم لوگ باہر نہیں آئے تو فائر کردوں گا۔ یہ گھاس کی دیواریں گولیاں نہیں روک سکیں گی۔''

اس بار بھی جواب نہیں آیا تو گل شاہ کا پارا چڑھنے لگا۔ اس نے چیخ کر کہا ''کیا تم لوگوں کو سنائی نہیں دے رہا' باہر آؤ۔''

اس بار بھی حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو گل شاہ کا غصے سے برا حال ہوگیا۔ اس نے پہلے پستول سیدھا کیا مگر پھر رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر خشک گھاس کا ایک چھوٹا سا گٹھا بنایا اور اسے لائٹر سے آگ دکھا کر جھونپڑے کی طرف اچھال دیا۔ وہ جھونپڑے کی چھت پر جا گرا اور اس نے آگ پکڑلی۔ گل شاہ نے قہقہہ مارا ''ارے احمقو! باہر آ جاؤ..... ورنہ روسٹ ہوجاؤ گے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑی اوپر سے نیچے تک شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ اچانک اندر ہلچل مچی اور جھونپڑی سے ایک مادہ لومڑی اور اس کے تین چار بچے نکل کر بھاگے اور ندی میں غائب ہوگئے۔ گل شاہ ہکا بکا رہ گیا۔

☆☆☆

سر پر لگی چوٹ کی وجہ سے شامی کو رہ رہ کر چکر آرہے تھے اور اس کا اسٹیمنا بھی اتنا بہتر نہیں تھا۔ اگر انوشہ اسے نہ کھینچ رہی ہوتی تو وہ اب تک گر چکا ہوتا۔ تکلیف اور لڑکی ہونے کے باوجود انوشہ جسمانی لحاظ سے مضبوط تھی۔ وہ ہاتھ سے پکڑ کر شامی کو لیے اندھا دھند اونچی گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ شامی کو اکسا رہی تھی۔ ''ہمت کرو' تم مرد ہو..... مجھے دیکھو' لڑکی ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہار رہی۔''

شامی کا جذبۂ عشق خاصی حد تک ماند پڑ چکا تھا۔ اس نے بھنا کر کہا ''ہمت کی خوب رہی..... سر پر پڑتا ڈنڈا تو پتا چلتا۔ میرے آگے زمین آسمان گھوم رہے ہیں۔''

''لیکن زبان پوری رفتار سے چل رہی ہے'' انوشہ جل کر بولی ''مجھے جو زخم آئے ہیں' تمہیں آتے.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی ورنہ شامی کو بتانا پڑتا کہ زخم کہاں آئے ہیں۔

''بس اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا ہے'' شامی دھپ سے ایک جگہ بیٹھ گیا۔

''تب تم گل شاہ کا انتظار کرو۔ وہ پستول لے کر آرہا ہوگا' تمہارے سر میں سوراخ کرنے۔'' انوشہ بولی۔

''میں چل رہا ہوں'' شامی اٹھ کر لپکا اور دونوں لڑھک کر ندی میں جا گرے۔ ندی کنارے پر اگی اونچی گھاس میں روپوش تھی۔ ایک دوسرے پر سے قلابازیاں کھاتے وہ برائے نام پانی میں گرے تھے۔ انوشہ نے بہ مشکل خود کو چیخنے سے روکا تھا۔ اسے گل شاہ کا خیال آیا تھا۔ آواز سن کر وہ سیدھا اسی طرف کا رخ کرتا البتہ شامی نے خوب واویلا مچایا۔ اس وقت بھی وہ پانی میں بیٹھا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ انوشہ نے اس کا بازو تھام کر اسے کھینچا ''خدا کے لیے بھاگو..... تمہاری یہ پھٹے بانس جیسی آواز سن کر وہ سیدھا ادھر آئے گا۔''

پستول بدست گل شاہ کے خیال نے شامی کو بادلِ ناخواستہ حرکت میں آنے پر مجبور کردیا تھا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا ندی کی تہ میں لیٹ جائے۔ گرتے پڑتے وہ آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار انہوں نے ندی سے باہر آنے کی کوشش کی مگر ڈھلان زیادہ ہی ترچھی تھی۔ شامی بار بار رک جاتا تھا اور اعلان کرتا کہ اب اس سے مزید نہیں چلا جا رہا ہے لیکن انوشہ کے سمجھانے بجھانے پر وہ دوبارہ چلنے کے لیے آمادہ ہوجاتا تھا۔ انوشہ کے پاس اسے رواں رکھنے کے لیے واحد نکتہ یہی تھا کہ قاتل ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ شامی سے بار بار کہتی ''بھاگتے رہو ورنہ وہ ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔''

''کیا تم نے خود اس کے پاس پستول دیکھا تھا؟''

''تمہارے خیال میں کیا میں شرافت سے اس کی کار میں بیٹھ سکتی تھی؟'' انوشہ نے طنز کیا ''اس نے مجھے پستول دکھا کر کار میں بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔''

''مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ..... اس نے زبردستی کی ہوگی'' شامی گہری سانسیں لیتا ہوا بولا۔

''تم پیچھے کیسے آئے؟''

''اتفاق سے میں نے مڑ کر دیکھ لیا تھا۔ تم اس وقت مورس میں بیٹھ رہی تھیں۔ میں بھاگا تھا لیکن میں تو تم سے بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کار کا مقابلہ کہاں سے کرتا۔ پھر خوش قسمتی سے تیسری بار ڈبل روٹی والی وین کے نیچے آتے آتے بچا تھا۔ ڈرائیور میری گوشمالی کے لیے اترا تھا تب کہیں میں جا کر وین میں بیٹھ گیا اور پھر مورس کا تعاقب کرتا اس کالونی تک آگیا۔''

''کاٹیج میں اتنی دیر سے آئے؟'' انوشہ خفا ہوکر بولی۔ ''اس خبیث نے دھمکیاں دے دے کر میرا برا حال کردیا تھا۔ جانتے ہو وہ میرے پیچھے کیوں پڑا ہے؟''

''ظاہر ہے' کوئی تمہارے پیچھے کیوں پڑ سکتا ہے؟'' شامی نے ایک معنی خیز سرد آہ بھری۔

''بدتمیز.....!'' انوشہ جھینپ گئی ''یہ بات نہیں ہے۔ اس شخص نے ایک جیولر کو لوٹا تھا اور شاپ سے نکلتے ہوئے مجھ سے ٹکرانے سے اس کا ہیٹ اتر گیا تھا' اس وجہ سے میں نے اس کی صورت دیکھ لی۔ میں تو اسے بھول گئی تھی لیکن وہ مجھے نہیں بھولا تھا۔''

''تم بھلانے والی شے بھی نہیں ہو۔'' شامی نے اعتراف کیا تو انوشہ نے اسے گھورا اور بات جاری رکھی۔

''اتفاق سے ہم پاس پاس ہی رہتے تھے۔ تبھی اس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ جو کہتے ہیں چور کی آنکھ میں تنکا۔''

''داڑھی میں'' شامی کراہا ''خدا کے لیے اردو زبان کے ساتھ وہ سلوک نہ کرو جو تم اب تک میرے ساتھ کرتی آئی ہو۔''

''شٹ اپ۔ ممکن ہے چور کی داڑھی نہ ہو..... لیکن اس کی آنکھ ضرور ہوگی۔ اس لیے محاورہ ہی غلط ہے۔''

''قصہ مختصر..... اس نے تمہیں دیکھا تو گھبرا گیا اور تمہارا کام تمام کرنے کے لیے اغوا کرلیا۔'' شامی بولا۔ اسی لمحے چھینک کی آواز آئی۔ وہ اچھل پڑا تھا۔ ''بھاگو'' اس بار اس نے انوشہ کا ہاتھ تھاما اور بھاگنے لگا۔ بحث میں وہ گل شاہ کو ذرا دیر کے لیے فراموش کر بیٹھے تھے۔ جوان کے پیچھے آرہا تھا۔ ایک جگہ کسی قدر کم ڈھلان دیکھ کر وہ ندی سے باہر نکل آئے تھے۔ ہموار راستوں پر جاگنگ کرنا الگ بات تھی۔ اونچے نیچے راستوں پر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا تو انوشہ کی سانس بھی بے قابو ہوگئی تھی۔ جیسے تیسے اوپر آکر انہوں نے فرار کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ ذرا فاصلے پر خشک گھاس سے بنی جھونپڑی نظر آئی ''یہاں چھپ جاتے ہیں'' شامی نے تجویز پیش کی۔

''تاکہ وہ سیدھا یہاں آکر ہمیں پکڑ لے'' انوشہ نے طنز کیا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''اس طرف چلو۔'' اس نے ندی کے گھومتے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید اس کے پار والے جنگل کے بعد ہم کسی آبادی تک پہنچ سکیں۔''

''چلو..... ساری عمر اس جنگل میں تو نہیں بھٹک سکتے ہیں'' شامی بولا۔ دونوں ندی کے پاس پہنچے تھے کہ گل شاہ نمودار ہوا۔ دونوں تیزی سے کوئی دو فٹ اونچی گھاس میں گر گئے۔ ایک لمحے کی تاخیر انہیں مروا دیتی۔ خوش قسمتی سے گل شاہ کی ساری توجہ جھونپڑی کی طرف تھی۔ انوشہ کے اندازے کے عین مطابق وہ سیدھا جھونپڑی کی طرف آیا تھا۔

''ہلنا مت'' انوشہ شامی کے کان میں بولی ''ذرا سی آہٹ اسے متوجہ کرے گی۔''

''کون کم بخت اٹھنا چاہ رہا ہے'' شامی اس عالم میں بھی باز نہیں آیا تھا۔ انوشہ اسے گھور کر رہ گئی۔ گل شاہ بلند آواز سے انہیں دھمکا رہا تھا کہ وہ جھونپڑی سے باہر آجائیں ورنہ وہ فائرنگ کردے گا۔ اس نے گنتی گننا شروع کردی تھی ''یہ کم بخت فائرنگ نہ کردے'' شامی پھر بولا تو انوشہ بھنا گئی تھی۔

''تم چپ نہیں رہ سکتے' عورتوں کو بھی مات کردیا ہے۔''

''تین تک گنتی گن کر گل شاہ نے مزید چند دھمکیاں دی تھیں اور کوئی ردعمل نہ پاکر چپ ہوگیا تھا۔ پھر وہ ان کی طرف آیا اور زمین سے خشک گھاس جمع کرنے لگا۔ وہ اتنا نزدیک تھا کہ ذرا آگے آتا تو انہیں دیکھ لیتا۔ انوشہ اور شامی دم سادھے پڑے تھے۔ خشک گھاس جمع کرکے گل شاہ نے اس کا گٹھا بنا کر اسے آگ دکھائی اور جھونپڑی کی چھت کی طرف اچھال دیا تھا۔ جھونپڑی نے آگ پکڑلی تھی۔ گل شاہ نے پھر انہیں باہر آنے کی ترغیب دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑی شعلوں میں گھر گئی۔ نہ جانے کس نے کس مقصد کے لیے بنائی تھی۔ پھر انوشہ نے بہ مشکل اپنی چیخ پر قابو پایا تھا۔ جلتی جھونپڑی سے ایک لومڑی اور اس کے بچے نکل کر ان کے پاس سے گزرے تھے۔ لومڑی نے انہیں دیکھ کر خوف زدہ سی آواز نکالی تھی اور نالے میں اتر گئی۔ اس کے بچے گرتے پڑتے اس کے پیچھے تھے۔ گل شاہ دم بہ خود تھا۔ یہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ انوشہ اور شامی کی طرف پشت کیے جھونپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب پوری طرح شعلوں کی زد میں آچکی تھی۔

شامی جواب تک خاموش تھا اور اس نے انوشہ کے سامنے خاصی بزدلی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ غالباً اپنی جھینپ مٹانے کے لیے یہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ وہ اچانک اٹھ کر دوڑا تھا۔ جھونپڑی سے سرکنڈے اور گھاس چیخ چیخ کر جل رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں گل شاہ شامی کے دوڑنے کی آواز نہیں سن سکا تھا اور جب تک اسے احساس ہوتا تاخیر ہوچکی تھی۔ دبلے شامی نے اسے پوری قوت سے ٹکر ماری اور اسے دھکیلتے ہوئے جلتی جھونپڑی تک لے گیا۔ گل شاہ نے خود کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ مدافعت نہ کرسکا۔ جب اسے احساس ہوا کہ وہ جلتی ہوئی جھونپڑی میں جا رہا ہے تو اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ جلتی جھونپڑی میں جا گھسا تھا۔

شامی جھونپڑی کے پاس زمین پر گر گیا تھا پھر خود کو آگ سے بچانے کے لیے لوٹ لگا کر دور ہوگیا۔ انوشہ بھی اس کے عقب میں دوڑتی آئی تھی۔ اس نے سہارا دے کر شامی کو اٹھایا۔

"یہ کیا' کیا تم نے.....؟"

"جو چنا اس نے ہمارے لیے جلائی تھی' اسی میں دھکا دے دیا۔" شامی مارے جوش کے لرز رہا تھا۔ جھونپڑی سے گل شاہ کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔

"وہ..... وہ مر جائے گا" انوشہ چلائی۔

"تو کیا اب میں اسے بچاؤں جا کر" شامی چڑ گیا تھا "اور میں نے کون سا جان بوجھ کر دھکا دیا تھا۔ بس اضطراری طور پر یہ حرکت کر بیٹھا تھا۔"

اسی لمحے گل شاہ شعلوں میں گھرا ایک طرف کی دیوار توڑ کر جھونپڑی سے برآمد ہوا تھا۔ اس نے باہر آتے ہی دیوانہ وار فائرنگ شروع کر دی تھی۔ انوشہ اور شامی بھاگے تھے اور نالے میں اتر کر بھاگتے ہی چلے گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ بے دم ہو کر گر گئے۔ ان کی خوش نصیبی کہ گل شاہ کی اندھا دھند فائرنگ بے کار گئی تھی اور کسی گولی نے ان کی طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔ انوشہ نے اوپر کی طرف دیکھا "شاید ہم کالج کے پاس ہیں۔"

"جلدی چلو..... وہاں کار ہے' ہم اس کی مدد سے نکل سکتے ہیں" شامی اچھل کر بولا "خاصی تگ و دو کے بعد وہ ندی سے باہر آئے تھے۔

"جلدی چلو..... وہاں کار ہے۔ ہم اس کی مدد سے نکل سکتے ہیں" شامی اچھل کر بولا "خاصی تگ و دو کے بعد وہ ندی سے باہر آئے تھے۔ جھاڑیوں کے درمیان کچھ دیر بھٹکنے کے بعد انہیں باہر جانے کا راستہ مل گیا تھا۔ کالج تک آتے ہی وہ کار کی طرف لپکے مگر اس کے دروازے بند تھے اور چابیاں یقیناً گل شاہ کے پاس تھیں۔" شامی کچھ کرو۔"

انوشہ کی فرمائش پر شامی نے یہ کیا کہ لکڑی کا ڈنڈا مار کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے اندر جھک کر اسٹیئرنگ کے نیچے سے تاروں کا گچھا باہر کھینچا۔ "تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ" اس نے انوشہ سے کہا اور دوسری نشست پر بیٹھ کر باری باری تاریں ملانے لگا۔

انوشہ بے تابی سے انجن اسٹارٹ ہونے کا انتظار کر رہی تھی "لگتا ہے تم اس کام میں ماہر ہو۔"

"ہاں' جب دادا جان کہیں باہر جاتے تھے تو اپنی رولز رائس کی چابیاں بھی ساتھ لے جاتے تھے تب ہمیں کار اس طرح اسٹارٹ کرنی پڑتی تھی۔"

اس لمحے انوشہ کی نظر جھاڑیوں سے برآمد ہوتے گل شاہ پر پڑی۔ وہ جھومتا اور لڑکھڑاتا ان کی طرف آ رہا تھا۔

"وہ آ رہا ہے" انوشہ گھگیائی "خدا کے لیے جلدی کرو۔"

"کر تو رہا ہوں" شامی کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ "یہ کم بخت بھوت ہے کیا؟"

گل شاہ اس وقت بھوت ہی لگ رہا تھا۔ کپڑے جل چکے تھے اور ان سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ گل شاہ کا چہرہ آبلوں سے بھر گیا تھا۔ سر کے بال جل جانے سے بدنما جلد نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پستول تھا۔ اس نے ہاتھ سیدھا کیا تو انوشہ نے چیخ ماری تھی۔ اس نے سر جھکایا تو شامی بولا "یہاں کہاں گھسی چلی آ رہی ہو۔ مجھے کام کرنے دو۔"

"وہ گولی چلا رہا ہے" انوشہ بولی "جلدی کرو ورنہ....."

دوسری طرف گل شاہ نے ٹریگر دبایا تو پستول سے ٹرچ کی آواز آئی تھی۔ پستول خالی ہو چکا تھا۔ اس نے جھنجلا کر پستول ایک طرف پھینک دیا اور بلند آواز سے گالیاں دیتے ہوئے کسی بدمست شرابی کی طرح ادھر ادھر ڈولنے لگا..... اس کے جسم کا اکثر حصہ جل گیا تھا اور تکلیف نے اسے پاگل کر دیا تھا مگر اس عالم میں بھی اس کے ذہن نے ان دونوں کو قتل کرنے کا خیال نہیں نکلا تھا۔ معاً اسے وہ کدال نظر آئی جس سے وہ قبر کھود رہا تھا۔ اس نے کدال اٹھائی اور ہمت جمع کر کے قدم بہ قدم ان کی طرف بڑھنے لگا۔ جب گولی چلنے کی آواز نہیں آئی تو انوشہ نے ڈرتے ڈرتے سر اوپر کیا تھا اور دوبارہ چلانے لگی "شامی! کب اسٹارٹ کرو گے انجن! وہ کدال لے کر آ رہا ہے۔"

شامی بے چارہ جلدی جلدی تاریں ملا کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان میں سے دو وائرز آپس میں ٹچ کرتیں تب ہی انجن چلتا۔ گل شاہ پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ انوشہ چلا رہی تھی اور شامی سے جلدی کرنے کو کہہ رہی تھی۔ شامی جلدی کر رہا تھا اور ساتھ ہی انوشہ کو چپ رہنے کو کہہ رہا تھا۔ مگر انوشہ شاید اس کی سن ہی نہیں رہی تھی۔ گل شاہ اتنا نزدیک آ گیا تھا کہ اس کے آبلے تک صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے کوشش کر کے کدال سر سے اوپر کیا اور انوشہ کی طرف آنے لگا۔ اس کی اب گھگی بندھ گئی تھی۔ ایک تو گل شاہ کا حلیہ اوپر سے اس کے قاتلانہ عزائم..... انوشہ بے بسی سے اسے نزدیک آتا دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ونڈ اسکرین کے سامنے آ گیا۔ گل شاہ کے جلے ہوئے ہونٹ پھیلے تھے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔

ونڈ اسکرین کے اوپر سے کدال کی نوک کا رخ اپنی طرف پا کر انوشہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور پوری دل جمعی سے چیخنے لگی تھی۔ گل شاہ نے کدال ماری۔ عین اسی لمحے دو تار ملے

اور موٹر کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ کار پہلے ہی گیئر میں تھی۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔ گل شاہ کی حالت کی وجہ سے کدال سست روی سے نیچے آئی تھی۔ کار اس کے قریب سے نکل گئی۔ زوردار جھٹکے کی وجہ سے گل شاہ کدال سمیت منہ کے بل زمین پر جا گرا تھا۔ انوشہ نے بروقت کار گھمائی تھی ورنہ جھاڑیوں میں گھس جاتی۔ اس بار اس کے منہ سے خوشی بھری چیخ نکلی تھی "ہم بچ گئے۔"

شامی نے اوپر ہو کر عقب میں دیکھا "گل شاہ منہ کے بل زمین پر پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انوشہ نے کار گھمائی اور گل شاہ سے ممکنہ حد تک دور سے گزاری تھی "یہ شاید مر رہا ہے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔" انوشہ نے کہا "جلنے سے آدمی کی فوری موت نہیں ہوتی۔ تم اطمینان رکھو' یہ پولیس کو بیان دے کر مرے گا۔"

"پولیس.....!" شامی کا دم خشک ہو گیا۔ پولیس کے خیال سے نہیں بلکہ دادا جان کے خیال سے..... پولیس تک بات پہنچتی تو دادا جان تک بھی پہنچتی اور یہ اس کی صحت کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم سیدھا گھر کا رخ کریں؟"

"کیا.....! اور اس شخص کو یونہی چھوڑ دیں۔ پولیس میں اس کی رپورٹ ضرور کرنی ہے۔ ایک ذمے دار شہری کے طور پر یہ ہمارا فرض بنتا ہے۔"

"ذمے دار شہری" شامی مرے ہوئے لہجے میں بولا "لیکن دادا جان.....!"

"فکر نہ کرو۔ دادا جان..... بلکہ کوئی بھی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ میرا بیان تمہیں ہیرو بنا دے گا۔"

"ہیرو..... خیر ہے" شامی نے سرد آہ بھری "تم بھی دادا جان کو نہیں جانتیں۔"

پوچھ پوچھ کر وہ پولیس اسٹیشن جا پہنچے۔ جہاں حرام خور قسم کے تھانے دار نے بہ غرض ناشتا ایک گھنٹے سے پہلے کچھ سننے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب انوشہ نے اپنے باپ کو کال کی تو لمحوں میں صورتِ حال بدل گئی تھی' پولیس نے فوری طور پر گل شاہ کے خفیہ ٹھکانے کی طرف پارٹی روانہ کی تھی۔ نصف گھنٹے بعد ایس ایس قدوائی اور اس کے پندرہ منٹ بعد دادا جان اور تیمور بھی تھانے پہنچ گئے تھے۔ پولیس پارٹی کو گل شاہ زندہ مل گیا تھا۔ درحقیقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ صرف چہرے' سر اور ٹانگوں کا کچھ حصہ جلا تھا۔ سینہ اور کمر محفوظ رہے تھے۔ اسی وجہ سے اس کی جان بچ جانے کے امکانات تھے۔ اس نے موقع پر ہی انوشہ کو تاوان کے لیے اغوا کرنے کا اعتراف کر لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جب صحت یاب ہونے کے بعد پولیس کے ہاتھ آیا تو اس نے کھایا پیا سب قبول کر لیا تھا۔ اس میں جیولر والی ڈکیتی اور انوشہ کے اغوا کرنے کا اصل مقصد بھی شامل تھا۔

دادا جان یہ ظاہر تو ہوتے کی بہادری پر خوش تھے اور سب کے سامنے اس کی تعریف بھی کر رہے تھے مگر شامی کو معلوم تھا' وہ اندر ہی اندر اس پر پیچ و تاب کھا رہے ہوں گے اور گھر جانے کی دیر ہو گی کہ وہ اس کی گوشمالی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ پولیس اسٹیشن میں اس کی بے بس صورت دیکھ کر انوشہ نے کہا "انکل! یہ میرے ساتھ جائے گا۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ یہ آج ناشتا میرے ساتھ کرے گا۔"

"نہیں..... بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے" دادا جان مسکرا کر بولے "ہم اس سے بعد میں بات کر لیں گے۔"

شامی عارضی سہی لیکن جان بچ جانے پر خوش تھا اور یہ خوشی بھی اس وقت غارت ہو گئی جب تیمور بھی ان کے ساتھ آ گیا تھا۔ مگر قدوائی کی وجہ سے وہ چپ رہا۔ اپنی کوٹھی پر انوشہ نے ان دونوں کے لیے پرتکلف ناشتا تیار کرایا تھا۔ تیمور اگرچہ گھر میں ناشتا کر چکا تھا مگر انوشہ کی وجہ سے وہ بھی شامل ہو گیا۔ ناشتے کے دوران میں شامی نے بڑھا چڑھا کر اپنا کارنامہ قدوائی کے سامنے بیان کیا۔ انوشہ سن کر مسکراتی رہی۔ اس نے کسی بات کی تردید نہیں کی تھی لیکن شامی کو یہ بات بہت بری لگ رہی تھی کہ وہ بار بار تیمور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ناشتے کے بعد قدوائی چلا گیا۔ اسے ابھی پولیس کے معاملات نمٹانے تھے۔

"تو نے آج ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا ہے" تیمور نے کہا "مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔"

"تیرے یقین نہ کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔ باقی سب تو مانتے ہیں کیوں مس انوشہ.....!"

وہ چونکی "کیا کہا آپ نے.....؟"

شامی نے طنز کیا "تم خاصی دیر سے کسی اور سوچ میں ہو۔"

انوشہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ "میں نے گل شاہ کو ڈکیتی کے بعد دیکھا تھا لیکن بعد میں مجھے وہ یاد نہیں آیا' اس نے خود بتایا تھا۔ اب تیمور کو بھی دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں..... کیا تم کبھی راول ڈیم کے کنارے ریستوران میں.....؟"

"شامی!..... بھاگ" تیمور چلایا اور وہ دونوں انوشہ کو حیران پریشان چھوڑ کر بھاگتے چلے گئے۔

تیسرا رنگ

سودا

شکیل صدیقی

کوئی شخص بغیر احساس کمتری کے ترقی نہیں کرسکتا۔ ہر شخص جو کامیابی حاصل کرتا ہے اس کے پیچھے اس کی زندگی کے نہ بھولنے والے دردناک واقعات کی یادیں ہوتی ہیں..... ایک ایسے ہی شخص کے عروج کی داستان جس نے اپنی ان تھک محنت، جانفشانی سے ایک ایمپائر کی بنیاد رکھی تھی..... مگر اس تمام تر کامیابی کے باوجود کوئی کسک تھی جو اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔

شطرنج کی بساط پر کھیلی جانے والی بازی، جیت دونوں فریقین کی بقا کا مسئلہ بن گئی تھی

عابد منگھی دراز قامت اور وجیہہ شخص تھا۔ اس کی رنگت گندمی، بال سیاہ اور نقوش تیکھے تھے۔ بھویں بے حد گھنی تھیں جنہیں سیدھا رکھنے کے لیے وہ ان پر انگلی پھیرا کرتا تھا۔ اپنی کلاک گیبل ٹائپ مونچھوں اور بھوؤں پر اسے انگلی پھیرنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اس کے والدین سندھ کے بڑے جاگیرداروں میں شمار کیے جاتے تھے اور ان کی ہزاروں ایکڑ جاگیر تھی۔ ایک لحاظ سے جاگیردار کے بیٹے کو جاگیردار ہونا چاہیے تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے زمین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا شروع سے رجحان تھا کہ وہ کاروبار کرے گا۔ اس نے اپنے باپ حاکم منگھی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اسے اپنے ایک دوست کی سرپرستی میں دے دیا جو کراچی میں بزنس کرتا تھا۔ اس بزنس مین کا نام شہاب الدین تھا۔ وہ لوہے کا کاروبار کرتا تھا اور اس کی دکان کے ایم سی ورکشاپ کے پاس لوہا مارکیٹ میں تھی۔ وہ سپریم آئرن ورکس کے نام سے کام کرتا تھا۔ اس کی دکان بہت بڑی تھی جس میں اس کا گودام بھی تھا۔ وہاں بارہ ملازم کام کرتے تھے۔ شہاب نے انہیں مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا۔

عابد نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کاروبار کی طرف توجہ دی۔ پانچ برس میں ہی اسے کاروبار کی سوجھ بوجھ ہوگئی۔ اس نے وہیں اپنی بھی ایک دکان کھول لی۔ وہ جدید رجحانات سے بہرہ ور تھا اس لیے اس کی نگاہ اپنے ملک کے علاوہ سات سمندر پار تک دیکھنے کی عادی تھی۔ اس نے اپنا مرکزی آفس میری ویدر ٹاور کے قریب ایک نئی عمارت میں کھول لیا۔ اس نے شاندار سی عمارت کی دوسری منزل پر پورا فلور بک کرا کے آفس بنایا تھا۔ نچلی منزل پر اس کا پارکنگ لاٹ تھا۔ اس علاقے میں ساری سہولتیں تھیں۔ چار بینک تھے اور کچھ فاصلے پر انشورنس کمپنی کی عمارت تھی۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں وہ کئی بار جاپان کا دورہ بھی کر چکا تھا۔ وہاں کی ترقی، تہذیب اور تمدن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب تک کنوئیں کا مینڈک تھا۔

وہ چوں کہ اونچے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسی طرح اس کاروبار میں دلچسپی لیتا رہا تو اس کا شمار بھی لوہے کے بڑے بیوپاریوں میں ہوگا اور وہ ایک دن آئرن کنگ کہلائے گا۔ اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے اس نے چھوٹے موٹے کئی اور بزنس بھی کر لیے تھے۔ شیر شاہ میں اس کی ایک فیکٹری بھی تھی جہاں پلاسٹک کے برتن بنتے تھے پھر جب اس نے دیکھا کہ لوگوں نے کمپیوٹر میں زیادہ ہی دلچسپی لینا شروع کر دی ہے تو وہ ہانگ کانگ سے کمپیوٹر منگوانے لگا۔ اس سلسلے میں اس نے تھیپوں سے رابطہ کیا تھا۔ جنہوں نے اسے بتایا کہ وہاں سے کمپیوٹر اور ہارڈ ڈسکس کے کنٹینر منگوائے جا سکتے ہیں اور صرف ایک کنٹینر پر لاکھوں روپے کمائے جا سکتے ہیں۔

عابد نے ایسا ہی کیا اور اس معاملے میں بھی اسے کامیابی ہوئی۔ پہلا کنٹینر منگواتے ہی اسے پانچ لاکھ کا منافع ہوا۔ اس نے پینٹی ایم فور کی ایک کھیپ منگوا کر مارکیٹ میں پھیلا دی جو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کے ایسا کرنے سے پی تھری کے دام مارکیٹ میں گر گئے۔ ہانگ کانگ میں اپنے ایجنٹ سے رابطہ قائم کر کے اسے کمپیوٹر سے متعلق دوسری چیزیں بھیجنے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً ہی بیس چیزوں کی فہرست تیار کر کے فیکس کے ذریعے بھیج دی کہ عابد ان میں سے انتخاب کر سکتا ہے۔

دولت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور ہوس لامحدود ہوتی

ہے۔ اس نے اتنی دولت کمالی تھی کہ اس کی پشتوں تک کام آ سکتی تھی مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ جنیکسن گروپ سے آگے جائے گا جن کی ملک میں تیس صنعتیں تھیں اور جو چار اخبارات بھی شائع کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ ٹی وی پر اپنا چینل کھولنے کا بھی تھا۔

عابد کو کسی نے مشورہ دیا کہ وہ شیئرز کے کاروبار میں سرمایہ لگائے تو اس کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آج کل شیئرز دگنے داموں تک پہنچ جاتے ہیں اور آدمی ہشیاری سے کام لے تو لاکھوں میں کھیل سکتا ہے۔ عابد کے لیے یہ کام بالکل نیا تھا۔ اس نے اسٹاک مارکیٹ میں بیٹھنے والے ایک ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا تو اسے پتا چلا کہ گھر میں بیٹھنے سے شیئرز کا کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کا روز چکر لگایا جائے اور حالات پر نظر رکھ کر کاروبار کیا جائے تو مناسب منافع مل سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مارکیٹ پر نگاہ رکھی جائے۔ اور اس سے بھی پہلے اس کاروبار کے نشیب و فراز کو سمجھا جائے۔

عابد نے اپنے دوست احتشام کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پچاس لاکھ سے اپنا کاروبار شروع کیا تو اسے تین ہفتوں بعد پانچ لاکھ کا فائدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کاروبار میں اتنا منافع ہو سکتا ہے؟ اس نے باقاعدہ پلاننگ کی اور اس کاروبار میں بہت سا سرمایہ لگا دیا۔ اسے منافع ہوا تو اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔

وہ ہر میدان میں ترقی کر رہا تھا۔ اس کا باپ اور ماں کئی بار اس کے پاس کراچی آ چکے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اب وہ شادی کر لے تاکہ وہ اس کی اولادیں کھلانے کا ارمان بھی پورا کر لیں۔ عابد ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ ان کا یہ احساس بڑھ گیا تھا کہ ان کا خاندان چھوٹا ہے۔ اس وقت تو انہیں بہت ہی چھوٹا لگ رہا تھا جب عابد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی چلا آیا تھا۔ حاکم منگھی کے چھوٹے بھائی کے بچے اگر گھر میں نہ ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ وہ سب کچھ ایک طرف ڈال کر کسی جنگل کی راہ لیتا مگر اس کے بھتیجوں کی وجہ سے گھر میں رونق تھی اس لیے اس کا دل لگا رہتا تھا۔ اب بہر حال اسے اپنے پوتوں کو کھلانے کا شوق تھا۔ عابد کی ماں نے بہت سی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں جن میں کئی جاگیردار تو ان سے زیادہ متمول تھے اور ان کا حکومت میں بھی اثر رسوخ تھا۔

عابد ڈیفنس میں رہتا تھا جہاں ساری آسائشیں تھیں۔ چار ملازم تھے۔ صفائی ستھرائی سے لے کر کچن کی ذمے داریاں تک ان ہی پر تھیں۔ اس کا کھانا پابندی سے گھر میں پکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے کھانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ روز ہی کاروباری سلسلے میں کسی نہ کسی کے ساتھ فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا رہتا تھا۔ جب وہ تھک ہار کر گھر پہنچتا تو سوائے بستر کے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

اس کی ماں کی محبت جوش مارتی.... تو وہ اس کے پاس ایک آدھ ہفتے کے لیے آ جاتی مگر پھر اس کی طبیعت گھبرا جاتی تو وہ واپس اپنے آبائی مکان کی طرف لوٹ جاتی تھی۔ جہاں اس کا شوہر اور بھتیجے تھے۔ ''میں کہتی ہوں کہ یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا؟'' اس کی ماں نے ایک روز اس سے پوچھ ہی لیا۔ وہ اس وقت اس کے لمبے چوڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔

''کیسا سلسلہ؟'' عابد نے انجان بن کر پوچھا۔ حالانکہ ...وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ماں کون سا موضوع چھیڑنا چاہتی ہے۔

اس گھر میں تو کب تک تنہا رہے گا؟'' اس نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''میں تنہا کب ہوں، آپ بھی تو میرے ساتھ ہیں پھر چچا کے بچے بھی تو آ جاتے ہیں۔''

''دوسروں کے بچوں سے کب تک دل بہلاتا رہے گا؟ تیرے کب ہوں گے؟'' ماں نے صاف لہجہ اختیار کیا۔

''تمہیں میری شادی کے سوا کوئی فکر نہیں رہتی۔'' اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیا دنیا میں اس کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا؟'' اس کا لہجہ ناگوار تھا، جس کی پروا اس کی ماں کو نہیں تھی۔

''ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔'' اس کی ماں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تیری عمر انتیس برس ہو گئی ہے، اس لیے شادی ہو جانی چاہیے۔ گھر میں بیوی بھی آنی چاہیے اور بچے بھی ہونے چاہئیں۔ تیری اتنی بڑی جائداد کون سنبھالے گا؟ تو نے اس بارے میں غور نہیں کیا؟ سب کچھ بینک اپنے قبضے میں کر لے گا۔''

عابد منگھی غور تو کر رہا تھا لیکن بیوی بچوں کے بارے میں نہیں بلکہ وہ سامنے لگی ہوئی پینٹنگ کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں ایک بحری جہاز سمندر کی موجوں سے نبرد آزما تھا۔ اس جہاز کا خیال اسے کیوں آیا تھا؟ اس لیے کہ اس کے ایک دوست نے اسے بحری جہاز خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ اسے پسند آیا تھا اور وہ اس پر عمل کرنے کے لیے پر تول

رہا تھا۔ اس کے دل میں امنگیں اور خواہشیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ وہ ملک کی سب سے بڑی جہاز راں کمپنی کے مالک گوگل کے برابر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ آج اس نے اپنے آفس میں اپنے بچپن کے ایک ساتھی ایاز سومرو کو بلایا تھا۔ وہ بحری جہازوں کی ایک کمپنی میں سیلز ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے دماغ میں بحری جہاز انگڑائیاں لے رہا تھا جب کہ ماں نے شادی کا قصہ چھیڑ دیا تھا۔ بہر حال اس موضوع سے بھی احسن طریقے سے نمٹنا تھا۔

''میری کون سی ایسی عمر گزر گئی ہے ماں۔'' اس نے ملائمت سے کہا۔ ''جب کوئی اچھی لڑکی مل جائے گی تو میں شادی بھی کر لوں گا۔'' اس نے پیچھا چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟ تو ہاں تو کر۔'' اس کی ماں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ اس نے عابد کی بات سے یہ عندیہ لیا تھا کہ اسے اپنے مرتبے کے لحاظ سے کوئی اچھی لڑکی نہیں مل رہی ہے اس لیے وہ شادی کرنے سے کترا رہا ہے۔

''اس برس میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''میں دو برس بعد شادی کروں گا۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''تو پھر میں تیری خالہ کی لڑکی کے لیے بات پکی کر لوں؟'' ماں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔'' عابد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شادی تو میں آپ کی رائے مشورے سے کروں گا لیکن سوچ سمجھ کر۔''

''زرینہ میں کیا برائی ہے؟'' اس کی ماں نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے باپ شہاب انڑ کی دادو میں چار ہزار ایکڑ زمین ہے اور وہ قومی اسمبلی کا ممبر بھی ہے۔''

''تو کیا آپ اس کے باپ سے میری شادی کر رہی ہیں؟'' عابد نے گھبرا کر کہا۔

''پاگل پن کی باتیں نہ کر۔ شادی کے لیے سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔'' اس کی ماں نے فہمائشی انداز میں کہا۔ ''عزت دولت اور مرتبہ۔ ہم لوگ کوئی گرے پڑے تھوڑی ہیں کہ جہاں چاہا شادی کر لی؟ تیرا باپ سندھ کے رئیسوں میں شمار ہوتا ہے۔ شاید تجھے پتا نہیں ہے کہ شہاب انڑ تجھے پسند بھی کرتے ہیں اور تیرے باپ سے دبے دبے لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ ہمیں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنی چاہیے۔''

''چلو ٹھیک ہے..... جھگڑا طے ہو گیا..... تم یہ منحوس قسم کا ہیٹ اپنے سر پر ہی رکھو گی..... اور میں اس سلسلے میں اپنا بڑا سا منہ بند رکھوں گا۔''

''میں سب باتوں سے واقف ہوں۔'' عابد نے کہا۔ ''مگر مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بے پڑھے لوگوں کے ساتھ اسمبلی میں نہیں بیٹھنا چاہتا۔ تمہیں چچا نورالدین کا پتا نہیں کہ وہ کتنی جماعتیں پاس ہیں؟ وہ اسمبلی میں پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو مجھے شرم سی آتی ہے۔''

''میں ایسی باتوں میں نہیں پڑتی۔'' ماں نے ایک طرح سے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں یہ جانتی ہوں کہ شہاب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ باہر کا پڑھا ہوا ہے۔''

''مگر زرینہ نے میٹرک بھی نہیں کیا ہے۔'' عابد نے کہا۔ ''جس عزت کی آپ بات کرتی ہیں' وہ زرینہ سے شادی کے بعد مجھے کہاں مل سکتی ہے۔''

ماں سوچ میں پڑ گئی۔ اس پہلو پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا اس کے سامنے تو اپنا زمانہ تھا جب عزت، مرتبہ اور جاہ و جلال دیکھا جاتا تھا۔ یہ پوچھا جاتا تھا کہ لڑکی کا باپ جہیز میں کتنی زمین دے سکتا ہے؟

''اچھا میں کوئی دوسری لڑکی دیکھتی ہوں۔'' اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

گویا عابد کے لیے میدان صاف تھا اور وہ اپنے آفس کی طرف جا سکتا تھا۔ اس نے شوفر کو بلا کر گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ جب وہ اپنے آفس پہنچا اور خصوصی لفٹ میں بیٹھ کر اوپر گیا تو وہاں جہاز راں کمپنی کا نمائندہ ایاز سومرو پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ذہین اور بردبار شخص تھا۔ اس کا ایک آفس ڈیفنس میں تھا اور وہ عابد کے بلانے پر آیا تھا۔ وہاں اور بھی بہت

سے لوگ بیٹھے تھے لیکن عابد نے سب سے پہلے اسے ہی بلایا۔ اس لیے کہ وہ سومرو سے خاص موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا۔

وہ اندرونی کمرے میں چلا گیا اور اس نے عابد سے ہاتھ ملایا۔ ''اتنی اچھی انٹیریئر ڈیکوریشن میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔'' اس نے گفتگو کی ابتدا تعریف و توصیف سے کی۔ ''شاید کسی بڑی کمپنی سے کرائی ہے؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے سومرو! مجھے افسوس ہے کہ تم اب تک میرے پاس کیوں نہیں ہوں۔ حالانکہ ہم نے آٹھویں کلاس میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی ہے۔''

''ہاں، اور جب ہم کچھ نہیں کرتے تھے تو شطرنج کھیلا کرتے تھے۔'' سومرو ہنستے ہوئے بولا۔

''شطرنج تو میں اب بھی کھیلتا ہوں۔'' عابد نے کہا۔ ''چاہے ایک ہی بازی کھیلوں۔''

آپ کا پارٹنر کون ہوتا ہے؟''

''سندھ کلب کا چیمپئن نعمان پیرزادہ۔''

''اوہ!'' اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''وہ تو ایس ایس ریفرٹی نامی شپنگ کمپنی میں پارٹنر ہے۔ شوگر نے اس کی ٹانگوں پر برا اثر ڈالا ہے۔ اس وجہ سے اسے اپنی ایک ٹانگ کٹوانا پڑی اور وہیل چیئر پر آنا پڑا۔ وہ شطرنج کا اچھا کھلاڑی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مقابلوں میں حصہ لینے لگے تو کراچی کی سطح پر کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لے سکتا ہے۔''

''تمہاری معلومات بالکل درست ہیں۔'' عابد نے کہا۔ وہ شطرنج اچھی کھیلتا ہے مگر مجھ سے ہار بھی جاتا ہے۔ اسی لیے مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتا ہے۔ بظاہر تو میری تعریفیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آئرن کنگ ہوں۔ اپنا اسٹیل مل قائم کرنے والا ہوں۔ یہ بڑی بات ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بھی تو شپنگ کمپنی کا پارٹنر ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے کہ کاش اسے کسی نے شپنگ کے بجائے آئرن کے کاروبار میں لگایا ہوتا تو وہ آج کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ اس کے ظاہر سے اس کے باطن کا پتا نہیں لگتا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ میری ترقی سے خوش ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے خار کھاتا ہے۔''

''تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ اس کے برابر آنے کے لیے، اس کے ہم پیشہ بننا چاہتے ہیں یعنی آپ بھی بحری جہاز خریدنا چاہتے ہیں اور شپنگ لائن میں آنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، میں کئی مہینوں سے اس بزنس کے سارے اتار چڑھاؤ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ میں ان کے طریقۂ کار سے واقف ہو سکوں۔ یہ اندازہ لگا سکوں کہ شپنگ بزنس کیسے ہوتا ہے۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں فروخت ہونے والے ایک جہاز کے سلسلے میں آپ کی بات کراؤں؟'' سومرو نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے تمہیں اسی لیے یہاں بلایا ہے۔'' عابد نے کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کافی بنواؤں۔''

''میں کافی ضرور پیوں گا۔'' سومرو نے کہا۔ ''مجھے آپ کی کامیابیوں کی داستان سننے کا بہت شوق ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے اتنی جلدی سب کچھ کیسے کر لیا؟''

''میں نے بابا سے تھوڑا سا سرمایہ لیا تھا اور انٹ شنٹ کام شروع کر دیے۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی اس لیے میں اوپر ہی اوپر نکلتا چلا گیا۔ تم نے وہ محاورہ تو سنا ہی ہوگا کہ مٹی میں ہاتھ ڈالا تو وہ سونا بن گئی۔''

''آپ نے مٹی میں ہاتھ ڈالا تو وہ ہیرا بن گئی۔'' سومرو نے ہنس کر کہا۔ ''بات کافی سے نہ جانے کہاں چلی گئی۔''

''اوہ ہاں۔'' اس نے انٹرکام پر کہا کہ دو کپ کافی کمرے میں بھیج دو۔ ''اگر تمہیں فرصت ہو تو کبھی سندھ کلب آ جانا۔ میں ہفتے میں تقریباً تین روز تو وہاں بیٹھتا ہوں۔''

سومرو نے اپنے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی اور پھر اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے بہت سے بروشر نکال لیے۔ وہ بحری جہاز ''الباسٹرس'' کے تھے جن میں اس کے ہر ہر زاویے سے فوٹو کھینچے گئے تھے۔ جن سے اس کی ساخت اور بناوٹ کا پتا لگتا تھا۔ وہ ایک کارگو شپ تھا۔

جب عابد اس طرف متوجہ ہوا تو سومرو نے بروشر اس کے سامنے پھیلا کر الباسٹرس کی خصوصیات بتانے کے بعد یہ بتایا کہ وہ کب سے کارگو شپ کے طور پر چل رہا ہے۔ عابد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں اسے دیکھنا چاہوں تو؟''

''مجھے کسی بھی وقت بلا لیجیے گا۔'' سومرو نے کہا۔

ایک ملازم کافی لے آیا تو انہوں نے کافی پینا شروع کر دی۔ وہ ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے جس میں شادی، بیاہ اور بچے شامل تھے۔ سومرو جب وہاں سے گیا تو کافی مطمئن تھا۔ اس لیے کہ عابد وہ بحری جہاز خریدنے کے موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز اس نے جہاز الباسٹرس کو نہ صرف دیکھ لیا بلکہ خرید بھی لیا یعنی اس نے اپنی جہاز راں کمپنی کی بنیاد رکھ دی۔

جس کا نام اس نے اپنی ماں کے نام پر کلثوم انٹرپرائز رکھا۔ اس کے ملازم اس نے سومرو کے انتخاب پر رکھے تھے۔ کمپنی چل پڑی اور اس کے سرمائے میں اضافہ ہونے لگا۔ دو برس میں جب اس کے جہاز نے دنیا کے گرد دو چکر لگا لیے تو اس کا شمار تجربہ کار لوگوں میں ہونے لگا۔ سرمائے دار اسے رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

اس روز جب ان کی بازی ختم نہیں ہوئی اور عابد اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تو نعمان پیرزادہ نے کہا۔ ''عابد، یہ کھیل کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ جب بازی اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو تمہارے گھر جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم غیر شادی شدہ ہو پھر تمہیں گھر جانے کی کیا جلدی ہے؟ اگر تم نے زیادہ وقت دیا ہوتا تو میں یہ بازی جیت جاتا۔''

''دراصل میں کوئی بازی ہارتا نہیں ہوں۔'' عابد نے ہنس کر کہا۔

''جیتنا تو میری بھی سرشت میں شامل ہے۔'' ارب پتی نعمان پیرزادہ نے کہا۔ ''مگر اس وقت میں اپنی ٹانگ سے مجبور ہو گیا ہوں، یہ تکلیف دے رہی ہے۔''

''آپ نے کبھی اپنی اس تکلیف کے بارے میں بتایا ہی نہیں۔'' عابد نے اپنی بھوؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں شوگر کا مریض ہوں۔ ٹانگ میں ایک زخم ہو گیا جو درست نہ ہو سکا، اس لیے اسے کٹوانا پڑا۔ جب سے میں نے یہ چیئر لی ہے اسی کے سہارے حرکت کرتا ہوں۔''

''بہرحال مجھے گھر جانے کی جلدی اس لیے ہے کہ میری والدہ آج کل آئی ہوئی ہیں۔'' عابد نے کہا۔

''کل تم میرے گھر آ جاؤ۔ وہاں دو چار باتیں ہو جائیں گی اور بازی بھی ختم ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس بازی کو کاغذ پر لکھ لیا جائے؟''

''ہاں، یہ مناسب رہے گا۔'' عابد نے اس سے اتفاق کیا۔

''یہ رہا میرا کارڈ۔'' نعمان پیرزادہ نے اس کی طرف اپنا کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم رات نو بجے تک آ جاؤ تو ہم دو یا تین بازیاں کھیل سکیں گے۔'' وہ بولا۔

''میں کوشش کروں گا۔'' عابد نے وہسکی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں کھیلنے سے پہلے سوئمنگ کرنا چاہوں گا۔ آپ کے ہاں پول تو ہوگا؟''

''ہاں..... اس میں مجھے پیرا کی کا موقع تو کم مل سکا البتہ وہ تم جیسے لوگوں کے کام آتا رہتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مہمان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' اس نے بھی اپنا گلاس میز پر رکھا اور ٹشو پیپر سے ہونٹ صاف کیے۔

''تمہاری بہت سی چیزوں سے دوسرے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔'' عابد نے دل میں کہا۔ ''تم اس کرسی کے سہارے زندہ ہو آخر کب تک یوں گھسٹتے رہو گے؟''

''میں ضرور آؤں گا اگر میرے پروگرام میں تبدیلی آئی تو میں فون کر کے بتا دوں گا۔'' عابد نے کہا ''مما آئی ہوئی ہیں، انہیں میری شادی کی فکر ستا رہی ہے۔''

''ہاہاہا، نوجوانوں کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہی رہتے ہیں بھئی اس میں ماؤں کا بھی کیا قصور ہے؟ بچوں کی چیاؤں میاؤں سے گھر میں ذرا رونق سی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ والدین یہ چاہتے ہیں کہ اولاد کے سر پر سہرا بندھ جائے۔ اس کے علاوہ بیوی کی بیڑی بچے کے پاؤں میں ڈالنے سے وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچہ قابو میں رہے گا۔ کیوں، میں درست کہہ رہا ہوں نا؟'' اس نے قہقہہ لگا کر خود اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

''آپ تجربے کار ہیں، میں آپ کی بات کیسے رد کر سکتا

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسہا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی چار پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے انکے لیے اپنے تجربے تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک ہفتے آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے بہا قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھ پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جنکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

ہوں۔"

"وش یو گڈ لک۔" عابد نے اس سے مصافحہ کیا اور پارکنگ لاٹ کی طرف چلا گیا جہاں اس کا شوفر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے عابد کے بیٹھنے کے بعد کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پارکنگ لاٹ سے نکلی تو عابد کو پھولوں کے جھرمٹ میں ایک لڑکی بیٹھی دکھائی دی۔ اس کے آس پاس مرکری بلب روشن ہے جن سے لان کا وہ حصہ دودھیا ہو گیا تھا۔ دوری کے باوجود عابد نے اندازہ لگایا کہ وہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس کے قریب ایک ملازمہ کھڑی اس کے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سارا منظر غیر حقیقی ہو مگر اس میں حقیقت سے ماورا کون سی بات تھی؟ عابد کو اس کا ادراک نہ ہو سکا وہ اپنے گھر تک پہنچ گیا لیکن لڑکی اس کے ذہن سے چپک گئی۔ اس کا ہیولا اس کی نظروں کے سامنے چکراتا رہا۔

گھر میں ماں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی اور بابا بھی زمینوں سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو بھتیجے بھی تھے، کمال اور ناصر۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ "چاچو آ گئے۔ چاچو آ گئے۔" دونوں کی عمریں سولہ سترہ برس کے قریب تھیں۔ وہ کراچی کے ایک کالج میں پڑھتے تھے اور اس کے قریب ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ اس لیے اپنے چاچو کے ہاں آنے کا کم ہی موقع ملتا تھا۔

اس نے اپنے بابا جان کے پاؤں چھوئے۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر خیریت پوچھی۔ "ماشاء اللہ کام تو کافی بڑھ گیا ہے۔" انہوں نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "انور بتا رہا تھا کہ جہاز والے کاروبار میں بھی اچھا منافع ہو رہا ہے۔ اب کس بات کا انتظار ہے؟"

"کیسا انتظار؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ارے بھئی شادی وادی۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔

"میں اس کے بارے میں مما کو بتا چکا ہوں۔ بس دو برس کے بعد شادی بھی کر لوں گا۔" عابد نے انہیں یقین دلایا۔

اس کے والد سر ہلا کر رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس کا جواب پسند نہ آیا ہو۔ "اچھا اس وقت تو مناسب نہیں ہے صبح بات کریں گے۔ مجھ سے ملے بغیر دفتر نہ چلے جانا۔" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ گھر میں والدین کے لیے ایک کمرا مخصوص تھا۔ وہ جب کراچی آتے تھے تو اسی کمرے میں ٹھہرتے تھے۔

وہ چلے گئے تو اس کے دونوں بھتیجے نزدیک آ گئے۔ بڑے بھتیجے کے ہاتھ میں ایک پوسٹر سا تھا۔ عابد نے وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ ہم دونوں نے کمپیوٹر گرافکس ڈیزائننگ کی پریکٹس کرتے ہوئے بنایا ہے۔" بڑے بھتیجے نے بتایا۔ "ہم اس کا کلر پرنٹ نکال کر دیکھ رہے تھے۔"

عابد نے دیکھا' وہ ایک عجیب سی تصویر تھی۔ اس میں اوورکوٹ اور ہیٹ پہنے ایک شخص کا ہیولا سا عقب سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی پشت سے ایک حسین لڑکی کا نامکمل چہرہ جھانکتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ قریب ہی ایک شخص ہنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پس منظر میں ویرانہ سا نظر آ رہا تھا جہاں بے ترتیب سبز گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ اسی گھاس میں ایک طرف ایک جھونپڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اوورکوٹ اور ہیٹ پہنے جس شخص کا ہیولا دکھایا گیا تھا وہ اپنی پشت پر اپنے ہاتھ میں ایک خنجر تھامے ہوئے تھا۔

"یہ تم دونوں نے خود بنایا ہے؟" عابد نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں..... نیٹ سے تصویریں لے کر گرافک ڈیزائننگ کی ہے۔" بڑے بھتیجے نے بتایا۔

"بہت خوب بھئی..... تم نے تو یہ اچھا خاصا کسی رسالے کا ٹائٹل یا فلم کا پوسٹر بنا ڈالا۔" عابد نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

"ایسی تصویریں تو ہم اکثر کمپوز کرتے رہتے ہیں۔" چھوٹے بھتیجے نے فخر سے بتایا۔

"اچھا بھئی..... یہ شغل وغیرہ تو اپنی جگہ ہیں..... یہ بتاؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔ "پچھلی بار تو تم لوگوں نے کافی مایوس کیا تھا۔"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہم نے پچھلے برس سیونٹی پرسنٹ نمبر لیے تھے۔" کمال نے کہا۔

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ پوزیشن لو گے۔"

"اس طرح پڑھ کر کیا کریں گے چاچو؟ ہمیں تو باہر جانا ہے۔ آپ ہمیں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ دلوائیں گے نا؟ مجھے وہاں پڑھنے کا شوق ہے۔"

"کیوں؟" عابد نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔

"اس لیے کہ بھٹو سائیں نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے تھے۔" ناصر نے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے چاچو اس دلیل سے ہار جائیں گے۔

"اوہ خوب! تو یہ ارادے ہیں میرے شیر کے۔" عابد نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"چاچو کل آپ کو ہمارے ساتھ کالج جانا پڑے گا۔"

"وہ کس خوشی میں؟" عابد نے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"کل بچوں کا عالمی دن ہے۔ اس موقع پر وہاں بہت اچھا پروگرام ہوگا۔"

"مگر بچوں کے پروگرام میں چاچو جا کر کیا کریں گے؟" اس نے کہا اور ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر اس کا دروازہ بند کر لیا۔

وہ دونوں باہر کھڑے سر کھجاتے رہ گئے۔

☆☆☆

رات کو کسی وجہ سے نیند میں گڑبڑ ہو گئی۔ عابد کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ جب صبح سو کر اٹھا تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سویا ہی نہیں تھا۔ اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور حلق میں خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کوئی ہلکی پھلکی دوا لیے بغیر آفس چلا گیا تو اس سے کام نہیں ہو سکے گا۔ وہ کافی ہی پیتا رہ جائے گا۔

اس نے اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کے لیے چار منیجر تو رکھ لیے تھے لیکن وقتاً فوقتاً ان کا کام چیک کرتا رہتا تھا۔ ان کے چھوٹے اور ذیلی آفس شہر کے مختلف حصوں میں قائم تھے۔ آج چیکنگ کا دن تھا۔ اس موقع پر حد سے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کسی موقع پر ڈھیلا پڑ گیا تو اس نے جو بزنس ایمپائر قائم کی ہے' اس کے در و دیوار میں شگاف پڑ جائیں گے۔ اس نے سیکڑوں لوگوں کو بہت کم عرصے میں دیوالیا ہوتے دیکھا تھا۔

اس نے دو گلاس پانی بھی پی لیا مگر اس کے حلق کی خشکی دور نہیں ہوئی۔ اس وقت اسے ڈاکٹر طاہر عباس یاد آیا۔ وہ گزشتہ برس سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا پرائیویٹ کلینک اپنے گھر کی انیکسی میں بھی بنایا ہوا تھا۔ جہاں وہ اپنے بے حد خاص قسم کے مریضوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس کے اوقات اس نے صبح آٹھ بجے سے نو بجے تک مقرر کر رکھے تھے۔

اس نے طاہر کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ خود اس کی طبیعت خراب ہے۔ اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ "آپ ساڑھے آٹھ بجے تک آ جائیے۔" اس نے کہا۔ "مجھے فلو ہو گیا ہے۔ لیکن میں آپ جیسے مریضوں کو تو دیکھ ہی سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ایسے مریض جنہیں کوئی سیریس بیماری نہ ہو۔"

"شکریہ میں حاضر ہو رہا ہوں۔"

اس نے اپنے والدین کو اللہ حافظ کہا اور اپنی چیمبر و میں بیٹھ کر وہاں سے ڈاکٹر طاہر عباس کے کلینک چلا گیا۔ گارڈ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اسے سلام کیا۔ انیکسی میں چار کشادہ کمرے تھے۔ ایک ملازم کے کہنے پر عابد تیسرے کمرے میں چلا گیا اور وہاں پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھر سے چلتے وقت ناشتا بھی نہیں کیا تھا تاکہ ڈاکٹر اس کا اچھی طرح معائنہ کر سکے۔

طاہر عباس چوتھے کمرے میں تھا۔

جب عابد کو بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی اور اس دوران اس نے انگریزی اخبار کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک چاٹ ڈالا تو اسے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے پہلے کوئی اور مریض بھی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی ڈاکٹر طاہر سے بے تکلفی تھی چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر وہ خود اس کے کمرے کی طرف چلا جائے تو وہ برا نہیں مانے گا۔ ویسے بھی اس وقت نو بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ یعنی اس کے کلینک کا ٹائم ختم ہونے کو تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس مریض کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اس سے معذرت کر لے؟

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے کمرے کی طرف

بچت

بخیل بستر مرگ پر تھا اس نے اپنی موتیا زدہ آنکھیں تھوڑی سی کھول کر نحیف آواز میں پوچھا۔ "بیگم! کیا تم یہاں موجود ہو؟"

"ہاں سرتاج! میں آپ کے بیڈ کے قریب موجود ہوں۔" بیوی نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔

"کیا سب بچے بھی میرے پاس موجود ہیں؟" بخیل نے پوچھا۔

"جی ہاں ابا جان! ہم سب موجود ہیں۔" بچوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا۔ تب بخیل بیڈ پر اٹھ بیٹھا اور چلایا۔ "کم بختو! اگر سب یہاں موجود ہو تو کچن کی لائٹ کیوں جل رہی ہے؟"

جا ہی رہا تھا کہ اس نے وہیل چیئر پر ایک لڑکی کو راہداری میں آتے دیکھا۔ اس وہیل چیئر کو ایک ملازمہ دھکیل رہی تھی۔ عابد شاید اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن ملازمہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر اس لڑکی کی شال درست کرنے لگی جو وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ عابد کو ایسا لگا جیسے اس نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔

پھر اسے یاد آ گیا کہ کل شام ہی اس نے اس لڑکی کو نعمان پیرزادہ کے لان میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ لڑکی اسے کچھ غیر حقیقی معلوم ہوئی تھی۔ لہٰذا اس نے خود بھی ٹھہر کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔

اسے اپنی یہ حرکت معیوب سی لگی۔ وہ لڑکی کوئی عجوبہ تو نہیں تھی کہ وہ راہ چلتے اسے دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ ملازمہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی البتہ لڑکی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ ساکت و صامت سامنے دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ اسے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالنے کی زحمت نہ گوارا کی ہو۔ عابد نے سوچا۔

ملازمہ نے جب اس لڑکی کی شال درست کر دی تو پھر وہیل چیئر کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ کیا وہ لڑکی مفلوج تھی اور اپنی شال خود درست نہیں کر سکتی تھی؟ عابد کے دماغ میں کھد بد ہونے لگی۔ اس نے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس لڑکی کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ وہ خواہ مخواہ اس سے کیوں متاثر ہو رہا تھا؟

مگر جب وہ ڈاکٹر کے روبرو بیٹھا تو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنی کیفیت بتانے کے بجائے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ''کلینک کا ٹائم ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں اور یہ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ خود میری طبیعت خراب ہے۔'' ڈاکٹر طاہر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر میں آپ کو اس لڑکی کے بارے میں بتانے لگوں گا تو ہو سکتا ہے کہ پھر آپ کے بارے میں پوچھنے کا وقت نہ رہے۔ وہ میری مریضہ ہے۔ اس کا ریکارڈ میرے پاس رکھا ہے۔ آپ کسی وقت آ کر اس کا مطالعہ کر لیجیے گا۔ ساری کہانی معلوم ہو جائے گی۔''

عابد کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے اپنی کیفیت بیان کرنا شروع کر دی۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی کہ وہ اپنے بارے میں بتانے کے بجائے اس لڑکی کے بارے میں کیوں پوچھ بیٹھا؟ اس وقت اس نے سکون کا سانس لیا جب ڈاکٹر طاہر نے بتایا کہ اسے کوئی خاص بیماری نہیں ہے اگر وہ دی ہوئی دوا تمام دن استعمال کرے گا تو شام تک طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔ فضا میں اڑنے والے گرد و غبار اور دھوئیں سے اسے الرجی ہو گئی ہے۔ کراچی ان دنوں اس کی لپیٹ میں ہے۔ اچھے خاصے انسان کا حلق خشک ہو جاتا ہے۔ جن کا حلق خشک نہیں ہوتا انہیں بھی کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ ہر وقت بند اور ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں اور کمروں میں رہنے والے لوگ بھی اس سے بچ نہیں پا رہے ہیں۔

عابد وہاں سے چلا تو آیا لیکن اس کی طبیعت شام تک صحیح نہیں ہو پائی۔ رہ رہ کر اسے لڑکی کا خیال پریشان کرتا رہا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ اس لڑکی میں کوئی خاص بات تو تھی نہیں..... پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں سارا دن سوچتا رہا؟ وہ اس معاملے میں نیک و پارسا بھی نہیں تھا، کلب میں روز ہی کسی نہ کسی لڑکی سے اس کا ٹانکا گرا ہوتا رہتا تھا اور پھر وہ حسن و عشق کے سارے مرحلے طے کر لیتے تھے۔ عابد نے شہر کے ایک اچھے علاقے میں اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا تھا جہاں وہ اور اس کے دوست اپنی شامیں کسی حسینہ کی بانہوں میں گزارتے تھے۔ شراب و کباب سے قریب رہنے میں بھی وہ کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔

بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں کیوں اتنا سوچنے لگا تھا؟

شام کو جب اس کے ہیجان میں کوئی فرق نہ آیا تو اس نے نعمان پیرزادہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید اسے اپنے دماغ میں نیزے کی طرح چبھتے ہوئے سوالات کا جواب اس سے مل سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی کوئی قریبی عزیزہ ہو۔ اگر نعمان پیرزادہ مناسب سمجھے گا تو اسے لڑکی سے متعارف کروا دے گا۔ لڑکی اسے جس کلب کے لان پر نظر آئی تھی، نعمان وہاں آنے والے تقریباً ہر فرد کے بارے میں تفصیل سے جانتا تھا..... اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ لڑکی اور اس کی ملازمہ نعمان کے ساتھ ہی وہاں آئے ہوں۔

اس کے گھر جانے سے پہلے عابد نے اسے فون کر دیا کہ وہ شام اسی کے گھر پر گزارے گا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گھر فون کیا کہ وہ دیر سے آئے گا۔ فون ماں نے ریسیو کیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تو تیری صورت دیکھنے کے لیے ترستی رہتی ہوں۔ گاؤں سے کراچی اس لیے آتی ہوں کہ یہاں تو نظر رہے گا لیکن اس سلسلے میں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''اوہ مما! آپ بات کو کتنا بڑھا دیتی ہیں۔'' اس نے

لاڈ سے کہا۔ ''میری مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہیں کہ میں آپ کا دیدار نہیں کر پاتا، میں شرمندہ ہوں۔ آپ شطرنج بھی تو نہیں کھیلنا جانتیں ورنہ میں.....''

''ورنہ تم میرے پاس سے نہ ہٹتے؟ کیوں بیکار سی باتیں کرتے ہو عابد! تمہارے بابا تو اچھی شطرنج کھیلتے ہیں لیکن تم ان کے سامنے بیٹھنے سے کیوں کتراتے ہو؟''

''بابا کی بات دوسری ہے۔ انہیں ہرا کر مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔''

''باپ بیٹے ایک جیسے ہیں۔'' اس کی ماں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تمہارے باپ بھی یہی کہتے ہیں۔ ان کا خاص جملہ ہے کہ بیٹے کو ہراتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''دو بڑے آدمی ایک طرح سے سوچتے ہیں، مما!'' عابد نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا اللہ حافظ کل ناشتا میں آپ کے ساتھ ہی کروں گا۔ آپ میرے لیے میٹھا دلیا بنائیے گا۔''

''ہاں ضرور۔'' وہ بولی۔ ''تمہاری باتوں میں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں تمہاری خیریت پوچھ لیتی۔ تم کیسے ہو؟''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہے، محض موسم کا اثر ہے۔ کراچی کا موسم ٹھیک ہوتے ہی طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر ریسیور اس کے ہاتھ میں رہا تو مما سیکڑوں سوالات اور کر دیں گی۔ انہیں تو بس بہانہ چاہیے تھا اس سے باتیں کرنے کا۔ ایک ماں کو اپنے بچے کی سلامتی کے علاوہ اور کیا فکر ہو سکتی ہے؟

فائلیں دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ لنچ میں اس کے ساتھ اس کا ایک منیجر راشد بھی تھا۔ وہ جہاز راں کمپنی میں کام کرتا تھا۔ ''ہمارے جہاز الباسٹرس نے اس سال اچھا بزنس دیا ہے۔'' اس نے ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد ایک میز سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم ایک اور جہاز خرید لیں؟''

''تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔'' عابد نے جواب دیا۔ ''میں چھوٹے بزنس کرنے کے بجائے اب بڑے بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے پیرزادہ کرتا ہے۔''

''میری دعا ہے کہ آپ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔'' راشد نے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں آپ کو ایک نئے جہاز ''سی کنگ'' کے بارے میں کچھ بتاؤں؟''

''ہاں ضرور۔'' عابد نے مینیو کی طرف نہیں دیکھا اور ویٹر کو کھانے کا آرڈر لکھوا دیا۔ وہاں کے ویٹرا سے [illegible] تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ کس روز کیا کھانا پسند کرتا ہے۔

جب راشد نے اپنے بریف کیس سے چند بروشرز نکالے تو عابد نے انہیں دیکھنے میں دلچسپی ظاہر کی، حالانکہ وہ کھانے کے دوران کسی چیز کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ کھانا وہ اطمینان سے ہی [illegible] لیکن اس جہاز کا تذکرہ سن کر اسے [illegible] سے دیکھا اور اس کے بارے میں بہت سے سوالات کیے۔ وہ جہاز جاپان کا بنا ہوا تھا۔ ''مگر اس کا مالک کون ہے؟'' عابد نے پوچھا۔

''یہ جہاز وائلنگ انٹر پرائز کے پاس ہے۔''

''وائلنگ کا مالک تو غالباً پیرزادہ ہے؟'' عابد نے حیرت سے کہا۔ ''اگر اسے اپنے جہاز کا سودا ہی کرنا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ وہ کل شام مجھ سے بات کرتا۔ میں کل وہیں تھا، اس کے ساتھ کلب میں۔''

''ممکن ہے اس کے نزدیک یہ بات معمولی ہو۔ اس نے براہِ راست بات کرنے کے بجائے ایجنٹ کے توسط سے بات کرنا مناسب سمجھا ہو۔'' راشد بولا۔

''ہاں، ہمارے درمیان ابھی تک شطرنج کے سوا کسی موضوع پر بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ وہ جہاز راں ہونے کے علاوہ اسٹاک مارکیٹ پر بھی چھایا ہوا ہے۔''

''ہاں.....'' راشد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ مارکیٹ کے بڑے لوگوں میں سے ایک ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں اس سے شام کو ملاقات کروں تو سی کنگ کے بارے میں بات کروں؟''

''ہاں..... کر سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ خبر تو مارکیٹ میں پھیلی ہوئی ہے۔'' کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ گیا۔

اپنے آفس پہنچ کر اس نے چند فائلیں نمٹائیں تو رات کے نو بج گئے۔ اس نے اپنے شوفر کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا پھر پیرزادہ کے بنگلے تک پہنچنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے پیرزادہ اس کا شدت سے منتظر ہو۔ ایک بٹلر نے اس کا استقبال کیا اور فوراً ہی اسے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ہی تھا لیکن وہاں عام ملاقاتیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ پیرزادہ کے قریبی لوگ ہی وہاں تک پہنچ پاتے تھے۔

پیرزادہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے عابد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہو ینگ مین؟''

''ٹھیک ہوں، ذرا موسم کا اثر ہو گیا تھا۔''

"کبھی باہر بھی نکلا کرو۔" اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "مری، نتھیا گلی، کافرستان وغیرہ اچھے علاقے ہیں۔ بڑی کمپنیاں تو اپنے ملازموں کو الاؤنس دیتی ہیں اور چھٹیاں بھی مگر کمپنیوں کے مالکان اپنے کاموں میں اتنا مشغول رہتے ہیں کہ سوائے کلبوں میں جانے کے کوئی تفریح نہیں کر پاتے۔"

عابد کمرا [illegible]

انہوں نے کافی پی۔ اس کے بعد شطرنج کی ایک بازی لگالی لیکن حقیقت یہ تھی کہ آج عابد کا دل کھیل میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جہاز "سی کنگ" کا موضوع چھیڑنا چاہتا تھا لیکن ایسا کوئی موقع ہی نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر پیرزادہ نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ "میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں رہ گیا ہے۔" اس نے ہوانا سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "کرسی پر بیٹھ کر حرکت کرتا ہوں یہ موٹر سے چلتی ہے اگر اس کے کسی نٹ بولٹ میں خرابی پیدا ہو جائے تو میں اتنی دیر کے لیے مفلوج ہو جاتا ہوں۔"

"زندگی اسی کا نام ہے۔ آپ ہمیشہ سے ایسے تو نہیں تھے۔" عابد نے کہا پھر اس نے دل میں سوچا۔ "بڑے میاں! مربھی چکو اور دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع دو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہ کاروبار مجھے دے جاؤ۔ میں تمہارا اچھا سا مقبرہ بنوا دوں گا۔"

"ہاں، اب میرے دل میں کوئی حسرت نہیں ہے۔" اس نے ایک پیادہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ کرنا تھا، کر لیا۔"

"تب تو آپ خوش قسمت ہیں۔"

"نہیں، میرا شمار خوش قسمتوں میں نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے کرب آمیز انداز میں کہا۔

"کیوں؟" عابد نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" پیرزادہ نے کہا۔ "میں ایک جہاز راں کمپنی کا مالک ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم میرے جہاز سی کنگ کو خریدنے کے خواہش مند ہو۔"

"لیکن یہ بات تو....."

"تم نے راشد کے سوا کسی سے نہیں کہی۔" نعمان نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس نے یہ بات میری ہی خواہش پر تم سے کہی تھی۔ تم کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اسے میری سفارش پر تم نے اپنے ہاں ملازم رکھا ہے۔ اس کی وفاداریاں بے شک تمہارے ساتھ ہیں لیکن اگر اس نے یہ کام میری خواہش پر کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

عابد نے بھوؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کا مقصد کیا تھا؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں جہازوں سے کس قدر دلچسپی ہے۔" اس نے شطرنج کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ عابد نے اس پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ بازی ہم کل بھی کھیل سکتے ہیں؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں کھیل میں دل نہیں لگ رہا۔" وہ بولا۔ "میں وہ جہاز خریدنے کا خواہش مند ہوں اس کے لیے ظاہر ہے کہ مجھے کسی ایجنٹ سے بات کرنا پڑے گی۔ تمہارا ایجنٹ کون ہے؟"

"میں وہ جہاز تمہیں ایسے ہی دے دوں گا۔" پیرزادہ نے کہا۔

"ایسے ہی سے آپ کی کیا مراد ہے؟" عابد نے پوچھا۔ "میں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ایسے ہی..... فری۔" اس نے فراخدلانہ لہجے میں کہا۔

"بحری جہاز ایسے ہی تو نہیں دیے جاتے!" عابد نے حیرت ظاہر کی۔ پیرزادہ کا انداز اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

"صرف سی کنگ ہی نہیں بلکہ سارے جہاز تمہارے نام کر دوں گا۔" پیرزادہ نے کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے عابد کے سامنے چارا پھینک دیا ہو اور اب اس بات کا منتظر ہو کہ وہ کب اس پر منہ مارے گا۔

"یہ سب آپ کس خوشی میں کر رہے ہیں؟" عابد نے پوچھا اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہزاروں سوالات اس کے دماغ میں کوندے تھے کہ پیرزادہ اس سے آخر چاہتا کیا ہے؟ وہ اربوں کا سرمایہ اسے کیوں دینا چاہتا ہے؟ یہ تو آدمی اسی وقت کرتا ہے جب اس کا دماغ اچانک چل جاتا ہے۔

"میری کرسی میں بہت سے بٹن لگے ہوئے ہیں۔" اس نے عابد کے سوال کا جواب دینے کے بجائے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔ "اسے دبانے سے کرسی دائیں جانب گھوم جاتی ہے اور اسے دبانے سے بائیں جانب اور اسے دبانے سے راہول آ جاتا ہے۔" اس نے کہا اور اس مخصوص بٹن کو دبا دیا۔

تھوڑی دیر میں ایک دراز قامت شخص وہاں آ گیا۔ پیرزادہ نے شطرنج کی طرف اشارہ کر کے اسے لے جانے کو کہا۔ "اب میں کچھ پرائیویٹ باتیں کر رہا ہوں۔ اس لیے اس طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔"

راہول نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی جیسے وہ سب کچھ

سمجھ گیا ہو۔ وہ تقریباً چالیس برس کا تھا۔ اس کے چہرے پر ملاحت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ فلموں میں کام کرنے والے دلنوں سے مشابہ تھا جن کے چہروں پر کرختگی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فائٹر رہ چکا ہو۔

جب وہ شطرنج لے کر چلا گیا تو پیرزادہ نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی سے شادی کر لو۔"

عابد کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ "بب بیٹی۔ مم مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ... آ..... آپ کی کوئی بیٹی بھی ہے۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ بے اندازہ خوشی ملنے سے اس کا نروس سسٹم متاثر ہو گیا تھا۔

"یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔" پیرزادہ نے کہا۔ "تم اس پیشکش کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"مگر میں ہی کیوں؟" عابد نے سوال کیا۔ "میرے علاوہ شہر میں اور بھی تو رئیس زادے ہیں؟"

"تم خود رئیس ہو۔ میں تم سے اپنی بیٹی کی شادی کیوں نہ کروں؟" اس نے عابد کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم کاروبار کی دنیا میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہو عابد منشی! میرے جہازوں کو تم جیسا قدرداں کہاں ملے گا؟ میرے جہاز محفوظ رہیں گے اور میری بیٹی بھی اچھے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ اس کی دیکھ بھال تم سے زیادہ اچھے طریقے سے کون کر سکے گا؟"

"ہم کاروباری حریف ہیں اور ہمارے درمیان تھوڑا بہت حسد بھی ہے تو پھر تم اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کیوں کرنا چاہتے ہو؟" عابد نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دوسری باتوں میں الجھنے کے بجائے میری بیٹی شمائلہ پیرزادہ کو ایک نظر دیکھ لو تو بہتر ہے۔ تب ہی تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنی کرسی پر لگا ہوا بٹن دبایا۔ ایک منٹ بعد راہول اس کمرے میں آ گیا۔

"عابد منشی کو شمائلہ کے پاس لے جاؤ۔" وہ بولا۔

عابد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ راہول نے اپنے گردن کو خفیف سا خم دیا اور دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

عابد کمرے سے نکل کر راہ داری میں چلا گیا۔ وہ مکان کیا تھا۔ اچھا خاصا محل تھا۔ مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے اور لان کے قریب سے گزر کر وہ مکان کے دوسرے حصے میں پہنچ گئے۔ جہاں ایک آراستہ کمرے میں شاندار کرسی پر شمائلہ متمکن تھی۔ راہول باہر ہی رہ گیا تھا۔ عابد وہاں تنہا ہی داخل ہوا۔

ایک عورت شمائلہ کے گیسو سنوار رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی عابد چونکا اور حیرت سے گرتے گرتے بچا، اس لیے کہ یہ وہی لڑکی تھی جسے وہ آج صبح ڈاکٹر طاہر کے کلینک پر دیکھ چکا تھا۔ گویا وہ پیرزادہ کی بیٹی تھی!

کمرے کی ایک کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی جہاں سے بیلا اور موتیا کی خوشبو کمرے میں آ رہی تھی۔ لان میں مرکری بلب روشن تھے جن کی روشنی نے سحر انگیز سماں پیدا کر دیا تھا۔ وہ سنہرا لباس پہنے تھی اور سنہری کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں میں سنہرے کام والی سینڈل تھی۔ وہ گویا سونے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی سونے کی مورتی تھی۔ اس کا انداز شہزادیوں جیسا تھا لیکن چہرے پر تمکنت اور وقار کے بجائے ایک عجیب سی ملائمت، بے کسی اور بے بسی تھی۔ وہ اس پس منظر میں کچھ غیر فطری سی لگ رہی تھی۔ غالباً اس لیے کہ اس کا چہرہ سپاٹ سا تھا۔ اس نے آہٹ ہونے پر بھی نظریں پھیر کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"مس شمائلہ! مجھے عابد منشی کہتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب نے حکم دیا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔" اس نے ادب سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے اپنی گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

شمائلہ نے اس کے تعارف کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بہ دستور ساکت و صامت تھی۔ عابد خود کو احمق محسوس کرنے لگا۔ اس نے ملازمہ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور گویا مدد کا طالب ہوا لیکن ملازمہ کی آنکھیں بھی ساکت تھیں جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ وہ اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔

عابد بلا کا ذہین تھا اور پیچیدگیوں سے نکلنا جانتا تھا۔ اس نے تیزی سے سوچا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہ اس کے قریب گیا اور اس کی کرسی کے چاروں طرف گھومنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اسے آہستہ سے دبا کر وہ بولا۔ "اگر ہم آپس میں تعارف حاصل کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔"

شمائلہ اب بھی خاموش تھی۔ اس کے سینے میں تموج تھا۔ وہ حرکت کر رہی تھی۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی مہک سے اس کا دماغ معطر ہوا جا رہا تھا۔ وہ مڑ کر اس کے سامنے جا کھڑا

ہوا۔ ''اوہ! تم تو واقعی خوبصورت ہو، کتابی چہرہ، گلابی آنکھیں، ستواں ناک، صراحی دار گردن۔ سب کچھ تو ہے جس کی تمنا وہ ماں کرتی ہے جو اپنے گھر میں ایک چاندسی بہو لانا چاہتی ہے۔'' اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تو تمہیں دیکھ کر کافی متاثر ہوا ہوں۔ افسوس ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔ کم از کم میں تمہیں اپنی ماں سے ضرور ملا دیتا جو ایک اچھی سی بہو گھر میں لانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔''

اس لفاظی کا بھی شائلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر عابد کے جادوئی الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ عابد کو گمان گزرا کہ وہ بہری ہے لیکن بہرے لوگ بھی آں، اوں کر کے اپنے جذبات کا اظہار تو کرتے ہیں۔ کیا وہ ان احساسات سے بھی عاری تھی؟

''اسے آپ کی موجودگی کا احساس نہیں ہے مالک۔'' اس کی ملازمہ نے کہا۔ ''یہ غریب تو.....''

''جناب باہر آ جائیے۔'' باہر سے راہول نے بلند آواز میں کہا۔ اس نے ٹھیک اس موقع پر مداخلت کی تھی جب ملازمہ شائلہ کے بارے میں کوئی انکشاف کرنے والی تھی۔ عابد سوچ میں پڑ گیا کہ وہ بھلا کیا کہنے والی تھی؟

اب وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا وہ دروازے کی طرف بڑھا اور باہر آ گیا۔ راہول نے پہلے کی طرح مؤدبانہ انداز میں اس کے آگے چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس حصے میں پہنچ گئے جہاں اپاہج ارب پتی نعمان پیرزادہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ عابد کی نوکِ زبان پر کئی سوالات مچل رہے تھے۔ وہ لب کشائی کرنا چاہتا تھا کہ پیرزادہ نے کہا۔ ''تو تم شائلہ سے ملاقات کر آئے؟ تم یقیناً مایوس ہو گے، اس لیے کہ تمہیں اپنی کسی بات کا جواب نہیں ملا ہو گا۔''

''ہاں، اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیوں کہ وہ سکتے کی کیفیت میں ہے۔'' پیرزادہ نے انکشاف کیا۔ ''اور یہ کیفیت اس پر اس وقت سے قائم ہے جب اسے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ کافی پرانی بات ہے، ممکن ہے تمہیں اس بارے میں کوئی نہ بتا سکے۔ جہاں تک پولیس ریکارڈ کا تعلق ہے تو اس واقعے کا ریکارڈ بھی نہیں ہو گا۔ ممکن ہے کہ پولیس نے اسے ضائع کر دیا ہو۔''

عابد گم صم حالت میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

''تم سوچو کہ مجھے اپنی بیٹی سے نہیں دولت سے پیار تھا، اس لیے میں نے اغوا کرنے والوں کو مطالبے کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ یہ بات نہیں ہے۔ انہوں نے کیش رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ انہیں چیک لینا منظور نہیں تھا، چناں چہ کیش انتظام کرنے میں دیر ہو گئی۔ جب میں رقم لے کر اس جگہ پہنچا تو ان ظالموں نے اس بے چاری کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا تھا کہ اس کی یہ حالت ہو گئی جو تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

عابد سناٹے میں آ گیا۔ اس کی زبان نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی زبان پر جو سوالات مچل رہے تھے، انہوں نے دم توڑ دیا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا۔

پیرزادہ نے اپنی کرسی میں لگا ہوا ایک مخصوص بٹن دبایا تو اس کا ملازم راہول کسی جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ ''آقا، غلام حاضر ہے۔''

''کاغذات لاؤ۔'' پیرزادہ نے حکم دیا۔

راہول الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ وہ پانچ منٹ بعد آ گیا اور اس نے ایک بڑا سا لفافہ اپنے مالک کو پیش کر دیا۔ عابد کا دل انجانی مسرتوں سے دھڑکنے لگا۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس کی آواز اپنے کانوں میں سن رہا تھا۔ پیرزادہ نے یقیناً اپنی املاک کے کاغذات ملازم سے منگوائے تھے۔ اس نے وہ لفافہ عابد کی طرف بڑھا دیا۔

''انہیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں اپنی ساری جائداد کا مالک بنانے کا وعدہ کر رہا ہوں۔''

''اگر میں شائلہ سے شادی کر لوں تو کیا آپ اپنی جہاز راں کمپنی کا مالک مجھے بنا دیں گے؟ وہ آٹھ جہاز جن کے آپ ابھی مالک ہیں، میری ملکیت میں آ جائیں گے؟''

''ہاں، صرف تین شرطوں کے ساتھ۔''

''وہ کیا؟''

''میں تمہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔'' پیرزادہ نے کہا۔ ''محض اپنی بیٹی کو تحفظ دینا چاہتا ہوں۔''

''میں آپ کی شرطیں سننے کا منتظر ہوں؟''

''میں نے شائلہ کا کافی علاج کرایا ہے، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اب اسے کسی ڈاکٹر کے ہاں لے جایا جائے۔'' اس نے کہا۔ ''اس وقت یہ ڈاکٹر طاہر کے زیرِ علاج ہے اور آج صبح بھی ان کے ہاں معائنے کے لیے جا چکی ہے۔''

''ہاں میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔'' وہ بولا۔

''دوسری بات یہ ہے کہ جب تک میری بیٹی زندہ ہے، اس مکان میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اسی طرح

رہے گا۔''

''اور تیسری شرط؟'' عابد نے پوچھا۔ اسے یہ سب انتہائی سنسنی خیز لگ رہا تھا جیسا اس نے کبھی ناولوں میں پڑھا تھا۔ ایسی سچویشن عام زندگی میں کہاں ملتی ہے؟

''تم دوسری شادی نہیں کرو گے۔ اس چھت کے نیچے کوئی اور عورت نہیں لاؤ گے۔ اپنی زندگی کسی معزز شخص کی طرح گزارو گے۔'' پیرزادہ نے کہا اور بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم مجھے زیادہ دنوں کے مہمان نظر نہیں آتے۔'' عابد نے دل میں سوچا پھر ایسی شرائط عائد کرنے کا کیا فائدہ؟

''یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔'' پیرزادہ نے کہا۔ ''میرا ایک وکیل تمہیں چیک کرتا رہے گا۔'' اس کی آنکھیں پتھر کی طرح سخت ہو گئیں۔ ''اب ان کاغذات پر دستخط کر دو۔ اس کے بعد ہمارے درمیان معاہدہ مکمل ہو گا۔''

عابد نے وہ کاغذات لفافے سے نکالے اور انہیں پڑھے بغیر ان پر دستخط کر دیے۔ ''شرائط اپنی جگہ پر رہیں، وہ میں نے تمہیں بتا بھی دی ہیں لیکن ان کاغذات کو تمہیں ضرور پڑھ لینا چاہیے تھا۔'' پیرزادہ نے ہنس کر کہا۔

''بڑے میاں! انہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' عابد نے سوچا۔ ''جب میں تمہاری بیٹی سے شادی کر لوں گا تو میں تمہاری ساری دولت کا مالک بن جاؤں گا۔''

''میں ان کاغذات کو پڑھوں گا اور اپنے والدین سے مشورہ بھی کروں گا۔ اس کے لیے مجھے ایک ہفتے کی مہلت درکار ہو گی۔''

''ہاں، اس سلسلے میں والدین سے مشورہ ضروری ہے۔ حالاں کہ زندگی ہماری ہے اور اسے گزارنا بھی ہمیں ہی ہے لیکن والدین بھی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ چنانچہ ان سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔ اس اثنا میں، میں اپنا وصیت نامہ تیار کرا لوں گا۔'' وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اس وقت شیمپین پی لو تو لطف آ جائے گا۔'' عابد نے اس سے اتفاق کیا۔

☆☆☆

وہ جب گھر پہنچا تو ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بابا البتہ اپنی خواب گاہ میں جا چکے تھے۔ گھر پہنچتے ہوئے عابد کا دماغ بے حد منتشر تھا اگر اس نے شیمپین کا ایک پیگ نہ لیا ہوتا تو نہ جانے وہ گھر تک پہنچ پاتا یا نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی مما کو دنیا کے اس انوکھے رشتے کے بارے میں کیسے بتائے گا؟ وہ ایک مفلوج لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہو گا کہ وہ اس کے باپ کی جائداد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا ماں کو اس کا یہ جواب پسند آئے گا؟

اس نے اپنی زندگی میں ایک جاگیردارنی کی حیثیت سے عیش ہی کیے تھے یا پھر حکمرانی کی تھی..... ہاریوں پر حکمرانی لیکن ایک چاندسی دلہن گھر میں لانے کا خواب بھی تو اس نے دیکھا تھا کیا وہ اپنے خوابوں کو پامال کرنے کی اجازت کسی کو دے سکتی ہے؟

وہ فوراً ہی اس سے نہیں پوچھے گی کہ اسے مزید دولت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی نہیں کر رہا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دس برسوں میں اسے اتنا کچھ مل جائے جس کا وہ خواہش مند ہے پھر اس کے لیے ایک اپاہج لڑکی کو اپنے گلے کا ہار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو پھر اس کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوچ سوچ کر اس کے دماغ میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔

رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ وہ ماں کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ ماں کے ساتھ اس کے بھتیجے ناصر اور کمال بھی شریک تھے۔ عابد نے سوچا کہ اگر کھانے کے دوران اس نے ایسی بات چھیڑ دی تو کھانا حرام ہونے کی توقع ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ ماں کھانے سے ہی اٹھ جائے۔ ہاں..... کھانے کے بعد چائے پیتے وقت اس کا تذکرہ کیا جا سکتا تھا۔ بابا کھانا کھا چکے تھے، لیکن جب انہیں پتا چلا کہ اپنے بیٹے سے ان کی ملاقات ڈنر ٹیبل پر ہو سکتی ہے تو وہ میٹھا کھانے کے بہانے آ گئے۔

''شکر ہے کہ آج تجھے جلدی گھر آنا نصیب ہو گیا۔'' وہ پیار سے بولے۔ ''ورنہ ہم کل گاؤں واپس جا رہے تھے۔ اس وقت معلوم نہیں ملاقات ہوتی یا نہ ہوتی۔''

''کیوں نہ ہوتی۔ میں بہرحال آفس سے گھر لوٹ آتا۔'' وہ ندامت سے بولا۔

کھانے کے دوران زیادہ تر کھیت کھلیان کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بابا اس سے فصل کے بارے میں مشورہ ضرور لیتے تھے۔ حالانکہ اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ وہ جب کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تو عابد نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ ورنہ یہ بات کہنے کے لیے اسے دادو جانا پڑے گا۔

''مما میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تو جانتی تھی کہ تو میرا دل نہیں توڑے گا۔'' اس نے پیار سے کہا۔ ''میں نے کل زرینہ کا تذکرہ کیا تھا اور آج

تو راضی بھی ہو گیا۔ شاباش میرے بچے۔ خدا تجھے سلامت رکھے۔"

عابد کے لیے بات کرنا دشوار ہو گیا، اس لیے کہ ماں نے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔

"میں زرینہ سے شادی نہیں کروں گا۔"

"اچھا..... تو کوئی لڑکی تو نے خود دیکھ رکھی ہے؟" وہ سر ہلا کر بولی۔ "اپنے بابا کے سامنے کہتے ہوئے شرما رہا ہے۔"

"شرمائے گا کیسے نہیں۔" اس کے بابا نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آخر اولاد تو ہماری ہی ہے۔ لاکھ بڑا ہو جائے مگر ہمارے سامنے تو بچہ ہی رہے گا۔"

"اوہ بابا۔" عابد نے جھینپ کر کہا۔ وہ بالغ ضرور تھا اور اپنے فیصلے خود کرتا تھا لیکن شادی جیسے معاملے پر بات کرتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی وہ پھر سے بچہ بن گیا تھا۔

جب اس کے بابا وہاں سے چلے گئے تو عابد نے اپنی ماں کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا۔ "اوہ بیچاری۔" انہوں نے افسوس ظاہر کیا۔ "اس کی زندگی تو خراب ہو گئی۔ اسے کون اپنائے گا۔"

"میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ پھر اس نے غور سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تا کہ ان کا ردِعمل تلاش کر سکے۔ ردِعمل اس کی توقع کے مطابق تھا۔

"بیٹے کوئی دیکھ کر تو مکھی نہیں نگل سکتا۔" اس نے تحمل مزاجی سے کہا۔ "اگر وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے تو کیا ہوا؟ کیا میں سمجھ لوں کہ تو نعمان پیرزادہ کی دولت سے متاثر ہو گیا ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے اس لڑکی پر ترس آتا ہے۔ اس کا علاج ممکن ہے۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ تم دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔ جب اس کی شادی ہو جائے گی تو اس بات کا امکان ہے کہ اس کی حالت درست ہو جائے۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟ ایک ذہنی دھچکے کے سبب اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ جب اسے ایک خوشگوار دھچکا پہنچے گا تو ممکن ہے کہ اس کی حالت درست ہو جائے۔

"لیکن دنیا میں سیکڑوں لڑکیاں پڑی ہیں۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس کا علاج کرنے بیٹھ جائیں؟ اگر وہ صحت یاب نہ ہوئی تو؟" ایک ماں بات کر رہی تھی، اس لیے اس میں اس کے اندیشے اور وسوسے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے بیٹے سے بات کرتے ہوئے اپنے جذبات کو علیحدہ تو نہیں رکھ سکتی تھی؟

عابد کوئی بچہ نہیں تھا کہ یہ سب باتیں سمجھ نہ پاتا۔ وہ اپنی ماں کے لفظوں سے ٹپکنے والی جذباتی حرارت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں پرورش پانے والے اندیشوں کا علاج وہ کر دیتا تو معاملہ اس کے حق میں چلا جاتا۔ بہرحال ابھی بہت سے جاں گسل مرحلے تھے جن سے نمٹنا تھا۔ پہلے ماں، اس کے بعد باپ اور پھر چچا۔ ان کی ذات برادری بھی بڑی تھی اور ان کے سارے افراد کو سمجھانا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ یورپ اور امریکا نہیں ہے جہاں شادی بیاہ مذاق سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تو شادی معاشرتی ذمے داری ہے۔ جس میں سب اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں اگر وہ بغیر بتائے ہی یہ شادی کر لیتا تو معاشرتی طور پر اس کا بائیکاٹ ہو جاتا۔ سب اس سے قطع تعلق کر لیتے۔

"ماں آپ سوچیے تو سہی اس کا کتنا ثواب ہے۔"

"کیا ثواب کمانے کے لیے تم ہی رہ گئے ہو؟" وہ پیشانی پر شکنیں سجا کر بولی۔ "ویسے بھی کیا ضروری ہے کہ اس اپاہج لڑکی سے شادی کر کے ثواب کمایا جائے۔ دنیا میں بہت سے ایسے کام ہیں جن سے ڈھیروں ثواب ملتا ہے۔ تم روز غریبوں کو کھانا کیوں نہیں کھلاتے یا پھر ہر سال حج پر کیوں نہیں جاتے؟"

عابد کو محسوس ہوا کہ اس کا تیر رائگاں چلا گیا۔ ثواب والی بات کا ماں نے اثر نہیں لیا تھا۔

"ہم پر اخلاقی لحاظ سے بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ایسی لڑکیوں کی طرف بھی دیکھیں جو معذور اور اپاہج ہوں۔ ہمارے مذہب کے مطابق تو بیواؤں سے نکاح کرنے کے لیے بھی کہا گیا ہے۔"

"تیری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" اس کی ماں نے فضا میں ہاتھ ہلایا۔ "تو نے یہ سوچا کہ اگر تیرے بابا کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ تو نے اتنا احمقانہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"وہ تو خود... شادی پر زور دے رہے ہیں ماں۔"

"تو کیا میں انہیں بتا دوں کہ تو ایک اپاہج لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟" اس نے اپنی بھویں سکیڑ کر کہا۔

"ہاں، یہ بات کبھی نہ کبھی تو بتانا پڑے گی۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ابھی بتا دوں؟" اس کی ماں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، اس سے اچھا موقع بھلا کب آئے گا؟"

"ٹھیک ہے میں ان کے کمرے میں جا رہی ہوں۔" اس کی ماں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر پاؤں پٹختی ہوئی

عابد کے بابا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صورتِ حال سے خوش نہیں ہے۔

وہ پندرہ منٹ بعد واپس آ گئی اور اس نے کہا۔ ''وہ لڑکی کو دیکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ کیا پیرزادہ اس کے لیے تیار ہوں گے؟ تم فون پر ان سے رابطہ قائم کر کے بتاؤ۔''

''ہاں، ان کا موبائل نمبر میرے پاس ہے میں معلوم کیے لیتا ہوں۔'' عابد نے کہا اور اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں اصل بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی جب کہ بابا ہو سکتا ہے وہاں تک پہنچ گئے ہوں جہاں تک اس نے سوچ رکھا ہے۔ وہ بہرحال جہاندیدہ تھے اور اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے تھے۔

نمبر مل گیا تھا پیرزادہ نے اس کی اجازت دے دی کہ اس کے والدین خوشی سے شائلہ کو دیکھنے آ سکتے ہیں اگر کل شام تک آ جائیں تو بہتر ہوگا۔ عابد نے فون آف کیا اور اپنی ماں کو یہ بات بتا دی۔ بابا اس پر رضامند ہو گئے کہ کل شام لڑکی کو دیکھنے کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔

صبح ناشتے کے بعد انہوں نے اپنے کمرے میں عابد کو طلب کیا اور اس سے متعدد سوالات کیے۔ ''تم نے جو کچھ سوچ رکھا ہے میں اس سے آگاہ ہوں عابد۔'' انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''پیرزادہ بہت ذہین ہے اور پرانا کاروباری شخص ہے۔ اس نے بھی تو اپنی بیٹی کو تحفظ دینے کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا؟''

''جی بابا، اس نے تین شرائط عائد کی ہیں۔'' عابد نے بتایا پھر اس نے پیرزادہ کی شرائط سے انہیں آگاہ کیا۔

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ اس کے بعد مونچھوں کو بل دے کر بولے۔ ''یہ تو اس کی زندگی تک کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو وہی ہوگا جو تم چاہو گے؟''

''ہوں۔'' عابد نے آہستہ سے کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

''ٹھیک ہے..... اب لڑکی کو دیکھ لیتے ہیں کہ اس کی تصویر اخبارات میں شائع ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟'' عابد نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''حاکم منگھی کے لڑکے کی شادی ہوگی تو دلہا اور دلہن کی تصویریں اخبارات میں شائع ہوں گی۔ آدھا سندھ ویسے میں آئے گا۔ اخباری نمائندے میرا پیچھا کر رہے ہوں گے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

''بابا میرا خیال ہے کہ کورٹ میرج کرنا بہتر رہے گا، اس لیے کہ لوگ سوالات کر کے آپ کا ناک میں دم کر دیں گے پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سب جگہ پھیل جائے گی۔ جب کہ کورٹ میرج میں یہ بات کسی حد تک چھپائی جا سکتی ہے۔''

''تیری بات دل کو لگتی ہے۔'' انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ایسی صورت میں ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں البتہ تیری ماں کا رویہ نہ جانے کیا ہو؟''

''میں انہیں منا لوں گا۔'' عابد نے یقین سے کہا۔

اس روز وہ شائلہ کو دیکھنے گئے تو لڑکی اس کی ماں کو پسند آ گئی۔ اس لحاظ سے کہ وہ خوبصورت تھی..... لیکن اس کے مفلوج ہونے کی بنا پر انہوں نے اسے فوراً مسترد کر دیا۔ انہیں شائلہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے واپس آتے ہوئے افسوس ظاہر کر رہی تھی کہ کاش وہ اپاہج نہ ہوتی تو وہ اسے دلہن بنا کر گھر لے آتی۔ اس کی گردن نفی میں ہلتی رہی جب کہ اس کے بابا اسے دوسرے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے اس سے سرگوشیوں میں بہت سی باتیں کیں۔ انہوں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''وہ ارب پتی اپنی بیٹی کا تحفظ بھی تو چاہے گا۔''

''اسی لیے تو اس نے تین شرائط عائد کی ہیں۔'' عابد بولا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ تم سے یہ چاہے گا کہ اپنی ساری دولت تم لڑکی کے نام کر دو؟''

''میرا خیال ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔'' عابد نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ''پیرزادہ کے زندہ رہنے کے امکانات کم ہی معلوم ہوتے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' حاکم نے اس سے اتفاق کیا۔ ''میں تو راضی ہوں، مسئلہ تمہاری ماں کا ہے۔ شادی میں ظاہر ہے کہ بے حد نزدیکی لوگ ہوں گے۔ چنانچہ بات زیادہ پھیلے گی نہیں۔''

''آپ ماں کو منا لیں۔'' عابد نے کہا۔ ''انہیں بتا دیجیے کہ دوسرے ملکوں میں جا کر اس کا علاج کرایا جا سکتا ہے۔''

''ہاں، میں بھی ایسی ہی بات سوچ رہا ہوں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔

پھر انہوں نے اس کی ماں کو کیسے رضامند کیا، اس کا بھید عابد کو معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کے بابا نے ایک ہفتے بعد اس سے کہا کہ وہ شادی کی تیاری کر سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک بہن اور ایک بھائی کو ہی اس شادی پر مدعو کیا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد وہ دو کاروں میں نعمان پیرزادہ کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ ان کا والہانہ طریقے سے استقبال کیا گیا۔ وہ سب سیدھے سجائے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں پیرزادہ فیملی کے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ڈرائنگ روم کے دو حصے کر دیے گئے۔ درمیان میں پھولوں کی ایک دیوار تھی۔ جس کے ایک طرف عابد اور دوسری طرف شائلہ بیٹھی تھی۔ وہ کورٹ میرج نہیں تھی کیونکہ وہ کورٹ نہیں گئے تھے' گھر پر ہی ایک عدد قاضی صاحب کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جنہوں نے نکاح پڑھانے کے بعد سب کو مبارکباد دی۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا اور اس کے بعد سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا..... پھر لان میں جا کر کھانا کھایا۔ عابد اور شائلہ کے لیے دو خصوصی کرسیاں وہاں رکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد ان کے والدین تھے۔ سب نے کھانا کھایا اس کے بعد پیرزادہ کے کہنے پر وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دلہا اور دلہن والوں کے درمیان پھولوں کی دیوار ختم کر دی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پیرزادہ کا وکیل جہانگیر علی، ڈاکٹر طاہر اور دوسرے معزز افراد کے علاوہ ملازم خاص راہول اور ملازمہ میمونہ بھی موجود تھی۔ وہ دونوں ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

''اب میں اپنے وکیل مسٹر جہانگیر سے درخواست کروں گا کہ وہ مسٹر عابد کو میرا وصیت نامہ دیں تاکہ وہ اسے پڑھ سکیں اور اگر انہیں اس پر کوئی اعتراض ہو تو وہ اسی وقت اس کا اظہار کر دیں۔'' پیرزادہ نے کہا۔

حاکم کا دل عجیب سے انداز سے دھڑکنے لگا۔ اس نے پیرزادہ کے بارے میں لوگوں سے معلوم کیا تھا لیکن کوئی اس کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکا۔ ایک آدھ شخص نے بتایا تھا کہ وہ پہلے کسی غیر ملک میں تھا اور چند برس سے یہاں دیکھا جا رہا تھا۔ باہر جانے سے پہلے اس کی چھوٹی موٹی زمین ہوا کرتی تھی۔ وہ اسے بڑھانا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زمین اس کے ہاتھ سے جاتی رہی پھر باہر جا کر نہ جانے کیسے اس کے قدم شپنگ لائن میں جم گئے۔ اس نے اپنی ٹانگوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ذیابیطس کا مریض ہے اور ایک زخم بگڑتے بگڑتے ناسور بن..... گیا تو ٹانگ کٹوانا پڑی۔ کچھ اس کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دہشت گرد تھا اور بم بلاسٹ میں اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا۔ اس کا چہرہ بھی جھلس گیا تھا اس لیے پلاسٹک سرجری کرانا پڑی۔

حاکم منگھی جب بھی اس کی طرف دیکھتا تو اسے نہ جانے کیوں یہ خیال ستانے لگتا کہ اس نے پیرزادہ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ یہ اسے یاد نہ آتا۔ اس پر بہرحال اعتماد کیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ اتنے متمول لوگ ہر روز اپنی رہائش تو نہیں بدلتے۔ پیرزادہ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا تھا' یہ کوئی نہیں بتا سکا۔ اسی لیے وہ الجھن میں گرفتار تھا۔ اس کی الجھن اس کے چہرے سے اس وقت بھی عیاں تھی جب اس کے بیٹے عابد کے ہاتھ میں پیرزادہ کی وصیت دی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شادی کے موقع پر وصیت نامہ بھلا کب دیا جاتا ہے؟ وہ اس بنا پر خاموش رہا کہ ممکن ہے ان کے خاندان میں یہی دستور ہو۔

جہانگیر نے اسے ادب سے ایک فائل پیش کی جس پر سنہرے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ عابد نے وہ فائل کھول کر پڑھی اور پھر سر اٹھا کر اپنے سسر جی سے کہا۔ ''اس میں یہ کیا احمقانہ سی بات لکھی ہوئی ہے کہ میں اپنی تمام جائداد اپنی بیوی اور بچے کے نام کر دوں گا؟ بیوی تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ شائلہ میری بیوی ہے لیکن بچہ؟ بچہ کہاں ہے؟ جو ابھی وجود میں نہیں آیا اس کا تذکرہ وصیت نامے میں ہونا کیا عجیب سا نہیں معلوم ہوتا؟''

''اس میں عجیب سی کیا بات ہے برخوردار؟ جب شادی ہو گئی ہے تو بچہ بھی ہو جائے گا۔'' پیرزادہ نے کہا۔ اس کا لہجہ ملائم لیکن سرد تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ شائلہ ماں بن سکے گی؟'' جاگیردار حاکم نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی آواز قدرے بلند تھی۔ ہال نما ڈرائنگ روم میں موجود سارے لوگ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ میری ادنیٰ سی خواہش ہے کہ شائلہ کے ہاں اولاد ضرور ہو۔'' نعمان پیرزادہ نے کہا۔

''جب اولاد کی شادی ہو جاتی ہے تو والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ہاں بھی اولاد ہو۔'' عابد کی ماں کلثوم نے کہا۔ ''لیکن اس بات کو وصیت میں لکھوانا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

''شائلہ مفلوج ہے۔'' حاکم نے پھر کہا۔ ''معلوم نہیں کہ اس نے ابھی ذہنی طور پر اس رشتے کو قبول کیا ہے یا نہیں!''

اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب میاں بیوی ایک دوسرے کی نزدیکی ہی نہیں آ سکیں گے تو پھر بچہ ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ ایک ایسی لڑکی جو ہوش و حواس سے بے گانہ ہو۔ ہنسی خوشی کے جذبات سے عاری ہو۔ کیا اس بات کے لیے آمادہ ہو سکتی ہے کہ خاص لمحوں میں اپنے شوہر کے

نزدیک آ سکے؟ بہرحال یہ بات وہ برملا نہیں کہہ سکتا تھا، اس لیے اس نے گھما پھرا کر کہہ دی۔

میں اس موقع پر اپنی فیملی ڈاکٹر سے گزارش کروں گا کہ وہ اس بات کی وضاحت کریں کہ شائلہ ماں بن سکتی ہے یا نہیں؟ انہوں نے ایک بہترین خاتون گائنا کولوجسٹ سے اس کا چیک اپ کرایا ہے۔'' پیرزادہ نے کہا اور ڈاکٹر طاہر کی طرف دیکھا۔

''شائلہ بٹی میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر طاہر نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے وضاحت کی۔ ''شادی کے وقت یہ سوال ضرور اٹھایا جاتا، اس لیے پیرزادہ صاحب نے میری معرفت اس کا چیک اپ کرالیا تھا۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' عابد نے ناگواری سے کہا۔ وہ شائلہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''ابھی سے ایسی شرائط عائد کرنا مناسب نہیں ہیں۔ اور نہ اس موقع پر اس کا ذکر کرنا چاہیے۔ ابھی شادی ہوئے ایک گھنٹا گزر رہا ہے اور بچے کے بارے میں بات کی جارہی ہے۔ اس کا انحصار منشائے الٰہی پر ہوتا ہے۔''

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے برخوردار۔'' پیرزادہ نے رسان سے کہا۔ ''خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میری آنکھیں نہ جانے کب بند ہو جائیں اگر میں یہ سوچتا ہوں کہ شائلہ کے ہاں اولاد ہونی چاہیے تو کیا میں غلط سوچ رہا ہوں؟'' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود جذباتی ہو گیا ہو، اس لیے کہ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''ڈاکٹر طاہر آپ میری بیوی شائلہ کا چیک اپ کرا چکے ہیں، یہ بتائیے کہ اس کے ماں بننے میں کوئی حرج تو نہیں ہو گا؟'' اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے پوچھا۔

اگر وہ معمول کی شادی ہوتی تو نہ ایسی وصیت پیش کی جاتی اور نہ ہی وہ اپنے والدین کے سامنے ایسے سوالات کرتا لیکن وہ ایک غیر معمولی شادی تھی، جس کی ہر چیز غیر معمولی تھی۔ لڑکی، اس کا باپ اور شادی کا شرائط نامہ..... جو حقیقت میں باپ کا وصیت نامہ تھا جو خوشی کے موقع پر پیش کیا جارہا تھا۔

''عابد منگھی صاحب! شائلہ کا طبی معائنہ صرف یہیں کی ایک بہترین گائنا کولوجسٹ نے ہی نہیں بلکہ برطانیہ اور امریکا کی ایک ڈاکٹر نے بھی کیا ہے۔ ان سب کی رائے یہی ہے کہ یہ ماں بن سکتی ہے۔'' ڈاکٹر طاہر نے انکشاف کیا۔

''اس پر سکتے کی جو کیفیت طاری ہے، اس کے بارے میں کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' عابد نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ ماں بننے کے بعد اپنے بچے کو کوئی نقصان پہنچا دے؟ اس کا ماں بننا بہرحال ایک رسک ہی ہو گا۔''

''اس میں کوئی رسک نہیں ہے۔'' پیرزادہ نے کہا۔ ''اس لیے کہ اگر شائلہ اس بچے کو جنم دیتے ہوئے اس دنیا سے چلی بھی گئی تو اپنا وارث اس دنیا میں چھوڑ جائے گی۔ کیا پتا میں اس کے سہارے کچھ دن اور زندہ رہ لوں۔''

''بڈھے! میں تیری ہلاکت کا تو سارا بندوبست کر کے رہوں گا۔'' عابد نے دل میں کہا۔ ''ہو سکا تو اپنے ہی ہاتھوں سے تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ اس کے بعد تیری بیٹی کو اپنی راہ سے ہٹانا کون سا مشکل کام ہو گا؟''

''جب شائلہ ماں بننے والی ہو گی تو یہ معاملہ کسی بہترین گائنا کولوجسٹ کے سپرد کر دیا جائے گا۔'' ڈاکٹر طاہر نے کہا۔ ''بچہ بیزیرین ہو گا، جس میں کوئی رسک نہیں ہوتا۔''

وہ سب شادی کے ایک گھنٹے بعد ہی بچے کے موضوع پر باتیں کر رہے تھے جس میں ایک ماہر ڈاکٹر اور وکیل کی رائے اور مشورے بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ لڑکی کا باپ بھی دلیلیں پیش کر رہا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اپنی کرسی آگے پیچھے کر رہا تھا پھر وہ اپنی بیٹی شائلہ کے سامنے ٹھہر گیا، اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا اس کے بعد وہ عابد کی طرف مڑا اور اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ ''پلیز عابد! ٹھنڈے دل سے سوچو۔ اس وصیت نامے کی عبارت میں ایسی کون سی بات ہے کہ تم اس پر دستخط نہیں کر رہے ہو؟ تم میری خوشیوں کو پامال کیوں کر رہے ہو؟ میں نے کوئی ایسی چیز تو نہیں مانگ لی ہے جو تم نہ دے سکو؟''

''اگر میں آپ کی خواہش کا احترام نہ کروں تو؟'' اس نے پوچھا۔

دفعتاً عابد کی نگاہ دیوار پر لگی ہوئی ایک پینٹنگ پر پڑی جس میں ایک بحری جہاز کو طوفانوں میں گھرا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس کے دماغ کے کسی گوشے سے یہ خیال نکل کر اس کے سامنے آیا کہ وہ جلد ایسے ایک جہاز کا مالک نہیں بلکہ آٹھ یا دس جہازوں کا مالک ہو گا۔ ہاں، پس منظر سے اس بڈھے کے ہٹنے اور اس کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی کے ایک طرف ہونے کی دیر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ساری جائداد بیٹی کے سپرد کر دے گا لیکن جب وہ نیک پروین اس دنیا میں ہی نہیں ہو گی تو وہ اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا مالک ہو گا۔

وہ اس سنہری بلبل کے پر کاٹ کر اسے اپنی جیب میں کیوں نہیں رکھ لیتا؟

''ٹھیک ہے، میں اس پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بولا پھر اس نے بقیہ دستاویز پڑھے بغیر ہی اس پر دستخط کر دیے۔ اسے پڑھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ان لوگوں کی آنکھیں بند ہونے کے بعد جب وہ اس ساری جائداد کا مالک ہو جائے گا تو پھر کاغذات پر لکھے ہوئے لفظوں کے گورکھ دھندوں میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے؟

بابا اس کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہے تھے غالباً یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ وہ کم از کم اس وصیت نامے کو مکمل طور پر پڑھ تو لے لیکن عابد کی نگاہ اس کے بجائے اس بحری جہاز پر لگی ہوئی تھی جس کی پینٹنگ سامنے والی دیوار پر لگی ہوئی تھی ایسے کئی جہاز اس کی ملکیت ہونے والے تھے۔

شائلہ کو وہ رخصت کرا کے وہاں سے لے آئے۔ پیرزادہ کی شرط تو نہیں تھی لیکن اس کی خواہش ضرور تھی کہ شائلہ اسی بنگلے میں قیام کرے تاکہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس نے عابد کو پیشکش کی کہ وہ اپنی قیام گاہ چھوڑ کر اس کے پاس چلا آئے تاکہ اس کی تنہائی دور ہو سکے۔ عابد نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔

اس نے تو اپنی ایاج بیوی کو قبول کر لیا تھا مگر اس کے گھر والوں نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ کسی کو بتانا ہی نہیں چاہتے تھے کہ اس نے ایسی کوئی شادی کی ہے۔ یہ شرمناک حقیقت سہی مگر حقیقت تھی کہ ان سب کو پیرزادہ کے مرنے کا انتظار تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے آتا تو وہ سب اِدھر اُدھر ہو جاتے بلکہ ظاہر یہ کرتے کہ وہ اس وقت گھر میں ہیں ہی نہیں۔ زیادہ تر وہ ایسے وقت آتا تھا جب عابد اپنے آفس میں ہوتا تھا۔ وہ شائلہ کے پاس کافی دیر تک ٹھہرتا۔ اس کے بعد اس کا شوفر اسے مخصوص کار میں واپس لے جاتا۔ اس کی کار میں وہیل چیئر کو سیٹ کرنے کی گنجائش تھی۔

پورے دس بحری جہازوں کا مالک بننے کے بعد عابد کا کاروبار حد سے بڑھ گیا تھا۔ شپنگ بزنس میں اسے توقیر کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اس نے اتنی جلد ترقی کر لی تھی کہ سب ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ان کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ کاروباری دنیا میں گیارہ برس پہلے آئے ہوئے نوجوان کو اتنی سرفرازی نصیب ہو سکتی ہے!

اس کے شب و روز وہی تھے۔ یعنی جب اس کے پاس وقت ہوتا تھا تو وہ اپنے سسر کے ساتھ شطرنج کی ایک آدھ بازی ضرور لگا لیتا تھا۔ وہ اس گیم میں کم ہی ہارتا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ نعمان پیرزادہ اپنی ہار پر ناخوش ہو جاتا ہے۔ اسے موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے، تاویلیں پیش کرتا ہے، ایسی باتیں کرتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ مثلاً وہ کہتا ''یہ تم نے آج کیسی خوشبو لگائی ہے کہ میرا دماغ اس کی وجہ سے ماؤف سا رہا اس لیے میں کھیل کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔''

''اوہ ینگ مین! تم نے کیا واہیات رنگ کا سوٹ پہن لیا کہ میری نظر اس پر جم ہی نہیں رہی ہے۔ یہ کھیل سے پہلے تم نے میوزک کیوں بند کر دیا تھا؟ کھیل کے دوران میوزک سننا میری عادت میں شامل ہے۔''

عابد ان سب باتوں کو سن کر کہتا کہ اگر اسے یہ سب باتیں ناگوار گزرتی ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ شطرنج نہ کھیلا کرے۔ اس پر پیرزادہ جواب دیتا کہ وہ کھیلے گا تو ضرور..... لیکن اسے شکست دیے بغیر جانے نہیں دے گا۔ کھیل کے دوران وہ کرید کرید کر اپنی بیٹی کے بارے میں سوالات کرتا۔ اس کے سوالات ایسے ہوتے تھے کہ ان کے جواب دیتے ہوئے عابد جیسے ماڈرن شخص کو بھی پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ سوچنے لگتا کہ ایسے آدمی کو کون سے خانے میں فٹ کرنا چاہیے جو اپنی بیٹی کی خواب گاہ کی باتیں جاننا چاہتا ہو؟

''شائلہ کو میرے خاندان کے کسی فرد نے قبول نہیں کیا۔'' اس نے ایک روز انکشاف کر ہی ڈالا۔

''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اسے قبول کر لیا۔'' پیرزادہ نے کہا۔ ''ڈاکٹر طاہر نے رپورٹ دی ہے کہ تم اس کا چیک اپ کرانے کے لیے دو تین بار اس کے کلینک گئے تھے۔ وہ خود بھی شہر کا ایک معروف گائنا کولوجسٹ ہے اور اس کے کلینک پر ایک بہت اچھی گائنالوجسٹ خاتون بھی بیٹھتی ہے۔ دیکھو اس بات کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو مجھے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں کیا کروں؟ باپ کے ساتھ مجھے ماں کی ذمے داریاں بھی نبھانا پڑ رہی ہیں۔ کیا انسان پر اس سے زیادہ آزمائش کا مقام آ سکتا ہے؟'' اس نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''اب آپ کو اتنا غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔'' عابد نے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ڈاکٹر طاہر نے اس بات کی کل ہی تصدیق کر دی ہے کہ شائلہ ماں بننے والی ہے۔''

''ارے نہیں! ونڈرفل۔ ینگ مین! تم کتنے اچھے ہو۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن کو جھکایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

''میں نے اسے سکتے سے نکالنے کے لیے ہزاروں جتن کر ڈالے ہیں مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔'' عابد نے افسردگی سے کہا۔ ''میں اسے کہانیاں سناتا ہوں، سیر کے لیے نئی اور انوکھی جگہوں پر لے جاتا ہوں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب میں نے سوچا ہے کہ میں اسے امریکا کے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا یا پھر قطر کے اسپتال میں داخل کراؤں گا جو دنیا میں نمبر ٹو مانا جاتا ہے۔''

''تم ایسی کوئی بات نہیں کرو گے جس سے اسے کوئی اور صدمہ پہنچے۔'' پیرزادہ نے تنبیہہ کی۔

عابد نے سوچا کہ نعمان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کافی پُراسرار ہے۔ وہ شائلہ کا باپ ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کا علاج کیا جائے! وہ حقیقت میں شائلہ کا باپ ہے یا پھر اس سے کوئی اور رشتہ ہے؟

اس رات کو وہ اپنے بستر پر لیٹا تو اسے اپنے ایک دوست کا دیا ہوا بریف کیس یاد آیا۔ اس میں بہت سے میکنزم تھے۔ اس کا دوست بن حام یہودی تھا، اس نے یہ بریف کیس ایک جرمن کمپنی سے بنوایا تھا۔ اس کے ذریعے سے کسی کمرے میں آگ لگائی جا سکتی تھی لیکن کسی کو یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ آگ اس بیگ کے ذریعے سے لگائی گئی ہے۔ اس کا ایک مخصوص بٹن دبانے سے بیگ میں لگی ہوئی ڈیوائس سے کمرے کی وائرنگ میں شارٹ سرکٹ ہو جاتا تھا۔

اس رات کو اسے یہ خیال بری طرح سے ستانے لگا کہ اگر اپاہج شائلہ کا بچہ ہو گیا تو اس کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ وہ اس کی جائداد کا وارث بن جائے گا۔ بہتر یہی تھا کہ اسے اس مرحلے پر ختم کر دیا جائے۔ شائلہ اور اس کا بچہ جتنی جلد ہو سکے دنیا سے عالم بالا کی طرف روانہ ہو جائیں تاکہ اسے کسی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ ویسے بھی وہ اس کھیل سے اکتا گیا تھا اب پیرزادہ کی ساری املاک کا مالک بننا چاہتا تھا۔

اسے خواب میں بچے کی چیخیں سنائی دیں۔ اس کے لمبے دانت اس کے نرخرے میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کا خون پی رہا تھا۔ معلوم نہیں آنے والا بچہ نسل انسانی سے تعلق رکھتا تھا یا پھر کوئی آسیب تھا؟ وہ اپنا منحوس وجود لے کر اس کی زندگی میں داخل ہونے آ رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اس سے پہلے ہی چھٹکارا حاصل کر لے۔

دوسرے روز عابد نے اپنے لیے ہانگ کانگ کا ٹکٹ کٹایا اور اسی رات کو اس بریف کیس کا بٹن دبا کر اس کمرے سے نکل آیا جہاں شائلہ سو رہی تھی۔ تیسرے دن جب وہ ہانگ کانگ میں تھا تو پاکستان میں یہ خبر ٹیلی وژن پر پیش کی جا رہی تھی کہ کروڑ پتی عابد منکھی کے بنگلے میں آگ لگ گئی۔ جب کہ وہ اس وقت ہانگ کانگ کاروباری دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ملازم نے فائر بریگیڈ کے آنے سے پہلے وہ بیگ وہاں سے ہٹا دیا ہو گا۔ اسی ملازم نے اسے یہ خبر فوری طور پر فون پر دے دی تھی۔

اس کے والد نے اسے یہ خبر نیٹ پر دی۔ عابد نے جواب دیا کہ وہ فوراً وطن واپس آ رہا ہے۔ اس نے اپنے بنگلے پر پہنچ کر کافی واویلا مچایا مگر آہ و بکا سے مرنے والے بھلا کب واپس آتے ہیں؟ اسے اداکاری تو نہیں آتی تھی لیکن اس نے اپنی آواز میں اتنی رقت پیدا کر لی کہ خود اس کے والدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شائلہ کی نماز جنازہ میں بہت کم لوگ تھے، اس لیے کہ ابھی تک بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کی سوختہ لاش کو اٹھانا دشوار ہو گیا تھا۔ شائلہ کا چہرہ اس قدر جھلس گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی خواب گاہ اب بھی جلی ہوئی حالت میں تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ پولیس آ کر تحقیق کرے گی۔ پیرزادہ کے علاوہ عابد اور اس کے قریبی رشتے دار شائلہ کے جنازے میں شریک تھے۔ ان سب کی آنکھیں نم تھیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ ارب پتی پیرزادہ بالکل نہیں رویا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اس کے لب آپس میں پیوست تھے جیسے انہیں سی دیا گیا ہو۔ وہ اپنی مخصوص کار میں قبرستان تک گیا جس میں اس کی وہیل چیئر سما جاتی تھی۔ قبرستان سے وہ واپس اپنے گھر چلا گیا۔ حاکم منکھی نے اس سے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ شدت جذبات سے اتنا مغلوب تھا کہ اس پر سکتہ طاری تھا یا پھر وہ گونگا بہرا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ عابد ایک لمحے کو کانپ گیا تھا۔

دوسرے روز وہ اپنے آفس گیا تو وہاں اس کے قریبی دوست آ گئے۔ یہ وہ دوست تھے جنہیں اس قصے کا علم تھا کہ عابد نے ایک اپاہج لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ وہ دل جوئی کی باتیں کرتے رہے اور عابد نے ہاں ہوں کرنے پر اکتفا کیا۔ جب وہ اس کے ہال نما کمرے سے چلے گئے تو وہ اپنے آفس میں چلا گیا۔ اس کی ہدایت پر اس کے ملازم نے اسے وہسکی کا ایک جام پیش کیا۔ عابد نے اس کے چند گھونٹ لیے تو اسے سکون ملا۔

اس کے دوست جو بیرونی ملکوں میں تھے انہوں نے اسے فیکس پر پیغامات روانہ کیے تھے۔ کچھ نے اس سے نیٹ پر رابطہ کیا تھا۔ وہ ان کے جواب دینے کے بعد جب اسٹاک ایکسچینج کا چینل کیبل پر دیکھ رہا تھا تو اس نے ایک عجیب سی آواز سنی۔ اس نے اپنے سامنے لگے ہوئے آئینوں پر نظر دوڑائی لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اپنے آفس میں تنہا تھا، چنانچہ اسے خوف سا محسوس ہوا جس طرف سے آہٹ ہوئی تھی، اس طرف لفٹ کا دروازہ کھلتا تھا۔ وہ لفٹ اس کے لیے مخصوص تھی۔ اس کی آمد و رفت اسی لفٹ کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ وہ براہ راست اس کے آفس میں آ کر کھلتی تھی۔ دروازے کی چابی بھی اس کی تحویل میں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر آہٹ ہوئی اور اس بار وہیل چیئر پر اس کے سابقہ سسر کا چہرہ ایک آئینے میں دکھائی دیا۔ وہ ارب پتی نعمان پیرزادہ تھا جو اپنی کرسی پر اس کی میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر تھے اور کرسی خودکار طریقے سے چل رہی تھی۔ وہ مخصوص قسم کی کشمیری شال اوڑھے ہوئے تھا۔

''ہیلو برخوردار!'' اس نے گونجیلی آواز میں کہا۔

''ہیلو۔'' عابد نے مختصراً کہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب ایک نیا کھیل شروع ہونے والا ہے جس میں شطرنج کی چالوں کی طرح اسے بے حد محتاط رہنا پڑے گا۔ اس کی ایک بھی لغزش اسے شاہ سے فقیر بنا سکتی ہے۔ وہ منٹوں میں دیوالیا ہو سکتا ہے۔ وہ پیرزادہ کے چہرے پر لکھی ہوئی کہانی پڑھ سکتا تھا۔ اس کی زبان ہلانے سے پہلے عابد بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

''مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم اس مخصوص لفٹ سے کیسے یہاں تک آ گئے۔'' عابد نے کہا۔ اس نے آپ جناب کا تکلف بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ''کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟''

''تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں ایک زندہ حقیقت کی طرح تمہارے سامنے ہوں۔ جہاں تک میرے لفٹ سے آنے کا سوال ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ اب میرے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں رہی ہے برخوردار میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میری مٹھی میں ہے۔''

''یہاں تمہاری آمد کا مقصد؟'' اس نے ترش لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہاری بیٹی شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگنے والی آگ میں جل کر ہلاک ہو گئی ہے۔ میں لفظوں میں اپنا غم بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کاش اس آگ میں، میں بھی اس کے ساتھ جل کر مر گیا ہوتا۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔'' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اتنی اچھی صداکاری کیسے کر رہا ہے؟

اس نے اپنی میز کے قریب رکھی ہوئی کیبنٹ پر سے شیوارز ریگل کی بوتل نکال کر گلاس میں ایک پیگ انڈیلا اور سوڈا ملائے بغیر اسے حلق سے اتار لیا۔ ''تم پینا پسند کرو گے؟''

''..... میں اس وقت اپنے خون کے گھونٹ پی رہا ہوں، اس کی تلخی یہ نفیس قسم کی شراب ختم نہیں کر سکے گی۔''

''اوہ!'' عابد نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تمہارا یہ مکالمہ کسی فلم سے لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہم بے تکلفی سے باتیں کر سکتے ہیں۔ کم آن ..... ہیوا ے ڈرنک .....'' اس نے ایک پیگ بنا کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''تم میری بیٹی کو ختم کرنے کے بعد کتنے اطمینان سے یہاں بیٹھے ہو؟ کاش میں بھی تمہیں اسی طرح ہلاک کر سکتا۔''

''وہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی تھی۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے پیرزادہ! حوصلے سے کام لو۔'' عابد نے اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

اے سی اس کے آفس میں مناسب کولنگ دے رہا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ عابد کو سردی لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ملازم کو بلا کر اس کی کولنگ کم کرا دے پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اسے ارب پتی اس کی کمزوری سے تعبیر کرے گا۔

وہ یہ جاننے کا منتظر تھا کہ پیرزادہ اس سے کیا کہنے آیا ہے؟

''میں جب تک تمہیں ایک عبرت ناک انجام سے دوچار نہیں کر دوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔'' پیرزادہ نے کہا۔

''تمہاری یہ احمقانہ گفتگو مجھے پسند نہیں آئی، لہٰذا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' عابد نے کہا اور اپنی میز کی اوپری دراز سے ایک ریوالور نکال لیا۔ جس کی نال کا رخ پیرزادہ کے سینے کی طرف تھا۔

''تم شوق سے گولی چلا سکتے ہو۔ فائر کی آواز اس بند کمرے میں نہیں گونجے گی۔''

''تم یوں دیدہ دلیری سے گفتگو اس لیے کر رہے ہو کہ پولیس کو یقیناً یہ اطلاع دے کر آئے ہو کہ میرے آفس کی

طرف جا رہے ہو۔'' عابد نے کہا۔

پیرزادہ اپنی کرسی گھماتا ہوا اس کی کرسی کے قریب آیا اور اس نے کھڑے ہوتے ہوئے وہ ریوالور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ یہ سب اتنی سرعت سے ہوا کہ عابد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پیرزادہ کی ایک ٹانگ مصنوعی تھی لیکن وہ اس کے سہارے کھڑا تھا۔ ''اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

''ڈارلنگ! تم نے میرے کمرے میں آگ کیوں لگائی تھی؟'' اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی اور کوئی لفٹ سے نکل کر اس کے آفس میں آ گیا۔

عابد نے گردن موڑے بغیر اسے سامنے لگے آئینے میں دیکھ لیا۔ وہ اس کی بیوی شائلہ تھی جو اپنی گود میں ایک بچے کو لیے ہوئے تھی۔ بچہ نوزائدہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا، چنانچہ رونے لگا۔

''شائلہ مذاق ختم کرو اور اس بچے کو دودھ پلاؤ۔'' پیرزادہ نے کہا۔

''تو کیا یہ سب ڈراما تھا؟ تم آگ میں جل کر مری نہیں تھیں؟'' عابد نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں وہ اس کی ملازمہ میمونہ تھی۔'' پیرزادہ نے کہا۔ اس بیچاری کو پتا بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس نے تو اپنی مالکہ کے حکم کی تعمیل کی تھی اور اس کی جگہ بستر پر لیٹ گئی تھی۔ جب آگ لگی تو وہ راکھ ہو گئی۔ کسی نہ کسی کو تو ہونا ہی تھا۔ اس لیے کہ پھر اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ کیسے بھرا جاتا؟''

''لیکن ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ تم خود سے پوچھو برخوردار!'' پیرزادہ نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ آگ تو تم نے لگائی تھی۔ وہ خوفناک آلہ ایسا کوئی راز نہیں ہے کہ مجھے نہ مل سکتا۔ بلفاسٹ کے دہشت گرد عموماً اسے استعمال کرتے ہیں۔''

''لیکن یہ یہ.....'' عابد نے شائلہ کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم اسے اس صدی کی سب سے بڑی اداکارہ تسلیم کر لو۔ یہ کبھی سکتے کا شکار تھی لیکن ڈاکٹر طاہر کے علاج سے صحت یاب ہو چکی تھی۔ اگر تم اس کا ریکارڈ دیکھ لیتے تو سب کچھ تم پر ظاہر ہو جاتا لیکن تم نے اپنی لاابالی طبیعت کی بنا پر اسے دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ تب میں نے سوچا کہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ملا کر ہم ایک اچھا منصوبہ بنا سکتے ہیں۔''

''کیسا منصوبہ؟'' عابد نے پوچھا۔

''وہی جو تم میرے بارے میں سوچ رہے تھے اور جس کا تم نے منصوبہ بنایا تھا وہی کچھ میں نے تمہارے بارے میں سوچ لیا۔ یعنی میں نے بھی ایسا منصوبہ بنا لیا کہ تمہاری ساری دولت میرے قبضے میں چلی آئے۔ اب وہ لمحہ آ گیا ہے اگر میں وہی ڈیوائس اس کمرے میں لگا کر چلا جاؤں تو تم اس کمرے میں جل کر خاک ہو جاؤ گے پھر میں نہایت آسانی سے یہ ثابت کر دوں گا کہ آگ میں جل کر مرنے والی شائلہ نہیں، اس کی ملازمہ میمونہ تھی۔ قبر سے لاش نکلوا کر اس کا پوسٹ مارٹم کرانے کے بعد پتا چل جائے گا کہ وہ حاملہ نہیں تھی۔'' اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ''اس کے علاوہ شائلہ کے جسم پر سگریٹوں ایسے نشانات ہیں جو میمونہ کی لاش پر سے نہیں ملیں گے۔ وہ ہماری ملازمہ تھی اس کے بارے میں ہم خوب جانتے ہیں لہٰذا ہم اس بات کو ثابت بھی کر سکتے ہیں۔''

''تو کیا تم نے میری جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا؟'' عابد نے پوچھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اسے ایک پیگ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

''جی ہاں سو بار ہاں۔''

''لیکن تمہارے پاس دولت کی کیا کمی ہے؟ تم تو ارب پتی ہو؟''

''یہ انتقام کی ایک لمبی کہانی ہے عابد منگھی! کاش تمہارے باپ نے میرے ساتھ ظالمانہ سلوک نہ کیا ہوتا لیکن جب آدمی صاحب ثروت ہوتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے سامنے ادنیٰ اور حقیر ہوتے ہیں تو اپنے سے چھوٹے آدمی اسے چیونٹیوں کی طرح زمین پر رینگنے والی مخلوق لگتے ہیں۔''

''میرے باپ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟'' عابد نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ تو تمہیں جانتے تک نہیں، تمہیں میں نے ہی ان سے متعارف کرایا ہے۔''

''اب میں پیرزادہ ہوں۔ اس لیے وہ شاید مجھے نہ پہچان سکے لیکن جب میں پیر حشمت کا بیٹا ہوا کرتا تھا تو وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ آج سے پینتالیس برس پہلے میں جب اپنے والد کے ساتھ دادو میں رہا کرتا تھا تو اس وقت ہماری تھوڑی سی زمین ہوا کرتی تھی چوں کہ ہم بڑے زمین دار نہیں تھے اور علاقے میں ہماری کوئی طاقت نہیں تھی لہٰذا ہمیں ہر کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا کرتا تھا۔ دوسروں کی زمین سے پانی لے لینا یا زمینوں پر قبضہ کر لینا بڑے جاگیرداروں کا

معمول تھا۔ ہماری زمین بھی چھین لی گئی اور میں در بہ در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں حاکم تنگھی کو اس کی سطح سے گرا کر رہوں گا۔ میرے باپ نے مجھے سمجھایا کہ حاکم بااثر شخص ہے، اس کا ایک بھائی پولیس میں اور دوسرا عدالت میں ہے اس لیے اس سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ایک کزن صوبائی اسمبلی میں بھی ہے لہٰذا اس کا بہت اثر رسوخ ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ جب ہمارے ہاتھوں سے زمین ہی نکل گئی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دیں، کسی اور جگہ چل کر رہیں۔ ورنہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ حاکم ہمیں مروا نہ دے۔ جاگیرداروں کے لیے قتل کروانا معمولی سی بات ہوا کرتی ہے۔''

''معلوم نہیں تم کیا قصہ لے بیٹھے ہو عرفان! تمہارا نام عرفان ہی ہے نا؟ میرے بابا نے بتایا تھا کہ تم لوگوں پر زندگی سخت تھی اور تم کوڑیوں کے محتاج تھے چنانچہ تم سے بابا نے زمین لے کر قیمت ادا کر دی تھی۔ اب چالیس برس کے بعد تم ان ہی زمینوں پر اپنا حق جتانے آ گئے ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے تمہیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تھا۔ تم یہاں کیوں چلے آئے؟ اگر اس وقت تمہیں کوئی نہیں جانتا تھا تو اب سارا شہر تم سے واقف ہے۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ سپریم کورٹ کے جج سے تمہاری رشتے داری بھی ہے؟ ہم پر مقدمہ کروا دو۔ اس واقعے کے عینی شاہد تو ابھی ختم نہیں ہوئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی ملازم ابھی زندہ ہو۔ اسے بھاری رقم کا لالچ دے کر ہمارے خلاف کچھ کہنے پر آمادہ کر لو۔ اس طرح سے تمہاری زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔''

''جاگیردار نے ہمارے مکان کو آگ لگوا دی اور اس کے غنڈوں نے ہمیں بہت مارا پیٹا۔ اسی سانحے میں میری ٹانگ جاتی رہی۔ کاغذات اگر تھے تو اسی آگ میں جل کر ختم ہو گئے۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں رہا۔ میں کراچی چلا آیا۔ یہاں اتفاق سے میرے والد کا ایک پرانا واقف کار مل گیا جو ایک بحری جہاز پر ملازم تھا۔ اس نے والد صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ملازمت پر لگوا سکتا ہے۔ والد نے اس کی اجازت دے دی۔ جہاز اٹلی کے شہر میلان کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ایک کارگو شپ تھا۔ میں نے محنت سے کام کیا تو اس کا مالک میری رپورٹ سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے ترقی دے کر سیکنڈ میٹ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اسی اثنا میں مجھے اپنے والد کی موت کی خبر ملی۔ میرا دل اس ملک سے اچاٹ ہو گیا۔ میں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی میں جہاز پر تھا۔ آج اس پر تو کل اس پر۔ میرا تجربہ بڑھتا رہا اور عہدے پر ترقی بھی ہوتی رہی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اگر مجھے زندگی میں کوئی مرتبہ حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیے کہ میں بھی اپنی شپنگ کمپنی قائم کروں۔ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں تھی۔ بہرحال میں نے کسی نہ کسی طرح سے ایک ٹوٹا پھوٹا جہاز خرید لیا اور.....''

''اور اس کی مرمت کر کے اس سے اپنی شپنگ کمپنی کی بنیاد ڈال دی۔'' عابد نے اس کا جملہ قطع کر کے کہا۔ ''میرے پاس پوری الف لیلہ سننے کا وقت نہیں ہے۔ بس یہ بتا دو کہ تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟''

''تم نہایت تیزی سے اوپر جا رہے تھے، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ تمہارے منہ میں لگام ڈال دی جائے۔ شاید قسمت کی دیوی تمہارا ساتھ دے رہی ہے، تم جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہو اس میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگتی ہے۔ لوہے کی فیکٹری قائم کرنے کا ارادہ میں نے بھی ایک زمانے میں کیا تھا لیکن اتنی دشواریاں پیش آئیں کہ میں نے اس سے توبہ کر لی مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تم کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لائے اور قدم پر قدم جماتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی تم نے جس جس کاروبار میں ہاتھ ڈالا، اسے کامیاب کر کے چھوڑا۔ میں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ تم سانپ کے بچے..... یعنی سنپولیے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم حاکم کے بیٹے ہو جس کا مجھے بدلہ چکانا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی بیٹی کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک کھیل کھیلے۔ اسے پہلے میں نے حالات سے آگاہ کیا تاکہ اس کے دل میں تمہارے خلاف بھی نفرت کا سمندر موجزن ہو جائے جیسے کہ میرے دل میں ہے۔''

''تمہاری کہانی پنجابی فلموں کی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ ایک جاگیردار، اس کی بیٹی..... اور دوسرا جاگیردار اور اس کا بیٹا..... دشمنی اور کھچا کھچ تے ڈزا ڈز۔ آخری سین میں جاگیردار گنڈاسے سے لڑ رہے ہیں اور ان کی اولاد محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہیں۔ ڈفر کہیں کے۔ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ اور خود کو کسی گندے نالے میں غرق کر دو، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ناؤ گیٹ آؤٹ۔'' وہ دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

''تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو برخوردار! تم جس کرسی پر بیٹھے ہو یہ اب میری ہو چکی ہے۔ یہ آفس اور تمہارا سارا کاروبار اب میرے قبضے میں ہے۔ جب میں عدالت میں یہ

ثابت کر دوں گا کہ شائلہ مری نہیں ہے اور اس کی جگہ اس کی ملازمہ میمونہ کام آ گئی تو اس ساری دولت کی مالک وہ ہوگی۔ تم نے میرے وصیت نامے کو پڑھے بغیر اس پر دستخط کر دیئے تھے۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ تم سے شادی ہونے کے بعد وہ تمہاری جائداد کی مالک ہوگی۔''

''بہت خوب! تمہاری سوچ کسی بڑے آدمی سے نہیں ملتی بلکہ تم شیخ چلی لگتے ہو اگر یہ جل کر نہیں مری تھی تو کیا ہوا؟ مرا تو میں بھی نہیں ہوں۔ کیا میں اپنی جائداد کا مالک نہیں ہوں؟''

''لیکن جب تم مر جاؤ گے تو؟'' اس نے شاطرانہ لہجے میں پوچھا۔

''یہاں مجھے کون مار سکتا ہے؟'' عابد نے کہا۔ ''اس وقت تم میرے آفس میں بیٹھے ہو اور یہاں کی ہر چیز میرے تابع ہے۔ اپنی زندگی کی فکر کرو۔ کیا تمہیں امید ہے کہ تم یہاں سے بچ کر نکل سکو گے؟''

''ہاں، میں تمہیں گولی مار کر نہایت آسانی سے واپس جا سکتا ہوں۔'' پیرزادہ نے کہا اور ریوالور سیدھا کر لیا۔ ''حالانکہ... میرے منصوبے میں یہ شامل نہیں ہے، میں تو اس ساکٹ میں یہ ڈیوائس لگا کر جانا چاہتا تھا تاکہ لوگ یہ تاثر لیں کہ تم شارٹ سرکٹ سے آگ لگنے پر ہلاک ہوئے ہو۔''

''اب ان کھلونوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔'' عابد نے کہا اور اپنی میز پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کمرے میں بھونچال آ گیا ہو۔ پیرزادہ نے گھبرا کر چھت کی طرف دیکھا۔

چھت میں ایک خلا سا پیدا ہوا اور تین فولادی دیواریں نیچے گرنے لگیں۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ نعمان یا عرفان کچھ سمجھ ہی نہیں پایا جب تک اسے احساس ہوا کہ اسے وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا اس وقت تک دیواریں فرش سے آ کر لگ چکی تھیں۔ اب لفٹ تک جانے کا راستہ غائب ہو چکا تھا بلکہ ہر راستہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ ایک مختصر سے کمرے میں کھڑے تھے جو کم قوت کے ایک بلب سے روشن تھا لیکن اس میں بھی ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی جس سے گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے ان کا دم نہیں گھٹا۔ تین طرف کی دیواریں سپاٹ تھیں مگر ایک طرف اوپر سے نیچے تک کیبنٹ بنا ہوا تھا۔ اس میں الماریاں اور خفیہ خانے تھے جن کے بارے میں صرف عابد ہی کو پتا تھا۔

پیرزادہ نے ایک دیوار کے قریب جا کر اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس صورتِ حال سے شائلہ ہیجان میں مبتلا ہو گئی اور چیخنے چلانے لگی۔ اس کا بچہ بھی اس احتجاج میں شامل تھا۔ وہ اپنے معاملات میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ اس معصوم کی طرف کسی کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ روتا تھا اور اس کے بعد خود ہی خاموش ہو جاتا تھا۔

''اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ اپنی چیخوں سے باہر موجود میرے عملے کو یا اس عمارت کے دوسرے فلورز پر کام کرنے والوں کو متوجہ کر لو گی تو یہ تمہاری بھول ہے، اس لیے کہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔'' عابد نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہاں کسی معمولی بم کا دھماکا ہو جائے تو اس کی آواز بھی باہر نہیں جا سکے گی۔ ویسے مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم شائلہ ہو اس لیے کہ اسے تو سکتہ تھا اور وہ مفلوج تھی۔''

''شائلہ! مرنے سے پہلے اسے اپنی اداکاری کا نمونہ پیش کر دو ورنہ اس کی جان آسانی سے نہیں نکلے گی۔''

شائلہ نے بچے کو ایک کرسی پر لٹا دیا اور خود سکتے کی سی کیفیت میں دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ عابد اس کے نزدیک گیا اور اس نے شائلہ کی ساکت آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا لیکن اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ وہی شائلہ تھی جس کے ساتھ اس نے ایک برس کا عرصہ گزارا تھا۔ وہ واقعی ایسی اداکارہ تھی کہ اسے آسکر ایوارڈ ملنا چاہیے تھا اگر نہیں ملا تھا تو یہ اس ملک کے لوگوں کی ناقدری تھی۔ اس نے خود پر وہی کیفیت طاری کر لی تھی جسے دیکھ کر عابد متاثر ہو گیا تھا۔

''بہت خوب!'' عابد نے داد دینے والے انداز میں کہا۔ ''کاش..... تم اپنے باپ کے اس گریہ منصوبے میں شامل نہ ہوتیں تو میں تمہیں اپنی ملکہ بنا کر رکھتا۔ یہ ساری جائداد خود ہی تمہارے قدموں میں ڈال دیتا۔''

''بیٹی! اس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تمہیں ورغلا رہا ہے۔'' پیرزادہ نے کہا پھر عابد کی طرف مڑ کر کہا۔ ''اگر میں یہ ڈراما نہ رچاتا تو تم شائلہ سے میری کبھی شادی نہ کرتے۔ یہ شادی تم نے اس لیے کی ہے کہ تمہیں یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی جلدی ہی موت کے منہ میں پہنچ جائے گا اور اس کے بعد تم سیاہ و سفید کے مالک ہو جاؤ گے۔ یہ حرص کی کہانی ہے جس کے ہم تینوں بنیادی کردار ہیں اب ہمیں باہر جانے کا راستہ دکھا دو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔''

''شوق سے۔'' عابد نے لاابالی انداز میں کہا۔ ''لیکن مجھے گولی مارنے سے پہلے اگر تم باہر جانے کا راستہ تلاش کر

لیتے تو بہتر ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ تم باقی زندگی اسی جگہ قید ہو کر رہ جاؤ اور جب اس فولادی کمرے کو توڑ کر یا اس کی دیواروں کو پگھلا کر راستہ بنایا جائے تو تمہارا اور تمہاری بیٹی کا ڈھانچا یہاں سے ملے۔ باہر کا عملہ اسے توڑنے میں جلدی نہیں کرے گا، اس لیے کہ میں ہفتوں ایسے ہی غائب ہو جایا کرتا ہوں۔ انہیں اس وقت تشویش ہوگی جب میں ان سے رابطہ قائم نہیں کروں گا۔''

''رابطہ۔'' پیرزادہ کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''میں اپنے موبائل پر تو رابطہ قائم کر سکتا ہوں۔'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس پر اپنے خاص ملازم کا نمبر ملانے لگا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی۔ اس لیے کہ موبائل ڈیڈ تھا۔ وہ بحرِ سکوت میں تھے جہاں سے ان کی آواز باہر نہیں جا سکتی تھی اور باہر والوں کو علم نہیں تھا کہ وہ کب سے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے علم میں تو یہ تھا کہ عابد وہاں موجود ہے لیکن وہ ان سے جب رابطہ قائم کرتا تھا اسی وقت اس کے کمرے میں جاتے تھے۔ اس کے آفس کے دروازے پر لگا ہوا ایک چھوٹا سا بلب اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ اندر موجود ہے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے عابد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی چرمی کرسی میں دائیں بائیں ہو رہا تھا۔ اس کرسی میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ تاکہ وہ اپنی میز پر لگے ہوئے کمپیوٹروں تو ایک ہی وقت میں دیکھ سکے۔ ''تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی کہ تمہارا موبائل کام کیوں نہیں کر رہا ہے مسٹر نعمان! کیوں کہ یہاں ڈیٹرنٹ آن ہو گیا ہے..... اب ساری ٹرانسمیشن جام ہو کر رہ گئی ہیں۔ خود اگر میں بھی چاہوں تو کسی کو فون نہیں کر سکتا اور نہ ہی دوسری طرف سے آنے والا کوئی پیغام سن سکتا ہوں۔''

''یہ ناٹک ختم کرو، ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' پیرزادہ نے اپنا ریوالور اس کے سینے کی طرف اٹھا کر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ جلال سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں تو خود کہہ رہا ہوں کہ اب اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے۔'' عابد نے سکون سے کہا۔ ''تم مجھے گولی مار دو اور یہاں سے باہر جانے کا راستہ تلاش کر لو۔ اس میز پر بہت سے بٹن لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اگر صحیح بٹن دب جائے گا تو یہ دیواریں ہٹ جائیں گی۔ اس کے برعکس ہوا تو پھر سب کچھ تباہ ہو جائے گا ہم سب یہاں جل مریں گے۔ ان میں ایک بٹن ریموٹ کنٹرول کا ہے جس کے دبتے ہی خفیہ خانے میں رکھا ہوا دھماکا خیز مادہ ہولناک آواز کے ساتھ پھٹ جائے گا۔ یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔''

پیرزادہ نے اپنا موبائل جیب میں رکھ لیا، ریوالور البتہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ہمیں جانے دو عابد! ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اس کی بیوی شائلہ نے کہا۔ ''اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو یہ بچہ بھی نہیں بچے گا۔''

''ہم میں سے کسی ایک کو ختم ہونا ہے۔ میں اب یہ عذاب زیادہ دیر کے لیے نہیں پال سکتا۔''

''کک..... کیا مطلب؟'' پیرزادہ نے ہکلا کر کہا۔

''شائلہ اور بچہ زندہ رہے گا تو یہ دونوں میری دولت کے مالک بنے رہیں گے۔ اس لیے کہ ساری دولت کی قانونی طور پر شائلہ مالک ہے۔ اب میں اسے اور تمہیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ فساد کی جڑ تو تمہی ہو۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''اگر میں زندہ رہوں گا تو تم مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کرتے رہو گے۔ اس لیے کہ تمہارا منصوبہ ہے کہ تم صرف اپنی ہی نہیں بلکہ میری بھی دولت کی مالک بن جاؤ۔''

''ہمیں تمہاری دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' پیرزادہ نے کہا۔ ''ہمارے کاغذات ہمیں دے دو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم سے کاغذات مانگنے کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ اس کی وہ کاپی جو میں نے اٹارنی کے پاس رکھوائی تھی وہ تم نے اپنے اثر رسوخ سے واپس لے لی ہے۔ میرے پاس بھی اس وصیت نامے کی ایک کاپی تھی، وہ اس وقت نہیں مل رہی ہے ممکن ہے تم نے میرے کسی ملازم کو لالچ دے کر تجوری سے نکلوالی ہو۔ ہوشیار سے ہوشیار آدمی بھی کبھی کبھار دھوکا کھا جاتا ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ اس وصیت نامے کو بینک کے کسی لاکر میں رکھتا۔ وہاں وہ محفوظ رہتی۔''

''میری اور تمہاری دولت اب علیحدہ نہیں ہے۔ ایک ہو چکی ہے۔ جب میں ڈوبوں گا تو تم بھی ڈوب جاؤ گے اور جب تم ڈوبو گے تو میرا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر میں جیت نہیں پا رہا ہوں تو تمہیں کیوں جیتنے دوں؟ سب کچھ تمہارے قبضے میں ہے اس کے باوجود تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''بکواس نہیں کرو اور ہمیں باہر جانے دو۔'' پیرزادہ نے غصے کا اظہار کیا۔

''یہاں انٹرنیٹ ہے۔ میں اس پر وصیت نامہ دوبارہ

ٹائپ کر دوں گا پھر تم اس پر دستخط کر دینا۔ اس کی ایک کاپی اپنے وکیل کو بھیج دینا اور دوسری عدالت کو۔ سب معاملات صاف ہو جائیں گے۔ میں ساری دولت کا مالک بن جاؤں گا۔ شائلہ اور بچے کے لیے میں کچھ گزارے کے لیے دے دوں گا۔ وہ بہر حال اتنی ہوگی کہ یہ بچہ پل جائے گا۔ اس کے علاوہ میں رحم کھا کر تمہارا مکان بھی چھوڑ دوں گا۔'' اس نے اپنا منصوبہ بتایا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور چلتا ہوا اس پینٹنگ کے پاس گیا جو جمیل کی سب سے اچھی پینٹنگ سمجھی جاتی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا اور کہا۔ ''ہم تم اس کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔''

''م..... میں اپنی ساری دولت..... تت..... تمہیں؟ یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... مم..... میں سیلف میڈ ہوں۔ اس شپنگ کمپنی کو قائم کرنے میں، میں نے ساری زندگی صرف کر دی ہے اسے اب میں تمہارے حوالے کر دوں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ میری شپنگ کمپنی تو ایک بڑا مقناطیس ہے جس میں تمہارے جہاز اور سارے اثاثے چپک کر میرے پاس چلے آئیں گے۔''

''ڈیڈی! ضد نہ کریں اور انہیں سب کچھ دے دیں۔'' شائلہ نے کہا۔

''بکواس بند کر لڑکی! ہوش کے ناخن لے۔ میں جو پاکستان میں شپنگ لائن میں نمبر ٹو ہوں، کیا مفلسوں کی طرح کراچی کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھروں گا؟ دھواں دیتی بسوں میں سفر کروں گا؟ سبزی اور دال چاول کے لیے کریانہ اسٹور پر جاؤں گا؟ اور تو گھر میں جھاڑو پونچھا لگائے گی؟ یا پھر کسی چھوٹی سی کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کرے گی؟ شائلہ! ہم لوگوں کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے اس کا تجھے احساس نہیں ہے۔ یہ منحوس ہمیں بھکاری بنانے کے چکر میں ہے۔''

''ڈیڈی! آپ تو خوامخواہ..... ہم لوگ ڈیفنس میں رہیں گے اور.....''

''اور ایک وقت آئے گا کہ ہم اسے افورڈ نہیں کر سکیں گے۔ وہ گھر ہمیں چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہم نئی کراچی یا پھر کورنگی میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''اوہ نو!'' اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو یہ سب سوچا بھی نہیں تھا۔''

''تو اب ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ لو۔'' عابد نے اس کی طرف پلٹ کر کہا۔ ''تمہارے باپ نے جو نقشہ کھینچا ہے ممکن ہے کہ میری کوششوں سے تمہارے حالات اس سے زیادہ خراب ہو جائیں۔ تم مجھ سے ٹکر لینا چاہ رہی تھیں، میں تمہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دوں گا۔'' اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

ارب پتی پیرزادہ اپنی کرسی چلاتا ہوا اس کی میز کی طرف گیا اور اس نے میز کی سطح کو غور سے دیکھا۔ وہاں بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس نے اندازہ لگا کر ایک بٹن دبا دیا جس کا کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ اس نے دوسرا بٹن دبایا لیکن اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔

''یہ بٹن اس طرح نہیں دبائے جاتے۔'' عابد نے دوسرے گوشے سے کہا۔ ''ان کی ایک خاص ترتیب ہے۔ جب تین بٹن ایک ساتھ دبائے جاتے ہیں تب ہی کوئی ردِعمل ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ان کی ترتیب غلط ہو جائے تو پھر اس کا نتیجہ بھی غلط نکلتا ہے۔'' اس نے ان کی طرف دیکھا اور اپنی مونچھوں پر انگلی پھیرنے لگا۔

پیرزادہ نے انجام کی پروا کیے بغیر دو تین بار ان بٹنوں کو دبایا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ مایوس ہو گیا۔ ''ڈیڈی! کوشش تو کیجیے۔'' شائلہ نے حوصلہ دلایا۔ ''تین بٹنوں کو تو دبانا ہے۔ جتنی بھی ترتیب سے دبا سکتے ہیں انہیں دبا دیجیے۔''

نعمان نے ایک دو بار اور کوشش کی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عابد کا جسم گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیتا اور اس کی لاش کو جیل کوؤں کے سامنے پھینک دیتا۔

''میری میز پر سو بٹن لگے ہیں۔ انہیں ستانوے ہزار طریقوں سے دبایا جا سکتا ہے۔ شائلہ اگر تمہارے ڈیڈی ناکام ہو گئے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ تم بھی ناکام رہو۔ میز کے نزدیک آؤ اور کوشش کر کے دیکھو۔'' عابد نے مسکرا کر کہا۔ ''کچھ عجیب سا کھیل ہے۔ یقیناً تم نے اس سے پہلے نہیں کھیلا ہوگا۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو آزماؤ ورنہ تم دونوں یہیں بھوک اور پیاس سے دم توڑ دو گے۔''

''ٹھہر، تجھے تو میں اپنے ہاتھوں سے ہی ختم کر دوں گا۔'' پیرزادہ نے کہا اور اس کے نزدیک جا کر کرسی سے اٹھا اور اس کی گردن پکڑ لی پھر اس نے عابد کو دھکا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ عابد کے حلق سے خرخراتی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ ''بتاؤ، مجھے کہ یہ بٹن کس طرح دبائے جاتے ہیں۔'' عابد غالباً ہاتھا پائی کے فن سے واقفیت نہیں رکھتا تھا اس لیے جدوجہد نہیں کر پا رہا تھا۔

''ہٹ جائیے ڈیڈی!'' شائلہ چیختی ہوئی پیرزادہ کے پیچھے چلی آئی اور اس کو کاندھوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگی۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اگر یہ مر گیا تو ہم ساری زندگی کے لیے یہاں قید ہو جائیں گے۔''

''پیچھے ہٹو، میں اسے ختم کر دوں گا۔'' وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس نے شائلہ کو اپنے ایک ہاتھ سے دھکا دے کر ہٹا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر خون سوار ہو گیا ہو۔

وہ دھکا کھا کر پیچھے گر گئی لیکن پھر اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئی۔ اس نے اپنے اپاہج ڈیڈی کو کھینچ کھانچ کر عابد سے علیحدہ کر دیا۔ پیرزادہ کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس نے سوچا کہ اگر اس نے ہوش مندی سے کام نہیں لیا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی قبر اسی کمرے میں بن جائے پھر تو سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ وہ جس دولت کے حصول کے لیے کوشاں ہے، وہ اس کے ہاتھ نہیں آ سکے گی۔ وہ عابد کے اوپر سے ہٹ گیا لیکن اس کا غصہ اتنا شدید تھا کہ اس نے عابد کی کھوپڑی پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ جب شائلہ نے اسے پیچھے کیا اور اسے کرسی پر گرا دیا تو وہ ہانپنے لگا۔ پسینے کی بوندیں اس کی پیشانی پر ظاہر ہو رہی تھیں۔

عابد بھی اس اثنا میں ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ پیرزادہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ دیوانہ اور خبط الحواس شخص تھا۔ اس کے مزاج میں انتقام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور یہ پچویشن ایسی تھی کہ وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب وہ دونوں تھک ہار کر نیند کی لپیٹ میں آ جائیں گے تو وہ کمرے کی فولادی پلیٹیں اٹھا کر لفٹ کے ذریعے وہاں سے نکل جائے گا۔ اس کے بعد اس کے آدمی ان کی لاشیں گھسیٹ کر لیاری ندی میں ڈال آئیں گے۔ شہر کے مختلف حصوں میں ایسی لاشیں روز ہی ملتی رہتی ہیں جن کے لواحقین کو بھی ان کا پتا نہیں چلتا۔ ندی میں پھینکنے سے پہلے اگر اس کا چہرہ مسخ کر دیا جاتا تو بھلا کسی کو کیا پتا چلتا؟

اس کی گردن میں تکلیف ہو رہی تھی، وہ اسے سہلانے لگا۔ دفعتاً اسے ہلکی سی کھانسی آئی تو اس کے منہ سے خون نکل آیا۔ وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور جیب سے رومال نکال کر اپنا منہ صاف کرنے لگا۔ اوہ! تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بری طرح سے زخمی ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی عضو اندر سے زخمی ہو گیا ہے۔ اس نے سوچا۔

اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ اس کے سانس کی رفتار مدھم ہو گئی۔ وہ اپنے حلق سے نکلنے والی خرخراہٹ سن رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

''ضد نہ کرو عابد، تم مر رہے ہو۔ تمہیں اندرونی چوٹ لگ گئی ہے۔'' پیرزادہ اس کے پاس آ کر دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''اگر تم مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں بتاؤ گے تو تھوڑی دیر بعد مر جاؤ گے۔ ضد کرنے سے کیا فائدہ؟ نہ تم رہو گے اور نہ میں رہوں گا۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں۔'' عابد نے آہستہ سے کہا۔

''تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سب اس کمرے میں مر جائیں؟ اس سے کیا ہوگا؟ یہ اربوں کی دولت کس کے کام آئے گی؟''

''نہ تمہارے نہ میرے۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔

وہ مایوسی کی باتیں کر کے پیرزادہ کو مایوس کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا تو ردِعمل کے طور پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے نزاعی کیفیت میں دیکھ کر پیرزادہ اور شائلہ نے اسے کرسی سے اٹھا کر کسی نہ کسی طرح صوفے پر ڈال دیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ شائلہ نے اس کے لبوں سے کان لگا دیے۔ ''سب کچھ ختم ہو جانا چاہیے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگر ان لوگوں کے ہاتھ کچھ لگ گیا تو پھر بازی مات ہو جائے گی۔''

''یہ پاگل نہ جانے کیا کہہ رہا ہے۔'' شائلہ نے اس کے قریب سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''غالباً اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' پیرزادہ نے کہا اور عابد کے قریب گیا۔ اس نے عابد کے ہونٹوں سے کان لگایا تو اسے شکستہ سی آواز سنائی دی۔ وہ بے حد مدھم تھی۔ اس لیے اسے آواز سننے اور اس کا مفہوم اخذ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

''وہ۔ وہ..... اس بٹن کو دباؤ۔ تمہاری مش مش کل حل ہو جائے گی۔'' وہ اٹک اٹک کر کہہ رہا تھا۔

''کون سا بٹن؟'' پیرزادہ نے اس کا رخسار تھپتھپا کر پوچھا۔ ''شاباش..... یاد کر کے بتاؤ۔ ورنہ تم ختم ہو جاؤ گے۔ تمہیں میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ہاسپٹل لے جاؤں گا۔''

''..... ایک قطار میں..... میں..... تین سرخ بٹن..... لگے ہیں..... انہیں دبانے کے بعد اوپر کا وہ..... وہ..... دبانا ہے..... جس پر نقطہ بنا ہوا ہے..... ہے.....'' وہ دقت سے بولا۔

اس کے منہ سے اب بھی خون نکل رہا تھا مگر پیرزادہ کو اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی؟ وہ مڑا اور میز کی طرف چلا گیا۔ میز پر بٹن ابھرے ہوئے تھے مگر وہ سب میز کا آرائشی حصہ لگتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عابد کو الیکٹرونکس سے بہت دلچسپی ہے۔

سرخ رنگ کے بٹن اسے درمیانی قطار میں لگے دکھائی دیے۔ اس نے ہدایت کے مطابق پہلے وہ تینوں بٹن دبائے اس کے بعد اوپر کی قطار میں لگا ہوا نقطے والا بٹن دبا دیا۔ ''ہاہا ہا شمائلہ! اب ہم آزاد ہوں گے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ یہ بہت ہوشیار بنتا تھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے مجھے نمبروں کی ترتیب بتا دی ہے۔ میں نے ان بٹنوں کو ویسے ہی دبا دیا ہے۔'' اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں اسے یہیں مرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا۔''

شمائلہ کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی دور ہو گئی۔ اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار پھر سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ امید بھری نظروں سے اس طرف دیکھنے لگی جس طرف لفٹ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ فولادی دیواریں اوپر اٹھ جائیں گی تو پھر لفٹ کا دروازہ کھل جائے گا۔ ''مگر ڈیڈی..... کاغذات..... اور وصیت نامہ؟''

''وہ بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔''

عابد کا پرانا ملازم عبدل اس کا دوست بن گیا تھا اور اسی نے اس کی جگہ پر ملازمہ میمونہ کو لٹا کر آگ لگائی تھی۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو اب تک شمائلہ موت کی وادیوں کی سیر کر رہی ہوتی۔ اس نے نہ صرف میمونہ کو اس کے بستر پر لٹا دیا تھا بلکہ آگ لگنے کے بعد اس کا چہرہ بھی اتنا مسخ کر دیا تھا کہ وہ تحقیق کے وقت پہچانی نہ جائے۔

اسی نے یہ راز بھی بتایا تھا کہ اس کے صاحب اپنے آفس جس کمرے میں بیٹھتے ہیں اس میں جانے والی لفٹ کی چابی کا صرف اسے ہی پتا ہے۔ شمائلہ نے اسے اپنا دوست بنا کر اس سے چابی لے کر اس کی نقل بنوالی تھی۔ وہ اسی نقل کو استعمال کر کے یہاں تک پہنچے تھے، لیکن اب وہاں سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس بٹن کے دبتے ہی ایک عجیب سی بات ہوئی کہ کمرے کے ایک گوشے میں گونج سی سنائی دینے لگی۔ وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ اس طرف ایک الماری تھی جس میں فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بند خانے بھی تھے۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور پھر اس کیبنٹ میں آگ لگ گئی۔

وہ گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے جب کہ عابد کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والا خون اس کی سفید قمیص کو رنگین بنا چکا تھا۔ اس کیبنٹ میں عابد اپنی ساری دستاویزات رکھتا تھا۔ اس کی کمپنیوں کے کاغذات اور اس سے متعلق خفیہ رجسٹر جن میں انکم ٹیکس بچانے کے لیے اندراجات تھے۔ اسی میں اس نے پیرزادہ کا وصیت نامہ بھی رکھ دیا تھا۔ اس کی ایک کاپی اٹارنی کے پاس تھی جو اس نے اپنے تعلقات کی بنا پر اس سے لے لی تھی۔

وہ سب ایک خفیہ خانے میں رکھے ہوئے ٹی این ٹی میں آگ لگ جانے کی وجہ سے جل اٹھے تھے۔ وہ آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی۔ وہ دونوں اس کی حدت محسوس کر کے چیخنے چلانے لگے۔ انہوں نے اضطراب میں دیواروں کو تھپتھپایا اور آوازیں دیں لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ چھوٹا سا کمرا جہنم معلوم ہونے لگا۔ ارب پتی بزنس مین نعمان پیرزادہ پر خوف کے ساتھ جنون بھی طاری تھا۔ وہ عابد کے قریب جا کر اسے بری طرح جھنجوڑنے لگا۔ ''ہم یہاں سے باہر کیسے جائیں گے؟ عابد! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔''

''تھوڑی دیر پہلے تم اپنی بیٹی شمائلہ سے کچھ اور کہہ رہے تھے۔ اب تمہارا اور میرا کھیل ختم ہو گیا۔'' عابد نے بے جان سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ''یہ ہوس اور طمع کی کہانی ہے، جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ جب کہ ہم کینہ و انتقام کی کشتی کے مسافر ہیں۔ اب یہ کشتی حرص کے جہنم کی طرف جا رہی ہے۔ اسے روک سکتے ہو تو روک لو۔''

وہ اضطراب میں دائیں بائیں، آگے پیچھے دوڑتے رہے لیکن انہیں کہیں اماں نہ ملی۔ اس بند کمرے کی کیبنٹ کے شعلے جب نیچے پہنچے تو قالین کے ذریعے سے ہوتے ہوئے میز اور کرسیوں تک پہنچ گئے۔ پیرزادہ کا اندازہ تھا کہ وہ آگ کسی کیمیکل سے لگی تھی اس لیے بڑھتی چلی گئی اور ان کی کوششوں کے باوجود نہیں بجھی..... شمائلہ نے عابد کا کوٹ اتار کر شعلوں پر مارا لیکن انہوں نے اس کا اثر قبول نہیں کیا اور مزید بھڑکنے لگے۔ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ شعلے ان کی طرف بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے راہ میں آنے والی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاروں بھی جل کر راکھ ہو گئے۔

حرص و طمع کی کہانی کے سارے کردار ختم ہو چکے تھے اب وہاں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

❋❋

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس۔ ایم۔ قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ حق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے اس عالم فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الٰہی ابد تک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنٰی اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی بخشیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے اپنی عقل و قلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور و آگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق و مالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنٰی کے محقق و دیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی و غیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط و کتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کنیڈا، امریکہ اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط و کتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز و منفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنٰی 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں 'ARY ڈیجیٹل' سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنٰی بعنوان ''کامیابی کا راستہ'' ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنٰی ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆----------☆☆

سدرہ شفیق۔ کراچی

○ محترم! میں ماہنامہ جاسوسی کی زیادہ پرانی تو نہیں لیکن پچھلے سال سے قاری ہوں جس میں آپ کا کالم بھی آتا ہے بڑے دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ آپ کو اپنی داستان لکھوں اور اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی سے فائدہ حاصل کروں۔ میرا مسئلہ کچھ اس طرح سے ہے کہ میں اپنے خالہ زاد سے محبت کرتی ہوں وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اور ہم دنوں شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میرے خالو اس بات پر راضی نہیں باقی سب خاندان والے راضی ہیں محترم صرف میرے خالو کی وجہ سے ہمارا پورا خاندان بکھرتا جا رہا ہے اس سلسلے میں ہماری مدد فرمایئے گا اور کوئی ایسی لوح، وظیفہ، اسم الٰہی تجویز فرمایئے کہ ہمارا خاندان بکھرنے سے بچ جائے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم فرمائے ''یا جامع یا سلام'' ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے۔

اللہ دتہ۔ ملتان

○ محترم! آپ سے پسند کی شادی کے لئے لوح تسخیر خاص

بنوائی تھی اب اللہ کرم سے آپ کی دعا سے میری مطلوبہ جگہ شادی ہوگئی ہے جس کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ لوح کا کیا کروں اور وظیفہ جاری رکھوں یا چھوڑ دوں؟۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو گھر بسانا مبارک کرے اور باہمی خوشیاں عطا فرمائے۔ لوح حفاظت سے رکھیں۔ نماز کی پابندی جاری رکھئے گا۔ وظیفہ ترک کردیں۔

شائستہ جبین۔ دوبئی

○ محترم! سب سے پہلے تو میں جاسوسی ڈائجسٹ کی انتظامیہ کی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اتنا اچھا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے جس سے ہم جیسے پردیسی فائدہ حاصل کررہے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم یہاں پر 6 سال سے ہیں لیکن کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے نہ کوئی مستقل روزگار کا سلسلہ بنا ہے اور نہ ہی رہائش کا اب تو ماشاء اللہ دو بچے بھی ہوگئے ہیں ان کا خرچ علیحدہ، پاکستان میں ساس، سسر کا خرچ یہ سب پورا کرنا اب مشکل ہوتا جارہا ہے اب میرے شوہر یہ سوچ رہے ہیں کہ میں اور بچے پاکستان چلے جائیں اور کسی اور ملک جانا چاہتے ہیں اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائیں اور کوئی حل بتائیں۔

☆عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ۔ خرچ میں میانہ روی سے کام لیجئے۔ "یا وہاب یا فتاح" ہر نماز کے بعد ایک تسبیح ورد کریں، اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے برطانیہ بہتر رہے گا۔

سرفراز۔ سبی

○ محترم! سب سے پہلے تو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری مدد فرمائی اور مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا یقین کیجئے مجھے کبھی بھی اخباری اشتہارات پر یقین نہیں تھا لیکن آپ کے بارے میں جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھا تو دل کو لگا کہ آپ ہی ہیں جو میرا مسئلہ حل کریں گے اور آپ کی دعا سے میں ماشاء اللہ بیٹے کا باپ بن گیا ہوں 8 سال سے مختلف حکیموں، ڈاکٹروں، نجومیوں کے چکروں میں پڑا رہا اور روپیہ، پیسہ برباد کیا لیکن ہاتھ کچھ نہیں آیا آپ کے نقش علاج در عقیم کے استعمال سے پہلے ہی سال اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھر میں پھول کھلا دیئے اب میرے لئے کیا حکم ہے۔

☆عزیزم! اللہ جل شانہٗ کا شکر ادا کیجئے اور اپنے بچوں کی تربیت صحیح اسلامی خطوط پر کیجئے۔ حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے وہ تمام مصیبتوں اور رنجشوں کو دور کرنے پر قادر ہے دعاؤں کا شکریہ۔

عمران علی۔ لاہور

○ محترم! آپ سے لوح عطارد برائے تعلیمی معاملات بنوائی تھی اللہ کے کرم اور آپ کی دعا سے میرا رزلٹ ماشاء اللہ بہت اچھا آیا ہے جس کے لئے ہم سب آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ اب میری بہن نے میٹرک کے پیپرز دینے ہیں تیاری بھی اچھی ہے پچھلی مرتبہ دو مضمونوں میں سپلی آگئی تھی کیا یہ لوح ان کے لئے بھی مفید رہے گی؟۔

☆عزیزم! دعاؤں کا شکریہ۔ لوح ہر شخص کے لئے اس کے نام کی مطابقت سے تیار کی جاتی ہے۔ "یا کریم یا سلام یا علیم" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔

طاہرہ رانی۔ لاہور

○ محترم! میری شادی کو چودہ سال ہوگئے ہیں میری صرف ایک بیٹی ہے وہ بھی شادی سے پانچ چھ سال کے بعد پیدا ہوئی تھی اس کے بعد امید ہوئی جڑواں بچے تھے لیکن پھر ضائع ہوگئے اب اس بات کو بھی چار سال ہوگئے ہیں اس کے بعد کوئی امید نہیں ہوئی میرے شوہر مجھے کو بہت تنگ کرتے ہیں اور اولاد نہ ہونے کے بہت طعنے دیتے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں اور ہر وقت روتی رہتی ہوں آپ اللہ کے نیک بندے ہیں آپ کی دعاؤں میں اثر ہے میرے معاملے میں مدد فرمائیں اور خصوصی دعا بھی کریں۔

☆عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ بھروسہ رکھیں۔ وہ ہر لمحے دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے پر قادر ہے آپ "یا وارث یا سلام" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

یاسمین۔ بھیکھم

○ محترم! سب سے پہلے تو آپ سے معذرت کہ اتنے عرصے بعد آپ سے رابطہ کررہی ہوں آپ کو یاد ہوگا آج سے تین سال پہلے ہم لاہور میں آپ کے ہاں آئے تھے اپنی بیٹی کی شادی کے

لئے لوح زہرہ بنوائی تھی اللہ کے کرم اور آپ کی دعا سے بیٹی کی شادی 6 ماہ میں ہوگئی تھی اب ماشاء اللہ وہ ایک بچے کی ماں ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ ان کے میاں جو پہلے تو ان کے ساتھ بہت اچھے رہتے تھے اب ان کا رویہ بدلتا جارہا ہے اب پچھلے چار ماہ سے وہ اپنے آفس میں ایک خاتون کے ساتھ مراسم بڑھا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں پچھلے ہفتے تو حد ہوگئی کہ وہ اس خاتون کے گھر 2 دن ٹھہرے اور ہم سب کے ساتھ جھوٹ بولا کہ وہ آفس کے کام کے سلسلے میں کہیں جارہے ہیں محترم میری بیٹی نے رو، رو کر برا حال کرلیا ہے آپ اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائیں۔

☆عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے داماد صاحب کی اصلاح فرمائے اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت ہو۔ (آمین) "یا کریم یا قدوس یا مانع" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ برائے اصلاح لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

سمیرا شریف۔ کراچی

○ محترم! میری شادی کو تین سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں دنیا کا کوئی علاج نہیں چھوڑا۔ لیکن ہر طرف سے مایوس لوٹی ہوں اب آپ کے در آپ آئی ہوں امید ہے مایوس نہیں لوٹائیں گے۔ آپ نے میری بھابھی کو بھی ایک نقش دیا جس کی برکت سے وہ اب ماشاء اللہ تین بچوں کی ماں ہیں آپ کی مدد کی طلب گار آپ کی بہن۔

☆عزیز بہن! سب سے پہلے تو یہ یقین رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور کام میں اسی کی مصلحت سے تقدیم اور تاخیر ہوتی ہے "یا وہاب یا والی" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے۔

انور چوہدری۔ گجرات

○ محترم! میرا گندم کا کاروبار ہے میں گندم فلور ملوں کو سپلائی کرتا ہوں اللہ کا کرم ہے کہ کچھ لاکھ سے کام شروع کیا اور ماشاء اللہ کروڑ کا ہے قادری صاحب مسئلہ روپے پیسے کا نہیں بلکہ لوگوں کا جس کو بھی میں اپنے ساتھ کام کے لئے لگاتا ہوں وہ کچھ عرصہ میں ساتھ کام کرتا ہے اور پھر اپنا شروع کرلیتا کوئی میرے ساتھ

جناب ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی تصانیف

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی انتہائی خوبصورت تفسیر

عملیات اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کے وظائف

ہاتھوں میں تقدیر

دست شناسی پر ایک خوبصورت کتاب

خوب صورت نام

اپنے بچوں کے خوبصورت نام خود تجویز کیجئے

سیدنا غوث اعظمؒ

دنیائے تصوف کے سب سے بڑے ولی کا تذکرہ

جادو اور جنات

جنات کی حقیقت اور اس کا علاج

خواب اور تعبیر

خوابوں کے ذریعے راہنمائی حاصل کیجئے

دعائیں

دُعائیں

قرآنی دعاؤں کا حسین گلدستہ

زیر طبع

تمام مسائل اور مواقع کی دعائیں

ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں، نہ ملنے کی صورت میں فی کتاب بذریعہ منی آرڈر۔ 175 روپے ارسال کر کے منگوائیں۔ (کتاب V.P نہیں کی جاتی) B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون 5167842

مخلص ہو کر کام نہیں کرتا حالانکہ عام لوگوں کی نسبت میں ہر طرح کی سہولت دیتا ہوں کبھی روپے پیسے کی ضرورت پڑے تو وہ کر دیتا ہوں اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں اور کوئی ایسی لوح عنایت فرمائیں کہ جو میرے ساتھ کام کرے مخلص ہو کر کرے۔

☆ عزیزم! پہلے تو یہ سوچ لیجئے کہ آپ جو کام بھی کریں گے جس کی مدد بھی کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کریں گے تب آپ میں اخلاص پیدا ہوگا اور لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا ہوگی "یا عزیز یا جامع" بکثرت پڑھا کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

محمد احسان۔ سعودی عربیہ

○ محترم! میں یہاں پر کافی عرصے سے ہوں اور اللہ کے کرم سے اپنا کاروبار کر رہا ہوں میری یہاں پر آٹو پارٹس کی دکان ہے عرصہ 8 سال سے ہے پہلے تو کافی اچھی جارہی تھی اب یہ حالات ہو گئے ہیں کہ میرے لئے دکان کے اخراجات بھی پورے کرنا مشکل ہو رہے ہیں یہ معاملات پچھلے سات آٹھ ماہ سے ایک دم سے ہی شروع ہوئے ایک اور اہم بات وہ یہ کہ پچھلے آٹھ نو ماہ سے میں اپنے چچازاد کو بھی اپنے پاس بلایا ہوا ہے وہ اب میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے محترم اس سلسلے میں آپ سے مدد کی درخواست ہے کوئی ایسی لوح بنا کر دیں کہ میرا کاروبار پہلے کی طرح ہو جائے تاحیات آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو، اور تمام افراد کے معاشی معاملات کو نظر بد سے بچائے (آمین) "یا رافع یا وہاب" ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔

شفقت علی۔ سیالکوٹ

○ محترم! میری عمر اس وقت تقریباً 65 برس ہے اور اللہ کے کرم سے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں سوائے ایک بیٹی کے جناب عالی میری بیٹی کی عمر 32 سال ہو گئی ہے لیکن ابھی تک اس کا کہیں رشتہ طے نہیں ہو رہا لوگ آتے ہیں دیکھ کر چلے جاتے ہیں یا پھر یا تو لوٹ کر نہیں آتے اگر کوئی آتا ہے تو جہیز کی طرف سے بات رہ جاتی ہے اب اس عمر میں پینشن میں گھر کے اخراجات بامشکل پورے کر پا رہے ہیں حسب توفیق جہیز بھی بنا لیا ہے لیکن پتہ نہیں کیا تاخیر ہے اس لئے میں اور میری بیگم بہت پریشان ہیں کوئی وظیفہ، لوح، اسم الٰہی تجویز کر دیں تاکہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔

☆ عزیز بھائی! اللہ تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائیں اور آپ بخیر و خوبی اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔ ہر نماز کے بعد "یا لطیف یا فتاح" 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ لوح زہرہ برائے شادی ارسال کی جارہی ہے۔

صفدر علی۔ قصور

○ محترم! میں روزگار کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں جہاں بھی جاتا ہوں ناکام لوٹتا ہوں حالانکہ اچھا تعلیمی سٹیٹس ہے اس کے علاوہ کمپیوٹر میں بھی کچھ کورسز کیے ہوئے ہیں انٹرویو ہو جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور میں کامیاب ہو گیا ہوں پھر جواب نہ میں ملتا ہے اب تو مایوسی بڑھنے لگی ہے اور عجیب سا چڑچڑا پن سا طاری ہو رہا ہے میری مدد فرمائیں۔

☆ عزیزم! مشکلات سے ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر ضرور اچھے معاش کے دروازے کھولیں گے۔ "یا فتاح" بکثرت پڑھا کریں۔ نماز کی پابندی فرمائیں لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

محمد صدیق۔ شیخوپورہ

○ محترم! آپ کے بارے میں مجھے میرے بہنوئی نے بتایا تھا اور میں نے اب جاسوسی ڈائجسٹ میں بھی پڑھا۔ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی اور کامیاب و کامران زندگی عطا فرمائے۔ اب میں اپنے مسئلے کی طرف آتا ہوں مسئلہ پلاٹ کا ہے میں نے کچھ عرصہ پہلے ایک پلاٹ لیا تھا پلاٹ میں نے اپنے جاننے والے سے ہی لیا تھا کچھ روپے نقد دے دیئے ہیں اور کچھ کا ٹائم لیا اب جبکہ میں اسے بقایا روپے ادا کرنا چاہتا ہوں اور پلاٹ اپنے نام کروانا چاہتا لیکن اب وہ ٹال مٹول سے کام لے رہیں اور پلاٹ کی قیمت اب دگنی ہو گئی ہے اور کئی لوگ سے سننے میں آیا ہے کہ وہ مجھے روپے واپس کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں کوئی ایسی لوح، نقش عنایت فرمائیں جس سے بغیر دقت وہ پلاٹ میرے نام ٹرانسفر کر دیں۔

☆ عزیزم! دعاؤں کا شکریہ۔ بعد نماز فجر سورۂ فتح ایک مرتبہ پڑھ

کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی نیتوں کو لالچ سے محفوظ و مامون فرمائیں۔ (آمین)

بشیر احمد۔ کوئٹہ

○ محترم! میری بیٹی کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے اور اس لڑکے کی شہرت اچھی نہیں ہے لیکن وہ بضد ہے کہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی جس کی وجہ سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں اس پر کسی کی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا دو دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکی ہے ہم لوگ بہت ڈر گئے ہیں کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے اس سلسلے میں کوئی وظیفہ، نقش تجویز فرمایئے تاکہ وہ ہماری بات مان جائے۔

☆ عزیز بھائی! اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں پر رحم فرمائے اور انہیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ موجودہ صورت حال میں نرمی اور محبت سے کام لیجئے۔ ہر نماز کے بعد "یا سلام" 200 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے دعاؤں کا شکریہ۔

جویریہ۔ راولپنڈی

☆ خواب ☆ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا ہے جس سے میں ناراض ہوں مگر بہت پیار کرتی ہوں اور اس کے راضی کرنے پر راضی ہو جاتی ہوں وہ مجھے اپنے والد سے ملنے کو کہتا ہے میں اس کے گھر میں داخل ہوتی ہوں گھر بہت عالیشان اور خوبصورت ہے میں کمرے میں لیٹے اس کے والد کو ابا حضور کہہ کر سلام کرتی ہوں اور وہ بہت خوش ہو کر جواب دیتے ہیں وہ لڑکا اپنے والد سے معافی مانگتا ہے کیونکہ اس نے مجھے ناراض کیا تھا مگر وہ اسے معاف نہیں کرتے اس لڑکے کے دوست اسے کہتے ہیں کہ وہ والد صاحب کو کسی طرح راضی کر لے اور وہ پھر معاف کر دیں گے اور اس کے ابا خوش ہو کر معاف کر دیتے ہیں اور ہم دونوں کی شادی کا اعلان کرتے ہیں میں بہت خوش ہوں لڑکے کے والد کے پاس تین چھوٹے بچے لیٹے ہوتے ہیں جو تقریباً چھ سات ماہ کے ہیں میرے پوچھنے پر لڑکے کے والد بتاتے ہیں یہ میرے پوتے ہیں مہربانی کر کے اس خواب کی تعبیر بتا دیں۔

ماہنامہ "اسماء الحسنیٰ" کامیابی کا راستہ شائع ہو گیا ہے
اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

تعبیر..... ذہنی اور جذباتی مسائل کا عکس ہے۔ "یا رافع یا فتاح" بکثرت پڑھیں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

خالدہ خان۔ لاہور

☆ خواب ☆ یہ خواب میری بڑی بہن نے دیکھا ہے۔ وہ اپنے گھر کے پچھلے حصے کے باغیچے میں ہیں چھوٹے بیٹے کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے اور باغیچہ کا وہ حصہ جوان کے بیڈروم سے نظر آتا ہے اس کونے میں ایک ہرے رنگ کا سانپ دیکھا۔ جو گھاس میں چل رہا ہے اس کا منہ نظر نہیں آیا خوف سے ایک دم سن ہو جاتی ہیں اور آواز حلق میں رہ جاتی ہے اور بیٹے کو پیچھے کرتے ہوئے سوچتی ہیں کہ شکر ہے کہ یہ سانپ بچوں نے نہیں دیکھا اور اس حالت میں اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان ہوتی ہے۔

تعبیر..... حسب توفیق صدقہ خیرات کیا کریں۔ تاکہ لوگوں کے حسد سے محفوظ رہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

یعقوب خان۔ وہاڑی

○ محترم! میں جاسوسی کا پرانا قاری ہوں جب سے آپ کا کالم شروع ہوا تب سے میں آپ کا کالم ضرور پڑھتا ہوں آپ جس طرح لوگوں کے مسئلوں کا حل بتاتے ہیں اس سے بہت متاثر ہوں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی و کامرانی عطا فرمائے (آمین) میرا بھی ایک مسئلہ ہے مسئلہ کچھ اس طرح کا ہے کہ میں نے ڈیری فارم بنایا ہوا ہے شروع شروع میں تو اچھا رہا اب کچھ عرصے سے میرے جانور بیمار بہت ہو رہے ہیں یہاں پر مولوی صاحب نے بتایا ہے کہ مجھ پر کسی نے خاص قسم کا عمل کروایا ہے اس سلسلے میں آپ سے مدد کا طلب گار ہوں۔

☆ عزیزم! دعاؤں اور کالم پسند کرنے کا شکریہ۔ "یا کریم" بکثرت پڑھا کریں۔ آپ کے لئے لوح دخل تیار کر کے ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب "جمعۃ المبارک تعطیل" (براہِ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ ایم۔ قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو بعد نمازِ عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے۔